صنعتی تاریخ انگلستان

سلسلہ نصابِ تعلیم جامعۂ عثمانیہ

صنعتی تاریخِ انگلستان

کے

ممتاز دور

تالیف

جارج ٹاؤنسنڈ وارنر، ام، اے

ترجمہ

مولوی رشید احمد صاحب، بی، اے (علیگ)، اف-آر-ای-ایس (لندن)

سابق رکن دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۵۹ف م سنہ ۱۹۴۹ء

مطبوعہ

عثمانیہ یونیورسٹی پریس حیدرآباد دکن

باراول .... (۵۰۰)

نمبر .... (۳۸۸)

یہ کتاب بلاکی اینڈ سن لمیٹڈ بمبئی کی اجازت سے اردو میں ترجمہ کر کے طبع و شائع کی گئی ہے۔
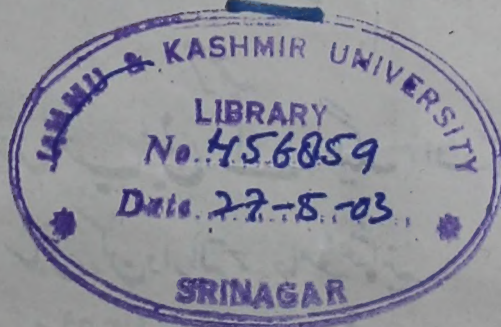
صنعتی تاریخ انگلستان

موجودہ ایڈیشن کے متعلق یادداشت

اس کتاب کی نظر ثانی سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی اور چند معمولی تبدیلیوں کے بعد سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ دوبارہ شایع کی گئی۔ اس سنہ ۱۹۲۴ء کے ایڈیشن میں مسٹر ٹی تیج، مارشل فیلو ٹرینیٹی کالج ڈبلن نے تین بابوں یعنی باب ۱۹، باب ۲۰ اور باب ۲۱ کا اضافہ کیا۔ موجودہ ایڈیشن میں ان بابوں میں مناسب جگھوں پر حالیہ قوانین و میلانات کے لحاظ سے ترمیم کردی گئی ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۳۰ عیسوی

کتاب کی اشاعت اور مکرر طباعتوں کے متعلق

یادداشت

(۱) کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔

(۲) بعد کی اشاعتیں، ۱۹۰۱ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۹ء۔

(۳) نظرثانی کیا ہوا نیا ایڈیشن ۱۹۱۰ء۔

(۴) مکرر طباعت:- ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء، و ۱۹۲۳ء۔

(۵) نیا ایڈیشن (ٹی، ایچ مارشل کے تین بابوں کے اضافے کے ساتھ) ۱۹۲۴ء

(۶) مکرر طباعت ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء۔

(۷) موجودہ ایڈیشن (جس میں حال کی ترقیوں کے لحاظ سے ترمیم کی گئی ہے) ۱۹۳۰ء۔

پہلے ایڈیشن کا مقدمہ

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ قاری کے سامنے انگلستان کی گزشتہ صنعتی و تجارتی ترقی کی اہم خصوصیات پیش کی جائیں۔ تمام شعبوں میں ترقی کی رفتار ہر زمانے میں یکساں نہیں رہی ہے۔ ایک دَور میں تجارت کو ترقی ہوئی۔ دوسرے دور میں زرعی حالات اور زرعی طریقوں میں نئے نئے اصلاحات ہوے۔ تیسرے دور میں جہاز رانی کو فروغ ہوا۔ اسی طرح چوتھے دور میں میکانی ایجادات کا چرچا ہوا۔ ان واقعات سے متعلق تفصیلات کتاب کی ابتدا میں دی گئی ہیں، حالانکہ بعض لوگ ان کو کم اہمیت دیتے ہیں اور ان پر سیاسی و دستوری تاریخ کو ترجیح دیتے ہیں۔ کتاب میں جو مواد دیا گیا ہے اس کے متعلق میں کسی جدت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ ہر تاریخی واقعہ نہ صرف فی نفسہٖ اہم ہے بلکہ دوسرے واقعات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے میں نے ایک نئی ترتیب اختیار کر کے واقعات کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے بظاہر ہر دَور کے اہم ترین واقعے کو چن لیا ہے اور اس واقعے کے اسباب و نتائج معلوم کرانے کی کوشش کی ہے۔

مذکورۂ بالا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ واری ترتیب باقی نہ رہ سکی اور ساتھ ہی بعض ایسے حصے چھوڑ دینے پڑے جو اہم اور دلچسپ تھے۔ مجھ کو توقع ہے کہ اس کمی کی تلافی اس طرح ہو جائے گی کہ کتاب کی ترتیب میں سادگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ملک کی معاشی ترقی کے خاکے کو واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مواد کا انتخاب اور ترتیب ہی اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس لیے میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ بہت زیادہ حاشیے اور حوالے دیے جائیں۔ دو کتابوں سے میں نے بطور خاص امداد لی ہے، اس لیے ان کا ذکر بہت ضروری ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں: (۱) انگریزی صنعت و تجارت کی ترقی، اور (۲) ایشلے کی معاشی تاریخ۔

میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کردینا چاہتا ہوں جنھوں نے اِس کتاب کی تیاری میں مدد دی۔ ریورینڈ ڈبلیو کننگھم۔ ڈی ڈی خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی تنقید اور مشورے سے بہت سہولت بہم پہنچائی۔

۱۸۹۸ء

جارج ٹاؤنسنڈ وارنر

صنعتی تاریخ انگلستان

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

تاریخ کا میدان اس قدر وسیع ہوتا جارہا ہے کہ سب کی مشترکہ رضامندی سے اس کو کئی شعبوں میں تقسیم کردیا گیا ہے چنانچہ ان مختلف شعبوں کو تاریخ قدیم، تاریخ جدید، سیاسی تاریخ، دستوری تاریخ، مذہبی تاریخ، فوجی تاریخ اور معاشی یا معاشری تاریخ وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گو اس تقسیم نے سہولت پیدا کردی پھر بھی ان علحدہ شعبوں میں فرق و امتیاز قائم کرنے میں بہت زیادہ شدت سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ تاریخی واقعات کو جستہ جستہ لے کر یہ کہنا کہ ان میں سے فلاں کا تعلق فلاں شعبے یا موضوع سے ہے یا فلاں موضوع سے نہیں ہے، وضاحت بیان کی خاطر خواہ کتنا ہی ترغیب دہ کیوں نہ ہو، مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسے کئی واقعات ہوں گے جن کو تاریخ کے صرف ایک ہی شعبے میں نہیں بلکہ کئی شعبوں میں اہمیت حاصل ہوگی۔ بعض واقعات کی حد تک یہ گوناگوں اہمیت بالکل عیاں اور نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی اس کا وہم و گمان بھی نہیں کرسکتا کہ "سند اعظم[1]" کو محض دستوری مورخ کا موضوع بحث قرار دینا اور سیاسی مورخ کو اس کی بحث کی ممانعت کرنا درست ہے۔ اسی طرح "تحریک اصلاح[2]" یا "ماڈل پارلیمنٹ[3]" یا "السٹر کی آبادکاری[4]"

---

[1] Magna Carta

[2] Reformation

[3] Model Parliament

[4] Colonisation Of Ulster

یا اسکاٹ لینڈ کے ساتھ استحاد" جیسے واقعات کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتے ہیں۔ بعض واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بادی النظر میں تو وہ تاریخ کے ایک شعبے سے قطعی طور پر متعلق معلوم ہوتے ہیں، لیکن غائر نظر ڈالنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اثرات دوررس اور دوسرے شعبوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۲ فلپ دوم اور لوئی چہاردہم نے اپنی رعایا پر جو ظلم وستم کیے وہ بظاہر سیاسی یا مذہبی نوعیت کے واقعات معلوم ہوتے ہیں تاہم یہ ثابت ہو چکا کہ ان کو تاریخ انگلستان میں معاشی اعتبار سے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ غیر ملکی دستکاروں کی انگلستان میں توطن گزینی جہاں ہالینڈ اور فرانس کے حق میں نقصان رساں ثابت ہوئی وہیں انگلستان کی صنعتوں کے حق میں محرک بن گئی۔ اسی طرح ایک اور واقعہ لیجیے۔ ایک "انڈین" پیرو (Peru) کے پہاڑی ڈھالو پر ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے پھسل کر گرا اور خود کو بچانے کے لیے جب ایک جھاڑی کا سہارا لیا تو جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی اور انڈین نے دیکھا کہ چاندی کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ اس کی یہ دریافت پوٹوسی (Potosi) کی کانوں کی کھدائی اور اس کے بعد یورپ میں چاندی کی بھرمار کا پیش خیمہ بن گئی۔ اس کو سننے کے بعد آپ کو یہ کہنے کی ترغیب ہوگی کہ یہ ایک خالص معاشی واقعہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے دوررس سیاسی اثرات صرف اسپین ہی پر نہیں بلکہ انگلستان پر بھی پڑے۔ چنانچہ نئی چاندی کی درآمد کے باعث قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اس نے شاہان اسٹوارٹ کے لیے اتنی آمدنی پر زندگی بسر کرنا بڑی حد تک ناممکن بنا دیا جتنی کہ ملکہ ایلزبتھ کے واسطے بالکل کافی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چارلس اول اور اس کی پارلیمنٹ کے درمیان شدید تصادم واقع ہوا۔ کوئی شک نہیں کہ دوسرے اور زیادہ موثر اسباب بھی کام کر رہے تھے، لیکن مالی مشکلات نے بادشاہ اور پارلیمنٹ کے باہمی اختلاف کی بنا ڈالی جس کی وجہ سے بغاوت رونما ہوئی۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ آگے چل کر ہمیں زیادہ مفصل طور پر بحث کرنے کا موقع ملے گا، تجارتی ضرورتیں اور خیالات ہی عام طور پر طویل جنگوں کے سبب رہے ہیں اور

ممکن ہے کہ یہ اصلی سبب اسلحہ کی جھنکار اور فتوحات کے شادیانوں کے شور میں نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ مثلاً یہ مان لینا تو کافی آسان ہے کہ کلایو نے ارکاٹ میں اور ولف نے کوئیک میں برطانوی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ممکن ہے کہ بادی النظر میں یہ واقعہ ہماری سمجھ میں نہ آئے کہ جو برطانوی فوجیں منڈن میں لڑ رہی تھیں وہ بھی اسی تاسیسی کام میں حصہ لے رہی تھیں۔

غرض جہاں یہ ضروری ہے کہ کسی واقعے یا پالسی کے فوری نتائج ہی پر نہیں بلکہ بعید اور بعض اوقات اچانک اثرات و نتائج پر توجہ دکی جائے وہاں آغاز کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا اور چھپا ہوا کیوں نہ ہو۔ اگر کسی شئے کا عمل، خواہ اس کا آغاز کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، دور رس اثرات پیدا کرے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گوناگوں اہمیت حاصل کرتا جائے تو ممکن ہے کہ یہ شئے ایسی اکثر اشیا کے مقابلے میں اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہو جو شروع میں تو بہت ہیجان پیدا کر دیں اور کھلبلی مچا دیں لیکن جن کا اثر زمانے کی رفتار کے ساتھ کمزور اور زائل ہوتا جائے۔ مثلاً لندن کی ۱۶۶۶ء کی عظیم آتش زدگی کی اہمیت کا مقابلہ و موازنہ اس کے تیس سال کے بعد کے واقعے یعنی بنک آف انگلینڈ کی تاسیس[1] سے کیجیے۔ اول الذکر حادثے نے لندن کی تجارت کو مفلوج کر دیا، لیکن یہ اثر دیر تک قائم نہیں رہا۔ برخلاف اس کے موخر الذکر واقعہ گو عارضی عملی مالی تدبیر کے سوا کسی اور مقصد سے قائم نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملک کے کل تجارتی نظام کو غایت درجہ متاثر کیا، اس لیے کہ اس کے اثرات وسیع اور دور رس ثابت ہوئے۔ معاشی تاریخ کا کوئی جدید مصنف پہلے واقعے کو چند جملوں میں بیان کرے گا، لیکن دوسرے واقعے کا ذکر پوری طرح اور تفصیل کے ساتھ کرے گا۔ تاہم لندن کے کسی تاجر کے ذہن میں اگر

[1] بنک آف انگلینڈ ۱۶۹۴ء میں قائم ہوا۔

اس نے دونوں واقعات کا مشاہدہ کیا ہو تو، آفت زدگی کا اثر نسبتہً زیادہ گہرا مرتسم ہوگا اور وہ بدرجہا موثر معلوم ہوگی۔ وہ فوری نتائج کو زیادہ وزن اور اہمیت دے گا اور زیادہ دور کے اثرات محسوس کرنے سے قاصر رہے گا۔ لیکن وقت گزرنے پر ان کا صحیح باہمی تناسب ظاہر ہو کر رہے گا۔

چونکہ واقعات ایک دوسرے سے گتھے ہوئے اور آپس میں بل کھائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے بعد کے واقعات شاخ در شاخ رونما ہو کر ان سے پیچیدہ طور پر وابستہ ہوتے ہیں اور چونکہ اس گتھی کو سلجھانے اور ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے لیے کوئی چاقو استعمال نہیں کیا جا سکتا، اس لیے یہ کل الجھاؤ اس قدر بڑا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اطمینان بخش طور پر نبٹا نہیں جا سکتا۔ لیکن ذہن میں جو خیال بھی قائم کیا جائے گا اس کا انحصار لازمی طور پر زاویۂ نگاہ پر ہوگا۔ کسی ناہموار پہاڑی پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالیے تو اس کی مختلف تصویریں سامنے آئیں گی۔ مثلاً اگر سامنے سے دیکھیے تو ایک چکنی اور ڈھلوان چٹان دکھائی دے گی؛ بازو سے نظر ڈالیے تو اس کا اصلی ڈھال معلوم ہوگا؛ کسی دوسرے مقام سے معائنہ کیجیے تو ایک سر بہ فلک ستون یا مینار نظر آئے گا؛ ایک خاص زاویے سے یہ سب منظر غائب ہو جائے گا اور نئی نئی چوٹیاں اور نوک دار حصے نظر کے سامنے ہوں گے۔ بس بعینہ یہی حال تاریخ کا ہے۔ سیاسی مورخ، دستوری مورخ اور معاشی مورخ، غرض ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے خاص نقطۂ نگاہ سے واقعات پر نظر ڈالتا ہے۔ ان سب کو تاریخ کی بڑی اور نمایاں خصوصیات یکساں طور پر دکھائی دیں گی، لیکن یہ اشخاص جن ادنیٰ اور دوسرے درجے کی خصوصیات کا انتخاب کریں گے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔ گویا ہر مصنف اسی چیز سے بحث کرتا ہے جس کا اس کے خصوصی موضوع یا جزو مضمون سے قابل لحاظ تعلق ہو اور باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اس طرح انتخاب کا کام بہت دشوار ہے؛ اور کسی دوسرے شعبے کے مقابلے میں معاشی تاریخ میں غالباً یہ دشواری بدرجہا زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہ

معاشی تاریخ اپنی نوعیت ہی کے اعتبار سے نمایاں واقعات اور ممتاز وجودوں
سے کسی حد تک معرا ہوتی ہے۔ عام قاری ایک معاشی واقعے کے مقابلے
میں دس سیاسی یا دستوری واقعات پیش کرنے کے قابل ہوں گے۔ معاشی تاریخ
اسباب و رجحانات اور حکمت عملی کی تاریخ ہوتی ہے اور اُن میں سے اکثر
بہت آہستگی سے عمل کرتے ہیں۔ رفتار اس قدر دھیمی ہوتی ہے کہ صرف طویل مدت
تک مقابلہ و موازنہ کرنے کی صورت ہی میں اس کا یقین ہو سکتا ہے کہ واقعی
حرکت عمل میں آ رہی ہے۔ معاشی تاریخ، انسان کی شخصیت یا اس کے خصائل
کا عام طور پر کوئی اثر نہیں لیتی۔ اس میں وہ سب دلچسپیاں نہیں ہوتیں جو
سوانح حیات میں جھلکتی ہیں۔ اس کی جو کچھ افسانوی دلچسپی ہے وہ اتفاقات
کے سریع تسلسل یا قسمت کی نیرنگیوں اور گردشوں سے نہیں پیدا ہوتی،
بلکہ اس وجہ سے رونما ہوتی ہے کہ اس کے دریافت کردہ اسباب عاملہ
"تدریجی طور پر قوت حاصل کرتے اور ناقابل مزاحمت ثابت ہوتے ہیں۔ انتخاب
ایسے واقعات کے انبار میں سے کرنا پڑتا ہے جن میں سے بہت ہی کم
ایسے ہوتے ہیں جو باقی کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ اہمیت رکھتے ہوں۔
بے ربط و بے تعلق واقعات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اگر اس کا یقین
حاصل ہو جائے کہ وہ بے ربط و بے تعلق ہیں۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ معاشری
ترقی یا صنعتی نشو و نما یا تجارتی پالیسی کے طویل سلسلے ڈھونڈ نکالے جائیں
اور ان کو ایک دوسرے سے جوڑا جائے۔ ہر اس شے کو نظر انداز کرنا چاہیے
جو پچھلے زمانے کی طرف لے جائے یا جو کسی طرف بھی رہنمائی نہ کرے۔ ہم کو
۵ ان "ادنیٰ شروعات" سے سروکار رکھنا چاہیے جن سے ہمارے ملک کی
دولت میں توفیر ہو۔ آئین و رواج، حکمت علی اور خیالات بھی پیدا ہوتے،
پھلتے پھولتے اور پھر دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم
ایسے ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے تاریخ پر اور قوم کی نشو و نما پر اپنا نقش نہیں
چھوڑتے۔ موجودہ زمانے میں انگلستان اپنی جن چیزوں پر فخر یا افسوس کر سکتا ہے
وہ سب زمانہ گزشتہ کا ثمر ہے۔ اس ثمر کو رفتار زمانہ نے کس طرح پکایا یا

جھلسا دیا۔ یہ صرف تاریخ ہی بتا سکتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کی عمرانی و معاشی ترقی کے ایسے ہی سلسلے کا سراغ لگانے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔

جس رفتار سے ہم ترقی کر رہے ہیں اس پر اخباروں میں اظہار حیرت کرنا آج کل ایک پامال مضمون شمار کیا جاتا ہے۔ ایک دریافت کے بعد دوسری دریافت نہایت حیرت انگیز تیزی کے ساتھ عمل میں آرہی ہے۔ ایجادیں ادھر مکمل ہوئیں اور ادھر پرانی اور دقیانوسی بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی سرگرم اور مسلسل جدوجہد تجارت اور کاروبار کے ساتھ سیاسیات کے حصے میں بھی آئی ہے۔ پس جب دماغ کی یہ حالت ہو تو اندیشہ لگا ہوا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ بلا تحقیق مذموم قرار دیا جائے یا حقارت آمیز بردباری کے ساتھ ان واقعات کو ٹھکرا دیا جائے جو گزشتہ زمانے میں پیش آئے تھے۔ ہمیں تاسف آمیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہنے کی ترغیب ہوتی ہے کہ ایسے واقعات قدامت شناسی کے نقطۂ نظر سے بے شک دلچسپ ہیں لیکن یقیناً تقویم پارینہ بن چکے ہیں، اور سب سے اچھا یہی ہوگا کہ ماضی پر وقت ضایع کیے بغیر دور جدید کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اگر ہم اپنے ذاتی اطمینان کی خاطر جدید ملحوظات اور جدید معیارات کا اطلاق قدیم محرکات اور قدیم حالات پر کریں تو ممکن ہے کہ ہم ماضی کو یہ سمجھ کر نظر انداز کرنے کی طرف مائل ہوں کہ وہ مایوس کن طریق پر تاریکی اور گمراہی میں مبتلا ہے، اس پر اظہار تعجب کریں کہ ہمارے اسلاف و اجداد بد سلیقہ اور ناواقف تھے، اور خدا کا شکر بجا لائیں کہ ہم دور حاضر میں معاملات کو بدرجہا بہتر طریق پر انجام دینے کے قابل ہیں۔ اس قسم کے تصورات اور میلانات قطعی طور پر غلط ہیں۔ ماضی کو محض اس بنا پر مذموم قرار دینا کہ وہ ماضی ہے اپنے لیے محض مستقبل کے نلفن ملعن کو مدعو کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تجارتی و صنعتی کاروبار میں عقل و حکمت کے مدارج مختلف زمانوں میں درحقیقت مختلف ہوں۔ لہٰذا یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ انیسویں صدی ہی کا آخری زمانہ اس عقل و حکمت کا اجارہ دار ہے۔ اگر ہم ماضی کی پالیسی پر ماضی ہی کے

نقطۂ نظر سے غور کرنے سے ہٹ دھرمی سے انکار کرتے رہیں تو ماضی کی پالیسی کو سمجھنے کی کبھی توقع ہی نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں ماضی کو ٹھکرا دینا صرف غیر علمی حرکت ہی نہیں ہے بلکہ ناسپاسی اور ناحق شناسی بھی ہے۔ غیر علمی اس وجہ سے کہ جدید سائنسی ترقی کی رفتار نے بحیثیت مجموعی کچھ سال ادھر سے مشاہدے، ترتیب اور مقابلے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور نظریے سے ابتدا کر کے اس نظریے کے مطابق واقعات کا انتخاب کرنے کی بجائے واقعات کا جستہ جستہ اور بتدریج ان کے ماخذ تک سراغ لگانے کی اہمیت خاص طور پر جتائی ہے۔ ناسپاسی اس لحاظ سے کہ دورِ جدید کا انگلستان محض گزشتہ زمانے کے انگریزوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر صرف موجودہ حالات ہی محتاج توجہ خیال کیے جائیں تو کیا ہم یہ مان لینے کے لیے تیار ہوں گے کہ محض دورِ حاضر ہی ایسا ممتاز دور ہے جس میں انگلستان کو عظمت حاصل ہوئی؟ کیا اٹھارھویں صدی میں اور ملکہ ایلیزبتھ اور شاہ ایڈورڈ سوم کے دورِ حکومت میں انگلستان کو عظمت حاصل نہ تھی؟ کیا اس زمانے میں ملک کے اندر اور باہر کم از کم ویسا ہی جوش و خروش نمایاں نہ تھا جیسا کہ اس وقت ہے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ اس زمانے کا انگلستان اور اس کے باشندوں کی آزمایش ہوئی اور وہ اس میں سے کامیاب نکلے۔ برخلاف اس کے ہم اپنے دور میں امتحان اور آزمایش سے بچے ہوئے مسرور اور شاد ہیں اور اس کی خبر نہیں کہ دشمن گھر کے پھاٹک تک چڑھ آیا ہے۔

ہم لوگ اپنی وسیع سلطنت کے لیے ان لوگوں کے رہینِ منت ہیں جو ہمارے پیشرو ہیں۔ انھوں نے لڑ کر، محنت کر کے، عمدہ حکمرانی کر کے اور اپنی اولاد کی اچھی تربیت کر کے یہ سلطنت ہمارے لیے پیدا کی تاکہ ہم اپنے بزرگوں کے کام کو جاری رکھ سکیں، اگر انگلستان اور دوسرے ملکوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات ایک واقعہ ثابت ہوگی کہ انگریزوں نے گزشتہ زمانے میں گھر بیٹھے رہنے پر قناعت نہیں کی، بلکہ دور دور پھیلنے کی وسیع تجاویز کو عملی جامہ پہنایا، روئے زمین پر اپنا تسلط و قبضہ بڑھایا اور پھیلایا، اور

اس کے بعد حکومت اور وہ اشخاص جو ملک ہی میں ٹھیرے رہے۔ گامزن ہوئے اور اسلحہ کے وسائل اور دولت کے غیر محدود ذرایع کے ساتھ اس کام کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جس کو ان کے بیشتر کے افسر اونے حوصلہ مندی اور جوش و خروش سے شروع کیا تھا۔ یوں تو دوسری قوموں نے بھی بڑی بڑی نو آبادیات قائم کیں، اور بعض اب بھی نو آبادیات حاصل کرنے کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ لیکن انگلستان اس اعتبار سے یکہ و تنہا ہے کہ اس نے اپنی نو آبادیات اپنے قبضے میں باقی رکھیں، اور ایسا کرنے کے قابل وہ زیادہ تر اپنے بے نظیر مادی ذرایع کی بدولت ہوا۔ پس ان ذرایع کا نشو و نما اور اس کی صنعت و تجارت کی ترقی، جو ابتداءً ملک کے اندر اور بعد میں ملک کے باہر بھی رونما ہوئی، ایسا مسئلہ ہے جس کو کسی حال نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہ سب سرگزشت خشک اور غیر دلچسپ معلوم ہو اور اس نظر فریب حسن سے عاری ہو جو سپاہیوں اور ملاحوں کے کارناموں سے وابستہ ہوتا ہے۔ محاذ کے جنگ و جدال کے مقابلے میں فوجی رسد رسانی کا محکمہ غیر رومانی ہوتا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ فوج کا سارا دارومدار اسی غیر رومانی محکمے پر ہوتا ہے۔ وہ شاندار عمارت جستہ جستہ اور بتدریج تعمیر اور تیار ہوئی ہے جسے "سلطنت برطانیہ" کہا جاتا ہے۔ بھلا قومی صنعت و حرفت، کفایت شعاری، کاروباری حوصلہ مندی اور مادی ذرایع کا کون خیال کرے گا جو اس سلطنت کی اساس ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان کا خیال کرنے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ اکثر لوگ اس عمارت کے بالائی حصے یعنی کنگوروں اور کلسوں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھیں گے۔ لیکن اگر عمارت کی پائیداری دیکھنا مقصود ہو تو اس کی بنیادوں پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

نارمن فتوحات سے پہلے

جب ماہِ اگست ۵۵ ق۔م میں جولیس سیزر ساحل کینٹ پر لنگر انداز ہوا تو اُس طاقت سے برطانویوں کا راست ارتباط و اتصال پہلی دفعہ قائم ہوا جو اُن پر ایک زمانۂ دراز تک ایسا ہی گہرا اثر ڈالنے والی تھی جیسا کہ اس نے باقی مغربی یورپ پر ڈالا تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ مغربی یورپ میں رومیوں کی تہذیب دیرپا ثابت ہوئی اور اُس نے اپنے کئی نقش اپنے پیچھے چھوڑے۔ اس کے برخلاف برطانیہ میں یہ تہذیب سیکسنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ نیست و نابود ہوگئی۔ اکثر اعتباروں سے رومی برطانیہ کی سرگذشت ہماری تاریخ میں ایک درمیانی قصے کی نوعیت رکھتی ہے جو بذات خود تقریباً مکمل ہے۔ لیکن بعد کے واقعات سے کوئی ربط و تعلق نہیں رکھتی۔

نہ تو سیزر کا پہلا حملہ نتیجہ خیز ثابت ہوا اور نہ دوسری چڑھائی جو ایک سال بعد عمل میں آئی موثر تھی۔ سیزر نے دریائے ٹیمس کو عبور کیا۔ اور کیسی ولانس[1] کو بہ مقام سینٹ البانس[2] شکست دی۔ لیکن یہاں کوئی

[1] Cassivellaunus

[2] St. Albans

باب ۱

رومی فوج متعین نہیں کی گئی اور تقریباً ایک سو سال تک کوئی اہم واقعہ
ظہور پذیر نہیں ہوا۔ فتح کا اصلی کام آلس پلاٹیس[1] اور ویسپاسین[2] نے ۴۳ء میں
شروع کیا۔ جنوبی انگلستان اور وادی ٹیمز زیر نگیں کر لیے گئے۔ اسکیپولا[3] نے
لنکن شائر اور شراپ شائر پر لشکر کشی کی۔ اور سوٹونیس پالی نس[4] شمالی ویلز
میں جا گھسا۔ ملک کے انتظام و قیام امن و امان کا کام اگریکولا[5] کے عہد میں
(۷۸ء تا ۸۹ء) شروع ہوا۔ چنانچہ اسی کے دورِ حکومت میں برطانویوں
نے رومیوں کے عادات و اطوار کی تقلید کی، رومیوں کے طرز پر مندر،
مکان اور حمام تعمیر کیے، رومی لباس اختیار کیا، اپنے فاتحوں کی زبان سیکھی
اور رومی صوبے کے باشندوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ کچی
برطانوی سڑکوں اور پگڈنڈیوں کے بجائے رومیوں نے پختہ سڑکیں بنائیں
جن میں پتھر، کنکر، چونا، روڑہ اور بجری یکے بعد دیگرے استعمال کیا جاتا تھا۔
رومن طرز کی کوٹھیوں کی تعمیر نے برطانویوں کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ
اس سے قبل تک برطانوی اپنے جھونپڑے بھدے لکڑی کے جو کھمبے یا
جال دار چھپنے سے بناتے تھے اور شگاف چکنی مٹی یا گارے سے تھوپ لیا
کرتے تھے۔ رومی کوٹھیاں پتھر یا اینٹ سے نہایت مضبوط بنائی جاتی تھیں
یا پتھر کی نیو پر چوبینہ استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض عمارتیں دو دو سو فٹ لانبی
ہوتی تھیں، ان کے اندر پچی کاری اور سنگِ مرمر کا فرش ہوتا تھا اور اطراف
میں مسقف برآمدہ بنایا جاتا تھا۔ زراعت میں بھی اسی پیمانے پر ترقی ہوئی
رومیوں کی آمد سے پیشتر بھی برطانیہ کی سرزمین زرخیزی کے اعتبار سے

۱؎ Aulus Plautius

۲؎ Vespasian

۳؎ Scapula

۴؎ Suetonius Paullinus

۵؎ Agricola

شہرت رکھتی تھی اور وہاں غلہ خوب پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گال آئرلینڈ کو اسکی کچھ برآمد ہوا کرتی تھی۔ لیکن چونکہ وسائل نقل و حمل عام طور سے ناقص تھے اس لیے صرف غذا کی مقامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی غلہ بویا جاتا تھا اور اس سے زیادہ کاشت نہ کی جاتی تھی۔ رومیوں کے عہد حکومت میں غلے کی کاشت کا باضابطہ انتظام کیا گیا اور اس کی تجارت نے خوب فروغ پایا۔ غلہ کثیر مقدار میں اور ارزاں پیدا کرنا رومی حکومت کا ہمیشہ مطمح نظر بنا رہا، کیونکہ وہ نہ صرف جزیرے میں متعین کردہ سپاہیوں اور جرمنی کی سرحد پر پڑاؤ ڈالے ہوئے لشکر کے لیے درکار تھا۔ بلکہ روما کے باشندوں میں اس کی مفت تقسیم کرنے کے لیے بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب رومی اصول کے تحت رومی سپاہیوں اور نئے بسنے والوں کو اراضی دی جانے لگی اور اس پر قدیم باشندوں سے جو ایک زمانے میں ان خطوں کے مالک تھے، کھیتی باڑی کا کام لیا جانے لگا تو غلے کی پیداوار میں بہت اضافہ ہو گیا۔ زوسی مس[1] لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ آٹھ سو جہاز برطانیہ سے غلہ لانے اور براعظم کے رومی شہروں میں پہنچانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اگرچہ جہازوں کی تعداد ظاہر کرنے میں غالباً مبالغے سے کام لیا گیا ہے، پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ غیر معمولی زرخیزی کی سرزمین خیال کیا جاتا تھا۔ ایومی نیس[2] اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "وہ اس لحاظ سے زرخیز اور متمول ملک ہے کہ وہاں زرعی پیداوار کی فراوانی ہے، چراگاہیں شاداب اور معمور ہیں، فلزات سے لبریز معدن ہیں، محاصل اچھے وصول ہوتے ہیں اور گودیاں اور بندرگاہیں بکثرت موجود ہیں۔" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدرت نے اس کو زمین اور آب و ہوا کے سب محاسن عطا کیے تھے، نہ تو وہاں موسم سرما میں انتہائی سردی کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی

9

[1] Zosimus

[2] Eumenios

اور نہ موسم گرما میں شدید گرمی ہوتی تھی، اور زمین اس قدر سیر حاصل اور زرخیز تھی کہ اس میں غلہ اور انگور کی کاشت بآسانی ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک جھوٹی قصیدہ خوانی ہے۔ اس لیے کہ آباد کاروں کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوگئی تھی کہ وہ برفانی ملک تو نہ تھا، لیکن بہر عام طور پر گرتی تھی اور بکثرت بارش ہوتی تھی، اور انگور کی کاشت حقیقت میں کبھی کامیاب ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اناج کی کاشت کے لیے جزیرہ واقعی خاص طور پر موزوں تھا۔ زرعی پیداوار کا جو مقررہ جزو بطور خراج رومی سپاہیوں اور عہدہ داروں کے استعمال کے لیے وصول کیا جاتا تھا اس کے علاوہ ملے[1] کی کافی مقدار تجارت کے سلسلے میں بھی برآمد کی جاتی تھی جس سے برطانیہ کو عطا کردہ لقب "شمال کا گودام" حق بجانب ثابت ہوتا ہے۔ مرغ، تاز، بطخ اور بے سینگ کی بھیڑیں اور بعض میووں کے درخت مثلاً ناشپاتی اور شاہ دانہ جیسے زرعی نوادر کا برطانیہ میں تعارف رومیوں ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

بیرونی حملوں سے پیشتر ہم یہ جانتے ہیں کہ برطانویوں کو کپڑا بننے، رنگنے دھات کے آلات اور مٹی کے ظروف بنانے اور ملمع کاری میں کچھ یوں ہی سی مہارت حاصل تھی۔ کپڑا بھدا اور اس قدر کافی موٹا بنا جاتا تھا کہ تلوار کی ضرب کے مقابلے میں ایک حد تک حفاظت کا کام دے سکتا تھا۔ دھاری دار اور شوخ رنگوں کے چار خانے کے کپڑے، جن میں سب سے مقبول سرخ رنگ تھا، کوٹ اور لبادوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ رنگ مختلف درختوں کی چھال اور بناس پتی سے بنائے جاتے تھے۔ انگوٹھیاں، چوڑیاں گھنگنی، تنکے اور عنبر، کہربا اور سیاہ تاب کے منکے بطور زیور پہنے جاتے تھے۔ اگرچہ اوّل اوّل فولادی تلواریں اور نیزے گال سے بن کر آیا کرتے تھے، لیکن برطانویوں نے ان کو بہت جلد اپنے طور پر بنانا سیکھ لیا، اور تلوار کے قبضوں اور کانسی کے نیام کو سونے کی میناکاری اور نقش و نگار سے

[1] Annona

سجایا جاتا تھا۔ پائی تھیاس[1] کے ورود کے بعد سے (۳۲۰ ق۔م) سکے یونانیوں سے نقل کر کے بنائے جاتے تھے، اور رومی فتح سے بیشتر ان پر رومی وضع کے حروف مثلاً وہ متعلق بہ شاہ بیلی یا بیلی نوس[2] منقوش کیے جاتے تھے۔ اگرچہ لوہا بیشتر باہر سے آتا تھا، پھر بھی رومیوں کی آمد سے بیشتر سے سیورن[3] کی وادی کی کانوں سے خام لوہا نکالا جاتا تھا، اور کارنوال میں سیسے اور ٹین کی کھدائی بہت قدیم زمانے سے مروج چلی آتی تھی، چنانچہ فینیقیوں کی تجارتی سرگرمی کے زمانے میں بھی یہاں کان کنی کا ثبوت ملتا ہے۔ پوسی ڈونیس[4] مشہور حکیم سرو کا استاد، کارنوال گیا تھا اور ٹن کی کھدائی کے طریق کو یوں بیان کرتا ہے کہ زیریں طبقات زمین سے ٹین نکالا جاتا ہے۔ کوٹنے کے بعد گلایا جاتا اور صاف کیا جاتا ہے۔ اور تختیوں کی شکل میں برآمد کیا جاتا ہے۔ تاجر اسکو ٹن آئی لینڈ (ٹن کے جزیرے) سے جہاز میں لاد کر بھیجتے تھے۔ اس جزیرے کو عام طور پر کوہ سینٹ مائیکل خیال کیا جاتا ہے۔ پوسی ڈونیس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رانگا پانی سے دھو کر صاف کیا جاتا تھا اور اس سے خالص قلعی الگ نکل آتی تھی جس کو صاف کرنے کی مزید ضرورت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے ملکی مصنوعات جنگی رتھ چمڑے اور بنی ہوئی ٹہنیوں کی کشتیاں اور جہاز تھے۔ رتھیں، لوہے کے برچھوں اور گنڈاسوں سے مسلح ہوتی تھیں اور یہ آہنی اسلحہ بھی یہیں تیار ہوتے تھے۔ چمڑے اور بنی ہوئی ٹہنیوں کی کشتیاں دریاؤں کے عبور و مرور میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مغربی حصے کے برطانوی چوڑے پیندے کے جہازوں میں آئرلینڈ کو اکثر جایا آیا کرتے تھے۔ چوڑے پیندے میں

---

[1] Pytheas

[2] Cunobelinos Rex. یہ بیلی برطانویوں کا دیوتا تھا، اس کا لاطینی تلفظ بیلی نوس ہوتا ہے۔

[3] Severn

[4] Posidonius ۱۳۵ق م میں پیدا ہوا اور ۵۱ ق۔م میں فوت ہوا۔

فایدہ یہ تھا کہ پانی اندر نہ آسکتا تھا۔ لیکن جہاز کا اگلا اور پچھلا حصہ اونچا اور شاہ بلوط کا بنایا جاتا تھا حفاظت کے لیے آہنی نیزے لگائے جاتے تھے، لنگر آہنی زنجیروں میں لٹکائے جاتے تھے، اور بادبان چمڑے کے بنائے جاتے تھے، اور ان پر نیلے رنگ کا روغن لگایا جاتا تھا تاکہ فاصلے سے نظر نہ آسکیں۔

رومیوں کے طاقتور تہذیب وتمدن نے ملکی صنعت و دستکاری کی انوکھی خصوصیت کو نیست ونابود کردیا اور برطانویوں نے اپنی توجہ خود اپنی صنعتوں سے ہٹا کر اطالویوں کی ادھوری تقلید کی جانب پھیردی لیکن حملہ آور اپنے محکموں کو بہت سی باتیں سکھا سکتے تھے، چنانچہ وہ ملک کی قدرتی دولت کے حاصل کرنے کا طریقہ خوب جانتے تھے۔ مثلاً کانیں زیادہ تر رومیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارنوال میں ٹن کی پیداوار بہت بڑھ گئی اور ڈربی اور مِن ڈیپس[1] سے سیسے کی اس قدر کثیر پیداوار برآمد ہونے لگی کہ اس کی تحدید بذریعہ قانون کرنی پڑی۔ لوہے کے کارخانے، ڈین کے جنگل ہیرفورڈ اور مان متھ میں موجود تھے۔ دھات کی سلاخوں اور اینٹوں پر تاریخ کندہ کرنے کا رواج بظاہر عام تھا۔ نارتھمبرلینڈ میں کوئلہ نکالا اور جلایا جاتا تھا نئے آقاؤں کو اپنے مکان کی تعمیر میں ترشے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں اور تختیوں اور اینٹوں کی ضرورت تھی، اور ان کا اعلیٰ ذوق شیشہ و آلات وظروف کا متقاضی تھا، چنانچہ ان کی اعلیٰ قسمیں پیٹر برو کے قریب کیسٹر میں اور ادنیٰ قسمیں لنکن شائر، سمرسٹ، وسٹرشائر، نارتھمپٹن شائر اور اسکس میں تیار کی جاتی تھیں۔ اتنے قدیم اور غیر ترقی یافتہ زمانے میں بھی بیر (ملکی شراب) ملک بھر میں عام طور سے تیار ہوتی تھی۔ بحری تجارت کی پائداری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ رومیوں نے ڈوور کیسل[2] میں روشنی کا ایک مینار بنا رکھا تھا، اور نشیبی رومیوں نے ساحل کی زیر آب زمینوں کو بھراؤ کے ذریعے سے اور پشتے باندھ کر

[1] Mendips

[2] Dover Castle

خشک بنانا شروع کر دیا تھا۔ اشیائے تعیش مثلاً چابیاں، فولادی آلات، پالش،
شیشے کی بوتلیں، چمچے، پیچے اور گھنٹیاں یہ سب رومی تہذیب کے باعث
برطانیہ میں آئے۔ غلہ، مویشی، چمڑے، دھات، برطانوی کتوں، پشم اور
غلاموں کی برآمد ہوتی تھی جس کی بنا پر کچھ اشیاء لازمی طور پر درآمد
کی جاتی تھیں۔ نمک، جو گوشت کو سرما میں گلنے سڑنے سے محفوظ رکھنے
کے لیے ضروری تھا، زیادہ تر باہر سے آتا تھا، گو کہ کچھ مقدار سمندر کے
ساحل پر تبخیر کے ذریعے سے بھی حاصل کی جاتی تھی۔ شراب بھی بکثرت
درآمد کی جاتی تھی اور اس کے ساتھ عنبر اور ہاتھی دانت کی بھی درآمد ہوتی تھی جو آرائشی کاموں
میں استعمال کئے جاتے تھے۔ مگر یہ زیادہ تعداد میں درآمد نہیں کیے جاتے تھے۔ اعلیٰ قسموں کا کپڑا
جزیرے میں تیار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس کو اور اعلیٰ درجے کی آہنی اشیاء
کو درآمد کیا جاتا تھا۔ برآمد میں عام طور سے اشیائے خام قابلِ ذکر ہیں، اور
درآمد زیادہ تر تعیشات یا اُن ضروریات کی جو ملک کے اندر دستیاب
نہ ہو سکتے تھے یا مصنوعات کی کی جاتی تھی۔ سلطنت روما کے دوسرے تمام
علاقوں کے مثل یہاں بھی اشیاء کی درآمد و برآمد دونوں پر محصول عاید
کیا جاتا تھا جسے پورٹوریا (Portoria) کہتے تھے۔ رومی قبضہ و تسلط کا ۱۲
ایک اور اثر شہروں کی ترقی میں ملتا ہے۔ ان شہروں میں سے اہم ترین
حسب ذیل تھے:— (۱) لندن جہاں متعدد سڑکیں آ کر ملتی تھیں (۲) یارک،
جس کا رومی نام ایبوراکم (Eboracum) تھا، شمال کا فوجی مرکز تھا۔
(۳) باتھ جس کا رومی نام اکوی سولیس (Aquaesulius) تھا اپنے
پانی کی خوبی کے باعث مشتاقانِ صحت کا مرجع تھا۔ کول چسٹر (جس کا رومی
نام کیمولوڈونم (Camulodonum تھا) راکسیٹر (جس کا رومی نام
یورکی کونم (Uriconium تھا)، چسٹر، سینٹ البانس (Verulamium)
سائرن سسٹر، ڈارچسٹر، لن کن، گلوسٹر، یہ سب اچھے خاصے وسیع شہر تھے۔
کہا جاتا ہے کہ جب بوڈیسیا، سینٹ البانس اور لندن پر حملہ آور ہوئی تو
ستر ہزار نو آباد کاروں کی جانیں نذرِ اجل ہوئیں۔ ان شہروں کے بہترین

مکانوں میں سیول اور فوجی عہدہ دار سکونت اختیار کرتے تھے، اور ان کے اطراف میں ادنیٰ طبقے والوں کے جھونپڑے ہوتے تھے جو عام طور پر لکڑیوں کو آڑا ترچھا باندھ کر بنائے جاتے تھے۔ رومی تسلط کے بعد کے سالوں میں ایسے علاقوں میں جو لکڑی کے جنگل تھے شہروں میں زیادہ تر اینٹ پتھر کے گرجا بنائے گئے۔ میونی سپیا (Municipia) کا لقب بعض شہروں کو دیا گیا ہے۔ اور یارک، گلوسسٹر، اور لنکن میں شہری مجالس کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ مجلسیں دوسرے شہروں میں بھی موجود تھیں، لیکن بہرصورت یہ ممکن ہے کہ مجلسوں کی رکنیت کا عہدہ موروثی رکھا گیا ہو جو باپ سے بیٹے کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا تھا، حالانکہ اس عہدے سے جو گئی تکلیف دہ ذمہ داریاں وابستہ تھیں ان سے چھپا چھڑانے کی ہر ممکنہ کوشش کی جاتی تھی۔ چونکہ حکومت نے ان بلدی جماعتوں کو محصولوں کے بارے میں ذمہ دار گروانا تھا اور ان کے وصول کا طریقہ اور انتظام ان کی مرضی پر چھوڑ رکھا تھا، اس لیے یہ عہدہ بہت زیادہ نامقبول اور بدنام تھا۔ براعظم یورپ کے حالات پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مختلف پیشے فرقوں یا جتھوں Collegia کی شکل میں متحد ہوتے تھے۔ لیکن برطانیہ میں اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔

برطانیہ کو سب سے بڑا فائدہ رومیوں کے قائم کردہ امن و امان سے حاصل ہوا۔ اب تک جن نزاعوں اور لڑائی جھگڑوں کا فیصلہ ظلم و تشدد کے ذریعے سے ہوتا تھا وہ عدالتوں میں تصفیے کے لیے پیش کیے جانے لگے۔ سڑکیں بنیں تو مختلف علاقوں کے باشندوں میں میل جول بڑھا، اندرون ملک تجارت میں سہولت پیدا ہو گئی اور صنعت و زراعت ناحق تباہی سے محفوظ ہو گئی۔ جب تمام ملک فتح کر لیا گیا تو سوائے سرحدی علاقوں کے ہر جگہ امن و امان کا دور دورہ تھا۔ رومی دور کے کسی مکان میں قلعہ بندی یا استحکام کی علامت نہیں ملتی۔ یہی امن و امان اس خوش حالی کی بنیاد تھی، ۱۳ جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ

برطانویوں نے اس بیرونی تسلط کو بعض صورتوں میں ناقابل برداشت توجہ تصور کیا۔ وہ قدرتی طور پر آزادی کو ترجیح دیتے تھے اور غیر ملکی باشندوں کو جو نامانوس زبان بولتے تھے نفرت و ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن اس کے ماسوا رنجش اور ناراضی کے دوسرے وجوہ بھی تھے۔ جن باشندوں کو نئے بسنے والوں نے ان کی زمینوں سے نکال باہر کیا تھا ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ خاموشی کے ساتھ اطاعت قبول کر لیں گے، اور اگر یہ صدمہ و تکلیف نوواردوں کے آبسنے کے ابتدائی زمانے تک محدود تھی تو دوسری قسم کی تکالیف بدرجہا زیادہ دیرپا تھیں۔ محصول بہت بھاری تھا، اور محصول وصول کرنے والے بے مروت، عجلت پسند اور غیر معقول تھے۔ محصول غلہ اور محصول بندرگاہ کے ماسوا محصول املاک بھی جسے (Tributure) کہتے تھے موجود تھا، اور ۲۱۲ء کے بعد جب عوام بڑی تعداد میں رومی شہری بن گئے تو محصول وراثت بھی ادا کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں جبری فوجی خدمت بھی انجام دینی پڑتی تھی۔ ہر سال نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد فوج میں بھرتی ہوتی تھی تاکہ اس وسیع سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کرنے اور امن و امان قائم کرنے میں حصہ لے جس کا ایک صوبہ ان کا ملک بھی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک جنگجو قوم کے لیے فوجی زندگی تکلیف دہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن اغلب یہ ہے کہ جو افراد بھرتی کیے جاتے تھے ان کا ایک بہت ہی چھوٹا حصہ ملک کی خدمت کے لیے رکھا جاتا تھا۔ بڑے حصے کو بعبور آبنائے انگلستان گال یا اس سے زیادہ دور افتادہ علاقوں کو بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے انھیں معلوم تھا کہ لوٹنے کی کوئی سبیل نہ ہو سکتی تھی، اور اس کے برخلاف بیرونی سپاہی خود برطانیہ کی مدافعت کے لیے متعین کیے جاتے تھے۔

لیکن اس جزیرے کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ تیسری اور چوتھی صدی میں وہاں دو مختلف و متضاد جماعتیں رومیوں اور برطانویوں کی

موجود تھیں صحیح نہ ہوگا۔ دونوں میں میل جول پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ایک تیسری اور نئی وضع کی قوم رونما ہو گئی تھی جسے ہم صرف "رومی و برطانوی" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ برطانیہ اپنے آپ کو سلطنت روما کا جزو خیال کرتا تھا۔ اور اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ اس کا جزو بن کر رہے۔ اس کے باشندے رومی شہری تھے۔ شہروں میں رومی انتظام، رومی فن تعمیر کی جھلک، رومی رسم و رواج اور رومی زبان موجود تھی۔ دیہات اور قریوں میں بھی سلٹ قوم کی تہذیب و تمدن کے سب آثار و علائم مٹ چکے تھے۔ ہمیں موجودہ زمانے میں اس کی تمثیل ہندوستان کی برطانوی حکومت میں ملتی ہے، لیکن اس میں بہت زیادہ کھینچ تان نہ کرنی چاہیے۔ یہاں رنگ اور مذہب، نسل اور زبان کے فرق و اختلاف نے میل جول میں بہت دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ لیکن جہاں تک امن و امان، نظم و ترتیب کے قیام و انتظام کے بیرونی حکومت کے ہاتھ میں رہنے، بیرونی عادات خیال و عدل و انصاف کے جاگزیں ہونے اور عجیب و غریب طریقوں، ساز و سامان اور تعیشات کے ذریعے سے بیرونی اور انوکھی تہذیب و تمدن کے رواج پانے کا تعلق ہے وہاں تک خاص طور پر بہت نمایاں اور قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ رومی برطانیہ کے آخری زوال کا نقشہ دیکھنا ہو تو ہمیں تھوڑی دیر کے لیے ذہن میں یہ تصور قائم کرنا چاہیے کہ مثلاً سنہ ۱۹۱۷ء میں جرمن برطانیہ کے مشرقی ساحل پر لنگر انداز ہو کر لندن پر چڑھائی کر رہے تھے، امریکہ نے کینیڈا پر حملہ کر دیا تھا، جنوبی امریکہ میں بوئیروں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے میدانوں پر سرحدی قبائل اور ان کے پیچھے روسی فوجیں پہاڑوں سے جوق جوق امنڈتی آ رہی تھیں۔ برطانیہ کا سکیسنوں کے سامنے سر اطاعت خم کر دینا وحشیوں کی حملہ آور فوجوں کے مقابلے میں سلطنت روما کی شکست و زوال کی حالت کا ایک رخ تھا، اور یہ در اصل رومی نظام کی خرابی یا اس کا فساد تھا نہ کہ برطانویوں کی زوال پذیری جس نے ایسا

۱۴

نتیجہ پیدا کیا۔

چوتھی صدی میں شہنشاہی پایۂ تخت قسطنطنیہ میں منتقل ہوگیا، اور سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، رقیب فرمانرواؤں میں نا اتفاقی رونما ہوئی اور مقامی فوجوں میں آئے دن شاہی تخت و تاج کے دعویدار پیدا ہونے لگے جنھوں نے بزور شمشیر حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ برطانیہ میں ایسے کئی مدعی کھڑے ہوئے اور ان میں سب سے آخری قسطنطین تھا، جس نے یورپ کو اپنے زیر نگیں کرنے کے لیے سنہ ۴۰۷ء میں مہم آغاز کردی اور جزیرے کے بعض بہترین سورما اس کے ہمراہ تھے۔ یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جب کہ پکٹ اور اسکاٹ فوجوں نے پھر چھاپے مارنے شروع کیے تھے اور روما سے کمک روانہ کرنے کی چیخ و پکار پر کوئی کان نہ دھرتا تھا۔ ایسے نازک وقت میں برطانویوں کو لامحالہ وحشیوں سے لڑنے کے لیے وحشیوں کو بلاوا بھیجنے کا مہلک مگر عملی حیثیت سے ضروری چارہ کار اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ وارٹیجرن نے پکٹ اور اسکاٹ قوموں سے لڑانے کے لیے قوم جوٹ کے ایک دستے کو بھرتی کیا جو ان کو شکست دینے اور پیچھے ہٹا دینے میں کامیاب ہوا، لیکن اس نے پھر اپنے ہی آقاؤں کے خلاف سرکشی شروع کردی اور اس کی کامیابی اس کے ہم قوموں کو یہاں کھینچ لائی۔ چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے مسلسل ترک وطن کر کے یہاں آتے رہے، ملک میں ہر طرف لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا، فتح کبھی ایک فریق کو نصیب ہوتی تھی اور کبھی دوسرے فریق کے ہاتھ میدان رہتا تھا لیکن بحیثیت مجموعی سکسنوں کو برابر کامیابی حاصل ہوتی گئی۔ برطانوی بجانب مغرب ہٹا دیے گئے یہاں تک کہ پانچویں صدی کے ختم تک ملک کا شرقی، وسطی اور جنوبی علاقہ سب کا سب حملہ آوروں کے قبضے میں چلا گیا اور برطانویوں کا تسلط صرف ڈیون، کورنوال، ویلز اور اس خطے پر باقی رہ گیا جو پینائن کی پہاڑیوں کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ حملہ نہایت مہلک اور تباہ کن تھا اور ایسی قوم نے کیا تھا جسے برطانوی اپنا خوفناک دشمن خیال کرتے تھے،

جو بالکل وحشی اور بُت پرست تھی، جس پر رومیوں کے تہذیب و تمدن کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا تھا اور جس کو عیسائیت بھی مہذب اور شائستہ نہ بنا سکی تھی۔ لیکن اس قوم کے افراد نڈر، دلیر اور سخت جان سورما سپاہی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نوواردوں میں برطانویوں کی سی تہذیب ذرہ برابر بھی موجود نہ تھی اور نہ وہ اس کو اختیار کرنے کے متمنی تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ زمین بہت اچھی اور منظم تھی جس میں بکثرت غلہ پیدا ہوتا تھا، منے بھیڑ، مویشی، باغ اور کھیت تھے اور یہ سب چیزیں مال غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ میں چلی گئیں۔ ان کے قدیم وطن فریسیا میں انھیں بزور شمشیر زمینوں پر قبضہ رکھنا پڑتا تھا، چنانچہ ہر فرد کبھی سپاہی کبھی کاشتکار ہوتا تھا۔ اگرچہ بقول ٹے سی ٹس وہ جرمنی کے قبائل سے مشابہت رکھتے تھے لیکن ان کے کاشتکاری کے طریقے بھدے اور بھونڈے تھے، ان کی صنعتی مہارت نے موٹا جھوٹا کپڑا بُن لینے اور جہاز جھکڑے اور اسلحہ تیار کر لینے سے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی صنعت کی جانب متواتر اشارہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ان کی زندگی سر آزمائی اور جنگی کارناموں سے پُر تھی۔ انھوں نے شہر نہیں بسائے بلکہ جہاں کہیں موقع ملا الگ الگ ٹولیوں میں آباد ہو گئے اور بالعموم کسی نہ کسی قسم کا رشتہ یا ناتا ان کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے خانہ بدوشی کے عادات کو بہت ہی ناقص اور نامکمل طریقے سے ترک کیا۔ اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ برطانیہ پر حملہ کرنے سے پہلے کاشت وسیع[۱] کے طریق سے بالکل دست کش ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے

۱۔ کاشت وسیع Extensive Cultivation کا طریق زیادہ تر نقل پذیر اور خانہ بدوش قومیں اختیار کرتی ہیں۔ صرف ایک سال تک زمین پر کاشت کی جاتی ہے۔ کھیت بونے سے پیشتر اس کی جھاڑیاں اور خس و خاشاک جلا دیا جاتا ہے، اس کے بعد ہل جوتتے وقت جلی ہوئی راکھ کھاد کے طور پر مٹی میں ملائی جاتی اور بیج بو دیا جاتا ہے۔ دوسرے سال کوئی

پیچھے جو حالات چھوڑے ان کی بنا پر ہمیں اپنے ذہن میں ان حملہ آوروں کی تصویر کھینچنا مشکل نہیں ہے۔ انھوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا، بستیاں جلا دیں، کھیت برباد کیے، شہر اجاڑ کر ویران بنا دیے، ملک کو تاخت و تاراج کر دیا، برطانویوں کا خوں خواری کے ساتھ تعاقب کیا حتیٰ کہ وہ بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی کھووں میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس عام بدنظمی اور افراتفری میں اس تہذیب و تمدن کے باقی رہنے اور جاں بر ہونے کا کوئی موقع یا امکان نہ تھا جو رومی اپنے ساتھ پہلی دفعہ اس سرزمین میں لائے تھے۔

یہ امر اس وقت بھی معرض بحث میں ہے کہ اس زمانے میں حقیقت میں کیا واقعات ظہور پذیر ہوئے ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ رومیوں کے زمانے میں مزروعہ زمین متفرق خطوں میں منقسم اور انفرادی زمینداروں کی ملک تھی جس پر زرعی غلام اور غیر آزاد مزدور کام کرتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۱۰۸۶ کے ڈونڈے سروے[1] (مساحت بندوبست) میں ملک کی حالت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کچھ مدت تک جاگیری موضعوں یا پرگنوں میں منقسم تھا، پرگنے بھی جاگیریں تھیں جو منفرد زمینداروں کو عطا کی گئیں تھیں اور غیر آزاد و زرعی کاشتکار یا غلام ان پر کاشت کیا کرتے تھے۔ یہ خیال بظاہر درست ہو سکتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دوسرا خطۂ زمین منتخب کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف "کاشت عمیق" کے یہ معنی ہیں کہ ایک ہی کھیت کو کئی دفعہ زیر کاشت لایا جائے اور کئی مرتبہ جوت کر، کھاد دے کر اور گاہے گاہے وقفہ اور آرام دے کر یعنی کاشت روک کر اس کی زرخیزی کو تازہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ آبادی کے کسی مقام پر مستقلاً بس جانے کی صورت میں بھی کاشت وسیع ممکن ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کاشتکار کم تعداد میں ہوں اور زمین سب کو بافراط دستیاب ہو۔ چنانچہ اس طریق پر بنگال اور روس کے بعض علاقوں میں اب بھی عمل ہوتا ہے اور اٹھارھویں صدی جیسے قریبی زمانے تک اسکاٹ لینڈ کے بعض حصوں میں اس کے مماثل طریق پایا جاتا تھا۔

[1] Domesbay Servey

سیکسن پرگنہ یا جاگیر Manor محض رومی دیہاتی مزرعے Villa کا
دوسرا نام تھا۔ لیکن اس زمانے میں اور ہمارے دور میں چھ صدیوں کا
فصل ہے اس لیے ہمیں نتائج حاصل کرنے میں عجلت نہ کرنی چاہیے۔ ایک
زمانے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سیکسن اپنے پیدائشی ملک اور وطن میں
آزاد قوم کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اور زمین میں ان کا حصہ مساویانہ
تھا جس پر وہ امداد باہمی کے طریق پر مشترکہ طور پر کاشت کرتے تھے۔
مالکان زمین یا زمیندار موجود نہ تھے اور زمین پوری قوم کی مشترکہ ملک تھی
اور اس بنا پر یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انھوں نے اسی قسم کی بستیاں اور
آبادیاں اس ملک میں بھی قائم کی ہوں گی کیونکہ یہاں سابقہ تہذیب و تمدن
میں سے کوئی چیز باقی نہ رہی تھی جس کو وہ ترقی دیتے۔ لیکن اس مفروضے کو
مان لینے کی صورت میں اس امر کی تشریح و توجیہ مشکل ہو جاتی ہے۔ (اگرچہ
جیسا کہ آیندہ باب میں بیان ہوگا اس کی توجیہ غیر ممکن نہیں ہے) کہ ان
آزاد اور مساویانہ طور پر زندگی بسر کرنے والوں نے اپنی آزادی اور مساوات
کو کس طرح خیرباد کہہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعضے تو زمیندار بن گئے اور ۱۷
اکثر زرعی غلام ہو گئے۔ اس خیال کے بارے میں اس بنیاد پر اعتراض
کیا گیا ہے کہ انگلستان میں کسی زمانے میں بھی آزاد قریوں کی موجودگی کا
کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا اور اس کے برخلاف جاگیری پرگنوں کے سلسلے
کا سراغ بہت قدیم زمانے سے ملتا ہے۔ اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ
سیکسنوں نے ابتداً آتے ہی مفتوح برطانویوں کو مزدور بنا کر جاگیریں
قائم کیں اور بہت ممکن ہے کہ انھوں نے یہ جاگیریں ان قدیم رومی مزرعوں
کے جائے وقوع پر جو حملے اور دستبرد سے محفوظ رہ گئے تھے قائم کی ہوں۔
اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ برطانوی اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنا
مذہب لے کر مغرب کی طرف چلے گئے اور رومی مزرعے رومی شہروں کے
مثل بے نام و نشان کر دیے گئے۔ لیکن ان دو نظریوں میں سے کوئی بھی
پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ حال حال میں ایک اور قیاس آرائی

یعنی تیسرا نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ بعض مورخوں نے اس خیال کے متعلق شبہ ظاہر کیا ہے کہ برطانیہ فتح کرنے سے پہلے آزاد قریہ کبھی سیکسن آبادی کی معمولی اور نمایاں خصوصیت رہا ہوگا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ "زمینداری طریق تاریخی دوروں میں تدریجی ارتقار کی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ قدیم ترین معلومہ اداروں میں سے ہے" اگر یہ صحیح ہو تو سیکسن دور کے جاگیری طریق کی توجیہ بآسانی ممکن ہے اور اس کے متعلق یہ خیال کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ رومیوں کے تہذیب و تمدن کے باقیات میں سے تھے یا برطانویوں کو ان کے فاتحوں نے غلام بنا لیا تھا۔ لیکن حقیقت پوشیدہ ہی رہتی ہے۔ غالباً ہم یکسانی دریافت کرنے کی توقع کرتے ہیں غلطی پر ہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ سب مختلف واقعات کسی نہ کسی جگہ ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ اگرچہ یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ کس تناسب اور کس شکل میں رونما ہوئے۔

بہرحال سیکسنوں کا عام پیشہ زراعت تھا۔ وہ شہروں سے دور رہتے تھے جس کی وجہ سے شہر اُجڑ گئے اور اپنی وضع کے مطابق یہ چھوٹے قریوں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ان بستیوں کے گرداگرد حفاظت کے خیال سے مٹی یا پتھر کی دیوار بنائی جاتی تھی۔ خواہ کسی شخص کے کھیت کی وسعت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ لکڑی کے مکانوں، ہال، غلہ گودام، مویشیوں کے سائبان، گھاس پھوس کے چھپر یہ سب ہر ایک کی الگ الگ باڑ سے محصور ہوتے تھے[1]۔ زمینداروں کے غلام گتھی ہوئی بستیوں کے جھونپڑوں میں

۱۸

[1]۔ مشرقی اسکاٹ لینڈ میں مزرعے کے مکان اب بھی عام طور سے ایک مربع خطہ کے تین پہلوؤں پر بنائے جاتے ہیں یعنی سکونتی مکان بیچ میں تعمیر کیا جاتا ہے اور پہلوؤں پر انبار خانے، اصطبل اور گاؤ خانے وغیرہ بنائے جاتے ہیں اور اس طرح جو احاطہ بنتا ہے اس کو مزرعے کی باڑ Farm Enclosure کہتے ہیں۔ یہ بظاہر قدیم سیکسن وضع کے باقیات میں سے ہے۔

منفصل ہی رہتے تھے۔ کھیتی باڑی کے معمولی طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔
خنزیر، بھیڑ اور مویشی پالے جاتے اور چراگاہوں میں چرائے جاتے تھے۔
دیہات اور قریوں میں ایسے لوگ بھی رہتے تھے جنھیں نجاری، آہنگری،
اور کفش سازی میں کچھ نہ کچھ مہارت حاصل تھی۔ موچی جوتوں کے علاوہ
چمڑے کی بوتلیں، صراحیاں، پیالے، زرہ بکتر، گھوڑے کا ساز اور موزے بھی
بناتے تھے۔ یہ لوگ موجودہ مفہوم کے اعتبار سے دستکار اور کاریگر نہ تھے،
بلکہ دوسروں کے مثل وہ بھی موسم گرما اور بہار میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔
رئی Rye، جئی Oat، گیہوں، لوبیا اور جو عام زرعی پیداوار تھی۔ مچھلی
خاصکر مسیحیت کے شایع ہو جانے کے بعد جمعہ کے روزہ اور روزوں کے
ایام میں بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ ویہی ماہی گیر جال یا ڈور استعمال کرتے
تھے اور اپنے طور پر دریا کی چھوٹی بڑی مچھلیاں اور تنبو اور بام پکڑتے تھے
کبھی کبھی بڑی مچھلی کے شکار کے لیے سمندر کا رخ بھی کیا جاتا تھا، لیکن
وھیل پکڑنا ہمیشہ پُرخطر خیال کیا جاتا تھا[1]۔ شہد سے Mead شراب
بنائی جاتی تھی اور بیر کشید کی جاتی تھی۔ غلے کو عورتیں عام طور پر دستی چکیوں
میں پیس کر آٹا تیار کرتی اور گھر کے تنور میں روٹی پکاتی تھیں۔ گیہوں کی
روٹی خوش حال لوگوں کے لیے اور تہوار تقریبوں کے موقع پر پکتی تھی
اور جو کی روٹی عوام کھاتے تھے۔ جو بہت ہی مفلس تھے وہ ادنی قسم کی
رئی، جئی اور لوبیا پر گزارہ کرتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیہی صنعت سے مقامی ضروریات تقریباً سب کی
سب پوری ہو جاتی تھیں۔ ہر گروہ اور قبیلہ اپنی سب احتیاجات کی تکمیل
خود ہی کر لیتا تھا اور دوسروں سے اپنی ضرورت کی اشیا کا مبادلہ نہ کرتا
تھا۔ البتہ نمک قریب ترین ضلعے سے خریدنا پڑتا تھا۔ کچھ نمک ووسٹرشائر
کی کانوں سے لایا جاتا تھا اور کچھ باہر سے منگایا جاتا تھا، لیکن اکثر ساحلی

۱۔ دیکھو الفرک Aelfric کی کتاب Dialogues

اضلاع میں رومیوں کے زمانے کے شل سمندر کے پانی کو جوش دے کر بھی بنایا جاتا تھا۔ ہل اور جنائی کے کاموں کے لیے لوہا اسپین سے اور چکی کے پتھر فرانس سے درآمد کیے جاتے تھے پھیری والے کندھوں پر گٹھری لیے ہوئے کبھی کبھی دیہات میں گھوما کرتے تھے اور اپنے ساتھ زیادہ تر بیرون ملک کی بنی ہوئی چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً زیور، ریشمی کپڑے کشیدہ کاری کے پارچے اور مسالے وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ لیکن ہر قریے کے باشندے عام طور پر دوسرے دیہات کے باشندوں سے بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے اور اس طرز زندگی میں کسی تبدیلی یا اس کی خواہش کے بھی کوئی آثار نہ تھے۔

19

اس غیر حوصلہ مندانہ طریق زندگی سے ڈنمارک کے حملوں نے انگلستان کو بیدار کیا۔ سیکسن جو ابتداءً ویسے ہی جانباز اور نڈر ملاح تھے جیسے کہ کوئی اور بحری ڈاکو ہو سکتے تھے، بہت جلد اپنی بحری زندگی کی خصوصیات کھو بیٹھے۔ ڈینوں کی مدافعت کی ضرورت نے الفرڈ کو نئے اور ڈینیوں کے جہازوں سے بڑے تیز رفتار اور اونچے جہاز بنانے کی جانب مائل کیا، اور گو اس کو ابتداءً ان جہازوں کے چلانے کے لیے فریس لینڈ کے بحری قزاق ملازم رکھنے پڑے تھے پھر بھی اس کا بیٹا ایڈورڈ آبنائے انگلستان پر قبضہ رکھنے کے لیے ایک سو جہاز اکٹھا کرنے کے قابل ہو گیا، اور ایڈگر تو انگریزی بیڑے کے ساتھ ساحل کے گرداگرد ہر سال گشت کرتا تھا۔ ڈینوں کی خصومت نے جنگی بیڑے کا رکھنا ضروری بنا دیا اور ان کی تقلید نے تجارت کو فروغ دیا۔ آٹھویں صدی میں تجارت خارجہ کی مقدار کم اور اس کی رفتار بے قاعدہ رہی۔ بر اعظم کے میلوں مثلاً سینٹ ڈینیز، روئین، اور ٹرائیز میں انگریز تاجر بہت شاذ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ چارلس اعظم نے اوفا آف مرشیا کو جو خط تحریر کیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلوں کو جانے والوں کی حیثیت زائرین کی ہوتی تھی نہ کہ تاجروں کی، اگرچہ اثنائے سفر میں موقع ملتا تو وہ کچھ

کاروبار کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے، تجارت کا میلان خالص دنیاداری اور مذہبی مقاصد و دینداری کے خلاف تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن ڈینوں کی تقلید کے محرک کے تحت اس چھوٹے کاروبار نے ترقی کر کے نارمنڈی، پوآتھو، فرانس اور فلینڈرز کے ساتھ باقاعدہ تجارت کی شکل اختیار کرلی۔ "شہنشاہ کے آدمیوں Men of the Emperor" کی ایک بستی لندن میں قائم ہوئی، اور وہ شراب، مچھلی، کپڑے، گول مرچ، دستانے اور سرکہ درآمد کرتے تھے۔ جو تاجر خود مصارف برداشت کر کے تین دفعہ سمندر کا سفر کرآتے تھے اُن کے واجب التعظیم آزاد شہری ہونے کا اعلان کردیا جاتا تھا۔ ایلفریک کی کتاب Dialogues میں مذکور ہے کہ تاجر اپنے ذاتی جہازوں میں چرم، بیش قیمت ریشمی کپڑے، جواہرات، زربفت کے کپڑے، رنگ روغن، شراب، تیل، ہاتھی دانت، پیتل، تانبا، چاندی، شیشہ وغیرہ لایا کرتے تھے۔ مشرقی اشیا قسطنطنیہ سے وینس اور یہاں سے فلینڈرز آتی تھیں۔ ڈین پشم، کھال، رسّی اور قیر بار لاتے تھے۔ انگلستان سے ٹن، سیسہ، اون اور غلاموں کی برآمد ہوتی تھی۔ برسٹل بردہ فروشی کا مرکز تھا۔ لیکن اس کو روکنے کے بارے میں اہل کلیسا کی سرگرم کوششوں کے باوجود شمالی جرمن بندرگاہوں میں غلاموں کی تجارت ترقی پر تھی۔ ۲۰

ڈینوں کی توطّن پذیری کا ایک اور اہم اثر جو تجدید تجارت سے یقینی طور پر بہت ہی گہرا تعلق رکھتا ہے، شہروں کی ترقی تھی۔ ابتداً سیکسن شہری زندگی سے متنفر تھے۔ بقول ٹےسی ٹس وہ شہروں کو آزادی کا قبرستان تصور کرتے تھے۔ جو کچھ شہر انھوں نے بنائے تھے ان کی حیثیت بڑے قریوں کی سی تھی۔ جن کے اکثر باشندوں کا ذریعۂ معاش زراعت تھا۔ لیکن ڈینوں کی مثال شہروں کی ترقی کا باعث بنی، جہاں صنعت و تجارت نے زیادہ اعلیٰ پیمانے پر نشوونما پائی۔ مناور، جو لوگوں کی زیارت گاہ تھے اور تجارت کا موقع بہم پہنچاتے تھے، خانقاہیں، مثلاً سنٹ ایڈمنڈ کی خانقاہ، جہاں آہنگر، نجار، زراج، ماہی گیر، چکی والے

دستکاری اور مزدور کام کرتے تھے۔ گڑھیاں، جو حملہ آور سے بچاؤ اور سڑکوں
کی حفاظت کے لیے تعمیر کی جاتی تھیں، چوراہے اور اندرونی دریائی گودیاں
جہاں اس زمانے کے جہاز آسکتے تھے؛ ان سب چیزوں نے شہروں کے
قیام و ترقی میں سہولتیں پیدا کیں۔ مثلاً شہر گلاسگو سینٹ فی مین کے مقبرے
کے اردگرد آباد ہوا۔ شہر سینٹ البانس اولین برطانوی شہید کے مزار کے
قرب وجوار میں بسا اور اس کے یہاں بسنے کی ایک اور وجہ ایک رومی
سڑک اور ایک قدیم رومی شہر تھا جہاں سے پتھر اور تعمیری مسالہ مل سکتا
تھا۔ آکسفورڈ کے محل وقوع میں ایک قدرتی شاہراہ نے بڑا حصہ لیا۔
علیٰ ہذا ناٹنگھم کی بھی یہی حالت تھی۔ کیمبرج، ایلی اور نارویچ کو بھی اسی
قسم کی سہولتیں حاصل تھیں۔ یارک، لنکسٹر اور اپسوچ جہاں واقع ہیں
وہاں تک ایسے بحری جہازوں کی آمدورفت ممکن تھی جن کو چلانے کے لیے
زیادہ گہرے پانی کی ضرورت نہ تھی اور اس لحاظ سے تاجروں کو سامان
اتارنے اور چڑھانے کی زحمت بچ جاتی تھی۔ چسٹر اور برسٹل آئرلینڈ سے
اور وہاں کی ڈینوں کی بستیوں سے تجارت کرتے تھے۔ سینڈوچ مچھلی
کی تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ونچسٹر، کنٹربری، راچسٹر، سوتھمپٹن،
لوئیس، ویرہم، ہسٹنگز اور چچسٹر نے بھی اہمیت حاصل کر لی۔ لندن جو ۶۱ء
۲۱ میں اجڑا ہوا شہر تھا اور جس کی گلی کوچوں کے نشان مٹ چکے تھے،
الفریڈ کے زمانے تک ترقی کر کے بہت اہم مقام بن گیا تھا۔ یہاں
اہل فریسیا، ایسٹرلنگ، فرانسیسی اور پیکارڈ تجارت کی غرض سے آیا جایا کرتے
تھے۔ کئی گرجا تعمیر ہوئے اور ان میں سے اکثر کا انتساب ڈینی اولیا[1]
کے نام سے کیا گیا۔ جب کینوٹ کو ڈینی خراج[2] ادا کیا گیا تو مجموعی رقم کا
$\frac{1}{8}$ لندن کے حصے میں آیا جو باقی ملک کے مقابلے میں لندن کے تمول
کا نمایاں ثبوت تھا۔

۱۔ مثلاً سینٹ اولاف اور سینٹ میگ نس۔ ۲۔ Danegeld

پھر بھی بحیثیت مجموعی سیکسن دور کی صنعت و تجارت کی حالت بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رومی تسلط کے زمانے کے مقابلے میں ترقی معکوس دکھائی دیتی تھی۔ کانوں کا کام بند تھا۔ لوہے کی جو قلیل مقدار مطلوب تھی وہ بھی ملک کے اندر نہیں پیدا کی جا سکتی تھی۔ صرف ایک صنعت جس سے ملک روشناس ہوا شیشے کا کام تھا چنانچہ بینی ڈکٹ بس کاپ نے منک وِیرمونتھ[1] میں اپنے گرجا کی کھڑکیاں بنانے کے لیے ساتویں صدی میں فرانس سے کاریگروں کو طلب کیا تھا اور اہلِ ملک کو شیشے کے پیالے، لمپ اور ظروف مشروبات بنانے کا بھولا ہوا فن دوبارہ سکھایا۔ ایک خالص دیسی فن جس نے ملک سے باہر دور دور تک شہرت پائی زردوزی کا کام تھا، چنانچہ سنہری تار اور خوشنما رنگوں نے انگریزی صنعت کو جرمنی اور اٹلی میں بہت مشہور اور مقبول بنا دیا تھا۔ سیکسن حملے سے لے کر نارمن فتوحات تک چھ سو سال کی مدت میں انگلستان کے حالات یقینی طور پر صنعتی و تجارتی ترقی کے بالکل منافی رہے سیکسنوں کے حملے نے ملک کے پرخچے اڑا دیے۔ اور آبادی گھٹا دی۔ ذرائع آمد و رفت ناقص تھے اور ہر طرف بدنظمی اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ جونہی ویسکس بادشاہوں کے تحت ملک منظم و متحد ہونا شروع ہوا تازہ حملہ آور آ پہنچے اور مزید ابتری اور بے ترتیبی پیدا کر دی۔ چنانچہ ڈینوں کے ساتھ کشمکش کرنے میں دو سو سال تک ملک کو اپنے قوی صرف کرنے پڑے اور اس طرح اس کے ذرائع ضایع ہو گئے۔ ذرائع مبادلہ، اور باقاعدہ بازاروں کا بھی فقدان تھا۔ زر کی مقدار اتنی کم تھی کہ اس سے آلۂ مبادلہ کا کام لینا غیر ممکن تھا، اور مبادلۂ اشیا کا طریق ہمیشہ پریشانی و پیچیدگی پیدا کرتا رہا۔ تحریر سے عام ناواقفیت کے باعث کاروبار ایسے گواہوں کے روبرو انجام پاتے تھے جو فریقین کی جانب سے تکمیلِ معاملہ کی تصدیق

۲۲

[1] Monkwearmouth

کر سکتے تھے، اس طرح یہ طریقہ نہایت دشواری اور طوالت پیدا کرنے والا تھا۔ سڑکوں اور دریاؤں کو عبور کرنے والوں پر بھاری محصول عاید کیے جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود دونوں وسائل آمد و رفت پر خطر تھے۔ رہزنوں اور ڈاکوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ ہر اجنبی نووارد شبہے اور بدگمانی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ اس کے لیے یہ لازم گردانا گیا تھا کہ وہ شریف اور بھلے مانس آدمی کی طرح اپنی آمد کی اطلاع قرنا یا سنکھ بجا کر دیا کرے۔ سمندر قزاقوں سے بھرا پڑا تھا جو عام طور پر ساحل سے ہٹ کر دریاؤں کے راستے اندرونی حصوں پر دور تک چھاپے مارتے تھے۔ اِن حالات میں داخلی تجارت کی گرم بازاری کی توقع عبث تھی۔

باب ۳

جاگیرداری نظام۔ خدمت اور عوض خدمت

خواہ ابتداءً انگلستان میں کاشتکاروں کی جماعت آزاد رہی ہو یا غیر آزاد اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نارمن فتوحات سے پہلے کچھ مدت تک زمین کے قبضے کی عام شکل جاگیر یا جاگیری موضع رہی۔ یہ اساسی طور سے غیر آزاد نظام تھا اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ ابتدائی کاشتکار آزاد تھے تو بھی اس آزادی کے سلب ہو جانے کی تاویل بہت زیادہ مشکل نہیں رہتی۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ اٹلی میں ظہور پذیر ہوا جہاں چھوٹے زمیندار یعنی وہ لوگ جو سِن سِنیاٹس کی طرح کھیتی باڑی سے نکل کر ملک کی خدمت پر کمر بستہ ہوئے، غائب ہو گئے اور ان کی جگہ بڑے زمیندار امروں نے لے لی جن کے بڑے کھیتوں Latifundia پر غلام کام کرتے تھے۔ گاؤں اور اس سے وابستہ کسانوں کے طریق کے ساتھ ساتھ ایسی جاگیریں قائم ہوتی گئیں جو منشور کے تحت دیا ہوا عطیہ تھیں اور جو مالکوں کی مستقل ملک بن گئیں۔ ممکن ہے کہ امن وحفاظت کی ضرورت یا زمانے کے انقلاب کے دباؤ نے آزاد اشخاص کو اس پر مجبور کیا ہو کہ اپنے آپ کو کسی ان داتا یا امیر سے وابستہ کر لیں۔

رسم جوار[1] بھی اسی طریقے سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اس قسم کی وابستگی قایم ہو جانے کے بعد اس میں بتدریج ترقی ہوتی تھی یہاں تک کہ ڈومسڈے (بندوبست) کے زمانے تک زمینداروں اور غلاموں کا انتظام اس قدر عام طور سے پھیلا ہوا ملتا ہے کہ اسی کو قاعدہ اور اصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ مستثنیات بہت کم ہیں اور وہ بھی انگلستان کے اس علاقے تک محدود ہیں جو مختلف اثرات کے تحت رہا۔

اس طرح یہ بیان کر دینا بہت اہم ہے کہ نارمنوں نے انگریز کاشتکار کو غلام نہیں بنایا۔ نارمنوں نے جاگیرداری نظام کو یہاں پہلی دفعہ رائج نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز اس سے پہلے ہی سے آشنا تھے۔ اور اگرچہ فتح نے اس انتظام کی جڑیں مضبوط کر دیں، پھر بھی ڈومسڈے بک (کتاب بندوبست) میں ٹی آر ای[2] کا مسلسل اشارہ ہوا کہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جاگیری موضع[3] کا جو آئین و رواج ایڈورڈ وی کنفسر[4] کے زمانے میں تھا بعینہ وہی ولیم اول کے زمانے میں تھا۔ علیٰ ہذا کاشتکاری کا طریق جو انگلستان میں ڈومسڈے (بندوبست) کے زمانے میں عام طور سے رائج رہا جس کو "تین کھیتی والا طریق"[5] کہا جاتا ہے نئی چیز نہ تھی۔ گاؤں کی زمین تین قسموں پر مشتمل تھی:۔ (۱) قابل زراعت زمین (۲) چراگاہ (۳) غیر مزروعہ اور بنجر زمین۔ زراعتی زمین تین بڑے کھیتوں میں منقسم ہوتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی مزید ذیلی تقسیم ایک ایکڑ یا نیم ایکڑ کے

---

[1] Practice of Comrsendation کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے سے زیادہ دولتمند اور طاقتور ان داتا یا امیر سے وابستہ کر کے اور اس امیر کے دربار میں خدمت انجام دے کر اس کی پناہ و حمایت میں آ جاتا تھا۔ رسم جوار ابتداً افراد کے مابین ایک تعلق تھی۔ زمین پر قبضہ خدمت انجام دینے کی شرط پر منحصر نہ تھا۔

[2] T. R. E. یعنی Tempore Regis Edwardi جس کا مطلب "زمانہ شاہ ایڈورڈ" ہے

[3] Manor ۔ [4] Edward the Confessor

[5] Three Field System ۔

خطوں میں ہوتی تھی جن کی حدِ فاصل بے کاشت گھاس کے تختے ہوتے تھے۔ اور ہر شخص کا کھیت اس قسم کے منتشر ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر کھیت پر دُہری کاشت ہوتی تھی یعنی موسم خزاں میں گیہوں کی فصل بوئی جاتی تھی اور موسم بہار میں جو یا جئی کاشت کی جاتی تھی اور پھر ایک سال تک اس کو بے کاشت رکھا جاتا تھا اس طرح کسی خاص سال میں تین کھیتوں میں سے دو سے ایک گیہوں کی اور ایک جو یا جئی کی فصل حاصل ہوتی تھی اور تیسرے کھیت کو بن جتا اور غیر مزروعہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حقیت اراضی کی پیچیدگی اور طریق کار کی یکسانی کی یہ انوکھی آمیزش زمانے کی ضروریات اور مشکلات کی بنا پر رونما ہوئی تھی۔ ابتداءً زمین کو انفرادی ملک نہیں خیال کیا جاتا تھا بلکہ گاؤں اور سب گاؤں والوں کی مشترکہ ملک تصور کیا جاتا تھا، اور ہر سال خطوں کی از سرِ نو تقسیم عمل میں آتی تھی تاکہ ہر شخص کو باری باری زرخیز ترین خطوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملے۔ جب زمین کو از سرِ نو تقسیم کرنے کا طریقہ موقوف ہوا تو ہر شخص کی اس قدرتی خواہش کی بنا پر کہ جس زمین کو اس نے محنت و مشقت کر کے ترقی دی ہو وہ اُسی کی ملکیت میں رہے اور وہی مستقل اصلاح و ترقی سے فائدہ اُٹھا سکے سہولت اس میں تھی کہ کسی شخص کا قبضہ پیشتر کی مانند منتشر زمینوں پر رہے۔ اگر اس کا سارا قبضہ ایک ہی کھیت پر رہتا تو ظاہر ہے کہ اس سال جس سال وہ کھیت غیر مزروعہ پڑا رہتا اس کو اشیائے خور و نوش سے محروم رہنا اور فاقہ کرنا پڑتا۔ علاوہ ازیں مختلف زمینوں میں خواہ وہ ایک دوسرے سے متصل ہی کیوں نہ ہوں خوبی کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہوتا ہے اور اگر بدررووں کا اچھا انتظام نہ ہو تو یہ فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اگر ہر شخص ان بڑے کھیتوں میں سے ہر ایک میں ان خطوں کا مالک ہو تو فصلوں کی دشواری تو باقی نہ رہے گی لیکن یہ مسئلہ حل طلب رہ جائے گا کہ ہر شخص کو مساوی سہولت اور مساوی فائدہ کس طرح پہنچایا جائے۔ پس ناانصافی اور رشک و حسد سے بچانے کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کے کھیت کو ایک ایکڑ اور نصف ایکڑ کے خطوں میں پھیلانے اور منتشر کرنے کی تجویز ہی

۲۴

عملی تجویز تھی۔ کاشت کے طریق کی یکسانی کا باعث یہ واقعہ تھا کہ متحدہ طور سے ہل چلانا اور زمین جوتنا ضروری تھا۔ ہر دیہاتی کے پاس بیلوں کی اتنی تعداد بہت شاذ ہوتی تھی کہ ہل چلانے کے لیے اُس کو کافی ہوسکیں۔ لیکن جب دیہاتی متحد ہو جاتے تو چار، چھے یا آٹھ بیلوں کی جوڑی سے بآسانی کام لیا جاسکتا تھا۔ ان وسیع کھیتوں میں ہر دیہاتی کو کچھ ٹکڑے حصے میں ملتے ہی تھے لیکن ان کے علاوہ گھاس کی غرض سے احاطہ کردہ رمنوں کے ایک جزو پر اس کو حقوق حاصل ہوتے تھے اور ان سب کے سوا گاؤں کی افتادہ زمین، جنگل یا چراگاہ پر مویشی یا سوّر چرانے، ایندھن کے لیے لکڑی اکٹھی کرنے یا گھاس کاٹنے یا کوئی اور کام لینے کے مزید حقوق بھی وہ رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر دیہاتی کی ملکیت میں عام طور پر اس کے جھونپڑے کے اردگرد کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی ہوتا تھا جس کو کلوس .Close یا ٹافٹ .Toft کہتے تھے۔ ان چھوٹے ٹکڑوں کو مستثنیٰ کرکے زمین کے کسی دوسرے خطے کے گرد اگرد مستقل باڑ نہ ہوتی تھی اور مزروعہ خطوں اور غیر مزروعہ رمنوں پر فصل اور گھاس کاٹ لینے اور اکٹھا کر لینے کے بعد مویشیوں کو چرنے کے لیے آزادی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا تھا، چنانچہ اسی وجہ سے اس طریق کاشت کو بعض اوقات ''کھلی کھیتی''[۱] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۵ ممکن ہے کہ آسامی آپس میں کسی معاہدے اور سمجھوتے کے ذریعے سے اس طریق پر کھیتی باڑی کرتے ہوں، لیکن اس زمانے میں جس کا تحریری حال ہمیں ملتا ہے زمین بڑی بڑی جائدادوں کی شکل میں جاگیرداروں کے قبضے میں تھی۔ اس وقت کل مزروعہ زمین دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک تو زمین سیر جو جاگیردار کا خطہ تھا، جس پر کلیتہً مالک کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کاشت کی جاتی تھی اور جو یا تو ایک علیحدہ

۱۔ Open Field.

احاطہ کردہ ٹکڑے پر مشتمل ہوتا تھا یا گاؤں والوں کی زمینوں میں منتشر طریقے سے پھیلا ہوا ہوتا تھا یا دونوں صورتیں ہوتی تھیں۔ دوسرے وہ زمین جنکی زرعی غلامی کے طریق .Villeinage پر کاشت ہوتی تھی یعنی ایسی زمین جو جاگیردار غیر آزاد آسامیوں یا کاشتکاروں کے قبضے میں اس شرط پر دیتا تھا کہ وہ اس کی بعض مقررہ خدمات انجام دیں گے۔ ہر اسامی قابض یا کاشتکار کے قبضے میں جو زمین ہوتی تھی اس کی مقدار اور وہ خدمات جو جاگیردار کے لیے انجام دینی پڑتی تھیں اسامی کی شخصی حیثیت پر منحصر ہوتی تھیں۔ بلحاظ رقبہ زمین کی دو بڑی اور نمایاں قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو معمولی کھیت تھا جو ورگیٹ[1] یا یارڈ لینڈ[2] کہلاتا تھا جس کا رقبہ بالعموم تیس ایکڑ ہوتا تھا اور منتشر و متفرق خطوں میں پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ ایک ورگیٹ کے قابض کو ولین یا ولینس Villein or Villanus یعنی زرعی غلام کہتے تھے ان کے بعد بارڈرون Bordars or Bordarii یا کاٹرون .Cotters کا درجہ تھا، چنانچہ ان کے کھیت کی وسعت عام طور سے ایک یا دو ایکڑ ہوتی تھی اگرچہ بعض اوقات اس کا رقبہ بڑھا کر پانچ ایکڑ یا اس سے زیادہ بھی کر دیا جاتا تھا لیکن اس قسم کے اسامیوں کے پاس بیل یا ہل نہ ہوتے تھے اور ولین یا زرعی غلام کے مقابلے میں ان کا درجہ قطعی طور سے ادنیٰ تھا۔ ولین اور کاٹر دونوں غیر آزاد تھے، لیکن ان کی حیثیت بالکل غلاموں کی سی بھی نہ تھی۔ غلام یا بندہ اپنے آقا سے کلیتہً وابستہ ہوتا ہے، اس کی بندگی شخصی ہوتی ہے وہ جملہ حقوق سے بے بہرہ و محروم ہوتا ہے، اس سے حسب دلخواہ ہر قسم کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نارمنوں کی ابتدائی آمد پر نئے امیروں اور جاگیرداروں نے واقعی غلاموں سے اپنی کھیتی پر یا اپنے گھروں میں کام لیا۔ لیکن ولین اور کاٹر، ارضی صرف یا زرعی غلام تھے

---

[1] Virgate. [2] Yard Land.

جو زمین سے چند خدمات انجام دینے کی شرط پر وابستہ ہوتے تھے، اور وہ کم از کم عام حیثیت سے حقوق سے عاری یا بے بہرہ نہ ہوتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ بذریعہ قانون ان کے حقوق کی نگہداشت کس حد تک ممکن تھی تو یہ بالکل جداگانہ چیز ہے۔

جاگیردار کی مملوکہ زمین پر جو خدمات انجام دی جاتی تھیں وہ محنت کی شکل میں ہوتی تھیں اور ان مختلف النوع خدمات کی عام طور سے دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک تو "ہفتے کا کام" Week Work یعنی سال بھر میں ہر ہفتے چند مقررہ ایام میں محنت کرنی پڑتی تھی، چنانچہ ولین عام طور سے تین یوم فی ہفتہ اور کاٹر دو یوم فی ہفتہ محنت کیا کرتے تھے۔ اور دوسرے زائد کام Precariae or Boon Work, یعنی ہفتہ وار کام کے علاوہ سال کے کسی حصے میں کوئی خاص زائد کام نکل آتا تو انجام دینا پڑتا تھا۔ فصل اور گھاس کی کٹائی کے موقع پر اور ہل جوتنے کے لیے زائد محنت کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہفتہ وار اور زائد کام کے علاوہ خراج کی تھوڑی سی مقدار یا مطالبات بہ شکل جنس بھی ادا کرنے پڑتے تھے، مثلاً مرغ انڈے اور رسی وغیرہ اور گاؤں والوں کو جاگیردار کی مطلوبہ نقل و حمل کی خدمت بھی انجام دینی پڑتی تھی۔ ان فرائض کو انجام دینے کے بعد اسامی کا باقی وقت اپنی زمین کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔   ۲۶

یہ ظاہر ہے کہ جاگیر کے انتظام میں سب سے بڑا کام ایک تو اس بات کی خبر گیری تھا کہ زرعی غلام .Villein اور دوسرے قابض اسامی اپنی خدمات منصبی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور دوسرے کام کے وقت ان کی نگرانی تھی۔ اگر ایسے کام کی باقاعدہ نگرانی نہ کی جاتی تو کام کم ہونے کا احتمال تھا اس لیے کہ کام تندہی اور جفاکشی سے انجام دینے کے لیے مزدور کو کوئی ترغیب و تحریص نہ تھی اور زائد کام کی حد تک زرعی غلام کے لیے اس امر کی پوری ترغیب و تحریک موجود تھی کہ اپنے ذمے کے کام کو ملتوی کر دے یا اس کی انجام دہی کی زحمت سے خود کو بچالے۔

چونکہ زمین کھیتی کاشت کے طریقہ پر زمین سیر اور گاؤں کی زمین دونوں پر باقاعدہ عمل ہوتا تھا اس لیے زمین سیر پر جس زمانے میں زائد محنت کی ضرورت پڑتی وہ قدرتی طور پر ٹھیک وہی وقت ہوتا تھا جبکہ کسان خود اپنے کھیت پر کام کرنے کے لیے مترود ہوتا تھا۔ ایسے ایام میں جیسے کہ مثلاً فصل کاٹنے اور کٹی ہوئی گھاس سکھانے اور پھیلانے کا زمانہ ہے جبکہ ذرا سی بھی تاخیر کے معنی یہ ہو سکتے تھے کہ موسم بدل جائے یا فصل بگڑ جائے جاگیردار کے کھیت کی گھاس اکھٹا کرنے یا اس کی فصل کاٹنے کے لیے کسان کا طلب کرلیا جانا اور اس کے اپنے کھیت سے ہٹا لیا جانا بہت ہی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہر جاگیری موضع میں ایسے عہدہ داروں کی ضرورت تھی جن کا سب سے اہم کام زرعی غلاموں کی خدمات کی بجاآوری کی نگرانی تھا۔

ایسے عہدہ داروں کی تفصیل تیرھویں صدی کی ایک کتاب Seneschaucie میں ملتی ہے جو ایک نامعلوم مصنف کی تصنیف ہے۔ اس میں مختلف عہدہ داروں پر مفصل بحث کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اپنے فرائض کس طرح انجام دینے چاہئیں۔ جاگیر کے کارندے .Seneschal کو کئی جاگیری موضعوں کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اور اس کے فرائض یہ تھے:۔ (۱) سال میں دو یا تین مرتبہ دورہ کرنا اور لگان، خدمات اور رسم و رواج کے متعلق احوال دریافت کرنا (۲) اس امر کی جانچ پڑتال کرنا کہ غلے کی پیداوار کتنی ہوئی، اس میں سے کتنی مقدار تخم کے طور پر استعمال ہوئی، اور کتنی زمین پر ہل چلایا گیا وغیرہ۔ (۳) اس بات کی نگرانی کرنا کہ گھوڑے، بیل، بھیڑ، اور خنازیر کی داشت اچھی طرح ہو رہی ہے اور (۴) یہ تحقیق کرنا کہ بیلف یا داروغہ جاگیر، باڑرکھوالا Hay Ward. اور محافظِ مویشی اپنے فرائض کس طرح انجام دے رہے ہیں۔ داروغہ Bailiff جاگیر کا صدر افسر ہوتا تھا۔ اس کے فرائض میں یہ داخل تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ رواجی اسامی اپنے ذمے کا زمین جوتنے اور ہل چلانے کا مقررہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں اور عمدہ تخم

۲۷

بو رہے ہیں یا نہیں۔ اس کو یہ حساب بھی رکھنا پڑتا تھا کہ کتنے ایکڑ زمین کی انھوں نے قطع و برید کی، اور اس کی بھی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جاگیری موضع سے کوئی شئے ناجائز طریقے پر فروخت تو نہیں کی جاری ہے۔ مکھیا Provost or Reeve, کے عہدے پر گاؤں والے اپنے ہی میں سے بہترین کاشتکار کا انتخاب کرتے تھے۔ زرعی غلاموں Villeins, کی نگرانی اس کے ذمے ہوتی تھی اور وہ ان کی خدمات بجالانے کا حساب پٹی پر رکھتا تھا۔ باڑ رکھوالا ہل چلانے ہینگا پھیرنے اور گھاس اور فصل کاٹنے کے موقعوں پر رواجی اسامی کے کام کی نگرانی کرتا اور ان سے مقررہ کام لیتا تھا۔ خبر گیری اور نگرانی کی ایسی ہی ضرورت والٹر ہنلی کی تصنیف Dite of Hosebondrie میں ظاہر کی گئی ہے۔ مصنف یہ مشورہ دیتا ہے کہ جاگیر کا بندوبست کرنا اور اس کی آمدنی اور مالیت کا تخمینہ کرنا چاہیے اور ایک یادداشت اس امر کی بابت رکھنی چاہیے کہ ہر کسان کے پاس کتنی زمین ہے اور کن خدمات کے صلے میں اس کو ملی۔ اور چونکہ رواجی ملازم اپنے کام سے تغافل برتتے ہیں لہذا ان کے دغا و فریب سے خبردار رہنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی ہمیشہ نگرانی کی جائے۔"

اس امر کا انحصار کہ آیا جاگیر نفع آور تھی یا نہیں مزدوروں کی تعداد پر تھا جو دستیاب ہو سکتے تھے۔ اگر مزدور دستیاب نہ ہوئے یا ان کی قلت رہی تو کھیتی باڑی ناممکن ہو جاتی تھی اور اس کا انتظام بوجھل اور گراں معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ مزدوروں کی کوئی ایسی جماعت نہ تھی جسے اجرت پر حاصل کیا جا سکتا لہذا زمیندار کو لامحالہ اپنے اسامیوں ہی کی خدمات پر انحصار اور تکیہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح جاگیر پر مزدور کو برقرار رکھنے کے لیے بہت دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ عام طور سے اسامی کے لیے جاگیر کا چھوڑنا ناممکن ہوتا تھا۔ اس کو ترکِ خدمت کی اجازت دینے سے بیشتر بھاری جرمانے یا تاوان طلب کیے جاتے تھے۔ اوسر اور افتادہ زمین سے نئے

خطّے باآسانی عطا کیے جاسکتے تھے یا موجودہ کھیتوں ہی کو زمین کی طلب بڑھنے کی صورت میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن بایں ہمہ جب عمدہ انتظام کا مقصد یہ تھا کہ ہر جاگیری موضع اپنی ضرورتوں کا آپ کفیل ہو، رواجی مزدور کافی تعداد میں موجود رہیں اور زاید مزدور حاصل کرنے کے لیے بطور اجرت زر خرچ نہ کیا جائے تو ہر جاگیر پر کام کرنے والے مزدوروں کا صحیح حساب رکھنا بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ان کی تعداد معلوم کرنا گویا جاگیری موضع کی آمدنی اور مالیت معلوم کرنا تھا اور اسی وجہ سے کتاب بندوبست Domes day Book میں ادنی زرعی اسامیوں کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔

۲۸

"بندوبست عظمیٰ" .Great Survey کا حال بیان کرنے سے پہلے اس کا مقصد واضح کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ خیال درست نہیں ہے کہ اس سے جتنی کثیر معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھیں یا یہ کہ وہ مؤرخ کے لیے ایک بے نظیر کارآمد تاریخی دستاویز ہے جو یہ بتلاتی ہے کہ نارمنوں کی فتوحات کے زمانے میں انگلستان کی زرعی زندگی اور مالی حالت کیا تھی۔ اس میں شک نہیں کہ "بندوبست عظمیٰ" موجودہ زمانے میں ایک دلچسپ یادداشت ضرور ثابت ہوئی ہے۔ لیکن یہ در اصل اسی زمانے کے لیے عملی حیثیت سے سب سے زیادہ کارآمد تھی۔ اس کی تدوین محاصل کا اندازہ قائم کرنے کی غرض سے عمل میں آئی تھی۔ بادشاہ کے لیے جس کے حکم سے وہ مرتب کی گئی تھی، مملکت کی زمین بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ نہ صرف بادشاہ بلکہ اس کے متعلقین کو بھی اسی زمین سے آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ زمین ہی پر ہر قسم کے محصول کا بار پڑتا تھا۔ بلکہ جاگیرداری نظام کے تحت سماج کی تنظیم کا انحصار بڑی حد تک زمین کی ملکیت پر تھا۔ بادشاہ اپنے خیر خواہوں اور حامیوں کو انعام و اکرام زمین کی شکل میں دیا کرتے تھے۔ ایک طرف شاہی تخت و تاج کے تحفظ اور ملک میں قیام امن کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر تھا کہ زمین کا انتظام قابلِ اعتماد ہاتھوں میں رہے

اور اس کی ملکیت غیر متنازعہ فیہ ہو تو دوسری طرف بادشاہ کے لیے اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی اور نہ تھی کہ وہ لا پروائی کے ساتھ بڑی بڑی اور منظم جاگیرات کو اُمرا کے تحت قائم ہوتا دیکھتا رہے اور شاہی حقوق میں دخل اندازی یا شاہی وقار کے تحفظ سے چشم پوشی کرے۔ اسٹیفن کے دور حکومت کی ابتری کو دیکھتے ہوئے ولیم فاتح کا زمین سے متعلق حقوق اور واجبات کے بندوبست پر اصرار کرنا اس کی عین دانشمندی کا ثبوت ہے۔

بندوبست عظمیٰ کا مواد و مسالہ ان نائبوں یا کمشنروں نے اکھٹا کیا جو ملک میں دورہ کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھیں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ بحلف شریف Sheriff, بیرنوں Barons. پرگنہ The Hundred کے پادری، مکھیا Reeve, اور ہر گاؤں کے چھ زرعی غلاموں Villeins. سے یہ دریافت کریں کہ جاگیری موضع کا نام کیا تھا، اس کا مالک کون تھا اور اڈورڈ دی کنفسر (معترفؔ[۱]) کے زمانے میں وہ کس کی ملکیت میں تھا، ہر جاگیری موضع میں کتنے ہائڈ[۲] Hide تھے، زمین سیر میں کتنے ہل اور اسامی تھے، ان کی حیثیت کیا تھی، جنگل، رمنہ، اور چراگاہ کا رقبہ کتنا تھا، چکیاں اور مچھلی کی ڈگیاں کتنی تھیں، آیا جاگیری موضع کے رقبے یا وسعت میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی، اور اس کی آمدنی اور مالیت کیا تھی۔ ان ہدایات پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ اور کمشنر نے اس قدر تفصیلی طور سے تحقیقات کی کہ کسی ایک ہائڈ کا تو کیا ذکر ایک گز زمین بھی محاسبے سے نہ بچ سکی اور اگرچہ اس کا تذکرہ کرنے میں حجاب معلوم ہوتا ہے لیکن کمشنر کو ایک ایک بیل، ایک ایک گائے اور ایک ایک خنزیر کے عدد کو اپنی یادداشت میں درج کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ بجز کمبرلینڈ، ویسٹ مورلینڈ، نارتھمبرلینڈ، ڈرہم اور شمالی لنکاشائر کی شہر نشینہ Counties. کے، تمام انگلستان کے متعلق مواد فراہم کیا گیا

۲۹

[۱] Confessor ۔

[۲] ایک ہائڈ ۱۲۰ ایکڑ کا ہوتا تھا۔

اگرچہ سب کا سب مساوی طور سے مکمل نہیں ہے۔ چند علاقوں کا مواد بہت ہی مختصر اور چند مقامات کا مواد بہت مفصل ہے۔ لیکن کیمبرج کی کونٹی .County سے ابتدائی کاغذات[1] کے مقابلے میں یہ مفصل مواد بھی مختصر معلوم ہوتا ہے۔ بندوبست کا عام نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ زرعی غلام ,Villein اور کاٹر .Cotter ہی زراعتی آبادی کا بڑا جز رو تھے۔ لیکن حلقہ بگوشوں یا خالص غلاموں اور آزاد آسامیوں یا لگان دینے والے کسانوں .Socmen کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔

ان طبقوں میں سے ہر ایک کے وجود کا باعث خاص اثرات معلوم ہوتے ہیں۔ کسانوں میں غلاموں کا اوسط ۹ فیصد ہے، لیکن مشرقی اور وسطی اضلاع میں ان کا وجود عام طور پر نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف جنوب مغربی اضلاع میں اور ویلس کی سرحد پر ان کی تعداد ۲۴ فیصد تک بڑھ جاتی ہے، اور یہ خیال بالکل حق بجانب ہے کہ یہ زیادہ تر برطانوی تھے جو یا تو نارمنوں کی آمد سے پہلے غلام بنالیے گئے تھے، یا جنھیں نارمنوں نے غلام بنایا تھا۔ آزاد اسامی اور لگان ادا کرنے والے کسان تقریباً سب کے سب مشرقی اضلاع میں پائے جاتے ہیں جہاں بعض اوقات ان کی تعداد بڑھ کر مجموعی آبادی کا ۴۵ فیصد ہو جاتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد اسامیوں Liberi Tenentes اور لگان ادا کرنے والے کسانوں .Socemanni کی اصطلاحوں کو پیمایش ترتیب دینے والے بیرنوں ,Barons نے کم و بیش مترادف و معادل الفاظ کے طور پر استعمال کیا، چنانچہ ان کے درمیان کوئی بین فرق و امتیاز قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں اور ویلینوں .Villeins اور کاٹروں .Cotters میں یہ فرق تھا کہ موخر الذکر دونوں طبقوں کی

۳۰

---

[1] The Inquisitio Comitatus Cantabrigie. یہ کیمبرج شائر کے پنچوں کے صادر کردہ فیصلوں کی ایک مثل ہے جن میں حالات و واقعات پر بہت ہی گہری اور تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔

طرح ان لگان داروں پر ہفتہ واری مقررہ کام انجام دینے کی پابندی نہ تھی۔ دوسری طرف ان کے کھیتوں کا تخمینہ ایک ورگیٹ[1] یا اس کے اجزا کے حساب سے کیا جاتا تھا، جس کے معنی یہ تھے کہ ان کی زمین ولینوں کی زمین کی طرح ابتدائی گاؤں کے کھیتوں کا ایک جزو تھی۔ ان کے ذمے لگان بہ شکل زر یا بہ شکل جنس واجب الادا ہوتا تھا اور عام طور پر ان کو زاید کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی مرضی کے مطابق آمد و رفت رکھ سکتے تھے لیکن اپنی زمینوں کو جاگیردار کی منظوری و رضامندی کے بغیر فروخت نہ کر سکتے تھے۔ وہ صرف ایک محدود معنی میں آزاد تھے۔ حقیقت اراضی جس کی بنا پر وہ زمین پر قبضہ رکھتے تھے اصولی طور پر آزاد تھی، البتہ ان کی آزادی پر مختلف طریقوں سے بندشیں عائد تھیں۔ انگلستان کے ایک علاقے میں آزاد اسامیوں یا لگان داروں کی کثیر تعداد میں موجودگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ڈینوں کا اثر کام کر رہا تھا، اور یہ افراد ان ڈینی ملازمین کے اخلاف تھے جو عطیۂ زمین کے عوض اپنے ڈینی آقاؤں کی کچھ خدمت بجا لانے کے لیے آمادہ تھے، لیکن جن کی حیثیت انگریزی زرعی غلاموں .Villeins سے بالاتر قرار دی گئی تھی۔

کتاب بندوبست میں جس صبر و تحمل اور تفصیل کے ساتھ معلومات کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم اور درج کیا گیا ہے اس کی قدر غالباً سب سے زیادہ وہ شخص کر سکتا ہے جو اس کے صفحات پر پہلی دفعہ نظر ڈالتا ہے۔ اگر کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ ہو تو وہ قدرتاً ملک کے ایسے علاقے کی طرف پہلے متوجہ ہوگا جس سے وہ واقف ہے۔ اگرچہ اس کو کامل یقین نہ ہوگا لیکن امید ضرور ہوگی کہ وہ جن موضعوں یا پیرشوں[2] (کلیسائی حلقوں) کو جانتا ہے شاید ان میں سے کسی کا تذکرہ مل جائے۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب مشہور نام بدلی ہوئی یا واضح شکل میں ایک کے بعد ایک اس کی نظر کے سامنے آتے ہیں اور مزدوروں،

۱۔ Virgate یہ بالعموم ایک ہائیڈ کا ایک ربع ہوتا تھا۔ گویا ہائیڈ میں ۱۲۰ ایکڑ زمین ہوتی تھی اور ورگیٹ میں ۳۰ ایکڑ۔ ۲۔ Parishes

جانوروں، مویشی، چکیوں اور واجبات کا حال درج ملتا ہے۔ اور اتفاق سے
کسی غیر معروف جاگیری موضع کی کیفیت پر نظر پڑ جائے تو اس سے ویسا ہی واضح ۱۳۱
اور دل خوش کن احساس اس امر کے بارے میں نہیں پیدا ہوتا کہ زمانہ حال
زمانۂ ماضی سے کس طرح مربوط ہے، افراد اور ان کے طرز بودوباش کس طرح
معرض وجود میں آئے اور غائب ہو گئے اور زمین باقی رہ گئی۔ گو کوئی اتفاقی طور سے
اخذ کردہ اقتباس اصلیت سے مقابلۃً معرا ہوتا ہے پھر بھی ایک یا دو
مثالوں کو بطور تمثیل پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلا اقتباس بہت ہی معمولی
قسم کا ہے اور بوشان Beauchamp. واقع ایسکیس کے جاگیری موضع سے
متعلق ہے۔

سینٹ پال کی کلیسائی زمین واقع ایسکیس اور رمنگ فورڈ کا پرگنہ۔
سینٹ پال کے قبضے میں شاہ ایڈورڈ کے دور میں بلشیان Belchamp,
کی جاگیر تھی جو ایک جاگیری موضع اور پانچ ہائیڈ Hide, زمین پر مشتمل تھی۔
زمین سیر میں ہمیشہ سے دو جوتیں رہیں اور کسانوں کی بارہ جوتیں تھیں، چوبیس[۱]
زرعی غلام Villein. دس بارڈر، Bordar. اور پانچ سرف تھے۔
ایک جنگل ہے جس میں ساٹھ خوک چر سکتے ہیں، تیس ایکڑ کا ایک رمنہ ہے،
نو جانور ہیں، دو بار برداری کے گھوڑے، چالیس خوک، ایک سو بھیڑیں اور پانچ
بکرے ہیں۔ اس کی آمدنی ہمیشہ سولہ[۲] پونڈ رہی۔"

اس عبارت میں نہ صرف اُن جوتوں کا حال درج ہے جو زمین سیر پر
کام کرتے تھے بلکہ اُس زمین کے جوتوں کی تعداد بھی بیان کی گئی ہے جو زرعی
غلاموں کو بشرط خدمت دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ولینوں، بارڈروں اور
غلاموں (اگرچہ غلام ایسکیس میں بہت کم تھے)، جنگل، رمنہ زمین، جانوروں،
مویشیوں اور آخر میں جاگیر کی آمدنی کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ مثال دلچسپ ہونے کے
اعتبار سے نہیں بلکہ نمونے کے طور پر منتخب کی گئی ہے۔ ورسٹر شائیر کی مثال

۱۔ ایک سو بیس[۱۲۰] ایکڑ زمین۔

اس سے بھی زیادہ انوکھی ہے۔

"شاہ ولیم کی زمین سیر کیڈ منسٹر Chideminstre. میں واقع ہے۔ ۳۲

یہ جاگیری موضع سب کا سب افتادہ اور ادسر تھا۔ زمین سیر میں ایک جوٹ بیس ولین اور تیس بارڈر ہیں۔ جن کے پاس اٹھارہ جوٹیں ہیں، اور مزید بیس جوٹوں کی گنجایش موجود ہے کھیتوں پر دو سرف اور چار غیر آزاد غلام عورتیں کام کرتی ہیں۔ وہاں دو چکیاں ہیں، جن کی آمدنی سولہ شلنگ ہے، دو نمک کے گڑھے ہیں جن کی آمدنی تیس شلنگ ہے، مچھلیوں کی ایک ڈگی ہے، جس کی آمدنی ۱۰۰ اینس ہے۔ ایک جنگل ہے جس کا رقبہ چار میل ہے۔ شاہ اڈورڈ کے زمانے میں کل جاگیری موضع چودہ پونڈ بطور لگان ادا کرتا تھا۔ لیکن اب دس پونڈ چار شلنگ بہ شکل جنس ادا کرتا ہے۔" یہ اقتباس نہ صرف اس امر کی مثال بہم پہنچاتا ہے کہ زمین پر کس اعتبار سے نظر ڈالی جاتی تھی، بلکہ یہ بھی کہ زمین کی اصلاح و ترقی کی صلاحیتوں کو کس طریقے سے جانچا جاتا تھا۔ حسب ضرورت زیادہ جوٹوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ غلاموں کی موجودگی جن میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے ویلز کی سرحد کے قریب خلاف توقع نہ تھی۔ چکیوں کی آمدنی کا حال درج ہے، اس لیے کہ کسانوں کو زمیندار کی چکی میں لازماً کام کرنا پڑتا تھا۔ نمک کے گڑھوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ نمک سازی کی صنعت ملک میں کس قدر قدیم ہے۔ ان کی وافر آمدنی صنعت کے بیش بہا ہونے کا بین ثبوت ہے۔ روزوں کے زمانے میں مچھلی ضرور استعمال کی جاتی تھی، چنانچہ مچھلیوں سے بھری ہوئی ڈگی ہر منظم جاگیر کے لوازم میں سے تھی۔ اڈورڈ معترف Confessor, کے عہد کے بعد سے مجموعی پٹے میں جو کمی ہو گئی اس کی وجہ یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ جاگیری موضع ویران و تباہ ہو گیا تھا۔

چونکہ ملک کی سرگزشت کو بیان کرنے کی جانب ہمارے دوبارہ متوجہ ہونے تک یہ معلوم ہو گا کہ آزاد آسامیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، واجبات بہ شکل محنت میں کمی ہو گئی ہے اور غیر آزاد آسامیوں کے ذمے بھی

۳۳ واجبات کم ہو گئے ہیں۔ لہذا یہ بتانا ضروری ہے کہ کس طرح یہ واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس کے لیے کچھ مواد "کتاب بندوبست" کے بعد ایک دستاویز موسوم بہ Extenta (بندوبست جاگیرات) میں ملتا ہے۔ اس میں "کتاب بندوبست" ہی کے نہج پر اور زیادہ مفصل طور پر خاص کر حقیت الارضی کے حالات[1] اور جاگیروں کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اور جاگیری عدالتوں کی روئدادیں اور یادداشتیں، کھیتوں کے تغیرات، نوواردوں، ترک وطن کرنے والوں اور مجرموں کے حالات درج ہیں۔ لیکن ان سب سے بیش بہا مواد ایک یادداشت موسوم بہ "کاغذات پرگنہ" The Hundred Rolls, میں ملتا ہے۔ یہ بندوبست کی ایک کتاب ہے جسے ۱۲۷۴ء میں اڈورڈ اوّل نے مرتب و مدون کرایا۔

اولاً یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ کس طرح آزاد آسامیوں کی تعداد بڑھی۔ ۱۰۸۶ء میں بوشان میں ایک بھی آزاد اسامی نہ تھا[2]۔ صرف چونتیس ۳۴ زرعی غلام اور پانچ غلام تھے۔ لیکن ۱۱۸۱ء میں اسی جاگیر کے متعلق ایک تحریری یادداشت میں پینتیس ۳۵ زرعی غلاموں کا وجود پایا جاتا ہے جن کے قبضے میں چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ ان کے علاوہ اٹھارہ ۱۸ آزاد اسامی تھے۔ لیکن ۱۲۲۲ء میں آزاد اسامیوں کی تعداد بڑھ کر چونتیس ۳۴ ہو گئی۔ اور ان کے علاوہ جاگیردار کی زمین پر کام کرنے والے کسانوں کی بھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ ان "آزاد اسامیوں" کے قبضے میں تیس ۳۰ ایکڑ کے خطے (ورگیٹ) یا ان کے اجزا تھے جن کے معاوضے میں وہ

[1] ۔ شاہی زمین سیر کے بندوبست کے متعلق شاہ اڈورڈ اول نے ایک یادداشت بنام Extenta مرتب کرائی لیکن اس میں زیادہ تر The Hundred Rolls. کا مواد شامل کیا گیا ہے۔ [2] بوشان کے جاگیری موضع میں کام کرنے والے کسانوں میں جو تغیرات واقع ہوئے ان کا تفصیلی حال پروفیسر ایشلے کی کتاب "معاشی تاریخ" Economic History, جلد اول جزو اول صفحہ ۲۳ میں موجود ہے۔

جاگیرداروں کو زر لگان کی مقررہ مقدار ادا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں زائد کام بھی لازماً کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح گو قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا لیکن اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۸۶ء کے زرعی غلاموں Villeins. کے جانشین تھے[1]۔ بعض ایسی صورتیں پائی جاتی ہیں جن میں آزاد آسامیوں نے زائد کام انجام دینے کے عوض زر ادا کرنے کو ترجیح دی اور اس طرح زیادہ مکمل آزادی حاصل کرلی، چنانچہ انھیں زمین منشور Charter. کے ذریعے سے ملتی تھی جو زمیندار یا جاگیردار عطا کرتا تھا۔ دوسرے آزاد آسامیوں کے پاس بھی کھیت موجود تھے۔ لیکن یہ شاملاتی اراضی میں نہ تھے بلکہ ہر گاؤں کی متصلہ اوسر اور افتادہ زمین سے منتخب کیے گئے تھے۔ ایسے آسامی عام طور پر لگان ادا کرتے تھے اور خدمات بجا نہ لاتے تھے۔ چند دوسرے کسان بھی تھے جو زمین سیر کے بعض خطوں پر اس شرط پر قابض تھے کہ پٹہ یا لگان بہ شکل زر ادا کریں گے۔ جہاں جاگیردار کے قبضے میں زمین کا ایک بڑا رقبہ ہوتا اور اس کو کاشت کرنے والے خدمت گزاروں کی تعداد قلیل ہوتی تھی وہاں اس قسم کے انتظام سے بڑی سہولت ہوتی تھی، اور اس طرح تیسرے طریقے پر بھی آزاد آسامیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۴۳

آزادی کی قطعی تعریف کرنا مشکل ہے۔ کوئی شخص اپنی حیثیت کے لحاظ سے "آزاد" یا "غلام" ہوسکتا تھا اگرچہ موجودہ زمانے میں یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ یہ فرق و امتیاز کیا تھا، لیکن یہ خیال کرنا حق بجانب ہے کہ اس زمانے میں اس تفریق کا مفہوم اچھی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اگر اس کے سمجھنے میں کہیں پیچیدگی پائی جاتی ہے تو وہ عہد جدید ہے نہ کہ دور وسطی۔ اس لیے کہ اس "آزادی" کا خواہ کچھ ہی مفہوم ہو یہ ممکن ہے کہ آج کل اس کو ایک دوسرے خیال یعنی "معاشی آزادی" کے تصور سے غلط ملط کردیا جائے اور کسی شخص کے آزاد یا غیر آزاد ہونے کا تصور

[1] ۔ چنانچہ پروفیسر ایشلے کا یہی خیال تھا۔

اس اعتبار سے کیا جائے کہ آیا وہ اپنے طور پر کام کرتا تھا یا جاگیردار کی
خدمات بجا لاتا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ آزادی کی یہ دونوں قسمیں
لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص حیثیت کے لحاظ سے تو سرف
ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ لگان ادا کرنے کی شرط پر
ایک قطعہ زمین اس کے قبضے میں ہو۔ اس کے برخلاف دوسرا شخص
خواہ حیثیت کے لحاظ سے آزاد ہی کیوں نہ ہو لیکن ممکن ہے کہ اس کو
ایسے کھیت پر قبضہ رکھنے میں زیادہ فائدہ اور سہولت ہو جس سے
خدمات کی بجا آوری وابستہ ہو۔ اس زمانے کے نقطۂ خیال سے
اول الذکر سرف اور دوسرا آزاد اسامی تھا۔ لیکن "معاشی آزادی" کے
تصور کے لحاظ سے معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ صحیح تعریف کے لیے
ہمیں قدرتاً قانون دانوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، لیکن یہاں بھی ہمیں
صادر کردہ فیصلوں کی صحت کے ساتھ توضیح و تشریح کرنے میں مشکلات سے
دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ممکن ہے یہ فیصلے کسی ایسے قاعدے کے مطابق
ہوں جس سے ہم پوری طرح واقف نہ ہوں یا اس کے خلاف ہوں
بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات وہ موخرالذکر نوعیت کے معلوم
ہوتے ہیں۔ مثلاً جاگیردار کی مرضی و منظوری کے بغیر لڑکی کا بیاہ نہ کر سکنا
یا بیل فروخت نہ کر سکنا خدمت گارانہ حیثیت اراضی کی سب سے
عام طور پر مسلمہ علامت تھی، اور شاہ جان کے دور حکومت میں ایک
مقدمے کا فیصلہ اسامی کی آزادی کے حق میں اس بنیاد پر ہوا کہ وہ اس
طریق سے وابستہ یا اس کا پابند نہ تھا، حالانکہ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اسے
زائد کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دوسری طرف منشوری اسامی بلاشبہ آزاد
تو تھے لیکن مویشی فروخت کرنے اور بیاہ کرنے کے معاملے میں بعض ۳۵
اوقات ان پر بھی بندش عائد ہوتی تھی۔ مال گزار Molmen.
یعنی وہ لوگ جو خدمت کے بجائے لگان یا مال ادا کرتے تھے کبھی آزاد
اور کبھی غیر آزاد شمار کیے جاتے تھے اولاد اکبر کی وراثت Primogeniture.

کے قاعدہ ہے کے بجائے قانون وراثت اولاد اصغر Borough English.[1]
کا طریق بھی غلامانہ حیثیت کی علامت تصور کیا جاتا تھا، اگرچہ اس کے
ذریعے سے بھی آزاد آسامیوں کو بعض اوقات وراثت پہنچتی تھی۔
آخر میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ جوں جوں قانون، رومی
خیالات اور رومی قواعد و ضوابط پر زیادہ سے زیادہ مبنی ہوتا گیا،
اس کا میلان غلاموں کی حیثیت کے متعلق شدید تر تخیل قایم کرنے کی
طرف زیادہ ہوتا گیا، اس لیے کہ رومی قانون غلام کو انسان کی
حیثیت سے نہیں دیکھتا بلکہ سامان یا اثاث البیت سمجھتا ہے۔ چنانچہ
تیرھویں اور چودھویں صدی کے مقنن ایسے اشخاص کا رتبہ یا درجہ
نسبتہً بہت کم قرار دیتے تھے جو اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں کمتر
آزادی کا حق ادا کرتے تھے۔

گو آزاد قبضۂ زمین کا مسئلہ انتہائی الجھا ہوا اور پیچیدہ ہے
لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ ڈومسڈے کے بعد کی ڈھائی صدی کے
دوران میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد آزاد ہوگئی جو ابتداءً غیر آزاد تھے
لیکن اس سے بدرجہا بڑی جماعت ان لوگوں کی تھی جو خدمات کے
بجائے عوض خدمت ادا کرنے کے باوجود غیر آزاد تھے۔ اس
میں شک نہیں کہ جاگیرات کے کھیوٹوں میں خدمات کی قیمت بہ شکل زرکا
اندازہ احتیاطاً ان جرمانے یا نذرانے کی خاطر درج کیا جاتا تھا
جس کا ادا کرنا خاطی یا قصوروار زرعی غلام Villein. کے ذمے
واجب تھا۔ لیکن اگر جرمانہ مزدور کی دن بھر کی غیر حاضری کے نقصان کی
تلافی کرنے کے لیے تکفی ہوتا تو جاگیردار اس کو بطور ترجیح قبول
کرتا تھا۔ ہفتہ واری کام یا زائد کام کے معاوضے میں جو رقمیں
ادا کی جاتی تھیں ان کے درمیان اصولاً کوئی فرق و امتیاز روا نہ ہوتا تھا۔

[1] ۔ وہ نظام جس کی رو سے سب سے چھوٹا بیٹا وارث ہوتا ہے۔

کسی سال جب جاگیردار کو عوض خدمت قبول کرنے میں فائدہ یا سہولت ہوتی تو وہ اس کو قبول کر لیتا تھا بشرطیکہ اسامی میں ادا کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہو۔ یہ ممکن تھا کہ ہفتہ واری کام کے مقابلے میں زائد کام نسبتہً زیادہ مدت تک لیا جاتا، اس لیے کہ معمولی موسموں میں مزدور کافی تعداد میں بھاڑے پر حاصل کیے جا سکتے تھے اور اس کے برخلاف فصل کی کٹائی یا تخم بونے کے زمانے میں ہر شخص مصروف رہتا تھا اور مزدوروں کی قلت ہو جاتی تھی۔ چنانچہ گاڑی کے ذریعے نقل و حمل کی خدمت کا عوض بہت شاذ قبول کیا جاتا تھا۔ لیکن ہر معاملہ فائدے یا نقصان کے اصول کی بنیاد پر فیصلہ پاتا تھا جاگیرداروں میں اس بات کی کوئی وجدانی خواہش نہ تھی کہ اپنے آسامیوں کو غلامی کی حالت میں رکھیں اگرچہ وہ قدرتی طور پر ان سے تا حد امکان زیادہ سے زیادہ کام یا زر لینے کے خواہاں ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں انھیں بہت ہی کم "حقوق" حاصل تھے چنانچہ اس لفظ کا اطلاق ہی فضول ہے۔ جاگیردار کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ محنت و خدمت کی مقررہ مقدار حاصل کرے اور اگر خدمت نہ بجا لائی جائے تو وہ انھیں سزا دے سکتا تھا جو عام طور پر جرمانے کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ محنت کے بجائے جرمانے کا مطالبہ کرنے کا اسے کوئی حق حاصل تھا۔ دوسری طرف کسان بھی اس امر کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے خدمت کے بجائے زر قبول کر لیا جائے۔ جب عوض خدمت کا طریق زمانہ دراز تک مستقل طور پر رائج رہا تو یہ امر بالکل قدرتی تھا کہ ایک دیرینہ رسم کو واجب و لازم خیال کیا جاتا، اور اس کو توڑنے کے خلاف غم و غصے کے اظہار کے ساتھ اس کو بالکل ناجائز تصور کیا جاتا۔ لیکن جاگیردار قانونی حیثیت سے عوض خدمت کو قبول کرنے کے لیے قانوناً اس وقت تک مجبور و پابند نہ تھے جب تک کہ انھوں نے کوئی معین و قطعی معاہدہ نہ کیا ہو، اور معاہدے کی صورتیں بہت ہی شاذ تھیں۔

۳۶

لیکن چونکہ کم از کم گاہے ماہے خدمت کا عوض دینے کا طریق
تمام ملک میں رائج تھا، لہذا یہ واضح ہے کہ ایسے مزدور لازمی طور پر
موجود ہوں جو زراعتی کام اُجرت پر انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔
ممکن ہے کہ یہ لوگ ایسے ہوں جن کے قبضے میں اتنے چھوٹے کھیت
ہوں کہ ان کو پوری طرح مصروف رکھنے کے لیے کافی نہ ہوں، یا جیسا کہ
نسبتہً شاذ صورت ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ ان کے پاس کوئی زمین ہی
نہ ہو اور ان کا انحصار سراسر اجرت پر ہو۔ اگر کہیں خدمت کے بجائے
عوض خدمت کے رواج کی رفتار سست تھی تو اس کی اغلب وجہ
یہی تھی کہ ایسے لوگ کمیاب تھے۔ لیکن عوض خدمت کا رواج،
جو بعض صورتوں میں بندوبست عظمیٰ سے پہلے شروع ہو چکا تھا،
چودھویں صدی کے وسط تک عام طور سے قائم ہوگیا اور بعض
صورتوں میں کسانوں کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ زر ادا کریں۔

اگر ہم اس عہد کے گاؤں کا عصر حاضر کے گاؤں سے مقابلہ
کریں تو کئی نمایاں فرق معلوم ہوتے ہیں۔ اولاً اس زمانے میں گاؤں
تا حد امکان خود اکتفائی یا اپنی سب ضرورتوں کے آپ کفیل ہوتے تھے۔
نقل و حمل اور ڈھلوائی میں مشکلات تھیں اور جنس فروخت کی
غرض سے بہت کم پیدا کی جاتی تھی۔ گو بعض ایسی صورتوں میں جب کہ
جاگیردار عادتاً غائب باش (بیرباس) ہوتا تھا کچھ نہ کچھ فروخت
لازماً عمل میں آتی ہوگی اور اگرچہ محض یہ واقعہ کہ زرعی غلام اپنے
ذمے کے واجبات خدمات کی بجائے زر کی شکل میں ادا کرنے کے
قابل تھے اور وارونہ زائد مزدوروں کو اُجرت پر حاصل کر سکتا تھا
کچھ نہ کچھ گردش زر کے وجود کو ظاہر کرتا ہے، پھر بھی جاگیری موضع
اپنی جگہ پر ایک اکائی یا فرد تھا اور اس کے مالک کا ذریعۂ معاش
اس کی اپنی زمین سیر کی پیداوار تھی یا اگر کئی جاگیریں یا مقطعے اس کے
قبضے میں ہوتے تو وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان سب کا اسی طرح

۳۷

دورہ کر کے باری باری سے ہر ایک کا غلّہ اپنے صرف میں لاتا تھا جس طرح کہ بادشاہ اور اس کے درباری شاہی جاگیروں یا خالصوں کا دورہ کرتے تھے۔ ابتداءً دیہات کے دستکاروں کو ان کی خدمات کے صلے میں گاؤں کی زمین میں سے ایک ایک کھیت دیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اپنے مطلوبہ کام کی تکمیل کے صلے میں کچھ بھی ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔ گاؤں میں موٹا جھوٹا کپڑا بنا جاتا تھا اور جوتے تیار کیے جاتے تھے۔ دکانیں نہ تھیں اور سامان صرف فرمائش آنے پر تیار کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ موجودہ حالات ان حالات سے کتنی بڑی حد تک مختلف ہیں۔ اس زمانے میں گاؤں سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتا تھا، لیکن یہ علٰحدگی اور بے تعلقی اب بالکل باقی نہیں رہی ہے۔

علاوہ ازیں دیہاتی زندگی میں ایک استقلال اور پائیداری تھی جو اب مفقود ہے۔ نئے لوگوں کا آنا مشکل تھا اور باہر نکلنا تو اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ کھیتوں کے قبضے فطری طور پر باپ سے بیٹے کو ملتے تھے۔ زرعی غلام کے خدمات انجام دیتے یا عوض خدمت ادا کرنے کے بعد اس کی حقیقت اراضی محفوظ ہو جاتی تھی۔ البتہ ایک بعد کی صدی کے مقننوں نے یہ قرار دیا کہ زرعی غلاموں کو اپنے جاگیرداروں کے مقابلے میں ان صورتوں میں، جن میں وہ بے دخل کر دیئے جاتے تھے کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ غرض جس طرح محنت میں پائیداری پائی جاتی تھی ٹھیک اسی طرح کاشت کا طریق بھی غیر متبدل تھا۔ افراد کو اپنی صوابدید سے کام لینے کا کوئی موقع ہی نہ تھا، دوری فصلوں کا طریق جاگیردار اور اس کے اسامی دونوں کے لیے یکساں اور مقررہ تھا۔ تین کھیتوں کی دوری کاشت کے طریق میں ذہانت کے اظہار یا تجربوں کے عمل میں لانے کی گنجایش ہی نہ تھی پیداوار بہت ہی قلیل وصول ہوتی تھی، لیکن اصلاح و ترقی بہ مشکل ممکن تھی۔

(۳) تیسرے یہ کہ بجائے زمیندار، کاشتکار اور مزدور کے تین طبقوں کے جیسا کہ آج کل پائے جاتے ہیں، اُس زمانے میں صرف دو طبقے تھے کسان کا وجود ہی نہ تھا۔ اور جہاں کہیں زمین کا لگان ادا کیا جاتا تھا اس کی شکل زمانۂ موجودہ کے لگان کی سی نہ ہوتی تھی کیونکہ آج کل کا لگان مسابقتی لگان ہے یعنی وہ مقابلے پر مبنی ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں لگان مختلف سہولتوں، زرخیزی اور موقع محل وغیرہ کے مطابق جو ایک خطۂ زمین کو دوسرے خطہ ہائے زمین کے مقابلے میں حاصل ہوں ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس زمانے کا لگان بدل خدمت لگان تھا یعنی وہ زمین کی آمدنی کا جزو نہیں ہوتا تھا بلکہ عوض خدمت کے طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بالعموم جو سب سے زیادہ اور بھاری خدمات انجام دیتا تھا اسی کو سب سے زیادہ یا بہترین زمین ملتی تھی، لیکن یہ حالت کسی طرح غیر تغیر پذیر نہ تھی۔ اس طرح ظاہر ہے کہ مسابقتی لگان ادنیٰ ہونے کی صورت میں بدل خدمت لگان اعلیٰ اور مسابقتی لگان اعلیٰ ہونے کی صورت میں بدل خدمت لگان ادنیٰ ہو سکتا تھا۔ مثلاً بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولیم اول کے زمانے کے غلاموں کے ورثا نے عطیات اراضی بتدریج حاصل کیے، لیکن یہ خطے ہمیشہ بہت ہی چھوٹے اور عام طور سے کم زرخیز تھے اور اس کے برخلاف خدمات بہت انجام دینی پڑتی تھیں۔ اگر بعد میں چل کر انھوں نے اپنی خدمات کو عوض خدمت سے مبدل کرنے کی کوشش کی تو انھیں کافی معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا اور بدل قیمت لگان بہت زیادہ ادا کرنے کی شرط پر زمین پر قبضہ ملتا تھا حالانکہ موجودہ حالات کے تحت مسابقتی لگان اس سے بہت کم وصول ہوتا تھا۔ لیکن اس زمانے کے زراعتی حالات کو سمجھنے کے لیے جدید تصورات مثلاً مسابقت،

۳۸

انفرادی آزادی، محنت کی نقل پذیری اور اصل کو اس معنی میں کہ وہ "دولت کا ایسا ذخیرہ ہے جس کو نت نئے اور نفع آور کاموں میں حسب ضرورت لگایا جا سکتا ہے[1]" الگ رکھنا چاہیے اور ان کی جگہ رسم و رواج اور حیثیت کی قوتوں کو دینی چاہیے۔

---

[1] دیکھو کننگ ہم کی کتاب صنعت و تجارت Indnstry and Commerce

باب ۳

شہر اور شہری زندگی کی ابتدا

ڈومسڈے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت انگلستان میں
اسّی شہر موجود تھے، لیکن ان سب کو ایک ہی قسم اور عنوان کے تحت
شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے خیالات کے لحاظ سے ان میں سے
بہت کم خالص شہروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لنڈن، یارک،
ونچسٹر، برسٹل، ناروچ، اور لنکن کو دیہات کی حیثیت سے تجاوز و ترقی
کیے ہوئے بہت زمانہ گزر گیا تھا، لیکن باقی سب زیادہ تر بڑے بڑے
گاؤں تھے جن کے گرداگرد دیوار تھی اور حفاظت کے خیال سے
قلعہ بندی کی گئی تھی۔ پھر بھی وہ اساسی لحاظ سے اس لیے گاؤں
تھے کہ ان کے باشندوں کا پیشہ تجارت یا حرفت نہیں بلکہ زیادہ تر
زراعت تھا۔ گاؤں کاشتکاروں کی چھوٹی سی جماعت پر مشتمل
ہوتا تھا اور اس سے بڑی جماعت، یا بستی کو شہر کہا جاتا تھا۔
فرق وسعت اور رقبے کا تھا نہ کہ نوعیت کا۔ ان شہروں کے

۳۹

باشندے یا تو بادشاہی زمینوں پر یا کسی جاگیر دار کے علاقے میں اپنے بالادست کی زیر نگرانی رہتے تھے۔ کھیتوں پر ان کا قبضہ غالبًا غلامی کی حقیقت Survile Tenure. کی شرائط پر تھا اور مالکِ زمین کی خدمات کی بجا آوری واجب تھی۔ ان کی بعینہٖ وہی حالت تھی جو زرعی غلاموں Villein. کی تھی۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی جاگیردار کا مقرر کردہ افسر اپنے آقا کے حقوق کی نگہداشت اور خدمات کی بجا آوری کی نگرانی کرتا تھا۔ شہر کے معاملات و مقدمات مینوریل کورٹ لیٹ Manorial Court Leet. یعنی جاگیری عدالت فوجداری کے سامنے پیش ہوا کرتے تھے۔ یہیں مقدمات کی سماعت ہوتی تھی، امور باعث تکلیف کو دور کیا جاتا تھا میلوں اور بازاروں کی منظوری صادر کی جاتی تھی، تجارت کی نگرانی کی جاتی تھی، غیر دیانت دار تاجروں کو خراب سامان فروخت کرنے یا ناپ تول میں کمی کرنے اور مجرموں کو بد اعمالی کی پاداش میں سزا دی جاتی تھی۔ خاص حقوق کو کام میں لانے کے لیے رسوم کی ادائی لازمی گردانی گئی تھی۔ جن کی آمدنی جاگیردار کو ملتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ شہر میں سیاسی ہیئت اور اجتماعی حیثیت مفقود تھی۔ چنانچہ اس باب میں ان خرابیوں کو رفع کرنے کی کوششوں کا سراغ لگایا جائے گا اور ان کی جگہ جس نظام نے لی اس کو بیان کیا جائے گا۔ اس نظام کے تحت شہروں نے وہ ہیئت سیاسی حاصل کرلی جس سے وہ ابتداءً بے بہرہ تھے اور اس طرح اپنے مالی و صنعتی معاملات کا خود انتظام کرنے کے قابل ہوگئے۔

عام طور سے دیکھا جائے تو جاگیردار کی نگرانی دو صورتیں اختیار کرتی تھی۔ ایک تو خدمات کا حاصل کرنا عطیہ زمین کی شرط پر جو سب کاشتکاروں کے لیے عام اور یکساں تھا۔ دوسرے تجارتی "حقوق" کے معاوضے میں واجبات کی ادائی، جو صرف شہروں کے باشندوں کے متعلق تھی۔

اور گاؤں کی طرح شہروں میں بھی خدمات کے مقابلے میں عوض خدمت کا طریق زیادہ رائج تھا۔ چنانچہ لیسٹر کے متعلق یوں مذکور ہے کہ "لیسٹر میں میرے کھیتوں کی فصل کاٹنے کے سلسلے میں میری لیسٹر کی رعایا سے سالانہ جتنے ہنس عادۃً لیے جاتے تھے"[1] لیکن یہ آزادی کم از کم ابتدا میں جاگیردار اور شہری کے باہمی سمجھوتے پر منحصر تھی۔ ہمارا تعلق صرف اس چیز سے ہے کہ شہروں نے اکائیوں کی حیثیت سے کس طرح آزادی حاصل کی۔

شہر دوہری حکومت کے تحت تھے۔ ایک حکومت تو جاگیردار کی تھی جس کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ دوسری، بادشاہ کی حکومت۔ اس صورت میں جب کہ شہر شاہی سیر پر واقع ہوتا تھا دونوں حکومتیں ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتی تھیں کیونکہ اس حالت میں بادشاہ جاگیردار بھی ہوتا تھا۔ لیکن حقوق مختلف ہوتے تھے بعض اسی شہر سے مخصوص ہوتے تھے اور جاگیردار کی جانب سے نافذ کیے جاتے تھے اور بعض ریاست کے لیے عام ہوتے تھے اور بادشاہ ان کو سب شہروں پر مساوی طور سے عاید کرتا تھا۔ خواہ جاگیردار کی واجب الوصول آمدنی اس کا داروغۂ جاگیر Bailiff اور بادشاہ کی واجب الوصول آمدنی اس کا "شریف" .Sheriff یعنی عامل وصول کرتا ہو، تشخیص محصول کے طریقے کے تعین میں شہریوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ "شریف" .Sheriff جن طریقوں سے عوام سے آمدنی وصول کرتے تھے وہ ہمیشہ غیر مقبول تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات ناواجب اور بے حد سخت ہوتے تھے۔ ہنری دوم کے عہد حکومت میں قانون تحقیقات "شریف"[2] کی رو سے ان عہدہ داروں کے

[1] دیکھو ٹامسن کی کتاب "انگریزی تاریخ بلدیہ" صفحہ ۴۰ English Municipal History.

[2] The Inquest of Sheriff 1170

حرکات و اعمال کے متعلق بہت ہی شدید تحقیقات عمل میں لائی گئی،
چنانچہ اس کا اشارہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض نے جن جن سے
دغا و فریب کیا تھا ان کو خاموش کرنے کے لیے اُن کی مٹھی گرم کی تھی۔
اس کمیشن کی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اکثر
"شریف" برطرف کردیے گئے اور ان کی بجائے ایسے لوگ مقرر کیے گئے
جو محکمۂ خزانہ سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
دیانت داری کے اعتبار سے وہ اپنے آقا کے سامنے بھی امتحان میں
پورے نہ اُترے اور ان کے ماتحتوں کو غالبًا اور بھی زیادہ شکایت
تھی۔ ایڈورڈ اول کے عہد حکومت جیسے قریبی زمانے کی ایک مثال سے
یہ واضح ہوتا ہے کہ "شریف" کسی شہر کا قافیہ کس قدر تنگ کرتے تھے۔
روجر متعینہ ایسٹرا نے کیمبرج میں فی ہائیڈ[۱] ۲ شلنگ ۶ پنس مجموعی محصول،
بظاہر تو پتھر کا پل بنانے کے لیے وصول کیا لیکن آخر میں اس نے
لکڑی کا پل تیار کیا اور اس کے علاوہ پل کی تعمیر کے زمانے میں دریا کے
پار لانے لے جانے کے لیے جس ناؤ کا اس نے انتظام کیا تھا اس کا
حد سے زیادہ کرایہ وصول کرتا رہا۔

۱۸

خواہ اہل شہر سے سخت برتاؤ کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، بادشاہ کے
عامل یعنی "شریف" Sheriff یا داروغہ جاگیر Bailiff, کی نگرانی کی
بھیانک بلا سے نجات حاصل کرنے کی خواہش بہت عام تھی۔ اور
جس طرح عوض خدمات کی صورت میں ہوتا تھا ٹھیک اسی طرح
جاگیردار کو اس آزادی کے عطا کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا
بشرطیکہ اس کا یقین ہو جائے کہ خود اس کو نقصان نہ پہنچے گا۔ یہ اطمینان کا
اور زر کا سوال تھا، خاصکر ایسے زمانے میں جبکہ بیرنوں Barons, کو
قصر تعمیر کرنے یا ارض مقدس کو مہم روانہ کرنے کے لیے زرِ نقد کی شدید

۱۔ Hide. ۱۲۰ ایکڑ زمین۔

ضرورت تھی، اگر اطمینان اور زر دستیاب ہو سکتے تو فوراً قبول کر لیے جاتے تھے۔ چنانچہ فتح نارمن کے بعد سے شہروں کی آزادی کا عمل برابر جاری رہا۔ اگر اہل شہر متمول ہوتے تو روپیہ دے کر منشور خریدا جا سکتا تھا۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو بادشاہ یا جاگیردار سے سالانہ ادائی کی شرط پر خاص حقوق حاصل کیے جا سکتے تھے۔ بہرصورت شہر کو آزادی مل جاتی تھی، چنانچہ Liber Burgus یعنی "آزاد شہر" اسی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، اگرچہ بدیہی طور سے آزادی کے مدارج مختلف ہوتے تھے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں ادائی کی ذمہ داری عام طور پر اس قدر بھاری ہوتی تھی کہ کوئی فرد واحد اس کا بار برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا بار اہل شہر پر جماعتی حیثیت سے پڑتا تھا اور اس طرح ہیئت سیاسیہ کی ذمہ داری کا تصور اور اس کے ساتھ اس ہیئت کا اقتدار رونما ہوا۔ اگر سالانہ محصولوں کی بجائے شہریوں نے یکمشت رقم ادا کر دینے کا بیڑا اٹھایا تو اس صورت میں انھیں رقم جمع کرنی پڑتی تھی۔ ہر گھر پر محصول عاید کیا جاتا تھا اور جو لوگ اس کی ادائی کر دیتے تھے ان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ قصبے میں اسکاٹ اور لاٹ Scot and Lot. ہیں۔ یعنی انھوں نے قصبے کے ذمے کی واجب الادا رقوم میں اپنا حصہ ادا کر دیا۔ انھیں اس کے صلے کے طور پر یہ سہولتیں دی گئی تھیں کہ وہ آزاد شہر قصبے کے شہری بن سکتے تھے۔ اور یہ سہولتیں حقیقی تھیں۔ شاہ جان نے ایپسوچ کو جو منشور عطا کیا اس میں اس امر کی صراحت کر دی گئی تھی کہ ہر سال معمولی لگان بہ شمول ۱۰۰ شلنگ خزانہ شاہی میں ادا کرنے کے بدلے میں شہریوں کو مختلف دوسرے قسم کے محصولوں مثلاً محصول راہداری، محصول دکان، پل کا محصول میلوں یا بازاروں کے تاجروں پر عاید کردہ محصول سے استثنا ملے گا۔ انھیں قصبے سے باہر مقدمات دائر کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان کے قدیم رسم و رواج کے مطابق

اُن کے ساتھ عدل و انصاف کیا جاتا تھا، سابق کی طرح وہ زمینوں کے
مالک رہ سکتے تھے، کسی کو وہاں خدمت انجام دینے پر مجبور نہیں
کیا جا سکتا تھا، نہ کوئی شے ان سے جبراً لی جا سکتی تھی اور وہ تاجروں کا
جتھا قائم کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ آزادی کے مفہوم میں میلے اور
بازار لگانا، تجارت کی تنظیم اور تحدید کرنا اور اپنے شہر کے عہدہ داروں کا
خود انتخاب کرنا بھی داخل تھا۔ چنانچہ اپسوچ میں اہل شہر دو داروغاؤں
Bailiffs کا انتخاب کرتے تھے تاکہ وہ قصبے کے نگہبان Provost.
کے ذمہ دارانہ عہدے کا کام انجام دیں اور شاہی خزانے میں رقوم
داخل کریں، چار مفتش مرگ Coroners. بھی اسی طرح منتخب ہو کر
مقدمات فوجداری کی سماعت کرتے تھے، اور بارہ بلدی عہدہ دار
Port Men. قصبے پر حکومت کرنے اور اس کے آزادانہ حقوق کی
نگہداشت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔

ان آزادانہ حقوق کی نگہداشت کوئی کھوکھلی اور نمائشی چیز
نہ تھی۔ شہر جس وقت تک جاگیردار کی نگرانی میں رہے ان سے معقول
آمدنی وصول ہوتی رہی۔ خواہ یکمشت رقم ایک ہی دفعہ سب کی طرف سے
ادا کر کے آزادی حاصل کی گئی ہو یا سالانہ مقررہ رقم ادا کی گئی ہو،
بہرحال زر کا کسی نہ کسی طریقے سے فراہم کرنا ضروری تھا۔ اور شہریوں کی
نظر قدرتی طور سے اسی ذریعۂ آمدنی پر پڑتی تھی جس سے جاگیردار
نفع حاصل کرتا تھا۔ یہ زیادہ تر تجارت کی تنظیم تھی اور نارمن
فتح کے بعد کی صدی میں تجارت میں بہت تیزی کے ساتھ ترقی
ہوئی۔ بر اعظم سے بہت قریبی تعلق پیدا ہو گیا، چنانچہ نارمنڈی،
پوئٹو، گیس کنی، کولون، فلینڈرز، اٹلی اور ہنزا[1] کے شہروں کے تاجر

[1] Hansa Towns. دورِ وسطیٰ میں زیادہ تر جرمنی کے تاجروں نے اپنے
تجارتی شہروں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی غرض سے ایک اتحاد یا وفاق

بڑے بڑے شہروں میں اپنے ساتھ مال تجارت یعنی شراب، مسالے، مشرقی ممالک کی اشیا اور اعلیٰ درجے کے کپڑے لاتے تھے اور سیسہ، ٹن، مچھلی، گوشت، اون، موٹے تازے مویشی اور سنگ موسیٰ خرید کر لے جاتے تھے۔ غیر ملکی دستکار خاصکر پارچہ باف اور جلاہے ملک میں آکر بس گئے، یہ شروع میں تو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے لیکن بعد میں زیادہ تر ہنری اول نے جنوبی ویلس ان کے لیے مخصوص کردیا۔ قصر اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں تو معماروں، نجاروں اور شیشہ گروں کے کاروبار نے فروغ پایا، آہنگر اور دھات کا کام کرنے والے ویلڈ ریزی کے ساتھ اسلحہ اور زرہ بکتر تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رود بار انگلستان کی دونوں جانب نارمن اور انجوی بادشاہوں کی عظیم الشان قوت، بحری قزاقوں کی بیخ کنی میں کارگر ثابت ہوئی، اور انھوں نے جس حسن انتظام سے حکومت کی اس کی وجہ سے ذرائع آمد و رفت میں بہت زیادہ سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ بیان کہ "ولیم اول کے عہد حکومت میں کوئی شخص بھی اپنی جیبیں سونے سے بھر کر بے کھٹکے پورے ملک کا سفر کر سکتا تھا" ممکن ہے کہ کسی قدر خوشنما مبالغہ معلوم ہو، لیکن وہ ایک اہم حقیقت کو ظاہر کرتا ہے یعنی یہ کہ نارمن حکومت نے اپنی عام دراز دستی اور زیادہ ستانی کے باوجود ملک میں امن و امان قایم کرکے تجارت اور آمد و رفت کی ترقی کا اتنا بڑا موقع بہم پہنچایا جس سے انگلستان رومی تسلط و قبضے کے بعد سے محروم و نابلد تھا۔

۴۳

اس ترقی پذیر تجارت کا اس طرح انتظام کرنا کہ اس سے ہر شہر کو فایدہ پہنچے، یہی شہر والوں کی پالیسی تھی اور وہ ایک عجیب و غریب

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ قایم کرلیا تھا اور اس اتحاد یا وفاق میں شرکت کرنے والے شہروں کو ہنزا شہر کہتے تھے۔ چنانچہ ہمبرگ، لوبیک اور بریمن کو اب تک ہنزا شہر کہا جاتا ہے (مترجم)

اور مخصوص پالیسی تھی۔ تجارت محض تجارت کی خاطر نہیں کی جاتی تھی، محض تجارت کو بڑھانا مقصد نہ تھا، بلکہ وہ تجارت کو محض اس غرض سے اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے کہ "اجنبیوں" کو خواہ وہ بیرون ملک سے آئیں یا دوسرے شہر سے، تجارت میں حصہ لینے سے باز رکھیں شہری اس بات کو بعید از انصاف خیال کرتا تھا کہ وہ تو شہری آزادی کے حاصل کرنے میں اپنا حصہ ادا کرے اور ایک اجنبی جس نے کچھ بھی ادا نہ کیا دخل اندازی کر کے اس کے منافع میں شریک ہو جائے جو کلیۃً اسی کا ہو سکتا تھا، اس کے بازار میں خرید و فروخت کرے اور اس کے گاہکوں کو اپنا بنائے۔ قصبے کی آزادی کو برقرار رکھنے کے معنی شہری کے خاص حقوق کی نگہداشت کے تھے جو محض اجنبی کی رقابت کے مقابلے میں اپنے واجبات جمعیت ادا کر دیتا تھا۔

انتظام تجارت اور شہر کی آزادی کی نگہداشت جس جماعت کے ذمے عاید ہوئی وہ تاجروں کا جتھا تھی۔ ایسے جتھے بارھویں اور تیرھویں صدی میں اکثر شہروں میں رونما ہوئے۔ چونکہ یہ بات مشہور ہے کہ ایسے جتھے انگلستان کے ۱۰۲ شہروں میں[۱]، ویلس کے ۳۰ شہروں اور آئرلینڈ کے ۳۸ شہروں میں موجود تھے، لہذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بہت کم ایسے اہم شہر[۲] تھے جن میں یہ جتھے موجود نہ تھے۔ تاجروں کے جتھوں کی تاسیس کے سلسلے میں جو منشور نافذ کیے گئے ان کے سب سے زیادہ عام فقرے یہی ہوتے تھے کہ "ہم یعنی (بادشاہ) جتھے کے رکن کو جتھے کی فیس داخلہ اور دوسرے محصول جو جتھے کے ذمے واجب الادا ہیں

۴۴

۱۔ ایک سو بیس[۱۲۰] انگریزی شہروں کے منجملہ بیاسی[۸۲] شہروں نے تیرھویں صدی کے ختم تک اپنی اپنی جتھے قایم کر لی تھیں۔ اگر ابتدائی تحریری یادداشتوں کو ان کی تاسیس کی تاریخ کے لگ بھگ تصور کر لیا جائے تو آئرلینڈ کی انجمنیں بہت بعد کے زمانے کی ہیں لیکن اس میں شبہ ہے۔

۲۔ صرف لندن جیسا اہم شہر ہی اس سے مستثنیٰ تھا۔

ادا کرنے پر رکنیت کا شرف عطا کرتے ہیں، پس کوئی شخص جس کا جتھے سے تعلق نہ ہو بجز اہل شہر یا جتھے کے ارکان کی منظوری کے مقررہ شہر میں تجارت نہ کر سکے گا۔" نیز یہ کہ "ہم اس طریقے سے ان اشخاص کو اور ان کے ورثا کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا زرعی غلام Villein. اسی شہر میں ساکن اور وہیں کی زمین پر قابض ہو اور جتھے کی فیس داخلہ ادا کر کے اس کا رکن بن جائے اور اپنے ذمے کے جملہ محصولات مطالبے کے بغیر یکمشت یا سالانہ ادا کر دے تو جاگیردار کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ اس کو سابقہ حیثیت میں از سر نو واپس لے سکے، بلکہ وہ اس مقررہ شہر میں آزاد رہے گا۔[1] اس آخری فقرے نے شہریوں کو خواہ وہ ابتدائی زرعی غلام ہی کیوں نہ ہوں، سابقہ مطالبات خدمت کی تجدید کی کوششوں کے مقابلے میں محفوظ کر دیا اور دوسری جانب اول الذکر فقرہ بیرونی مسابقت کے مقابلے میں ان کی محافظت کرتا تھا۔ ساوتھمپٹن کے تجارتی جتھے کی منظوری ہنری دوم نے عطا کی تھی اور اس کے قواعد و ضوابط اس امر کی نہایت ہی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں کہ اس قسم کے جتھے کس طرح عمل کرتے تھے۔ جتھا ہی ان عہدہ داروں کا انتخاب کرتا تھا جن کا صدر شریک میر بلد Alderman, ہوتا تھا، اور جتھے میں شریک ہونے والوں کے ذمے کے واجبات ان سے وصول کر کے ان عہدہ داروں کو تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔ خیرات و مبرات کے طور پر روپیہ دینا ضروری تھا اور بیمار ارکان کی تیمارداری اور مدد کی جاتی تھی۔ جب جتھے کا کوئی رکن مرتا تو دوسرے برادران شہر پر اس کے جنازے میں شرکت کرنا واجب تھا، اور اگر کوئی رکن انگلستان میں قید ہو جاتا تو شریک میر بلد Alderman, مجاز تھا کہ اگر ممکن ہو تو بہ ادائی زر اس کی بریت و رہائی حاصل کرے۔

---

[1] دیکھو گراس کی کتاب موسوم بہ Gild Merchant جلد اول صفحہ ۵۔

ان عہدہ داروں کو امن و امان قایم رکھنا پڑتا تھا۔ افترا، بہتان اور
ہتک عزت کے لیے یا جتھے کے ارکان کو مضرت و صدمہ پہنچانے کی
صورت میں سخت سزائیں تھیں۔ علاوہ ازیں جتھے کے خاص حقوق کی
نگہداشت ضروری تھی۔ کوئی شخص کسی اجنبی کو جتھے کے جلسے میں
نہیں لا سکتا تھا، اور کسی شخص کو بجز جتھے کے رکن کے اس امر کی اجازت
نہ تھی کہ وہ شہر میں مال کو فروخت کرنے کی غرض سے خریداری کرے
اور غیر رکن بجز ان ایام کے جب کہ میلے یا بازار لگتے تھے نہ تو شہد،
تیل، چمڑا، چکی کے پاٹ، یا کھاری مچھلی خرید سکتا تھا اور نہ شراب
فروخت کر سکتا تھا۔ اس کو اس کی بھی اجازت نہ تھی کہ خوردہ فروشی کے لیے
پانچ کوارٹر (یعنی ۴۰ پونڈ وزن) غلے سے زیادہ اپنے پاس رکھے۔ اجنبی
اور جتھے کا رکن مشارکت باہمی سے کاروبار نہیں کر سکتے تھے اور نہ
اجنبیوں کو اس کی اجازت تھی کہ رکن جو شے خریدنا چاہے اسے
وہ خرید لیں۔ ایک رکن دوسرے رکن سے اس کے کاروبار میں
شرکت کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اجنبیوں کی ہر اس چالبازی کے خلاف ۴۵
جس سے اہل شہر کے نفع میں کمی واقع ہو سکتی تھی قواعد و ضوابط نافذ
کیے گئے تھے۔ مچھلی اور گوشت کے بازاروں کی نگرانی عہدہ داروں کے
سپرد تھی، قصابوں کو خراب گوشت فروخت کرنے، فضلہ اور چھیچھڑے
راستے میں پھینکنے اور مکانوں کے سامنے یا سڑک پر خنزیر کو
آگ پر بھوننے کی ممانعت تھی۔ جہاز کے ذریعے سے جو مچھلی آتی تھی
اسے داروغہ Bailiff. کی اجازت کے بغیر ساحل پر اتارنے یا
فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف وہی شخص بازار میں مچھلی بیچ سکتا تھا
جس نے خود مچھلی پکڑی ہو، اور مچھلی صرف طلوع و غروب آفتاب کے درمیانی
حصے میں خریدی جا سکتی تھی۔ ایک مقررہ ساعت تک اور تاوقتیکہ اہل شہر
اشیائے خوردونوش کی خریداری سے فارغ نہ ہو جائیں حلوائی بھیڑ کے
بچے، پرندے، بھیڑی، خصی مرغ، دوسرے قسم کے پرند، تازہ پنیر،

مکھن اور انڈے ایک ہی بازار میں دوبارہ فروخت کرنے کی غرض سے
خریدنے یا ان اشیا کے بارے میں "احتکار" کی ممانعت تھی۔ یہ تمام قواعد
اور ان کے علاوہ دوسرے متعدد ضوابط جرمانے کے ذریعے سے اور بعض
صورتوں میں جب کہ قصور جتھے کے رکن سے سرزد ہوتا تھا قید اور رکنیت سے
اخراج کے ذریعے سے نافذ کیے جاتے تھے اور یہ بہت ہی سخت سزا تھی،
اس لیے کہ اس سے مجرم کی حیثیت گھٹ کر اجنبی کی سی ہو جاتی تھی۔

یوں تو مختلف تجارتی جتھوں کے قواعد میں بہت فرق و اختلاف تھا،
لیکن ان قواعد کی چند اساسی شکلوں کو جو سب میں مشترک تھیں بیان
کر دینا مناسب ہوگا۔ (۱) خیرات اور ہمسایوں کے حقوق کے قواعد،
(۲) جتھے کے جلسوں اور کاروبار کے انتظام، عہدہ داروں کے انتخاب
وغیرہ کے متعلق قواعد (۳) جتھے کے عہدہ داروں کی عملداری اور اختیارات کو
نہ صرف اس کے ارکان کے بارے میں بلکہ تجارت کی غرض سے شہر میں
ہر آنے والے کے بارے میں برقرار رکھنے کے ضوابط اور (۴) سب سے
اہم قواعد اجنبی کے مقابلے میں جتھے کے رکن شہری کے حقوق کے
تحفظ کے بارے میں تھے۔ بعض اشیا کی تجارت کرنے کی اجنبیوں کو
اجازت ہی نہ تھی، اور خوردہ فروشی کی تو قطعاً ممانعت تھی البتہ تجارت
کی غرض سے رکن کے اپنے لیے اشیا منتخب کر لینے کے بعد یا محصول راہداری
ادا کرنے کے بعد اجنبی تجارت میں حصہ لے سکتا تھا۔ اشیا کی خوبی کی
ضمانت کھلے بازار میں کاروبار کر کے دی جاتی ضروری تھی اور ہر شے کے
سوداگروں کی دکانیں مقررہ مقاموں پر ہوتی تھیں۔ اجنبیوں کو اپنی
ادائی کی قابلیت کی ضمانت پیش کرنی پڑتی تھی اور ان کی راہ میں
عام طور پر موانع قائم کیے جاتے تھے اور انھیں سہولتیں کم دی جاتی تھیں۔
صرف اکل و شرب کی حد تک ہر شخص کو کاروباری آزادی حاصل تھی، ۴۶
لیکن اسی کے ساتھ ذخیرہ کرنے کے لیے سامان خریدنے اور اس طرح
قیمت بڑھانے کی کوششیں ممنوع قرار دی گئیں تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اجنبی کی

راہ میں زیادہ سے زیادہ دقتیں اور رکاوٹیں حایل کرنا اچھا خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کو جتھے میں داخل ہونے اور تجارتی جتھوں کے ارکان کی ذمہ داریوں میں شرکت کرنے کی ترغیب ہوتی تھی اور دوسری جانب ارکان کی تعداد بڑھنے سے خزانے میں داخل کرنے کے لیے انفرادی حصہ کم ہو جاتا تھا۔

تاجروں کے جتھوں کے بارے میں دو مزید امور قابل غور رہ جاتے ہیں۔ اول یہ کہ اگرچہ ان جتھوں کی ابتدا کے متعلق کوئی عام قاعدہ پیش کرنا غیر ممکن ہے، اس لیے کہ مختلف شہروں میں جتھوں کا قیام مختلف طریقوں سے عمل میں آیا، پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ تاجروں کے جتھوں اور قصبے کی حکمران جماعت لازمی طور سے ایک ہی نہ تھی۔ چنانچہ اپسوچ میں شہر کو منشور بھی عطا کیا گیا اور تجارتی جتھے قایم کرنے کی اجازت بھی، لیکن یہ دو جدا گانہ اور مختلف چیزیں تھیں۔ اس صورت میں آزادی شہر، تاجروں کے جتھوں کے قیام سے قبل عطا کی گئی۔ لیکن عام طور پر اس کے برعکس بھی عمل ہوا چنانچہ تجارتی جتھے ایسے شہروں میں بھی سرسبز حالت میں تھے جو اصولی لحاظ سے آزاد نہ ہوئے تھے اور جہاں یا تو جاگیردار کے داروغہ عدالتوں کے صدر تھے یا جاگیردار خود یہ فیصلہ کرنے کا مدعی ہوتا تھا کہ تاجروں کے جتھے کا کون رکن ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اجنبی یا وہ اشخاص جو شہر میں مقیم نہ تھے انتخاب کے ذریعے سے اور فیس ادا کر کے رکن بن سکتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں عورتیں اور مذہبی اداروں کے ارکان بھی تاجروں کے جتھے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہ شہری نہیں بن سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص حلقۂ انتخاب کنندگان میں شامل ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا کہ تجارتی جتھے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ چنانچہ تاجروں کے جتھے کے قواعد و ضوابط میں ان کے درمیان عام طور پر فرق و امتیاز قایم کیا جاتا تھا۔ اس طرح سب سے آخر میں کوئی شخص شہر کا باشندہ تو ہو سکتا تھا، لیکن یہ ضروری نہ تھا کہ اس کو

شہری کے حقوق یا جتھے کی رکنیت بھی حاصل ہو۔ اس عنوان کی ذیل میں سب یہودی آتے تھے۔ گو یہ فرق و امتیاز ابتداءً بہت واضح اور صریح تھے لیکن پھر بھی اس کا قوی میلان تھا کہ شہر کی رکنیت اور تجارتی جتھے کی رکنیت دونوں کو ایک حیثیت میں ضم کر دیا جائے۔ ایک ہی منفردہ شخص شہر اور جتھے کے عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا، اس کے ذمے کے فرائض بھی تقریباً یکساں اور منقرر ہوتے تھے، اور ان اغراض میں گہری وابستگی ہوتی تھی چنانچہ جوں جوں تجارت میں ترقی ہوتی گئی یہ دونوں حیثیتیں عام طور پر ایک حیثیت میں ضم ہوتی گئیں۔ اور جب چودھویں اور پندرھویں صدی میں انضمام کی باضابطہ منظوریاں دی جانے لگیں تو وہ عام طور پر تجارتی جتھے ہی کو دی جاتی تھیں۔ جو اس طرح نہ صرف بظاہر بلکہ حقیقی طور پر بھی شہر کی سند یافتہ حکمران جماعت بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ تجارتی جتھا شہروں کی اجتماعی قوتوں اور خیالات کا مبدا اور منبع لازمی طور سے نہ تھا لیکن ان کی نشو و نما پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔

اس طرح تاجروں کے جتھے .Merchant Gild کے لیے منشور خریدنے کے معنی اجنبیوں اور دخل انداز ہونے والوں کے خلاف بادشاہ سے خاص حقوق حاصل کرنے کے تھے۔ لیکن بادشاہ بالعموم حق و انصاف سے کام نہیں لیتا تھا، چنانچہ ایک سے زیادہ مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اس نے حقوق یافتہ جتھے کے مقابلے میں دوسری جماعتوں کو حقوق عطا کیے۔ یہ دوسری جماعت دستکاروں کا جتھا .Craft Gild تھا اور ان غیر ملکی دستکاروں پر مشتمل تھا جو ترک وطن کر کے انگلستان آئے تھے۔ اور جنھوں نے اس نئی سرزمین میں اپنے اس اتحاد کو محفوظ و برقرار رکھا تھا جو انھوں نے اپنے وطن مالوف میں بڑے تاجروں کی چندسری حکومت کے مقابلے میں اپنی حفاظت کی غرض سے قایم کیا تھا۔ چنانچہ صرف اسی واحد صورت ہی میں دستکاروں کے جتھے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل داروں کے ساتھ مزدوروں کی عظیم الشان کشمکش میں موخر الذکر طبقے کے سب سے ابتدائی نظامات کی نمایندگی یہی جتھا کرتا تھا۔

لیکن انگلستان میں اسی قسم کی کوئی صورت حال نہ تھی۔ تاجروں
دستکاروں کے جتھے کی باہمی کشمکش کے متعلق یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ غریب دستکار،
اجارہ دار تاجر کے خصوصی حقوق سے لڑ رہا تھا۔ تاجر اس قسم کا کوئی خصوصی مفہوم
نہیں رکھتا اور اصل دار جیسی کوئی شے چودھویں صدی کے پوری طرح شروع
ہونے تک بالکل مفقود تھی[1]۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کشمکش بلاشبہ اجارے کے لیے تھی،
لیکن یہ اجارہ ملکی شہری کے لیے غیر ملکی دخل اندازی کرنے والے کے مقابلے میں
تھا۔ بادشاہ نے تاجروں کے جتھے کو اجارے کے حقوق ادا کیے تھے اور یہ اجارہ
ان شہریوں کے مقابلے میں بھی تھا جو تاجروں کے جتھے کے رکن نہ تھے۔ لیکن بادشاہ ۸۵
کا عمل ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف وہ اب اجنبیوں کی جماعتوں کی بھی حمایت
کر رہا تھا اور تاجروں کے جتھے کے حقوق کو قطعاً نظر انداز کر کے اجنبیوں سے معقول
نذرانے وصول کر رہا اور انھیں ملک میں بسنے کی اجازت دے رہا تھا۔

۱۱۳۰ء کے پائپ رول **Pipe Roll** سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لنکن،
لندن اور آکسفورڈ میں دستی پارچہ بافوں کے جتھے موجود تھے اور اس کے فوراً ہی
بعد وہ ونچسٹر اور ہیورلی میں بھی قایم ہو گئے۔ لڑائی بہت غضبناک اور طویل تھی۔
چنانچہ اس کا حال ایک کتاب موسوم بہ "شہری حقوق" **Liber Custumarum.** میں درج ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہری اجنبیوں
کو شہری حقوق حاصل کرنے سے روکنے کے لیے انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ ضمناً
یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ یہ آویزش عجیب قسم کی تھی کیونکہ تاجروں کے جتھے کے
ارکان اور شہریوں کی ابتدائی شکایت ان اجنبیوں کی مسابقت کے خلاف تھی
جو نہ تو قصبے کے ذمے کی واجب الادا رقوم خزانے میں ادا کرتے تھے اور نہ شہر کے
مصارف میں کوئی حصہ لیتے تھے۔

مسٹر میری ڈتھ اس خیال سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں اور اپنی حالیہ کتاب

---

[1] لیکن اس صورت میں بھی انگلستان میں صرف ۱۶۰ اشخاص ایسے تھے جو تجارت سے کثیر منافعہ حاصل کرتے تھے۔

"معاشی تاریخ" میں یہ استدلال کرتے ہیں کہ غالباً یہ ممکن ہے کہ صنعتی کشمکش کے عنصر کا اثر اس سے زیادہ قوی رہا ہو جتنا کہ عام طور پر اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ تصادم و آویزش کے واحد آثار صرف وہی ہیں جو پارچہ بافوں کے جتھے سے متعلق ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ محض پارچہ باف ہی تنہا وہ اجنبی تھے جن سے انگلستان روشناس ہوا، اس کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس لحاظ سے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ کپڑے کی تجارت کرنے والوں نے دراصل غیر ملکی پارچہ باف کی پیدائش دولت کی آزادی سلب کرنے کی نہیں بلکہ اس کے بازار کا رقبہ محدود کرنے کی کوشش کی، اور یہ کہ نسل کا مسئلہ دراصل اور بیچ میں پھوٹ کے معاشی سبب کی بنا پر سنگین ہو گیا تھا۔

لیکن کشمکش کے دوران میں تاجروں کے جتھے اور دستکاروں کے جتھے میں مساوی طور پر تغیر واقع ہوا۔ موخر الذکر میں پہلے کی طرح صرف غیر ملکی کاریگر ہی شامل نہ ہوتے تھے۔ غیر اجازت یافتہ جتھوں پر ۱۱۸۰ء میں جرمانہ عاید کیا گیا تھا اور ان میں سے بعض یعنی ٹاٹیز کے جتھے میں یقیناً ملکی دستکار بھی تھے۔ برخلاف اس کے جوں جوں شہر ترقی کرتے گئے اور صنعت زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی تاجروں کے جتھے کی یہ قابلیت کہ اپنے وسیع حلقۂ اقتدار میں شہری زندگی کے کثیر اور گوناگوں معاشی پہلوؤں کو شامل کر سکے گھٹتی گئی۔ پس تفصیلات فروع کی نگرانی کی غرض سے دستکاروں کے جتھے سرکاری طور سے قومی زندگی میں شریک کر لیے گئے اور ان کا تعلق بلدیوں سے منظم طور پر قایم کیا گیا اور بلدیے اور تاجروں کے جتھے اب قریب قریب بالکل ایک تھے۔ اس تغیر کا آغاز تیرھویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۲۶۱ء میں لوری مرکے دستکاروں کا جتھا لندن میں قائم ہوا اور اس کے قواعد و ضوابط سر ولیم فنز رچرڈ لندن کے اس وقت کے میر بلد اور اسی شہر کے دوسرے بیرنوں کی رضامندی و منظوری سے "مرتب کیے گئے۔ ۱۳۰۰ء میں Borons.

لندن کے جلاہوں کے جتھے نے میر بلد اور شہر کا میر بلد کے آگے سر تسلیم خم

۴۹

کر کے اپنی طویل اور تکلیف دہ آویزش کو ختم کر دیا اور ۱۳۰۳ء میں لندن
کے موچیوں نے بھی ان عہدہ داروں سے ایک معاہدہ کر کے مصالحت کر لی۔
بعینہٖ ایسا ہی عمل تمام ملک میں ظہور پذیر ہوا۔ ایکسیٹر میں موچیوں کو ہر سال
اپنے اختیارات سے دست بردار ہو کر ان کو شہر کے حکام کے سپرد کرنا
پڑتا تھا اور ان کی تجدید کے لیے جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ واضح
خاطر رہے کہ دستکاروں کے جتھے نے اس وقت اپنے قدیم دشمنوں یعنی
تاجروں کے جتھے کے سامنے سر اطاعت خم نہیں کیا تھا بلکہ حکام شہر کے
سامنے سر جھکایا تھا۔ یہ ایک دوسری مثال اس اتحاد و اتفاق کی ہے جو
ایڈورڈ اول کے دور حکومت کی امتیازی خصوصیت تھی۔ رہے تاجروں کے
جتھے تو یا تو وہ اور شہری حکومت ایک ہی ہوتے تھے یا جامع حیثیت رکھتے تھے، جن
کے اجزا مختلف دستکاروں کے جتھے ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی لندن
کے اس عجیب و غریب رواج کی کہ جو شخص سات سال تک کار آموز رہتا
تھا وہ اس کے بعد اپنی مرضی سے کسی بھی دھندے میں کام کر سکتا تھا۔
بہر نوع تاجروں کے جتھے کا تجارتی اجارہ ختم ہو گیا اور ۱۳۳۵ء کے ایک
قانون نے ملک کے اندر آزاد تجارت کی عام طور سے اجازت دے دی۔
یعنی اب غیر ملکی باشندے بھی تجارت میں بے روک ٹوک حصہ لے سکتے تھے۔

اس زمانے میں جو صورت حال پیدا ہوئی تھی وہ غالباً انگلستان کی
شہری خوشحالی کے عروج کو ظاہر کرتی ہے۔ قواعد و ضوابط تو موجود تھے لیکن
صرف اس قدر جن سے عمدہ صناعی و کاریگری اور واجبی قیمت برقرار
رہ سکے، پھر بھی وہ ایسے سخت نہ تھے جن سے پیدائش کی روک تھام ہوتی۔
ان قواعد و ضوابط کے اہم اصول حکام شہر یا تاجروں کے جتھوں کی جانب سے
جہاں کہیں وہ باقی گئے تھے مقرر کیے جاتے تھے، لیکن تفصیلات کی ترتیب
مختلف متعلقہ دستکاروں کے جتھے کے سپرد تھی۔ چنانچہ ایشلے نے صورت حال کو
"گلڈ سسٹم" یعنی پنچایتی نظام" یا "جتھے کے نظام" کے نام سے موسوم کیا ہے۔
لیکن کننگھم نے اس کو "گھریلو نظام" کا جو نام دیا ہے وہ قابل ترجیح ہے،

۵۰

اس لیے کہ وہ اس اساسی خصوصیت کی طرف متوجہ کراتا ہے کہ ایک اُستاد پیشہ صنعت کا انتظام چھوٹے پیمانے پر خود ہی اپنے گھر میں کار آموزوں اور اجیروں کی ایک محدود تعداد کی مدد سے کرتا تھا جن میں سے ہر ایک کو یہ توقع ہوتی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ خود اُستاد پیشہ بن جائیں گے اور اپنے ہی گھروں میں اپنے طور پر کام کریں گے۔

گو ہر انفرادی شہر میں امن و امان کا دور دورہ تھا پھر بھی ہر شہر کے لیے ایک حفاظتی طریق موجود تھا۔ تجارت نے قومی رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک بین البلدی تھی۔

تجارت کے ساتھ یہ طریق کس قدر عام تھا دو چیزوں کو جانچنے سے اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ بادی النظر میں اس کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی ایک تو بڑے بڑے میلوں کی موجودگی اور دوسرے قرضدار سے رقم واپس نہ مل سکنے کی صورت میں تاجروں کے اس جتھے سے قرضے کی بازیافت کا طریق جس کا قرضدار رکن ہو۔ ونچسٹر، اسٹور برج، بوسٹن، سنٹ آئیوز، سنٹ ایڈمنڈز بری اور دوسرے مقاموں کے میلے نوعیت کے لحاظ سے قومی بلکہ بین الاقوامی معلوم ہوتے ہیں۔ ونچسٹر کے میلے میں نہ صرف لندن، ساؤتھمپٹن، برسٹل اور انگلستان کے دوسرے شہروں سے بلکہ فلینڈرز، نارمنڈی اور گیس کینی سے بھی تاجر آتے تھے اور شراب، پارچہ، نمکین مچھلی، مسالوں، گوشت اور اون کی تجارت ہوتی تھی۔ پھیری والوں اور میلے اور بازار کے تاجروں کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک ہاٹ کی عدالت[1] ہوتی تھی جس میں نزاعات کا تصفیہ قانون تاجران[2] کی رُو سے کیا جاتا تھا۔ لیکن ان میلوں میں کوئی حقیقی تجارتی آزادی نہ تھی۔ ان کے قائم کرنے کے لیے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا، ان کو کھلا رکھنے میں مُدت معینہ سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا تھا، معاملات طے پانے کی صورت میں

---

[1] Court of Pie Powder.   [2] Law Merchant

واجبات کی ادائی ضروری تھی، جس شہر کے قریب میلہ لگتا تھا اس کے تجارتی جتھے کے ارکان کو خاص خاص حقوق اور مستثنیات حاصل ہوتے تھے جن سے اجنبی محروم ہوتے تھے۔ دستکاروں کے ہر طبقے کے لیے اس کی الگ جگہ مقرر کر دی جاتی تھی، آس پاس کے شہر کے دستکاروں کو میلوں میں جانے اور آخر تک وہاں رہنے پر عام طور سے مجبور کیا جاتا تھا اور خود شہر میں ہر جگہ تجارت بند کر دی جاتی تھی۔ کسی بھی مقامی شے کے لیے ہر جگہ ایک ہی مقررہ ضابطہ ہوتا تھا، تجارت غیر معمولی سرگرمی کے ساتھ ہوتی تھی اور روک تھام کی شکلیں معمولی شہری قواعد سے مختلف ہوتی تھیں لیکن شہر میں انفرادی آزادی کا جو تصور تھا اس سے زیادہ میلوں میں نہ تھا۔ ۵۱

غیر ملکی باشندے سے قرضہ واپس وصول کرنے کا جو طریقہ تھا اس سے مساوی واضح طور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت میں فرد واحد کے حقوق کس قدر ادنیٰ تھے اور کسی سند یافتہ جماعت کی رکنیت کا تصور کس قدر قوی تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریز تاجروں کو کسی دوسرے ملک کے تاجروں سے زر واپس وصول کرنے میں دقت ہوتی ہوگی، چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسی صورت میں آخری چارۂ کار یہ اختیار کیا جاتا تھا کہ تاجروں کے اس جتھے سے رقم وصول کی جاتی تھی جس کا خاطی رکن تھا، اگرچہ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جتھے کے ارکان اور تاجروں کے جتھے کے اغراض میں کس قدر گہری وابستگی تھی۔ لیکن اگر تجارت توعیت کے اعتبار سے درحقیقت قومی ہوتی تو کسی دوسرے انگریز باشندے سے معاملہ کرنے کی صورت میں تاجروں کے جتھے کی جانب رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ لیکن اس طریقے پر اکثر عمل ہوتا رہا۔ مثلاً فرض کرو کہ ساؤتھمپٹن کے کسی جتھے رکن یا شہری بھی جس کو یارک کے تاجر سے رقم واجب الوصول ہوتی تھی یا تو یارک کی تاجروں کی کے جتھے سے قرضے کی بازگشت کا مطالبہ کر سکتا تھا یا اگر ضرورت پیش آئے تو اس جتھے کے خلاف دعویٰ دائر کر سکتا تھا۔ ایسے معاملات بالعموم نقصان اٹھانے والے شخص کا شہر خود اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔

مثلاً لندن کا بلدیہ اور میر بلد اُن قرضوں کو ادا کرنے کا تقاضا جو لندن کے تاجروں کو برسٹل، فلورنس، یارمتھ، بروجس، گان یا آکسفورڈ کے تاجروں سے واجب الوصول ہوتے تھے اِن شہروں میں سے متعلقہ شہر کے حکام سے کرتے اور اس سلسلے میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اس کا خلاصہ یہی ہوتا تھا کہ اس معاملے میں انھیں اسی طرح انصاف کرنا چاہیے جس طرح خود اپنے شہریوں کے بارے میں عدل کرنے کی ان کی خواہش ہوسکتی تھی اور اسی کیساتھ یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ خاطی شہر کے تاجروں کی جو جائدادیں اس وقت لندن میں تھیں انھیں قرق کر لیا جائے گا۔ اس قسم کی کارروائی کے لابد ہونے اور جلد جلد وقوع میں آنے سے ان اختیارات اور ذمہ داریوں کی بہت ہی نمایاں مثال ملتی ہے جو شہروں کو اکائیوں کے طور پر اس زمانے کے تمام تجارتی تعلقات میں حاصل تھے۔

۵۲ شہروں کے اندرونی تجارتی و صنعتی حالات کا موجودہ زمانے کے حالات سے مقابلہ کرنے پر بہت وسیع اختلافات رونما ہوتے ہیں اس صدی کی پامال خصوصیات مثلاً، اصل، محنت، آجر اور مسابقت، اگر ان کا اطلاق تیرھویں صدی پر کیا جائے تو بالکل مہمل ہو گا۔ تیرھویں صدی میں مزدور اور آجر ایک ہی شخص تھا۔ دستکار اپنا کام ان کار آموزوں کی مدد سے انجام دیتا تھا جو وقت آنے پر خود دستکار ہو جاتے تھے۔ خوردہ فروشی کی دکان عملاً مفقود تھی اس لیے کہ ہر دستکار خود ساختہ اشیا فروخت کرتا تھا۔ فیشن میں بہت کم تغیر ہوتا تھا اور طلب مستقل تھی۔ ذخائر بڑی مقداروں میں نہ تو بنائے جاتے تھے اور نہ رکھے جاتے تھے۔ خوشنما اشیا بنا کر یا اختراع و ایجاد کے ذریعے سے رقیبوں کی گلوتراشی یا ان کے مقابلے میں مال کم قیمت پر بیچنے کی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ ایسے متمول آجر نہ تھے جو اور زیادہ متمول بننے کی کوشش کرتے۔ اس کے برعکس اہل شہر تقریباً ایک ہی مقررہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ انفرادی خوشحالی کے ذریعے سے حسد و رقابت کو مشتعل کرنے کی بجائے اپنے جتھے سے خوشگوار تعلقات

"قائم رکھیں۔ دستکار سال بھر ایک ہی مقررہ طریقے پر اور مقررہ سازوسامان سے کام کرتے تھے۔ قیمت مسابقت کی بنا پر نہیں بلکہ رواج اور قانون کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔ کسی شے کی قیمت کا واجبی ہونا ضروری تھا نہ صرف خریدار کے لیے بلکہ فروشندے کے لیے بھی اور اس کا اندازہ کرنا آج کل کے مقابلے میں اُس زمانے میں بدرجہا زیادہ آسان تھا۔ موجودہ زمانے کی مختلف النوع پیدائش کے متنوع حالات کے تحت انصاف اور واجبیت کا تصور قیمت کو متعین کرنے والے عامل کی حیثیت سے باقی نہیں رہا ہے۔ آج کل اس کی کوئی کدوکاوش نہیں کی جاتی کہ واجبی اور مناسب قیمت کیا ہے، معمولی حالات کے تحت جو قیمت پیش کی جاتی ہے اس کو مناسب تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن جس زمانے میں سب دستکار ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے تھے اور موقع ومحل کی مماثل سہولتوں کے ساتھ مماثل پیمانے پر پیدائش میں حصہ لیتے تھے اور مصارف پیدائش بھی مماثل ہوتے تھے تو مناسب وواجبی قیمت کا تعین دشوار نہ تھا۔ چنانچہ اُس زمانے کی تجارت میں ایسے اخلاق کا عمل دخل تھا جس سے ہمارا زمانہ ناآشنا ہے۔ آج کل تجارت منافی اخلاق نہیں ہے لیکن غیر اخلاقی ہے۔ قیمت کا تعین مسابقت سے اور بازار کے حالات پر منحصر ہے۔ اگرچہ تیرھویں صدی میں رائجہ خیال کا معیار غالباً اس قدر اعلیٰ نہ تھا جتنا سینٹ ٹامس اکوی ناس نے اس کو ظاہر کیا ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ خریدار کو اشیا کے نقائص بتائے بغیر ناقص اشیا فروخت کرنے یا عارضی قلت کی صورت میں اعلیٰ قیمت طلب کرنے کو مذموم قرار دیتا ہے، پھر بھی یہ رائجہ خیال فریب، مکاری، دھوکا اور چوری کے سخت خلاف تھا۔ دوسروں کی ضرورتوں سے فائدہ اُٹھانا نہ تو خریدار کے لیے جائز تھا اور نہ فروشندے کے لیے لیکن دیانتداری سے انجام دیے ہوئے کام میں جتنی محنت صرف ہو اس کا مناسب وواجبی صلہ ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

۵۳

باب ۴

خزانہ، زر اور لین دین

معاشرے کی قدیم ترین حالتوں میں زر کا مطلق استعمال نہیں کیا جاتا۔ انسان اپنی ہی محنت کی پیداوار پر زندگی بسر کرتے ہیں جس شے کی انہیں احتیاج ہوتی ہے اُسے وہ خود ہی بناتے ہیں یا اگر خود نہیں بنا سکتے تو جو لوگ اسے تیار کر سکتے ہیں ان سے بذریعۂ "جنسی مبادلت" جس کو بارٹر Barter کہا جاتا ہے حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن بجز انتہائی سادہ صورتوں کے جنسی مبادلت یا مبادلۂ اشیا کا عمل انتہائی طور سے دقت طلب ہوتا ہے۔ کسی شے کی خریداری کرنا ہو تو محض یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جائے جو مطلوبہ شے کو اپنے ہاں سے الگ کر دینے کے لیے آمادہ ہو، اور یہ یقینی ہوتا ہے کہ اگر کافی زر اس کے معاوضے میں پیش کیا جائے تو یہ شخص اس کو قبول کر لینے کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن مبادلۂ اشیا کی صورت میں صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ کسی شخص کو جو شے مطلوب ہو وہ دوسرے کے پاس موجود ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس

دوسری شے کے لینے کے لیے بھی تیار ہو جو اس کو مبادلے میں دی جارہی ہے اس طرح مبادلہ اشیا کا طریق صرف ان صورتوں کے لیے موزوں ہے جن میں انسانوں کی احتیاجات بہت ہی سادہ ہوں اور چھوٹے دائرے یا رقبے میں اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص جو اپنے ملک سے دور ہلکی اشیا فروخت کرنے کے لیے جائے وہ کبھی اس پر آمادہ نہ ہوگا کہ ان کے مبادلے میں بھاری بھرکم اور بوجھل اشیا قبول کرے، خواہ یہ اشیا اس کے لیے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں؛ اس لیے کہ ان کی نقل و حمل اس کے لیے دشوار ہو گی۔

اس طرح ان ممالک میں جہاں جنسی مبادلت یا مبادلۂ اشیا کے طریق پر عمل ہوتا ہو اور ان ممالک میں جہاں خرید و فروخت میں زر بطور آلۂ مبادلہ استعمال ہوتا ہو، واضح فرق و اختلاف موجود ہے موخر الذکر ممالک ترقی کر کے اول الذکر ممالک سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ اگرچہ (۵۴) "سادہ فطری معاشی نظام" کا "ترقی یافتہ نظام زر" میں تبدیل ہو جانا اپنے نتائج کے اعتبار سے کسی ملک کی تجارت کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، پھر بھی ممکن ہے کہ یہ عمل بہت تدریجی طریق پر رونما ہو۔ ممکن ہے کہ وہ تاجر جو تجارت کے سلسلے میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جائیں زر استعمال کریں، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کے لیے زر کے بغیر اپنی تجارت کو جاری رکھنا بالکل ناممکن ہو گا۔ ممکن ہے کہ بادشاہ اور اس کے درباری، زر استعمال کریں اور علاوہ ازیں شہروں میں بھی زر کا رواج عام ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہو سکتا ہے کہ دیہات سادہ فطری معیشت کی حالت ہی میں رہیں، اور یہاں خدمات یا جنس کی شکل میں مطالبات ادا کیے جائیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ مزدور اسی غذا پر زندگی بسر کرے جس کو وہ زمین سے حاصل کرے اور اس کے معاوضے میں اپنی خدمات دے۔ اسی طرح گاؤں میں کپڑوں، جوتوں اور آلات اور اوزار کی مرمت جیسی سیدھی سادی احتیاجات کی تکمیل بھی جنس کی ادائیگی کے ذریعے کی جا سکتی ہے، گو ممکن ہے کہ

سکّے ایسی اکائیوں کے طور پر استعمال کیے جائیں جن سے اشیا کی قدر کی پیمائش کی جاتی ہے۔ اور اس طرح زر کے افعال میں سے ایک فعل زر کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں حقیقی طور پر منتقل ہوئے بغیر پورا ہو جائے۔

ایسی حالت جب کہ کوئی ملک کچھ تو نظام زر اور کچھ سادہ فطری نظام کے تحت ہو، نارمن فتح کے زمانے میں انگلستان میں موجود تھی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے سے ملک کبھی سکے کے بغیر نہیں رہا۔ ساتویں صدی کے چاندی کے سکّے اسکٹاس Scesaltas, کینٹ، ایسیکس، اور مرسیا میں ڈھالے جاتے تھے، ان کے بعد آٹھویں صدی میں چاندی کے پنس رونما ہوئے اور جس بادشاہ کے زمانے میں وہ رائج کیے جاتے تھے اس کا نام ان پر درج ہوتا تھا۔ سیکسن قوانین میں جرمانوں اور خوں بہا کے متعلق جو متعدد قواعد تھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زر سے لوگ ناواقف نہ تھے، اور ۹۹۱ء اور مابعد سالوں میں جو محصول بنام ڈین گلڈ Danegeld عاید کیے گئے ان سے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ دسویں صدی کے اختتام سے قبل زر کبھی کبھی تمام ملک میں پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کا عام رواج لندن، ونچسٹر، اور بڑے شہروں کے تاجروں، اہل معاملہ اور باشندوں تک محدود تھا۔ جاگیری موضع میں زر سے ابتدا کوئی کام نہ لیا جاتا تھا۔ ادائی یا تو بہ شکل خدمات کی جاتی تھی یا جنس، غلہ، لکڑی مرغ اور انڈے کی شکل میں۔ جاگیر دار، جن کے پاس کئی جاگیری موضع ہوتے تھے اور خاص کر بادشاہ، جو سب سے بڑا جاگیردار ہوتا تھا، ایک مقطعے سے دوسرے مقطعے میں دورہ کرتا تھا اور باری باری سے سب کی پیداوار اپنے صرف میں لاتا تھا۔ یہی ان کی آمدنی تھی جس پر وہ گزارہ کرتے تھے۔ لیکن جب خدمات بجا لانے کے بجائے بدل خدمت کا رواج عام ہوا تو اس نے دیہاتی علاقوں میں زر کا نظام قائم کرنے کے حق میں نئے محرک کا کام کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اگرچہ بدل خدمت کا حساب زر میں کیا جاتا تھا اور اس کے باوجود بدل خدمت ہمیشہ زر کی شکل میں نہیں

۵۵

دیا جاتا تھا بلکہ کبھی کبھی بہ شکل جنس بھی دیا جاتا تھا۔ لیکن زرعی آسامیوں کی جگہ مزدور اُجرت پر حاصل کرنے کی ضرورت نے جاگیردار یا اس کے داروغہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ کچھ نہ کچھ نقد بدست رکھا جائے۔ چنانچہ اسی لیے خدمات لینے کے بجائے بدل خدمت کے طور پر زر لینے کا رواج عام ہو گیا۔ یہ واقعہ کہ نظام زر، قدیم سادہ فطری نظام کی جگہ لے رہا تھا اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاگیر کے حسابات کا رکھنا معمول بن گیا۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں انگلستان میں اس کا عام رواج شروع ہو گیا۔ اس وقت تک دیہات و اضلاع میں یا تو زر ہی موجود نہ تھا یا تھا بھی تو بہت کم، اور اسی لیے حساب کتاب رکھنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔

اگر نظام زر کے اختیار کرنے میں تاجر سب سے اول اور زمیندار و مزدور سب سے آخر تھے تو بادشاہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ بادشاہی جاگیر میں سادہ فطری نظام اتنی ہی دیر تک رائج رہا جتنی دیر تک دوسری جاگیروں میں رہا۔ لیکن بادشاہ محض جاگیردار ہی نہیں ہوتا تھا، اس کی آمدنی کے دوسرے ذرایع بھی تھے وہ اپنی سلطنت میں درآمدی و برآمدی اشیا پر محصول، قانون شکنی کی پاداش میں جرمانے، اور شہروں کے آزادی خرید کرنے کی صورت میں ان سے خراج، اور حسب موقع ڈین گلڈ بدل خدمت اور پل واری محصول وصول کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ حتی الامکان اندوختہ اکھٹا اور اس میں اضافہ کرنا شاہی فرائض میں داخل تھے۔ عام جاگیروں میں حساب کتاب رکھنے کی ضرورت پیش آنے سے قبل ہی تذکرہ بالا آمدنیوں کی وجہ سے شاہی معاملات کا حساب کتاب ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ خزانہ شاہی مداخل کا حساب رکھتا تھا۔

Curia Regis. مجلس شاہی، Exchequer. خزانہ شاہی

کا ایک شعبہ تھا۔ مجلس شاہی کا صدر بادشاہ ہوتا تھا اور عدل و مالیہ کا انتظام بلاتفریق اسی جماعت کے تفویض تھا۔ لیکن چونکہ ایک جماعت کیلیئے

۵۶

ان سب فرائض کا کما حقہ انجام دینا ناممکن تھا، لہذا امرور زمانہ اور اضافۂ کاروبار کے ساتھ ساتھ مجلس کا کام تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے پہلی تفریق عدالتی و مالی معاملات میں رونما ہوئی، اور اسی مالی شعبے نے ترقی کر کے کورٹ آف دی اکسچکر .Court of the Exchequer یعنی محکمۂ خزانہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی ابتدائی سرگزشت بیان کرنا غیر ضروری ہے لیکن ہمیں صرف محکمے پر اور اس کے زمانے کے کام کے طریقوں پر نظر کرنی چاہیے جب کہ اس کا انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی میں زیادہ سہولت ہے اس لیے کہ لندن کے اسقف رچرڈ فٹز نیگل کی تصنیف موسوم بہ .Dialogus De Seaccario میں خزانے اور اس کے عہدہ داروں کے متعلق مفصل حال درج ملتا ہے۔

ہنری دوم کے عہد حکومت میں خزانہ ویسٹ منسٹر میں مستقل بنیاد پر قائم کر دیا گیا تھا، اس لیے کہ اس کے کاروبار کے لیے جو کاغذات، پیٹی، ہنر، شمار تختیاں اور حکمنامے درکار تھے ان کے بھاری اور بوجھل ہونے کی وجہ سے خزانے کو بادشاہ کے دوروں میں ساتھ ساتھ رہنا مشکل تھا۔ اس محکمے کے افسر کو صدر اعظم Justiciar کہتے تھے جو مالی اور عدالتی معاملات میں بادشاہ کا نائب تھا۔ لیکن برائے نام نگرانی کے سوا اس کے فرایض بہت ہی کم تھے۔ وہ اکثر غیر حاضر رہتا تھا، اور حقیقی نگرانی اور معاملات کی دیکھ بھال خزانچی کے سر عاید ہوتی تھی۔ خزانچی کے محرر کے پاس ایک فرد یا یادداشت ہوتی تھی جس میں تمام محاصل و مخارج کا حساب درج ہوتا تھا۔ چانسلر یا وزیر خزانہ شاہی مہر کا محافظ ہوتا تھا، اور اسکے محرر کے پاس فرد حساب کا ایک مثنیٰ ہوتا تھا، جس سے خزانچی کے حسابات کی صحت کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ شاہی بخشی .Constable خزانے سے شاہی عہدہ داروں کو تنخواہیں ادا کرتا تھا، اور میر دربار .Marshall کے تفویض حکمنامے اور حساب پٹیاں یا شمار تختیاں ہوتی تھیں۔ یہی بڑے عہدہ دار تھے، اور

ان کا تعلق خزانہ اعلیٰ[1] یا صیغہ حسابات سے ہوتا تھا۔ خزانہ ادنیٰ Lower Exchepuer. یا شعبہ داخل میں کم اہم اور ادنیٰ عہدہ داروں کا ایک مستقل عملہ ہوتا تھا، مثلاً چانسلر (وزیر خزانہ) کا کاتب یا محرر، آنکنے والا Assayer. حساب پٹی کا ٹنے والا Cutter of the Tallies نقیب Ushers, نائبان عرض بیگی Deputy. Chamberlam. وغیرہ۔ خزانے میں جس طریقے پر زر کا لین دین اور حساب کیا جاتا تھا اس کو بیان کرنے سے بیشتر اُن مشکلات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کو دور کرنا پڑتا تھا اور یہ یقیناً ایسی مشکلات تھیں جو اب موجود نہیں ہیں۔ آج کل لکھنے، پڑھنے اور جمع و تفریق کے ہنر اور فن سے اس درجہ واقفیت بڑھ گئی ہے کہ یہ تصور بہ مشکل کیا جا سکتا ہے کہ زر اور حسابات کا انتظام ان کے علم کے بغیر کس طرح ممکن ہے۔ مزید براں تحریری رسید کو نہ صرف اطمینان بخش سمجھا جاتا ہے بلکہ اطمینان بخش ہونے کی حیثیت سے قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔ اور آخر میں یہ کہ ہمارے زمانے کا سکہ قدر عرفی رکھتا ہے۔ لیکن تیرھویں صدی میں صورت حال اس سے مختلف تھی۔ اس میں شک نہیں کہ خزانے کے عہدہ دار کافی اچھی طرح لکھ پڑھ سکتے تھے اور جمع و تفریق کر سکتے تھے۔ لیکن سب "شریفوں" اور بادشاہ کے تمام دین داروں کے بارے میں جو وہاں زر ادا کرنے آتے تھے ایسا نہیں خیال کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو اعداد اطمینان بخش مانے جاتے تھے اور نہ تحریری رسائید قابل قبول خیال کیے جاتے تھے۔ اور سکے، نہ صرف وزن بلکہ کھرے پن کے لحاظ سے بھی عام طور پر ناقص ہوتے تھے۔ ان تمام معاملات کا حساب ایسے طریقے پر کرنے کی ضرورت تھی جو موجودہ طریقے سے بہت مختلف تھا۔ دو مسائل حل طلب تھے، ایک تو یہ کہ اعداد کا استعمال کیے بغیر حسابات کس طرح مرتب کیے جائیں کہ عینی مشاہدے پر

[1] Upper Exchequer یا خزانہ اعلیٰ۔

صاف سمجھ میں آئیں، اور دوسرے یہ کہ اس کا کس طرح اطمینان کیا جائے
کہ کئی طرح کے سکوں کی بہت بڑی تعداد میں سے جن کا وزن اور
کھرے پن کا معیار مختلف ہوتا تھا، بادشاہ کو واجبی رقم وصول ہوئی۔
خزانے میں ہر سال دو بڑے اجلاس ہوتے تھے، ایک ایسٹر Easter.
کے موقع پر، دوسرا مائیکل مس Michaelmas,
کے زمانے میں۔ ایسٹر کے موقع پر "شریف" حاضر ہو کر اس رقم کا کم و بیش
نصف حصہ ادا کرتے تھے جس کے ادا کرنے کی وہ توقع کرتے تھے یعنی
شائر (ضلع) کا میعادی لگان، جو نہ صرف شاہی زمینوں کے منافع پر
بلکہ ایسی زمینوں کے منافع پر مشتمل ہوتا تھا جو بہ شکل قرقی یا بہ تحفظ حق استرداد
عارضی طور سے بادشاہ کی نگرانی میں ہوتے تھے؛ ایسے شہروں کا میعادی
لگان جو شاہی نگرانی میں تھے اور جنھوں نے سند شاہی نہیں خریدی
تھی؛ راستوں کے محصول اور بازاروں کی آمدنی، لا دعویٰ دفینوں،
راندگان قانون اور سنگین مجرموں کے مال و اسباب کی شکل میں آمدنی؛
خلاف ورزی قانون کے جرمانے؛ باقاعدہ جاگیری لگان اور قرضہ ہائے تقاوی
اور دوسرے جاگیری واجبات؛ اور موقع کے وقت کے لحاظ سے بدل خدمت
محصول ہل واری محصول سپرداری محصول وغیرہ کی آمدنی۔ مائیکل مس کے
زمانے میں "شریف" اپنے ذمے کی کل واجب الادا رقوم کا حساب
پیش کرتے تھے اور بقایا پورا ادا کر دیا کرتے تھے۔ خزانۂ اعلیٰ میں
حساب پیش کیا جاتا تھا، اور خزانہ ادنیٰ میں رقوم داخل کی جاتی تھیں۔
چنانچہ مائیکل مس کے زمانے میں جملہ عہدہ دار ایکسیچکر (خزانے) کی میز کے
گرد اکٹھے بیٹھتے تھے۔ صدر اعظم Justiciar. اگر حاضر رہتا تو
اس جلسے کی صدارت کرتا، خزانچی اور اس کا محرر، وزیر خزانہ اور اس کا نائب،
اور دوسرے ذیلی عہدہ دار بہ شمول شمار کنندہ Calculator. بھی حاضر
رہتے اور "شریف" اور رقوم ادا کرنے والے میز سے الگ کھڑے ہوتے
تھے۔ میز کا طول دس فٹ اور عرض پانچ فٹ ہوتا تھا، اس پر ایک سیاہ کپڑا

۵۸

بچھایا جاتا تھا اور اس کو عرضاً سفید کھریا کے نشانوں یا چھڑیوں سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ ان مختلف خانوں یا قطاروں میں مختلف رقوم یعنی پنس، شلنگ، پونڈ، بیسیوں، سینکڑوں اور ہزاروں پونڈ کا حساب ہوتا تھا۔ ان کا سلسلہ محاسب کے داہنے ہاتھ کی جانب سے شروع ہوتا تھا اور میز پر صدر نشین کے بائیں جانب شمار کنندہ کی نشست ہوتی تھی۔ اس کی تفصیل میں پڑے بغیر کہ نقلی سکے یا شمار کے بلّے کس طرح جوڑے جاتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ چھ خانوں میں سے ہر ایک میں جو بلّہ ہوتا تھا وہ ۱۱۲۱ پونڈ اشلنگ اپنس کی نمایندگی کرتا تھا[۱]۔ اس طرح شمار کنندہ اوپر کی قطار میں دین وار کے ذمے کی واجب الادا رقم دکھاتا تھا۔ اس کے بعد "شریف" یا اس کی طرف سے حساب پیش کرنے والا طلب کیا جاتا تھا اور نیچے کی قطاروں میں ان رقموں کا شمار رکھا جاتا تھا جو "شریف" نے ایسٹر کے موقع پر نقد ادا کیں تھیں، جو اس کو مختلف عنوانوں کے تحت وصول ہوئی تھیں اور جن کو اس نے بحکم بادشاہ خرچ کیا تھا۔ جب سب بلّے عہدہ داران خزانہ اور "شریف" کے سامنے شمار کنندہ جوڑ کر رکھ دیتا تھا تو تمام مالی کیفیت آئینہ ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد شمار کنندہ کے ذمے یہ کام باقی رہ جاتا تھا کہ گردوں یا بلوں کی ایک ایک جوڑ الگ کرے، یعنی بادشاہ کے بلوں میں سے ایک اور "شریف" کے بلوں میں سے ایک پنس شلنگ پونڈ، سینکڑے کو یا جو کچھ شمار موجود ہو اس کو جوڑ کر خانوں سے ہٹائے۔ اس سے زیادہ تفریق کے عمل کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اگر میز پر کوئی گردہ باقی نہ رہا تو "شریف" بری الذمہ اور اس کا حساب بے باق ہو جاتا تھا۔ اگر بادشاہ کے بلّے اٹھ گئے اور "شریف" کے کچھ بلے

۵۹

[۱] غالباً اس کی توضیح کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا رقم میں ۲ کے عدد کی موجودگی کا باعث یہ واقعہ ہے کہ سینکڑوں اور اکائیوں کے درمیان جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے دہائی کی قطار نہیں تھی بلکہ بیسی کی قطار تھی۔

بچ رہے تو اتنی رقم "شریف" کو واجب الوصول قرار دی جاتی تھی؛ یا اگر، جیسا کہ عام طور سے ہوتا تھا "شریف" کے سب بلے ختم ہو جاتے اور بادشاہ کے کچھ بلے باقی رہ جاتے تو یہ اس رقم کو ظاہر کرتے تھے جو "شریف" کے ذمے واجب الادا باقی رہتی تھی۔ اس میں ذرہ بھی غلطی کا امکان نہ تھا۔ بے لکھے پڑھے آدمی کے لیے نہ تو حساب کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی اور نہ عددوں کو جوڑنے کی۔ صرف اتنی قابلیت کا موجود ہونا ضروری تھا کہ میز پر رکھے ہوئے بلوں کو شمار کر کے رقموں کا حساب کر لیا جائے۔ اس طرح ان ہی بلوں یا نقلی سکوں[1] سے ایکچر (خزانے) کا نام اخذ کیا گیا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ زر ادا کرنے کا کیا طریقہ تھا، کیونکہ اب تک "بلوں کے کھیل" .Ludus Scaccorum یا حسابی شطرنج سے جو خزانے کی میز پر کھیلی جاتی تھی، ہمیں صرف یہ معلوم ہوا کہ "شریف" کے ذمے کتنا زر واجب الادا ہے۔ لیکن اس طریقے کو بیان کرنے سے پیشتر اس کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ رسید کی کونسی شکل استعمال کیجاتی تھی۔ یہ تو بیان ہو چکا ہے کہ "شریف" کا یہ معمول تھا کہ محاصل کی تخمیناً نصف رقم ایسٹر کے موقع پر ادا کر دیا کرتا تھا اور یہ کہ اس رقم کو مائیکلمس کے زمانے کے حساب میں محسوب کر لیا جاتا تھا۔ رسید یا وصول یابی کی جو بیجک استعمال کی جاتی تھی اس کو حساب پٹی یا شمار تختی .Tally کہتے تھے۔ یہ بید مجنون کے درخت یا ایک مغزدار پھل والے بھورے درخت (Hazel) "ہیزل" کی تقریباً آٹھ انچ لمبی شاخ یا بید ہوتی تھی جس پر ادا کردہ رقم کا اندراج چاقو سے کھرچ کر کیا جاتا تھا۔ ایک جانب بڑی اور اصل رقم اور دوسری جانب چھوٹی رقمیں اور ان کے کسور مقررہ نشانوں کی شکل میں درج کیے جاتے تھے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ

---

[1] جرمن لفظ .Schach کے معنی نقلی یا مصنوعی شے ہیں۔

حساب پٹی پر ۱۲۶۱ پاؤنڈ ۴ شلنگ ۵ پنس کی رسید درج[1] کرنا ہو تو ایک ہزار کو ظاہر کرنے کے لیے پٹی کے ایک جانب انسان کی ہتھیلی کے برابر چوڑا نشان یا دندانہ بنایا جاتا تھا۔ پھر دوسری جانب ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر چوڑے دو نشان بنائے جاتے تھے جس سے دو سو کا اظہار مقصود تھا، چھوٹی انگلی کے عرض کے مساوی تین دندانے بنائے جاتے تھے جو تین بیس یعنی ساٹھ کی نمایندگی کرتے تھے۔ ایک دندانہ ایک جو کے برابر ایک پاؤنڈ کو ظاہر کرنے کے لیے بنایا جاتا تھا، چار باریک دندانے چار شلنگ کے لیے اور پانچ شوشے سیاہی سے پانچ پنس کے لیے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بعد حساب پٹی کو دو ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا کہ اس کے دونوں جانب کے دندانے بیچوں بیچ میں سے کٹیں۔ ان دو ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا "شریف" کو دیا جاتا تھا اور دوسرا خزانے میں رہتا تھا۔ یہ یقینی اور قطعی طور سے ایک نہایت مکمل رسید ہوتی تھی، اس لیے کہ فریقین میں سے کوئی بھی اس کو باطل نہیں کر سکتا تھا۔ دندانوں کو مٹایا نہیں جا سکتا تھا اور اگر کسی نشان کا اضافہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی تو دونوں نصف حصوں کو ملانے سے فریب و دغا کا حال فوراً کھل سکتا تھا۔ چنانچہ "شریف" ایسٹر کے موقع پر اپنی جمع کردہ رقم ادا کرتا تھا تو اس کے لیے ایک حساب پٹی ملتی تھی۔ مائیکل مس کے زمانے میں جب اس چوبی رسید کو پیش کیا جاتا تو اس کا مقابلہ اس مثنیٰ سے کیا جاتا جو خزانے میں رہتا تھا۔ اگر دونوں میں مطابقت ہوئی اور تقابل ٹھیک نکلا تو عامل کے حساب میں مندرجہ رقم محسوب کر لی جاتی۔[2]

۶۰

[1] ۔ بڑی رقم مثال کی غرض سے لی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ "شریف" بہر طور اس مقدار کے لگ بھگ کوئی رقم عام طور پر ادا کرتا تھا۔

[2] ۔ خزانے میں حساب پٹیوں کا استعمال موجودہ صدی کے آغاز جیسے قریبی زمانے تک بھی

حساب مکمل ہو جانے کے بعد ادائی کی جانب متوجہ ہونا باقی رہ جاتا تھا اور اس کے لیے ہمیں خزانہ اعلیٰ سے خزانہ ادنیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اگرچہ ہم پاؤنڈ اور شلنگ کا ذکر کرتے آئے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محض حسابی اصطلاحیں تھیں۔ صرف چاندی کی پینی ہی وہ واحد انگریزی سکہ تھا جو گردش میں تھا۔ چاندی کے گول (یعنی سکوک) ہاف پینی اور فارتھنگ تیرھویں صدی سے پیشتر رائج ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک محض چاندی کی پینی کو توڑ کر ٹکڑوں سے ہاف پینی اور فارتھنگ کا کام لیا جاتا تھا۔ ہنری سوم نے سونے کا سکہ رائج کیا، لیکن وہ در اصل بہت کمیاب تھا۔ ایڈورڈ سوم کے عہد حکومت تک سونے کے سکے (نوبل[1]) نے رواج نہیں پایا، اور جاری کیے جانے کے بعد بھی اس کا رواج بہت عام نہ تھا۔ ہنری ہفتم نے سب سے اول شلنگ اور پاؤنڈ رائج کیے۔ اس وقت تک محض چاندی کی پینیاں موجود تھیں جن کے ذریعے سے "شریف" محاصل خزانے میں داخل کرتے تھے۔ بحیثیت مجموعی انگریز بادشاہوں کا دامن سکوں میں آمیزش کرنے یا ان کی مخشوش کرنے یا کم وزن سکے جاری کرنے کے بدنما داغ سے پاک رہا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ کھرے پن کا معیار یعنی گیارہ اونس دو پینی ویٹ وزنی چاندی میں اٹھارہ پینی ویٹ کی کھوٹ کا تناسب ہنری ہشتم کے عہد حکومت تک برقرار رکھا گیا اور اگرچہ وزن کا معیار ایڈورڈ سوم نے اپنے عہد میں کسی حد تک گھٹا دیا تھا۔ لیکن ہنری ہشتم کے زمانۂ حکومت تک اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہ ہوئی یہاں تک کہ خود

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہوتا رہا۔ اور فرانس کے اضلاع شلاً لوڈین میں اب بھی ان کو بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ یعنی فروخت کردہ ہر روٹی کے لیے لکڑی پر ایک نشان کھینچ دیا جاتا ہے اور اس کے دو ٹکڑے کر کے آدھا گاہک کو دیا جاتا ہے اور باقی نصف آدھا دکان میں رہتا ہے۔

[1] Noble

ہنری ہشتم نے نہ صرف وزن میں بلکہ کھرے پن کے معیار میں بھی معتدبہ کمی کردی لیکن یہ یکسانی صرف شاہی زر کے بارے میں صادق آتی ہے۔ اسٹیفن کے غیر منتظم عہد حکومت میں یہ بے ضابطگی پائی جاتی تھی کہ بیرن بھی عام طور سے سکے ڈھالا کرتے تھے، اور اگرچہ ہنری دوم نے یہ طریقہ موقوف کردیا لیکن وہ ان خراب بینوں کو واپس نہ لے سکا جو گردش میں تھیں۔ علاوہ ازیں سکوں کو گھس کر اور ان کا کچھ حصہ کھرچ یا تراش کر بھی ان کو بگاڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چونکہ سکوں کے ارد گرد باریک اور یکساں خط ابھرے ہوئے نہ ہوتے تھے، اور سب سکے ہمیشہ ایک ہی ناپ اور وہازت کے بھی نہ تھے اس لیے افشا کے خطرے کے بغیر سکے سے چاندی کھرچ کر یا کتر کر نکال لینا ممکن تھا۔ یا بعض لوگ سکوں کو گھس کر برادہ نکال لیتے تھے اور تھیلی میں سب کو ملا کر اس طرح ہلاتے تھے کہ ان کا وزن گھٹ جاتا تھا۔ سکے چونکہ نہایت بھونڈے طریقے سے بنائے جاتے تھے یعنی ایک چوبی ٹھپے پر وہ جمائے جاتے تھے اور دوسرے چوبی ٹھپے کو اس پر رکھ کر ٹھونکا جاتا تھا، لہٰذا جعلی سکے ڈھالنا آسان اور پُر منفعت تھا اور اگر ہم ہنری اول کی اس کارروائی سے اندازہ لگائیں کہ انگلستان میں کسی سکہ ساز یا ساہوکار کو مکروفریب کی یہ سزا دی جاتی تھی کہ اس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا تھا تو یہ معلوم ہوگا کہ شاہی سکہ سازی میں بھی بادشاہ کے احکام کے باوجود ملاوٹ کرنے کا خطرہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت تک انگلستان میں کئی مقاموں پر سکے ڈھالے جاتے تھے اس وقت تک سکہ سازی کی پوری طرح نگرانی بہت ہی دشوار تھی۔ اور پھر بھی یہ ضروری تھا کہ کئی ٹکسالیں ہوں کیونکہ کئی ٹکسالیں نہ ہوتیں تو ملک میں زر کی تقسیم اچھی طرح نہ ہوسکتی اور بادشاہ کو واجبات اور محاصل بہ شکل زر وصول کرنے میں بہت دقتیں پیش آتیں۔ اس طرح تیرھویں صدی کے آغاز میں لنڈن، کنٹربری، کارلایل، چچسٹر، ڈرہم، سنٹ آیڈمنڈزبری، اکیسٹر، اسویچ لنکن

لن، نارتھمپٹن، نارووچ، آکسفورڈ، راچسٹر، اور ونچسٹر میں سکے ڈھالے جاتے تھے[۱]۔ گو اس امر کی کوشش کی گئی کہ ہر ایک دارالضرب ایک ہی طرح کا سانچہ یا ٹھپا استعمال کرے پھر بھی خود ٹھپے کی ناقص ساخت کامل یکسانی پیدا کرنے میں مانع تھی۔ علاوہ ازیں اگر ہم یہ ذہن نشین رکھیں کہ چاندی کا سکہ زمانہ دراز تک استعمال میں رہے تو وہ بہت جلد فرسودہ ہو جاتا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ہلکے سکوں کی بہت بڑی تعداد اور عام طور پر کھوٹے سکوں کی خاصی تعداد ہمیشہ گردش میں رہتی تھی۔

اس طرح اس امر کی نگہداشت ضروری ہو گئی کہ کہیں بادشاہ کو ہلکے اور کھوٹے سکے نہ ادا کیے جائیں اور اس طریقے سے بادشاہ کا نقصان ہو۔ اگر گنتی کے ذریعے سے ادائی کرنے کی اجازت دی جاتی اور پینیوں کی شکل میں مطالبات وصول کیے جاتے تو اس کے معنی خراب سکوں کو قبول کرنے کے تھے، دوسری طرف ظاہر ہے کہ ہر پینی کا معائنہ کرنا غیر ممکن تھا۔ اسی وجہ سے پہلی احتیاطی تدبیر یہ تھی کہ قرضداروں سے ہر پاؤنڈ کے ساتھ چھ پنس زائد وصول کیے جائیں تاکہ اس طرح وزن کی مفروضہ کمی پوری ہو جائے۔ اس قسم کی زائد ادائی کو "ادائی بہ لحاظ تعداد" Ad Scalam کہتے تھے۔ لیکن یہ طریقہ کافی اور کارگر ثابت نہ ہوا، چنانچہ دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ ہر گنے ہوئے پاؤنڈ کو تولا جاتا تھا اور قرضداروں یا زرسنداروں سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ کمی کو پورا کریں یا اس کے معاوضے میں ان سے فی پاؤنڈ ایک شلنگ تلافی کے طور پر قبول کر لی جاتی تھی۔ اس قسم کی ادائی کو "ادائی بہ لحاظ وزن" Ad Pensum. کہتے تھے۔ ہلکے سکوں کے مقابلے میں یہ احتیاطی تدبیر کارگر تھی۔ لیکن سچ پوچھو تو کھوٹے سکوں کی حد تک یہ طریقہ

۶۲

---

[۱] دیکھو ایشلے کی کتاب معاشی تاریخ Economic History. جلد اول حصہ اول صفحہ ۱۶۳۔

پوری طرح محفوظ ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ ہنری اول کے عہد حکومت میں سالس بری
کے ایک باشندے روجر نے زر کو پرکھنے یعنی اس کو پگھلا کر اس کے
کھرے پن کو جانچنے کی ایک نئی تجویز پیش کی۔ جب کوئی رقم ادا کی جاتی
تو موصولہ رقم کے انبار میں سے ۴۴ شلنگ کی قیمت کے سکے اٹکل سے
چن لیے جاتے تھے اور ان کو تول کر پرکھنے والے کے حوالے کیا جاتا تھا۔
چنانچہ پرکھنے والا اس میں سے ایک پاؤنڈ کے وزن کے سکے نکال لیتا
تھا۔ اور "شریفوں" اور خود اپنے ماتحتوں کے سامنے ان کو پرکھنے کے لیے
بھٹی پر چڑھا دیتا تھا۔ سکے گلائے جاتے تھے اور ان کی کثافت اوپر
سے الگ کر لی جاتی تھی یہاں تک کہ صرف خالص چاندی باقی رہ جاتی
تھی۔ جس وقت تک اس پگھلے ہوئے مادے کی سطح دھندلی رہتی اس وقت تک
میل کچیل باقی رہتا، لیکن اس زنگ کے نکل جانے کے بعد سطح اجلی اور
آئینے کی طرح صاف ہو جاتی اور صرف چاندی باقی رہ جاتی۔ دونوں
جماعتیں اس عمل کا بغور معائنہ کرتی رہتی تھیں "شریف" کو یہ تردد ہوتا تھا
کہ کہیں چاندی ضایع نہ جائے اور خزانے کے عہدہ داروں کو یہ فکر ہوتی
تھی کہ پوری کثافت اچھی طرح دور ہو جائے۔ پرکھنے والے کا مقصد و مفاد یہ
ہوتا تھا کہ پوری صحت کے ساتھ یہ کام انجام دے، اس لیے کہ اگر کوئی فریق
اس کے امتحان یا فرق سے اپنا عدم اطمینان ظاہر کرتا یا اس کو غلط
ٹھیراتا تو پرکھنے والے کو یہ عمل دوسری مرتبہ انجام دینا پڑتا جس کے لیے
اس کو کوئی محنتانہ نہ ملتا تھا۔ غرض جب یہ کام ختم ہو جاتا تو دھات کو تولا
جاتا اور اگر اس کا وزن مقررہ معیار سے کم ہوتا تو "شریف" کو اس
کمی کو پورا کرنے اور پلہ جھکا دینے کے لیے جنس کی کافی مقدار ڈالنی
پڑتی تھی۔ یہ جنس شمار کر لیے جاتے تھے اور تصفیہ یا کھر پائی کے لیے ۶۳
"شریف" کو اپنے داخل کردہ جمع میعادی لگان کے ہر پاونڈ پر چھپنیوں
کی اتنی تعداد ادا کرنی پڑتی تھی۔
غرض اس طریقے پر بادشاہ کے حاصل "شریفوں" اور محاصلوں سے

اور اڈورڈ اول کے دور حکومت میں محصول ادا کرنے والوں سے وصول اور جمع کیے جاتے تھے۔ خزانے کی دھاری دار میز پر رقم کا شمار کرنے اور زر کی جانچ اور پرکھ مکمل ہو جانے کے بعد زر شاہی خزانے میں جمع کر دیا جاتا تھا اور اس کا حساب خزانچی کا محرر مرتب کر کے فرد کلاں Great or Pipe Roll. میں رکھ دیتا تھا۔ جب یہ طریقہ ایک دفعہ نافذ ہو گیا تو ظاہر ہے کہ زر کا نظام تمام ملک میں سادہ فطری نظام کی بہت جلد جگہ لے سکتا تھا۔ ہنری اول اور ہنری دوم کے عہد حکومت کے درمیان جو عبوری دور ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ رچرڈ فٹز نیگل موخر الذکر عہد کے مورخ نے بوڑھے لوگوں سے جو باتیں ایام قدیم کے متعلق سنی تھیں انہیں تحریر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ جہاں کہیں دربار جاتا وہاں کی سڑکیں مویشیوں کے گلوں اور لدے ہوئے چھکڑوں سے بھر جاتی تھیں اور یہ کہ ایک زمانے میں شاہی محاصل کے طور پر گیہوں، گوشت، اور چارہ بھی داخل کیا جاتا تھا اور ان کی قیمت زر کے حوالے سے محسوب ہوتی تھی یعنی ایک سو آدمیوں کی خوراک کے مساوی گیہوں کے لیے ایک شلنگ، ایک دنبہ یا بھیڑ کے لیے چار پنس، اور بیس گھوڑوں کے چارے کے لیے چار پنس۔ تیس خود فٹز نیگل کے زمانے میں سپاہیوں کو مہم پر دور بھیجنے کے لیے تنخواہ دینا ضروری تھا اور زر ادا کرنے میں روز افزوں زیادہ سہولت محسوس ہوتی گئی، اور یہی حالات کامل تغیر کا پیش خیمہ بن گئے۔ چنانچہ "شریف" کا حساب کتاب بہ شکل زر انجام پانے لگا اور اسی کے ساتھ وہ محاصل بہ شکلِ زر وصول اور ادا کرنے لگا۔

باب ۵

انگلستان تین اڈورڈوں کے تحت قومی اتحاد اور تجارتی پالیسی

اب تک تجارت کی بین البلدی حیثیت و حالت بیان ہوئی۔ ۶۴
اگر تیرھویں صدی کے اوائل کے کسی شہری سے یہ بیان کرنے کو کہا جاتا کہ تجارت کی کونسی حالت مثالی ہو سکتی ہے تو وہ یوں کہتا کہ اس کے شہر کے ذمے جو رقمیں خزانۂ شاہی کو واجب الادا ہوں وہ معقول حد تک کم ہوں؛ خود شہر کا انتظام بہت ہی عمدہ ہونا چاہیے، اور اس کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہیے؛ جو لوگ اس شہر میں تجارت کرنا چاہیں انھیں تاجروں کے جتھے کا رکن بننا چاہیے؛ اسی طرح دستکاروں کو بھی دستکاروں کے جتھے میں شامل کرنا چاہیے؛ اور ہر جتھے کے قاعدے اور ضابطے ایسے مرتب کرنے چاہئیں جن سے شہر کو فائدہ پہنچے؛ اجنبیوں اور پردیسیوں کو تجارتی مال افراط کے ساتھ لانے کی آزادی ہونی چاہیے جو صرف شہریوں کے ہاتھ فروخت کیا جائے؛

کسی پردیسی[۱] کو اس کی اجازت نہ ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے پردیسیوں کے ہاتھ بجز میلوں کے زمانے کے مال فروخت کرے یا کسی بہانے سے خوردہ فروشی کرے؛ جس وقت تک وہ شہر میں ٹھیرے کسی شہری کے ساتھ مقیم رہے تاکہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے، اس کو یہ ہدایت کرنی چاہیے کہ اپنا مال جلد جلد فروخت نہ کرے اور اعلیٰ قیمت ملنے کی امید میں مال روک رکھنے کی ممانعت ہونی چاہیے؛ اس سے یہ توقع کیجائے کہ وہ شہریوں سے وصول شدہ زر سے شہریوں کا مال خریدے گا اور خریدنے کے بعد پھر چلا جائے گا۔ تیرھویں صدی کا یہ شہری یہ بھی تسلیم کرے گا کہ آسان اور محفوظ بحری اور بری آمدورفت کا ذریعہ اچھی چیز تھی اور کہ یہ کہ عمدہ زر اور یکساں اوزان اور پیمانے تجارت کو ترقی دے سکتے تھے اور محصولوں کی زیادتی اس میں رکاوٹ پیدا کر سکتی تھی لیکن وہ یہ بھی کہے گا کہ ان معاملات سے شہر کو سروکار نہیں تھا۔ اگر شہر خوشحال ہو تب تو بہت ہی اچھی بات تھی اور اگر دوسرے شہر کم خوشحال ہوں تو یہ موقع اُن کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مبارک باد دینے کا تھا۔ شہری کی نظر میں اس کا شہری سب سے اہم تھا اور قوم و ملک کوئی چیز نہ تھی۔

لیکن اب زیادہ وسیع نظر ڈالنے کا وقت آگیا تھا۔ مقامی جنگی کا محصول ان لوگوں کے لیے دقت نہ پیدا کرتا تھا جو ان سے مستثنیٰ تھے۔ مقامی کروڑگیری ان لوگوں کو عجیب نہیں معلوم ہوتی تھی جو ان کے خوگر اور عادی تھے، قومی معاملات پر ان لوگوں کی نظر نہیں پڑتی تھی جو اپنے شہر کی چار دیواری کے باہر نگاہ نہیں دوڑاتے تھے۔ لیکن بادشاہ اس محدود

[۱] اس باب میں لفظ "ایلین" یا اجنبی Alien پردیسی یا غیر ملکی باشندے کو تعبیر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شخص اس شہر کا باشندہ یا اس شہر کے جتھے کا رکن نہ ہو اجنبی یا "پردیسی" تھا۔

تخیل اور تنگ نظری پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ نارمنوں کے تحت جب بادشاہ اپنے ہی طور پر زندگی بسر کرتا تھا یعنی کسی دوسرے بڑے جاگیردار کی طرح اپنی جاگیروں کی پیداوار پر گزارہ کرتا تھا تو یہ ممکن تھا کہ شہروں کو علٰحدہ زندگی بسر کرنے کے لیے اس وقت تک چھوڑ دیا جاتا جس وقت تک اُن سے آمدنی وصول ہوتی رہتی۔ لیکن اڈورڈ اول کے زمانے تک سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوگئی تھیں سیکسنوں اور نارمنوں کی خصومتوں کی یاد دل سے مٹ چکی تھی، بیرونی تجارت کو فروغ حاصل ہو چلا تھا، وسیع تر تجویزیں پیش ہونے لگیں تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ آمدنی اور منافعے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ بادشاہ ایسے قواعد وضوابط کو پسند کرتا تھا۔ جو امن و امان اور عمدہ حکومت قائم کرنے میں ممد ومعاون ہوتے تھے، اور ان کی حمایت کرتا تھا۔ لیکن اسے شہروں کا باہمی رشک وحسد اور رقابتیں ناپسند تھیں۔ اور اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہ مقامی عدم مساوات کو دور کرنے، تعلقات کو خوشگوار بنانے، سلطنت پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنے، قومی اغراض کو پیش نظر رکھنے، شہروں کے انفرادی اغراض کو نظرانداز کرنے، اور ایسی تجارتی پالیسی اختیار کرنے کے لیے مداخلت امکانی حد تک کرتا تھا جو یکساں اور تاحد امکانی حد تک سب کے لیے مساوی طور پر مفید ہوتی۔

اگر بلدی تجارتی نظام سے قطع نظر کر کے تجارت کے قومی نظام کے آغاز کی تاریخ اڈورڈ اول کی تخت نشینی قرار دی جائے تو اس سے یہ خیال نہ کر لینا چاہیے کہ اس سے پیشتر تجارت کے متعلق قومی نقطۂ نظر بالکل مفقود تھا۔ تاجروں اور بعض دستکاروں کے جتھے بھی سند شاہی کے تحت قائم ہوئے تھے اور ایسے جتھوں کو جنھیں بادشاہ کی اجازت حاصل نہ ہوتی تھی غیراجازت یافتہ یا غیرقانونی کہتے تھے، چنانچہ وہ مستوجب سزا ٹھیرتے اور انھیں توڑ دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں جتھوں ہی کے ذریعے سے اس وقت کے موجودہ

عام قواعد وضوابط نافذ کیے گئے۔ مثلاً ساؤتھمپٹن کے تاجروں کے حصے نے قرار دیا تھا کہ شراب اور روٹی کے کاروبار کے متعلق مقدمات کی سماعت عدالت نان و شراب[1] میں سال میں دو دفعہ کی جائے۔ عدالت نے روٹی کے متعلق ۱۲۰۲ء میں پہلے حکم کے ذریعے ایسی میزان مقرر کی کہ ایک فارتھنگ کی روٹی کا وزن ایک کوارٹر گیہوں کی قیمت کے لحاظ سے متغیر ہوتا تھا۔ یہی اصول اُن قوانین کے بارے میں اختیار کیا گیا جو بعد میں ازسرنو نافذ کیے گئے، اور ۱۲۶۶ء میں اور زیادہ مفصل قوانین کا اضافہ کیا گیا جن میں گیہوں کی تمام قیمتوں کو ۱۲ پنس سے لے کر ۱۲ شلنگ تک ملحوظ رکھا گیا، اور اس کا بھی تعین کر دیا گیا کہ نان بائی کو کس قدر منافع لینا چاہیے۔ عدالت کے اس حکم میں شراب بھی شامل کی گئی اور ایک پینی میں کتنے گیلن شراب فروخت کی جائے اس کو جو کی قیمت پر منحصر رکھا گیا۔ شراب ۱۱۹۹ء ہی میں حکومت کے قوانین کے تحت آ چکی تھی، اگرچہ اس سے مختلف طریقے پر اس کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا، یعنی ایک بیشترین قیمت مقرر کر دی گئی اور اس سے زیادہ طلب کرنے کی صورت میں شہر کے حکام کو اس امر کا اختیار دیا گیا تھا کہ خاطی کی دکان بادشاہ کے حکم ثانی تک بند کر دی جائے۔ رچرڈ اول نے اوزان اور پیمانوں کے متعلق ایک حکم نافذ کیا اور پوری مملکت میں یکسانی کا حکم دیا، اس کے بعد منشور اعظم Magna Carta. میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ زر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مسلمہ طور پر شاہی معاملہ تھا۔ نہ صرف زر کی حد تک بلکہ محصولوں کے عائد کرنے اور زیادہ سنگین جرائم بین المصرام عدل کے بارے میں بھی پوری سلطنت بر حیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتی تھی لیکن ان قواعد وضوابط میں کاروباری پہلو کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی اور جو کچھ قواعد موجود تھے ان کو شہروں کے قواعد میں شامل کر کے نافذ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے

[1] Assizes of Bread and Ale

بعض مثلاً اوزان اور پیمانوں سے متعلق قوانین اور منشور اعظم کی اس قرار داد سے کہ "تجارتی اغراض کے لیے تمام تاجروں کو انگلستان میں داخل ہونے، قیام کرنے اور سیاحت کرنے کی آزادی ہونی چاہیے اور ان پر کسی نقصان رساں محصول کا بار عائد نہ کرنا چاہیے بلکہ صرف قدیم اور منظورہ رسوم اور محصول کی ان سے پابندی کرانی چاہیے" لازمی طور پر عام طور سے بے اعتنائی کی گئی۔ بعض صورتوں میں اوزان اور پیمانوں کے مقامی فرق و اختلاف خود ہمارے زمانے تک باقی ہیں۔ "قدیم و منظورہ آئین و رواج" کو نافذ کرنے کے بعد اجنبی کے لیے بہت کم "آزادی" باقی رہ جاتی تھی۔

قومی تنظیم کی حد تک اڈورڈ اول کا دور حکومت ایک ممتاز عہد ہے۔ سب سے اول تمام مسائل اور معاملات کے متعلق قوانین کا ایک بڑا ذخیرہ وضع ہوا جس کو زیادہ تر خود بادشاہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ایک پارلیمنٹ بنائی جو پورے انگلستان کی کافی نمایندگی کرتی تھی۔ اس سے اہم نتائج و اثرات رونما ہوئے۔ اڈورڈ نے خود بھی بہت کچھ کام کیا، اور ایک ایسی مجلس بنا کر جس میں مقامی خیالات اور رشک اور رقابتوں کو غلبہ حاصل نہ ہو سکتا تھا قوم کو بھی اور زیادہ کام کرنے کا موقع دیا۔ اس امر کی تفریق کرنا بہت مشکل ہے کہ بادشاہ نے تنہا کس قدر کام انجام دیا اور اپنے ان مشیروں کے مشورے اور رضامندی سے کتنا کام کیا جن کو اس نے اپنی مدد کے لیے طلب کیا۔ تنہا پارلیمنٹ نے ایسا کام بہت کم کیا جس کو اس کی اختراع و جدت کہا جا سکے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کا باہمی تعاون و تعامل "تاریخ انگلستان میں ایک نئی قوت تھی اور اس کا اثر نہ صرف تجارت پر بلکہ سیاسیات پر بھی پڑا۔

۶۷

اڈورڈ نے تین بڑے قوانین وضع کیے۔ ایک "قانون جائداد وقف" Mortmain ۱۲۷۹ء میں؛ دوسرا قانون عطیات مشروط De Donis ۱۲۸۵ء میں اور تیسرا قانون انتقال اراضی

Quia Emptores. سنہ ۱۲۹۰ء میں؛ اور ان سب کا تعلق حقیقی اراضی سے ہے خواہ وہ کلیسائی جماعتوں کے متعلق ہو یا جاگیری کاشتکاروں کے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لیے وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اگر یہ نظرانداز بھی کر دیے جائیں تب بھی بہت سے ایسے قوانین ہیں جن کا تجارت سے راست تعلق تھا۔ بادشاہ کی ۱۲۷۵ء کی پارلیمنٹ نے ویسٹ منسٹر کا پہلا قانون نافذ کیا جس میں جہاز کی غرقابی کے مسئلے کے متعلق قواعد مرتب کیے گئے تھے۔ اور غرق شدہ مال کے مالک کو اس کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں کہ وہ بچے کھچے سامان کو کسی جاگیردار یا بادشاہ کے قبضے میں چلے جانے سے بچا سکے۔ اسی سال شاہی رسوم نے ایک مستقل بنیادی صورت اختیار کی۔ اب تک شاہی حقوق غیر معین سے تھے۔ حق شاہی Prisage. یعنی بادشاہ کا یہ اختیار کہ اپنی بندرگاہوں کے استعمال کے لیے جتنا محصول مناسب خیال کرے وصول کرے کسی قطعی اصول کے تابع نہ تھا اور اس محصول کی مقدار اور اس کا بار غیر یقینی تھا۔ لیکن اب قدیم حقوق ترک کر دیے گئے اور ان کے بجائے ایک قطعی تجویز موسوم بہ "رسوم قدیم" Ancient Custom. نافذ کی گئی۔ یعنی اون کے ہر تھیلے پر نصف مارک[1]، چمڑے کے ایک لاسٹ[2] یا بارہ تھیلوں پر ایک مارک، ہر جہاز کے مستول کے سامنے اور پیچھے لدے ہوئے شراب کے پیپوں پر بحساب فی ٹن شاہی محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اجنبی جدید یا اونی محصول ادا کرتے تھے جو ۱۳۰۳ء کے تجارتی منشور میں مقرر کیا گیا تھا۔ اون اور چمڑے کے محصول میں ۵۰ فیصد کا اضافہ کیا گیا، شراب پر فی ٹن دو شلنگ رکابداری محصول Butler Age. اور دوسرے برآمدی و درآمدی اشیاء پر بحساب فی پاؤنڈ محصول وصول کیا جاتا تھا۔

۶۸

[1] Mark. ایک قدیم سکہ تھا جس کی قیمت ۱۳ شلنگ ۴ پنس تھی۔

[2] Last بارہ تھیلے یا ۴۳۶۸ پاؤنڈ (وزن)۔

ان محصولوں کو شاہی عہدہ دار جنھیں محصّل Customers, کہا جاتا تھا وصول کرتے تھے۔ یہ عہدہ دار چور تجارت کو بھی روکتے تھے۔ تجارت کی بہتر تنظیم کے لیے سلطنت کی بڑی بڑی بندرگاہوں کو تجارتی مال روانہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا تھا اور خود، اڈورڈ نے تجارتی شہروں کی بنا ڈالنے میں بہت دلچسپی لی۔ چنانچہ ونچل سی کی داغ بیل اسی کے ہاتھوں پڑی۔ اس یکساں تنظیم سے بہت سے فوائد تھے۔ بندرگاہوں اور گودیوں کی حالت میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوئی، اور تاجروں کو جب یہ معلوم ہوا کہ انھیں زائد اور خلاف توقع محصول ادا کرنا نہ پڑے گا تو انھیں یہاں آنے کی ترغیب ہوئی۔ نظم اور امن و امان کے اسی قسم کے فوائد ایک قانون موسوم بہ "قانون ونچسٹر" Statulate of Winchister. میں جو ۱۲۸۵ء میں نافذ ہوا، پیش نظر رکھے گئے تھے۔ اس میں چوری اور قتل کا پتا چلانے کے متعلق قواعد مرتب کیے گئے اور خاطی کے بھاگ جانے کی صورت میں پورے علاقے کو ذمہ دار گردانا گیا تھا۔ اس قانون کی رُو سے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ شہروں کے اطراف فصیل کی دیواریں اُٹھائی جائیں؛ آفتاب غروب ہوتے ہی شہر کے پھاٹک بند کر دیے جائیں؛ کوئی شخص غروب کے بعد شہر کے باہر حفاظت کا انتظام کیے بغیر نہ رہے؛ سڑکیں وسیع کی جائیں اور ان کے اطراف کی جھاڑی نکال دی جائے تاکہ چور پناہ نہ لے سکیں۔ شہر لندن کی سڑکوں کی نگہداشت کے لیے ایک خاص ضابطہ بنایا گیا۔[1] تجارتی قرضوں کی جبری ادائی کا بہتر طریق نافذ کر دینے سے تاجروں کو مزید فائدہ ہوا۔ خاطی کے تجارتی جتھے کے خلاف کارروائی کرنے کی قدیم تجویز بہت بوجھل تھی۔ اور اس پر عمل کرنے میں بہت تاخیر ہوتی تھی۔ خاطی کے شہر میں رہنے والے دوسرے شخص کا سامان چھین لینے کا طریقہ بہت سخت تھا، اور اس میں بسا اوقات

---

[1] Stotuta Civitatis Londanie.

۶۹

ناانصافی کی جاتی تھی۔ ضابطۂ ایکٹن برنل[۱] ۱۲۸۳ء کی رُو سے کوئی لینِدار اپنے قرضدار کو میئر بلد کے سامنے پیش کر سکتا تھا، اور اگر دیندار ی ثابت ہوگئی تو دین دار کو ایک معینہ مدت کے اندر رقم ادا کردینے کے لیے ایک دستاویز پر اپنی مہر ثبت کرنی پڑتی تھی۔ اگر وہ مقررہ وقت پر قرضہ ادا کرنے سے قاصر رہا تو اس علاقے میں اس کا منقولہ سامان قرق کیا جاسکتا تھا، یا اگر اس کے پاس کچھ سامان نہ ہوا تو دوسرے مقام پر جو منقولہ املاک اس کے قبضے میں ہوتیں انھیں قرق کرلینے کے بارے میں حکمنامہ حاصل کرلیا جاتا تھا۔ ۱۲۸۵ء میں یہ قانون تمام سلطنت میں سب تاجروں کے لیے عام کردیا گیا۔ اجنبی تاجروں کو منصفانہ برتاؤ کا اطمینان دلانے کے لیے تجارتی منشور Carta Mercutoria. میں یہ قرار دیا گیا کہ جب نزاع ملکی اور غیر ملکی باشندوں کے درمیان ہو تو جیوری کی نصف تعداد اجنبیوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ غرض ان سب اعتباروں سے قومی تجارت کی خبرگیری اور اس کا خیال عیاں ہے۔

اڈورڈ اول کا سب سے زیادہ نمایاں کام انگلستان کے مفاد کے لیے یہودیوں کا اخراج تھا، لیکن اس کو نسلی بغض و حسد یا مذہبی غیر رواداری کی دلیل قرار دے کر بدنام کیا گیا۔ یہودی یقیناً غیر مقبول تھے۔ وہ ایک انوکھی حیثیت رکھتے تھے اس لیے کہ اول تو انگریزی قانون کا اطلاق ان پر نہ ہوتا تھا، اور دوسرے یہ کہ وہ انگریزوں سے کسی طرح میل جول پیدا کرنے کے فطرتاً خواہاں نہ تھے۔ خواہ وہ انگلستان ہی میں کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں اور انگریزی زبان ہی کیوں نہ بولتے ہوں، وہ اجنبی ہی رہے۔ علاوہ ازیں وہ کسی صنعت یا دستکاری میں منتخدی کیساتھ حصہ نہ لیتے تھے۔ ان کے گزر بسر کا ایک یہی ذریعہ تھا کہ وہ بیش قرار شرح سود پر قرضہ دیا کرتے تھے لیکن قرون وسطیٰ کے خیالات کے لحاظ سے

---

[۱] Statute of Acton Burnel

رباخواری قابل نفرت چیز تھی۔ چنانچہ آیندہ باب[1] میں اس موضوع پر مکرر بحث کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن یہاں ان بنیادوں کا مختصر حال بیان کردینا مناسب ہوگا جن پر یہ قرون وسطیٰ کا خیال مبنی تھا۔ موجودہ زمانے میں ربا اور سود میں فرق و امتیاز کیا جاتا ہے۔ ربا کو ہم ظالمانہ اور بھاری یا غیر منصفانہ سود کہتے ہیں لیکن قرون وسطیٰ میں اس منافعے کو جو روپیہ قرض دینے سے ملتا تھا، مسیحی تعلیم برا قرار دیتی تھی۔ اس لیے کہ اس میں قرض دہندہ تمام خطرات سے محفوظ ہوتا تھا۔ کام اور محنت سے جو منافعہ ملتا تھا وہ حق بجانب تھا، کیونکہ کام سے کوئی نہ کوئی شے پیدا ہوتی تھی؛ لیکن زر کو مستعار دینے سے جو نفع ہوتا تھا وہ اس لیے ناجائز تھا کہ اس کے لیے کوئی کام کرنا نہ پڑتا تھا بقول شکسپیر "وہ ایک بانجھ دھات کی پیداوار تھی"۔ یہ بھی عام طور سے صحیح تھا کہ کوئی شخص اپنی عارضی احتیاج رفع کرنے اور وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہ کہ زر مستعار سے کاروبار کرنے یا زر کمانے کے لیے قرضہ لینے پر مجبور ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر قرض دہندہ کو یہ ضمانت دیدی جائے کہ اس کا زر اس کو واپس مل جائے گا تو قرض دہندہ کو چاہیے کہ قرضے کے صلے کی توقع کیے بغیر قرض دیدے۔ اس لیے کہ اس صورت میں قرضہ دینا ایک رحمدلانہ فعل ہوتا نہ کہ کاروبار۔ جب تک زر قرضدار کے پاس رہے قرض دہندہ کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اگر قرض دہندہ اس زر کو اپنے پاس رکھتا تو ممکن تھا کہ اُسے خود بھی کوئی کاروبار کرنے کا خیال نہ آتا، اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ اُس کا زر اُسے واپس مل گیا تو اس سے اُس کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا۔ یہودی ربا کی بہت ہی اعلیٰ شرح طلب کرتے تھے اور جو لوگ اکثر قرض لیا کرتے تھے وہ خود کو تباہ اور شکستہ حال پاتے تھے، اور چونکہ ربا عیسائیوں کے لیے ممنوع قرار

[1] دیکھو باب ۱۳۔

قرار دیا گیا تھا اس لیے یہودیوں کا اس کو لینا خاص طور پر گھناؤنا اور قابل نفرت تھا۔

علاوہ ازیں یہودی بھی ہمیشہ عاجزی وچاپلوسی کرنے والی قوم نہ تھی جیسا کہ تاریخی ناولوں میں ان کو ظاہر کرنے کا میلان پایا جاتا ہے کہ جاگیردار انھیں گالیاں دیں، ستائیں، ان پر ظلم و زیادتی کیجائے اور وہ حق رسی و چارہ سازی کے قابل نہ ہوں اور انھیں محض شکستہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ دوسرے انھیں اپنے حسب دلخواہ لوٹتے رہیں۔ اس کے برخلاف وہ اب تک بادشاہ کی خاص اور راست نگرانی میں تھے بلکہ سچ پوچھو تو بادشاہ کا اثاث البیت تھے۔ بادشاہ کے مقابلے میں انھیں کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کی املاک منقولہ اور غیر منقولہ دونوں بادشاہ کے رحم وکرم پر تھیں۔ ان کو جو قرضے واجب الادا تھے وہ بادشاہ کو واجب الادا سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو بادشاہ خود یہودیوں کو لوٹا کرتا تھا، لیکن دوسرے اشخاص کا ایسا برتاؤ اسے پسند نہ تھا۔ یہودی یہ سمجھ کر قرضے کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے کہ بادشاہی اقتدار اس کی پشت پناہ ہے۔ ان کے تمسکات بادشاہ کی نگرانی میں باجبر اور محفوظ کیے جاتے تھے اور ایک خصوصی عدالت یعنی محکمہ یہود Exchequer of the Jews. ان کے معاملات کا تصفیہ کرتا تھا یہودی بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ تھے اور اس لحاظ سے اور بھی زیادہ قابل قدر تھے کہ اس آمدنی کے وصول کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے بادشاہ کا فطری اصول یہودیوں کی سرپرستی و حوصلہ افزائی تھا۔ وہ نہ صرف ان پر محصول عائد کر سکتا تھا بلکہ ان سے قرض بھی لے سکتا تھا جس کی ادائی اس کی مرضی پر موقوف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں سے بہت سے فائدے اور سہولتیں حاصل تھیں۔ ۱۷

لیکن اڈورڈ اول کے پیش نظر ذاتی منفعت نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی تمام ملک کا مفاد تھا۔ اس لحاظ سے یہودی ناقابل برداشت بوجھ کی طرح تھے،

ان کی موجودگی ناپسندیدہ اور ان کے عادات و اطوار غیر مقبول تھے۔ وہ نہ تو کوئی کام کر سکتے اور نہ شہر کی زندگی میں حصہ لیتے تھے۔ اعلیٰ شرح سود یا ربا پر زر مستعار دینا ہی ان کا کام تھا۔ ان کے بارے میں مزید بدگمانی یہ کی جاتی تھی کہ وہ سکون میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ چنانچہ کلیسا اور پارلیمنٹ دونوں نے ان کے اخراج کا مطالبہ کیا اور اڈورڈ نے ۱۲۹۰ء میں اس سے اتفاق کر لیا مگر یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی کہ ملک چھوڑنے میں انہیں حتی الامکان کم تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ چنانچہ ان کے دین داروں کو اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ یا تو اپنے ذمے کی واجب الادا رقموں کا نصف حصہ یہودیوں کو ادا کر دیں یا پوری رقم بادشاہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ اس کا انتظام کیا گیا کہ یہودیوں کو اثنائے سفر میں کوئی نہ ستائے یا ان سے برا سلوک نہ کیا جائے۔ بادشاہ نے قابل نفرت اجنبی سمجھ کر ان سے اپنا پیچھا نہیں چھڑایا بلکہ ان کو اس وجہ سے نکال باہر کیا کہ وہ اس قومی تجارت میں مخل ہو رہے تھے جس کی پرورش اور داشت وہ کر رہا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس تدبیر کے نتائج و اثرات ایسے عمدہ نہیں نکلے جن کی بادشاہ کو توقع تھی۔ ان کا کاروبار جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا کارزینوں اور لمبارڈوں[1] کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ بڑے نام رباخواری نہیں بلکہ حقیقی رباخواری کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہنرمندی کے ساتھ مختلف وجوہ پیش کیے گئے اور تجارت کی توسیع اور ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زر سے کام لینے کا میلان بڑھتا گیا، بتدریج اس چیز سے نفرت جاتی رہی جس کو ہم آج کل "سود" کہتے ہیں۔ اس امر سے یہ واقعہ متاثر نہیں ہوتا کہ اڈورڈ کا طرز عمل تجارت کو اصلاح اور ترقی دینے کی ارادی اور بے غرضانہ کوشش تھا، اگرچہ ممکن ہے کہ بادشاہ کی حیثیت سے اس کو نقصان برداشت کرنا پڑا ہو۔

---

[1] Coursines and Lombards

اڈورڈ اول نے انگلستان میں تجارتی اتحاد پیدا کر کے اور انگلستان کو عوام کی نمایندگی کرنے والی ایک پارلیمنٹ دے کر بہت بڑا کام کیا۔ چنانچہ اس پارلیمنٹ میں چھوٹے بڑے زمینداروں، پادریوں اور شہریوں کو جگہ ملی۔ اڈورڈ سوم نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے تجارتی پالیسی سے کام لیا۔ تجارتی پالیسی نے تاریخ انگلستان کو متاثر کرنے میں اس سے کہیں بڑھ کر حصہ لیا جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اڈورڈ سوم کی تجارتی پالیسی نے ایسے نمایاں اور اہم نتائج نہیں پیدا کیے جیسے کہ اس پالیسی نے جس کی بنا پر ہم یکے بعد دیگرے ڈچ قوم کے ساتھ مسلسل جنگوں میں الجھ گئے، امریکی نوآبادیاں ہمارے قبضے سے نکل گئیں اور فرانس سے بڑی مدت تک جنگ جاری رہی (اگرچہ اس جنگ کا "صد سالہ جنگ" کے آغاز سے بہت گہرا تعلق تھا)۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پالیسی کی نوعیت اتفاقی تھی۔ اڈورڈ سوم نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جو مختلف ذرائع استعمال کیے وہ ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں کوئی شے مستقل اور منظم نہ تھی۔ اڈورڈ سوم کے بنائے ہوئے آئین اور قوانین زیادہ تر تجربی تھے۔ لیکن اس نے تین مقاصد اپنے پیش نظر رکھے: (۱) خارجی تجارت کو فروغ دینا، نئے کارخانے کھولنا، اور سلطنت کی مصلحتوں کو مدنظر رکھ کر افراد کے مصارف اور فضول خرچی کو قانون کے ذریعہ سے روکنا[۱]

تمام قدیم عہدوں میں تاج اور اجنبیوں کا باہمی تعلق لازمی طور پر گہرا تھا۔ چنانچہ اجنبیوں کی ایک جماعت یعنی یہودیوں کی حیثیت و حالت اوپر بیان کی جا چکی ہے لیکن تمام اجنبیوں کو جو حیثیت حاصل تھی وہ شاہی کرم فرمائی کا نتیجہ تھی۔ بجز بادشاہ کی مہربانی کے ان کے لیے سلطنت میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ ابتداءً انفرادی تاجروں کو اور بعد میں جتھوں کو بھی اجازت نامے دیے جاتے تھے۔ اجنبی تاجروں کی حیثیت دو بادشاہوں کے درمیان معاہدوں کا موضوع بنتی تھی، منشوروں کے ذریعے سے اس حیثیت کی تعریف کی جاتی تھی

۷۲

[۱] دیکھو کننگ ہم کی کتاب موسومہ بہ "انگلستان کی صنعت و تجارت"۔

اور ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کی رعایا کو اپنے علاقے میں تجارتی حقوق و مراعات جوابی طور پر عطا کرتا تھا، اور اس طرح جو اجنبی آتے تھے انھیں شاہی قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ہالینڈ اور شمالی فرانس کے شہروں سے اس طرح آنے والے تاجر متحد ہو کر آتے تھے۔ ایتھلرڈ کے زمانے کے سے قدیم زمانے میں بھی "شہنشاہ کے آدمیوں" کا اڈا لندن میں تھا جہاں انھیں باقاعدہ حقوق حاصل تھے۔ یہ اسٹیل یارڈ[1] میں کم و بیش اسی طرح رہتے تھے، جیسے کہ فوجی سپاہی دشمن کے ملک میں مقیم ہوتے ہیں۔ اس طبقے کے ارکان اپنے قلعے کی چار دیواری کے اندر جس میں مکان، گودیاں یا گھاٹ اور مال گودام ہوتے تھے، مشترکہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے، اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے ایک جگہ کھانا کھاتے اور اپنے ہی منتخب کردہ عہدہ داروں کے زیر حکم بسر کرتے تھے۔ تاہم وہ اس چار دیواری کے اندر انفرادی طور پر تجارت کیا کرتے تھے۔ رچرڈ اول نے کولون کے ۶۳ تاجروں کو ملک کے طول و عرض کے میلوں میں خرید و فروخت کرنے کے بارے میں حقوق عطا کیے تھے اور تہ بازاری معاف کردی گئی تھی۔ ان رعایتوں کے مد نظر جرمن تاجر بھی کولون کے اتحاد ہنزا میں شریک ہوگئے تھے۔ بتدریج نو وارد قدیم باشندوں کے مقابلے میں تعداد میں بڑھ گئے اور ان کی انجمن ٹیوٹانک ہنزا[2] کے نام سے کولون کی نگرانی سے نکل کر لیوبک اور بالٹک کے ہنزا کے شہروں کی نگرانی میں چلی گئی۔ فلورنس، لک کا (Lucca) پیاسنزا اور گیس کنی کے تاجروں نے بھی بادشاہ سے کچھ اسی طرح کے حقوق حاصل کیے تھے۔

بادشاہ اور ملکی تاجر دونوں ان اجنبیوں کی بابت ایک حد تک

---

[1] The Steel Yard. یہ دریا صل جرمن لفظ Stalhof کا انگریزی ترجمہ ہے اور لندن میں جرمانی ہنزا تاجروں کے مسکن کو "اسٹیل یارڈ" کا نام دیا گیا تھا۔

[2] Teutonic Hanse یعنی ٹیوٹن تاجروں کی انجمن۔

متحد اور متفق تھے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں انگلستان تجارتی حیثیت سے بر اعظم سے بہت پیچھے تھا۔ اگر اجنبی عمدہ کپڑے، شراب، مسالے اور دوسری درآمدی اشیا جو انگلستان میں دستیاب نہ ہو سکتی تھیں نہ لاتے تو ان اشیا کے ملک میں لانے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ برآمدی تجارت زیادہ تر انھی اجنبیوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے ان کے اخراج کے معنی یہ تھے کہ برآمد کرنے والوں کو ان کے بازار سے محروم کر دیا جائے پس اس حد تک یعنی اشیاء درآمد کرنے والوں اور خریداروں کی حیثیت سے اجنبی بادشاہ اور شہریوں دونوں کے لیے یکساں طور پر پسندیدہ تھے۔ لیکن بادشاہ اور شہریوں کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ شہری یہ چاہتے تھے کہ اجنبی تاجر اشیاء لائیں، ان کے ہاتھ فروخت کریں، محصلہ زر سے انگریزی مال خریدیں اور چلے جائیں اور جتنی جلد جائیں اتنا ہی اچھا تھا۔ لیکن بادشاہ کا نقطۂ خیال اس سے مختلف تھا۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر اجنبیوں کو زیادہ حقوق دیے جائیں تو وہ اور زیادہ تعداد میں آئیں گے اور تجارت میں بھی کافی ترقی ہو گی۔ اسی وجہ سے چودھویں صدی کے اوائل میں شہریوں اور بادشاہ کے درمیان کشمکش جاری رہی، شہریوں کی کوشش یہ تھی کہ اجنبیوں کے مقابلے میں اپنے خصوصی حقوق برقرار رکھیں اور بادشاہ ان حقوق کو نظرانداز کرنے کی فکر میں تھا۔ تیرھویں صدی کے ختم پر شہر لندن سے اڈورڈ اول کا جھگڑا ہوا اور اس شہر میں اس کی حکومت کے تحت اجنبیوں کو قیام و سکونت کی سابقہ منظورہ چالیس دن کی میعاد سے تجاوز کرنے کی پہلی دفعہ اجازت دی گئی۔ جب لندن کے تاجروں نے از سر نو اپنے حقوق حاصل کر لیے تو اجنبیوں پر پھر بندشیں عائد کی گئیں۔ لیکن ۱۳۰۳ء کے تجارتی منشور (Carta mercatoria) کی رو سے بادشاہ نے اجنبیوں کو ملک میں جب تک اور جہاں کہیں وہ چاہیں قیام کرنے کی آزادانہ اجازت اس شرط پر دیدی کہ وہ کچھ زائد محصول ادا کریں۔ انھیں مسالوں، پشمینہ اور قیمتی کپڑوں کے سوا کسی دوسری شے کی خوردہ فروشی میں حصہ لینے کی ممانعت تھی۔ لیکن دوسری اشیا جس کے ہاتھ چاہیں فروخت کر سکتے تھے۔

۴۷

اڈورڈ دوم کی کمزور حکمرانی کے زمانے میں شہریوں نے قدیم بندشوں کے عائد کرنے کا حق پھر حاصل کر لیا، لیکن جب بادشاہ نے ۱۳۲۲ء میں پھر اقتدار حاصل کر لیا تو اس نے اجنبیوں کو ان کے حقوق واپس کر دیے ۱۳۲۷ء میں جب اڈورڈ سوم نیا نیا تخت نشیں ہوا اور حکومت بدستور کمزور تھی تو چالیس دن کے قیام کی حد از سر نو تازہ کی گئی اور انگریز میزبانوں کے ساتھ سکونت اختیار کرنے کا طریقہ نافذ کیا گیا۔ لیکن ۱۳۳۵ء میں بادشاہ نے آزادی کی پالسی اختیار کرنے کا اظہار مصمم ارادہ کر لیا، چنانچہ مقامی مشوروں کو نظر انداز کر کے تمام اجنبیوں کو خرید و فروخت کی پوری آزادی عطا کی گئی۔ شہر لندن کو کچھ رعایتیں دینے کے باوجود آزادی کی یہ پالسی اڈورڈ سوم کے عہد حکومت کے ختم تک جاری رہی۔ اجنبی تاجر جس کے ساتھ اور جس مدت تک چاہیں ٹھیر سکتے تھے، لیکن شرط یہ تھی کہ معمولی محصول ادا کریں اور وہ حسب دلخواہ خرید و فروخت بھی کر سکتے تھے۔ جس زمانے میں اجنبیوں کو خاص حقوق سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع دیا گیا وہ خاص طور سے قابل ذکر ہے یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جب کہ اڈورڈ فرانس سے بھڑنے والا تھا اور چونکہ اس وقت وہ جنگ کی تیاری کے متعلق غور کر رہا تھا اور پارلیمنٹ اس کی رسد رسانی کے انتظام کے متعلق دل کھول کے منظوری دے رہی تھی، یہ خیال معقولیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جو رعایتیں عطا کی تھیں اس کا مقصد اپنے حلیفوں سے اتحاد کے رشتے کو مضبوط کرنا تھا خاص کر ان حلیفوں سے جو فرانس کی شمالی مشرقی سرحدوں پر رہتے تھے اور جنھیں اس نے اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے پر راضی کر لیا۔ فلیمنگز کو انگلستان میں تجارتی حقوق حاصل کرنے کے بارے میں خاص طور سے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اور اگرچہ جنگ کے ابتدائی زمانے میں بہت کم اجنبی اڈورڈ کی رعایا تھے[۱] پھر بھی فرانس

---

[۱] اڈورڈ گیس کنی اور پان تھیو کا جاگیردار تھا جس کے لیے اسے ۱۳۳۱ء میں وابستگی کا اظہار کرنا پڑا تھا۔ بریٹنی معاہدے کے بعد اکوئیٹین اور پان تھیو کی تمام ڈچی اور شہر کیلے کامل خود مختاری کے ساتھ اس کی

۷۵ کے تحت حکومت کے لیے اس کا جو مطالبہ تھا اس میں یہ دعویٰ بھی شامل تھا کہ سب فرانسیسی اور اہل فلیمنگز اس کی اجنبی رعایا تھے۔ اور اگرچہ بریتنی معاہدہ میں اس کا دعویٰ مسترد کر دیا گیا، تاہم جب جنگ کی تجدید ہوئی تو آنجو، مین، اور برٹنانی کے مقررہ قدیم حقوق از سر نو جتانا آسان تھا۔ اس طرح اڈورڈ کے زیر نگیں اجنبی رعایا کی غیر معمولی بڑی تعداد میں موجودگی اس امر کی محرک ہوئی کہ وہ ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرے۔

اڈورڈ کے خواہ کچھ ہی وجوہ کیوں نہ ہوں، اس کا طرز عمل شہروں کے خاص حقوق پر ایک کاری ضرب تھا، اور اہل شہر اس کو فطرتاً ناپسند کرتے تھے۔ لیکن بادشاہ کی نظر شہروں سے بہت آگے پڑتی تھی۔ وہ پورے ملک کو ایک رقبہ تصور کرتا تھا۔ اس کو یہ فکر تھی کہ تجارت خارجہ کو بڑھائے اور سستی اور بڑی مقدار میں اشیا درآمد کرے؛ اور اس بات کی پروا نہ تھی کہ تجارت کس کے ہاتھ میں رہے۔ یہ "فراوانی کی پالیسی" جس سے صارف اور خریدار کے اغراض کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، "اقتدار کی پالیسی" سے قطعی تضاد رکھتی تھی جس کو اس کے جانشین رچرڈ دوم نے، جس کی طرف قوانین جہازرانی کا نفاذ منسوب کیا جاتا ہے، اختیار کیا تھا۔

اون، چمڑا اور ٹن اہم برآمدی اشیا تھیں۔ ان میں اون اس قدر زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ تنہا اس کو عام طور پر سلطنت کی اصل اور معیاری پیداوار کہا جاتا ہے۔ ہنری سوم کے عہد حکومت تک برآمدی تجارت تقریباً سب کی سب اجنبیوں کے ہاتھوں میں تھی، لیکن اس عہد حکومت میں یا اڈورڈ اول کے دور حکومت میں "دساوری تاجر" (Staplers) ظاہر ہوئے۔ یہ ملکی تاجر تھے جو اون برآمد اور فروخت کرتے تھے۔ چونکہ اسپین کی اون کی برآمد ابھی بمشکل شروع ہوئی تھی اس لیے انگلستان تقریباً مقابلے کے بغیر کاروبار کرتا رہا، لیکن پارچہ بافی کی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ حالت میں یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ملکیت میں آگئے۔

غیر ممکن تھا کہ انگریزی اون کو پورا یا اس کے بڑے حصے کو ملک ہی میں صرف کیا جائے۔ اُس زمانے میں پارچہ بافی کے مرکز بلجیم اور ہالینڈ تھے اور وہی انگریزی اون کی کھپت ہوتی تھی۔ برآمدی تجارت کا باقاعدہ راستے سے باقاعدہ مقام تک جاری رہنا کئی اسباب کی بنا پر سود مند تھا۔ اس میں بحری ڈاکو کے نقصان یا واجب الادا رقوم کے نہ ملنے کا خطرہ گھٹ جاتا تھا۔ بادشاہ کو محصول بہت آسانی کے ساتھ وصول ہو سکتے تھے اور جہاں کہیں خریداروں کی تعداد زیادہ ہونے کا یقین ہو وہاں اچھی قیمت مل سکتی تھی۔ چنانچہ عام دستور یہ تھا کہ اس شہر کا تعین کر دیا جائے جہاں دساوری پیداوار یعنی اون بھیجی جا سکے اور جہاں خریدار اور فروشندے آسانی سے جمع ہو سکیں۔ ۱۳۱۳ء میں اڈورڈ دوم نے ایک قطعی دساوری منڈی کا اعلان کیا اور اگرچہ مختلف اوقات میں مختلف شہروں کا انتخاب کیا گیا پھر بھی یہ منڈی عام طور سے فلینڈرز میں تھی۔ اجنبیوں کی طرح اون کی خصوصی منڈی کے بارے میں بھی اڈورڈ سوم نے کئی تجربے کیے ۱۳۲۸ء میں اون کی سب خصوصی منڈیاں اٹھا دی گئیں، چنانچہ تاجر جہاں مناسب سمجھتے تھے وہاں جا سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی کامل آزادی کا اچھا نتیجہ نہ نکلا چنانچہ ۱۳۴۳ء میں بروجس Bruges. کا شہر اون کی خصوصی منڈی قرار دیا گیا لیکن بروجس بھی اطمینان کے قابل ثابت نہیں ہوا شہریوں نے لمبارڈی خریداروں کو خارج کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ خود سستی اون حاصل کر سکیں۔ لیکن دوسری طرف فلینڈرز میں بے چینی اور بدنظمی بڑھ رہی تھی، جس کی وجہ سے تجارت کی حالت غیر معین اور پر خطر بن گئی۔ چنانچہ ۱۳۵۳ء میں اڈورڈ نے منڈی انگلستان منتقل کر دی اور اون کی فروخت کا مرکز نیوکیسل، یارک، لن کن، ناروچ، ویسٹ منسٹر، کنٹربری، چچسٹر، ونچسٹر، اکسیٹر اور برسٹل کو قرار دیا۔ اجنبی تاجروں کو ملک میں آنے کی ترغیبیں دی گئیں اور تجارت کو منڈیوں کے شہروں کے میئر یلد کے تحت رکھا گیا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خریداروں کی تعداد زیادہ ہو گئی اس لیے کہ کسی کو خریداری کی ممانعت نہ ہوگی،

اور اس طرح قیمت اچھی وصول ہو گی۔ علاوہ ازیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ نقل و حمل کے مصارف اور سمندر کے خطرات اجنبی کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن اس واقعے کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا کہ نقل و حمل کی تجارت بھی اجنبی کو منتقل ہو گئی۔ اس تجربے پر زیادہ مدت تک عمل نہیں کیا گیا باوجود اس واقعے کے اون کی جو مقدار برآمد کی گئی وہ اگلی مقدار سے کہیں زیادہ تھی اس لیے کہ ۱۳۶۲ء میں منڈی بھر کیلے میں قائم کی گئی اور بادشاہ کے باقی عہدِ حکومت تک وہیں رہی۔

یہ سب کارروائی از سرتاپا عجیب و غریب ہے۔ اڈورڈ نے مختلف صورتوں کا باری باری سے تجربہ کیا۔ پہلے تو اس نے انگلستان سے باہر منڈی قائم کی؛ اس کے بعد سب منڈیاں اُٹھا دی گئیں؛ پھر خود انگلستان میں منڈی قائم کی اور آخر میں قدیم تجویز کی جانب رجوع ہوا یعنی بیرونی شہر کا انتخاب کیا گیا لیکن وہ ایسا شہر تھا جو انگریزی علاقے میں تھا۔ ان تغیرات سے غالباً کوئی نمایاں دانشمندی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس قسم کی تبدیلیوں نے لازمی طور سے پراگندگی پیدا کر دی۔ لیکن ان سے بادشاہ کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ تجارت کو حتی الامکان بہترین بنیاد پر قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ایک حقیقی تجارتی پالیسی کارفرما ہے اگرچہ اس کے طریقے متلون، تغیر پذیر اور تجربی ہیں۔

اسی کے مشابہ علامتیں اس شوق کی جو اڈورڈ کو تجارت سے تھا اس کے اس دعوے میں مل سکتی ہیں کہ سمندر پر اس کی حکمرانی تھی۔ رودبار انگلستان کے دونوں ساحلوں پر کم و بیش پورا قابو رکھ کر اس نے ان بحری قزاقوں کو مغلوب کر لینے کی تھوڑی بہت کوشش کی جو اکثر فرانسیسی بندرگاہوں میں اُمنڈ آئے تھے۔ انگریزی جہازوں کے ہمراہ مسلح بدرقے کی روانگی کا انتظام کیا گیا اور ملکی باشندوں کو تحفظ اور تاوان کے خطوط دیے جاتے تھے۔ فرانس کے ساتھ بادشاہ کی جو جنگ ہوئی اس نے ایسے علاقوں پر اقتدار حاصل کرنے کی شکل بھی اختیار کی جو اہم تجارتی مرکز تھے۔ انگلستان میں جتنی شراب

درآمد کی جاتی تھی اس کا بیشتر حصہ گین Guienne, سے آتا تھا، نمک کی تجارت بہت بڑی تھی اور برٹینی معاہدے[1] کی رُو سے گین کے انگریزی مقبوضات میں توسیع ہوگئی۔ فلینڈرز نے جو پارچہ بافی کی صنعت کا مرکز تھا، فلپ کے مقابلے میں اڈورڈ کا ساتھ دیا؛ چنانچہ ابتدائی حملوں میں فلینڈرز ہی اڈورڈ کی فوجی کارروائیوں کا صدر مقام تھا۔ یہ بلاشبہ ممکن ہے کہ ان واقعات کو اس خیال سے بہت اہمیت دیدی جائے کہ جن کاموں کو فوجی یا سیاسی حیثیتوں سے کرنا ضروری تھا ان میں بھی تجارتی پالیسی کا لگاؤ پایا جاتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ گین پر اڈورڈ کے خاندانی حقوق تھے اور فلینڈرز سے اس کے خاندانی تعلقات تھے۔ فلینڈرز کے شہر، شاہِ فرانس سے برسرپیکار تھے اور یہی حال اڈورڈ کا تھا۔ پس فلیمش شہروں اور اڈورڈ کے درمیان اتحاد قائم ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا قدرتی ذریعہ ہوسکتا تھا؛ اگرچہ محرکات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر بھی نتیجہ کافی نمایاں تھا۔ شراب کی تجارت انگریزوں کے قابو میں آگئی اور انگلستان اور فلینڈرز کا باہمی ربط اور اتحاد بہت بڑھ گیا۔

۸ یہ ایک واقعہ ہے کہ آئندہ معاہدۂ برٹینی میں اڈورڈ نے گین حاصل کر لیا لیکن فلینڈرز پر اپنے دعوے سے دست بردار ہوگیا۔ اس واقعے کی بہت ہی پامال تشریح یہ کی جاسکتی ہے کہ بہترین شرطیں حاصل کی جاسکتی تھیں ان کو اس نے حاصل کیا اور اس سے زیادہ وہ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اگر انتخاب ہی کرنا تھا تو فلینڈرز پر گین کو کیوں ترجیح دی گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ شراب انگلستان میں اطمینان بخش طریقے پر تیار نہ ہوسکتی تھی، اور دوسری طرف ۱۳۶۰ء تک فلینڈرز میں بیجا مداخلت کے بغیر پارچہ بافی کی صنعت پر قابو حاصل کرنے میں بادشاہ بڑی حد تک کامیاب ہوچکا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ خود اپنے ہی ملک میں اس نے صنعت کو مستحکم طور پر جما دیا۔ قدیم ترین

[1] Treaty of Bretigny.

زمانے سے انگلستان میں کچھ نہ کچھ پارچہ بافی کا سلسلہ چلا آتا ہے، لیکن کپڑا جو بنا جاتا بھدا اور موٹا ہوتا تھا اور صرف ادنیٰ طبقے میں اس کی مانگ تھی۔ جن لوگوں کو عمدہ، دبیز، کلف دار، اور شوخ رنگوں کے کپڑوں کی ضرورت ہوتی انھیں یہ مال ہالینڈ سے حاصل کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، بیرونی دستکاروں کی کچھ تعداد ولیم اول کے ساتھ ملک میں آئی تھی، لیکن یہ لوگ عام مانگ پوری نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے کپڑے کی درآمد بہت زیادہ تھی، اور اس کو وہ لوگ پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو یہ چاہتے تھے کہ ملک خود مکتفی یا اپنی جملہ ضرورتوں کا خود کفیل ہو۔ چنانچہ ۱۲۵۸ء میں بیرنوں نے اصلاح کے متعلق جو سفارشیں پیش کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ انگریزی کپڑے کے استعمال پر زور دیا جائے، خواہ وہ موٹا اور بھدا ہی کیوں نہ ہو اور اس کو بدیسی کپڑے پر ترجیح دی جائے۔ ۱۲۷۱ء میں فلینڈرز پر دباؤ ڈالنے کے سیاسی ذریعے کی حیثیت سے نہ صرف اون کی برآمد بلکہ کپڑے کی درآمد بھی ایک زمانے تک ممنوع قرار دی گئی۔ لیکن فلینڈرز کے جھگڑوں کی وجہ سے اڈورڈ سوم کے یہ موقع ہاتھ آیا۔ ۱۳۲۸ء میں بمقام کیسیل فلینڈرز کے دستکاروں کو ان کے ضلع وار (کونٹ) نے شاہِ فرانس کی مدد سے شکست دی اور ان میں سے اکثر گینٹ یا گان Ghent, یپرس Ypres, اور بروجس Bruges. سے جلاوطن کر دیے گئے۔ تین سال بعد اڈورڈ نے ایک فلیمش پارچہ باف جان کیمپ[1] کو، جو اپنے خادموں اور کارآموزوں کے ساتھ انگلستان آگیا تھا پناہ دی اور دوسرے پارچہ بافوں، رنگریزوں اور کپڑوں کو کلف دینے والوں کو بھی جو انگلستان میں کام کرنا اور اپنا فن سکھانا چاہتے تھے اسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ برابان کے ڈو اور دی لینڈ کے بیندرہ باشندوں کو ۱۳۳۱ء اور ۱۳۳۷ء میں اسی طرح پناہ دی گئی، اور موخر الذکر سال میں ترک وطن کر کے آنے والے پارچہ بافوں

[1] John Kempe

کے لیے یہ پیش کش عام کر دیا گیا' اور بدیسی کپڑے کی درآمد اور اون کی برآمد ممنوع قرار دی گئی۔ یہ آخری بندشیں فلینڈرز کے شہروں پر ایک سیاسی ضرب تھی چنانچہ وہ بہت جلد منسوخ کردی گئیں، لیکن اجنبی دستکاروں کی آمد کا سلسلہ اس وقت اور بھی زیادہ ہو گیا جب کہ انگلستان اور فلینڈرز، شاہِ فرانس کے مقابلے میں دوش بدوش لڑے اور اڈورڈ نے نوواردوں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنے پر اس وجہ سے زور دیا کہ "ہماری طرفداری اور حمایت میں ثابت قدم رہنے کے باعث" انھیں جلاوطن کیا گیا تھا۔

اس تمام پناہ دہی اور تامین کے باوجود جو بادشاہ کے امکان میں تھی ملک کے اس وقت کے پارچہ بافوں کے جتھے خاص کر لندن میں ان پارچہ بافوں کو حسد اور رقابت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے یہ محضر پیش کیا کہ اجنبی لوگ جتھے کی فیس ادا نہیں کرتے اور کپڑے میں ہر قسم کی ندرت اور جدت کر کے ان کی صنعت میں مداخلت کر رہے ہیں۔ لیکن بادشاہ نے اجنبیوں کا ساتھ دیا اور موجودہ جتھوں کی شرکت کی ذمہ داری سے انھیں بالکل مستثنیٰ اور سبکدوش کر دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلوے اور حملے اکثر ہوتے تھے اسلیے کہ ایک طرف اجنبیوں کو ضرر نہ پہنچانے کے متعلق سخت احکام نافذ کیے گئے دوسری طرف اجنبیوں کو ہتھیار رکھنے کی ممانعت کردی گئی۔ جب اس طرح سرپرستی اور دستگیری ہوئی تو اجنبی خوب پھلے پھولے۔ انھوں نے اپنی ایک علحدہ انجمن قایم کرلی، بہر طور کچھ زمانے تک انگریزی جتھوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انگریزی بازار انگریزی جتھوں سے بڑی حد تک خالی ہو گیا۔

جس زمانے میں اونی صنعت انگلستان میں فروغ پا رہی تھی اس کا ایک اور شعبہ یعنی بٹی ہوئی اونی اشیا کی صنعت مشرقی علاقوں یعنی ناروچ اور اس شہر کے گرداگرد جس سے یہ اشیا نامور اور مشہور ہوئیں ہیں ترقی کر رہی تھی۔ ان کاریگروں کا حال ہمیں اس جھگڑے اور قضیے کے باعث معلوم ہوتا ہے جو ان میں اور اونی کپڑے کی پیمایش اور اس کی خوبی کا امتحان کرنیوالے سرکاری ناظر[۱] میں

۱۔ Aulnager.

ہوتا تھا۔ ناظر کا تقرر ہی اس لیے کیا جاتا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کرے کہ کپڑا مناسب طول کا بنا گیا اور اس کی خوبی برقرار رکھی گئی۔ ابتداءً بنی ہوئی اون کی صنعت غیر منظم تھی۔ اور آئے دن یہ شکایت رہتی تھی کہ دھوکا دے کر یعنی ان کا جتنا طول ہوتا تھا اس سے زیادہ ظاہر کرکے کپڑے فروخت کیے جاتے تھے۔ ناظر دھوکے اور فریب کو روکنے کے لیے مقرر کیا جاتا تھا، مگر وہ اس کام سے تجاوز کرکے سب پارچہ بافوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ ایک خاص اور مقررہ طول کا کپڑا تیار کریں، اس نگرانی اور ناظر کی فیس کے خلاف پارچہ بافوں نے اعتراض کیا اور آخر کار طول کے بارے میں انھوں نے اپنے معاملے میں کامیابی حاصل کرلی۔ یہ عام پالیسی کے مطابق تھا اس لیے کہ ۱۳۵۳ء میں حکومت یکساں معیار برقرار رکھنے کی کوشش سے دست کش ہوگئی اور محض یہ قرار دیا گیا کہ ناظر کپڑے کی لمبائی اور اچھائی کی تصدیق کردے تاکہ کسی کو دھوکہ نہ ہو۔

تینوں اڈورڈوں کی حکومت کے زمانوں پر جو صدی مشتمل ہے وہ سیاسی یا دستوری تاریخ میں جس قدر اہمیت رکھتی ہے اس سے کچھ کم اہمیت تجارتی تاریخ میں نہیں رکھتی۔ سیاسی یا دستوری تاریخ کے متعلق جو واقعات ہیں وہ زیادہ شاندار اور زیادہ نمایاں ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ ہمارے ذہن پر ویلس کی فتح آئین سازی کے عظیم الشان کارناموں، اسکاٹ لینڈ سے کشمکش، پارلیمنٹ کی ترقی، شاہی منشوروں کی توثیق، بیرنوں اور اڈورڈ دوم کی باہمی رقابت اور کریسی[1] اور پواتیے[2] کی قومی عظمت و ناموری کے واقعات ہمارے خیالات پر زبردست اثر ڈالیں اور ہم ان عظیم الشان واقعات کے مقابلے میں صنعت و خوشحالی کی ترقی جیسے معاملات کو پامال اور ادنیٰ خیال کرکے نظرانداز کردیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دوسرے شعبے کے کارنامے بھی عظیم الشان ہیں۔ انگلستان متحد اور مستحکم ہوچکا ہے، سلطنت کو شہر سے بالاتر اور

---

[1] Cressy.

[2] Poitecrs.

فایق مانا جاتا ہے۔ تاجر خواہ وہ اجنبی ہوں یا ملک کے کسی دوسرے حصے سے آئیں،
تکلیف دہ مقامی بندشوں سے ہٹا کر ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور
تجارت کی مقداروں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ برآمد اور محاصل دونوں بادشاہ کی خاص
نگرانی میں آجاتے ہیں۔ پارچہ بافی کی صنعت جس کا آیندہ مدت دراز تک
سلطنت کا سب سے بڑا حرفتی سہارا ہونا مقدر تھا، اس کی پرورش اور
نگہداشت اس مدبرانہ پالیسی کے ذریعے سے کی جاتی ہے کہ غیر ملکی دستکاروں،
کو جن کے ساتھ ان کے وطن میں بدسلوکی کی گئی تھی یہاں پناہ دی جاتی ہے۔
بعد کی مدت میں اسی پالیسی کی بدولت انگلستان کو بہت کچھ فوائد حاصل
ہونے والے تھے۔ شہری حقوق بجز ان حقوق کے جو غیر ملکی باشندوں کے متعلق تھے
پامال نہیں کیے جاتے تھے بلکہ ان کو منسوخ کر کے دوسرے حقوق دیے جاتے ہیں۔
تاجروں کے جتھوں کو بلدی اور بین البلدی تجارت کی ضرورتوں کے لحاظ
سے محدود کر دیا جاتا ہے۔ قومی تجارت کو بادشاہ اور پارلیمنٹ کی نگرانی اور
رہنمائی میں دیدیا گیا ہے۔ اڈورڈ سوم کے عہد حکومت کی عام تجارتی آزادی
اس لحاظ سے اور بھی زیادہ نمایاں ہے کہ بہت کم زمانے تک اس کا
دور دورہ رہا۔ اب تک جو کچھ کام کیا گیا تھا اس کے بعد کے دور میں اس کے
بڑے حصے کی کایا پلٹ دی گئی۔ شہروں نے اپنے کھوئے ہوئے خصوصی حقوق دوبارہ
حاصل کر لیے اور اجنبیوں کی راہ میں سکونت اور فروخت کے متعلق شرطوں اور
بندشوں سے رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بادشاہ کی کارستانی
تھی اور صنعتی طبقوں میں عام طور پر غیر مقبول رہی۔

81

اگرچہ تجارت کو جو آزادی دی گئی تھی وہ بہت جلد چھین لی گئی، پھر بھی
دونوں جلیل القدر اڈورڈوں کے سب کارنامے ان کی وفات کے ساتھ مٹے نہیں
قومی اتحاد اور تجارتی تنظیم میں دور اندیشی کی ایک مثال قائم کر دی گئی
تھی اور یہ مثال بدستور قائم رہی تاکہ انگلستان کے آیندہ حکمراں اس کی تقلید کریں۔

باب ۶

کالی وبا

سیاسی یا دستوری تاریخ سے معاشی تاریخ اس لحاظ سے ممتاز اور مختلف ہوتی ہے کہ اس کی تحریکوں اور واقعات کی رفتار نسبتہً سست ہوتی ہے اور اس کی ترقی کا درجہ نسبتہً کم نمایاں ہوتا ہے۔ اس میں عظیم الشان واقعات اور واقعات کی اہم تاریخیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ایسے نتیجہ خیز اور اہم تغیرات کے مقابلے میں جو کہ سنہ ۱۲۱۵ء تا سنہ ۱۸۹۸ء کی سی تاریخوں سے ہمارے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں، معاشی تاریخ میں کوئی بھی بڑا تغیر نہیں ملتا اور سائمن ڈی مونٹ فورٹ کی پارلیمنٹ[1] یا آرمیڈا (جنگی بیڑا[2]) یا واٹرلو یا مسودہ قانون اصلاح[3] کے سے واقعات کے مثل ایک واقعہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ اس کی بجائے ہمیں ایسے تغیرات سے بحث کرنی پڑتی ہے جو صرف اجتماعی حیثیت سے بتدریج عظمت

---

[1] Simon de Montfort's Parliament

[2] Armada, آرمیڈا

[3] The Reform -Bill

حاصل کرتے ہیں، جن کا اثر تمام ملک میں بہت آہستہ آہستہ پھیلتا ہے،
جن کے میلانات ابتدائً مستثنیات سے پُر ہوتے اور پھر بتدریج عمومیت
حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً ہم اس بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں جانتے کہ بدلِ خدمت
کی صورت سب سے پہلے کب ظاہر ہوئی یا کسی شہر کو سب سے پہلی مرتبہ
آزادی کب عطا کی گئی۔ ایسے معاملات یقیناً توجہ طلب ہوں گے اگرچہ ان میں
ویسی ہی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جائے گا جیسا کہ پارلیمنٹ میں نمایندگی کے اصول
کی پہلی دفعہ رونما ہونے یا جیوری کے طریقے کی ابتدا کے متعلق کیا جاسکتا ہے۔ ۸۲
گو معاشی تاریخ کی حرکت کی رفتار عام طور پر سست ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی اس
میں تیزی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم لفظ تغیر کو استعمال کرنے پر قانع نہیں
ہوتے بلکہ اس سے زیادہ قوی لفظ یعنی "انقلاب" سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ اس
قسم کا ایک انقلاب معاشی تاریخ کے اساسی واقعات میں سے ایک واقعے کی
بنا پر رُونما ہوا، اور یہ واقعہ ان چند واقعات میں سے ایک ہے جنکی تاریخ
کے ذہن میں آتے ہی اس واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ "کالی وبا"
یا بلیک ڈتھ Black Death. کا واقعہ ہے۔

یہ جانکاہ سانحہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ اہم اور نمایاں بن گیا کہ
اچانک رُونما ہوا۔ مزدور آزادی کی طرف تدریجی طور پر قدم بڑھا رہے تھے
خدمات کی بجا آوری کے بجائے محنت کا عوض جنس یا زر کی شکل میں ادا کیا جانے لگا تھا
اور خفیف سی آزادی حاصل کرنے والے اسامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا
تھا؛ یہ سب چیزیں بتلا رہی تھیں کہ زرعی غلامی کا طریق زوال پذیر تھا اور
رفتہ رفتہ، خاموشی کے ساتھ اور کسی مداخلت کے بغیر معدوم ہو جائے گا۔ لیکن
مقدر کچھ اور ہی تھا۔ جب ۱۳۴۷ء کے موسم خزاں میں کریسی کی کامرانی اور
کیلے کی تسخیر کے بعد اڈورڈ سوم تازہ دم انگلستان کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو
فاتح اعظم کی حیثیت سے اس کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی
بڑا فاتح پاس ہی موجود تھا اور وہ اس بنا پر بلاشبہہ بہت ہی مہیب اور
رعب دار تھا کہ اس کی آمد سے بہت کم لوگ خبردار تھے۔

جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ "کالی وبا" نے انگلستان کی ایک تہائی یا
بعضوں کے اندازے کے مطابق نصف آبادی کا صفایا کر دیا تو یہ مرگ عام بہت
ہولناک اور خوف زدہ کرنے والی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ
ممکن ہے کہ ہم اس بلائے ناگہانی کے اثر کو پوری طرح سمجھنے میں وقت محسوس
کریں۔ اس قسم کے عام بیانات اپنے حجم ہی کے باعث یقین پیدا کرنے
میں ناکام رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو ڈی فو کی بدولت اور کچھ
"طاعون اعظم" کے نام کی بدولت یہ بات مان لی گئی ہے کہ سنہ ۱۶۶۵ء کی
وبا انگلستان کی سب وباؤں میں بدترین تھی۔ لیکن یہی اصلی صورت حال
نہ تھی۔ چنانچہ انگلستان میں "کالی وبا" کے حقیقی اثر کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ
سمجھنا کار آمد ہوگا۔ اگست سنہ ۱۳۴۸ء میں بمقام ڈ ل کومپ ریجس اس کا آغاز
ہوا، اور وہ بہت جلد برسٹل اور گلوسسٹر میں پہنچ گئی۔ سال کے اختتام تک
وہ بجانب مشرق لندن تک اور بجانب مغرب بوڈمن تک پھیل گئی۔ وبا
کے ویسٹ منسٹر میں شایع ہو جانے کی وجہ سے پارلیمنٹ کا اجلاس
۱۹ر جنوری سے ۲۷ر اپریل تک موقوف کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اس کا
احساس نہیں ہوا کہ صورت حال کس قدر نازک ہو گئی تھی۔ لیکن اوایل مارچ
میں پارلیمنٹ کا اجلاس پھر ملتوی کر دیا گیا اور اس مرتبہ غیر معین مدت
کے لیے۔ خوف و ہراس بڑھتا چلا گیا، لیکن بدترین صورت حال ختم
نہیں ہوئی تھی اور نہ ابھی تک ظاہر ہوئی تھی، مرض، مشرق و شمال کی طرف
پھیلتا گیا۔ چنانچہ پہلے مشرقی انگلیا اور اس کے بعد وسطی اور شمالی علاقے کی
تاراجی ہوئی۔ پھر آئرلینڈ اور ویلس کی باری آئی اور آخر میں اسکاٹ لینڈ
کا نمبر آیا، چنانچہ سنہ ۱۳۵۰ء اس کے لیے بدترین سال تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ
سنہ ۱۳۴۹ء کے موسم خزاں تک انگلستان میں وبا کم ہو گئی اور اس طرح
پوری سلطنت کا دورہ کرنے کے لیے چودہ مہینے اس کے لیے کافی مدت
تھی۔ کسی ایک علاقے میں مرض انتہائی طور پر چھ مہینے تک پھیلا رہا۔ اس
زمانے میں بھی جب کہ مرض کی شدت گھٹ رہی تھی مبتلا شدہ اشخاص کی تقریباً

۸۳

نصف تعداد فوت ہوئی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب "کالی وبا" نے کسی ضلع کو چھوڑا تو اس وجہ سے چھوڑا کہ اس کے لیے کوئی شکار باقی نہ رہا تھا۔
مبادا کسی شخص کو یہ خیال کرنے کی ترغیب ہو کہ چودھویں صدی کے اندازے ناقابل اعتبار ہیں اور یہ کہ "کالی وبا" سے مرنے والوں کی تعداد کے متعلق اسی قسم کی مبالغہ آمیزی کا امکان ہے جیسی کہ اس زمانے کی جنگوں میں شریک ہونے والی سپاہ کی تعداد کے متعلق کی جاتی تھی، یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ قیاس کرنے کے کیا وجوہ تھے کہ ایک تہائی سے نصف آبادی تک نذرِ اجل ہوئی۔ یہ اسی زمانے کا قایم کردہ اندازہ نہیں ہے۔ لیکن معاصرین نے تو اور بھی کم اعتدال سے کام لیا ہے۔ چنانچہ والسنگ ہم[1] اس عام یقین کا حوالہ دیتا ہے کہ اموات کی تعداد آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ تھی۔ موجودہ تخمینہ قیاس آرائی پر نہیں بلکہ یادداشتوں پر مبنی ہے، یعنی ایک بنیاد تو تقرری کتابچے Institution Books ہیں جن میں پادریوں کی مقرر کردہ ذرائع معاش درج کیے جاتے تھے، دوسری بنیاد انجمنوں اور سندیافتہ اداروں کی یادداشتیں اور سب سے اہم جاگیروں کی عدالتوں کی مثلیں اور کاغذات ہیں۔ چونکہ ان عدالتوں کا کام یہ تھا کہ ان تمام تبدیلیوں کو قلمبند کیا جائے جو جاگیردار کے اسامیوں میں رونما ہوتی تھیں اور چونکہ اس قسم کی تبدیلیوں کی صورت میں جرمانے ادا کیے جاتے تھے، اس لیے عدالتی کاغذات میں اموات کا باقاعدہ اندراج کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مواد سے کالی وبا کے متعلق تفصیلات جمع کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پادری کے تعلقہ ناروچ میں کلیسائی حلقے کے دو ثلث پادری مر گئے۔ جولائی ۱۳۴۹ء میں ۲۰۹ پادری مقرر کیے گئے گویا اس ایک مہینے میں تقررات کی تعداد معمولی سال کے

۸۴

---

[1] والسنگ ہم بالکل معاصر تو نہیں ہے، اس نے رچرڈ دوم کے عہد حکومت میں واقعات قلمبند کیے۔

ایک مہینے کے مقابل سہ گونہ تھی۔ خانقاہوں میں بھی اموات کی تعداد مساوی طور پر زیادہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیورنگ لینڈ میں آگسٹینی پادریوں کے گھر میں پادریوں کی مجلس کا کوئی رکن اور خانقاہ کا کوئی عہدہ دار بھی زندہ نہ بچا، اور ہیگلے میں پادریوں کی مجلس کا صرف ایک رکن بچا۔ سنٹ البانس کے ساٹھ راہبوں میں سے سینتالیس مرض کا شکار ہوئے۔ اپریل سنہ ۱۳۴۹ء میں بمقام ہیچم جبنیز کے مسئلے کے متعلق میاں بیوی کا ایک مقدمہ پیش ہوا تو دو مہینے کے لیے اس کو ملتوی کر دیا گیا، لیکن جب تاریخ پیشی آئی تو بیوی کے سب گواہ اور شوہر ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک چھوٹے سے کلیسائی حلقہ ہنس ٹنٹن میں وبا آٹھ مہینے تک رہی اور جاگیر کے ۱۷۲ آسامیوں کی موت واقع ہوئی، ان میں سے ۷۴ اشخاص کا کوئی مرد وارث نہ تھا اور انیس لاوارث فوت ہوئے۔ اگرچہ مزدوروں کے حق میں طاعون سخت مہلک ثابت ہوا لیکن عورتیں اور بچے بھی اس کا شکار ہوئے اکثر صورتوں میں خاندان یکے بعد دیگرے معدوم ہو گئے۔ عدالتی کاغذات سے اس عام تباہی کی شہادت نہ صرف یادداشتوں بلکہ فروگزاشتوں سے بھی بہم پہنچتی ہے۔ بعض کاغذات میں پورے سال کا اندراج ندارد۔ منتظم جائداد (Steward) کے انتقال کی وجہ سے یا عام خوف و ہراسانی کی بنا پر عدالتوں کا اجلاس ہی منعقد نہیں ہوا اور جب اندراجات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوتا ہے تو تحریر عام طور پر بدخط اور جلدی میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، آسانی سے پڑھی نہیں جا سکتی، اور زبان اور طرز بیان بھی غیر رسمی ہوتا ہے۔ سابق محرر یا کاتب دوسروں کے مثل مر چکا تھا۔ اور اس کا جانشین ایسا شخص مقرر ہوا تھا جو

ل۔ دیکھو اے، جیسپ کی کتاب موسوم بہ "راہبوں کی آمد" The coming of the Friars تین میں جو مثالیں درج کی گئی ہیں ان میں سے اکثر اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

لکھنے کی مشق و مہارت نہ رکھتا تھا اور اس کام سے ناواقف تھا۔ گو اسقفی تعلقہ ناروچ پر "کالی وبا" کا شدید حملہ ہوا، پھر بھی اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں اس کی شدت غیر معمولی تھی۔ لنڈن کی گولڈ اسمتھ کمپنی میں ایک سال کے اندر چار نگرانِ کار یکے بعد دیگرے متقرر ہوئے، کولچسٹر کے ایک تہائی شہری فوت ہو گئے اور باڈمن اور لیسٹر کی نصف آبادی کا صفایا ہو گیا۔ باتھ اور ویلس کے اسقفی تعلقے میں مُردوں کی تجہیز و تکفین کے لیے ڈھونڈے سے بھی کوئی پادری نہ ملتا تھا۔ برسٹل میں مردوں کو دفن کرنے کے لیے زندوں کی کافی تعداد نہ تھی۔ غرض اعلیٰ ادنیٰ، امیر غریب شہر اور دیہات سبھی اس موذی مرض کا شکار بنے۔ سنہ ۱۳۴۹ء کے خزاں تک وبا کا پہلا شدید حملہ کمزور پڑ گیا تھا۔ یوں تو آئندہ بیس سال تک اس وبا نے ملک کا پیچھا نہیں چھوڑا اور اس کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ان میں سے کوئی حملہ بھی پہلے حملے کے برابر شدید نہ تھا۔ طوفان آیا بھی اور چلا بھی گیا، لیکن اپنے پیچھے تباہ کاریوں کا نقش چھوڑ گیا۔

سردست اگر شہروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی دیہات و اضلاع پر "کالی وبا" کے دو بڑے اثرات بآسانی دکھائی دیتے ہیں۔ محنت کمیاب ہو گئی اور بدنظمی اور پریشان حالی کی وجہ سے فصلوں کی پیداوار گھٹی ہوئی آبادی کے لیے بھی ناکافی ہوتی تھی۔ باڑ اور جھاڑیاں توڑ دی گئی تھیں اور مویشی کھیتوں کو روندتے پھرتے تھے۔ اگر کہیں فصلیں تیار بھی ہوئیں تو بالعموم انھیں کاٹنے والا کوئی نہیں ملتا تھا، اور وہ اپنی جگہ پڑی سڑتی رہتی تھیں۔ زمین کی جتائی اور تخم ریزی موقوف ہو گئی اور پیداوار میں ٹوٹے کا اندیشہ تھا۔ غلہ اور محنت کی رسد کی قلت سے جدید تصورات کے لحاظ سے دو چیزوں کی توقع ہو سکتی ہے۔ ایک تو اُجرت کا اضافہ اور دوسرے ہر قسم کی زرعی پیداوار کی قیمت کا اضافہ۔ لیکن چودھویں صدی کے لوگ اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ ایسے کسی نتیجے کا رونما ہونا ضروری تھا؛ اور آنکھ نہ ماننے کے باوجود ظاہر ہے کہ نتائج ناپسندیدہ تھے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے

ان کی روک تھام کا کام جم کر شروع کر دیا۔

چونکہ پارلیمنٹ زیادہ تر ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو زمیندار تھے اور چونکہ پارلیمنٹ کی سرگردگی بادشاہ کر رہا تھا جو سب سے بڑا زمیندار تھا؛ اس لیے یہ معلوم کرنا اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ زمیندار اپنے اسامیوں کی موت سے کس طرح متاثر ہوا۔ اگر اوسط تعداد سے صرف کچھ ہی زیادہ موتیں واقع ہوتیں تو زمیندار کو کوئی ضرر نہ پہنچتا؛ بلکہ بعض صورتوں میں وہ فایدے میں رہتا، کیونکہ متوفی اسامی کا وارث اپنے باپ کی زمین پر قابض ہو جاتا اور حسب سابق اپنے ذمے کی خدمات بجا لاتا یا اُن کا معاوضہ بہ شکل جنس یا زر ادا کرتا، اور جاگیردار کو انتقال زمین کی صورت میں جو نذرانے اور محاصل وصول ہوتے وہ مزید آمدنی کا ذریعہ ہوتے۔ چنانچہ اس کا انحصار وارث کی موجودگی پر تھا، لیکن اکثر صورتوں میں تو سالم خاندانوں کا صفایا ہو گیا اور خدمات، لگان، نذرانے یا جرمانے ادا کرنے کے لیے کوئی وارث ہی باقی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں لاوارث جائداد بحق جاگیردار ضبط ہو جاتی تھی۔ اگر جاگیردار زمین پر قدیم شرح سے کاشت کرنے کے لیے اُجرت پر مزدور حاصل کر سکا تو اس میں بھی لازمی طور سے کوئی نقصان نہ ہوتا تھا۔ اگر شرح اموات اوسط سے زیادہ ہو لیکن حد سے بہت زیادہ نہ ہو تو جاگیرداروں کو خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ متوفی لاوارث ہونے کی صورت میں جہاں خدمات کا نقصان ہوتا تھا، وہاں مالک کو زمین واپس مل جانے اور زائد محاصل اور نذرانے وصول ہونے سے اس نقصان کی تلافی ہو جاتی تھی۔ لیکن "کالی وبا" کی عام ہلاکت خیزی نے تمام معمولی حسابات کو درہم برہم کر دیا۔ ملک کی تمام جاگیروں میں یہی شکل درپیش تھی۔ مزدور اتنی کثیر تعداد میں فوت ہوئے کہ جاگیروں کی حالت سقیم ہو گئی۔ چند مزدور جو بچ گئے تھے وہ زمین سیر پر مناسب طریقے سے کاشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور جو زمینیں جاگیرداروں کو واپس مل گئی تھیں ان کا

۸۶

ملنا نہ ملنا برابر تھا، اس لیے کہ اُجرت دینے پر بھی مزدور نہ مل سکتے تھے۔ جاگیر میں خواہ کچھ ہی دستور رہا ہو، خواہ خدمات کی بجا آوری کے بجائے عوض خدمت پیش کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو جاگیردار تو مصیبت میں گھر گیا اس لیے کہ زمین تو اس کے پاس بہت زیادہ تھی لیکن مزدور بہت کم تھے، اور چونکہ جاگیر کی آمدنی کا دارو مدار ہی زیادہ تر اس پر تھا کہ محنت کی رسد کافی مقدار میں ہو اس لیے بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان صورتوں میں کسی حد تک اختلاف بھی ممکن تھا۔ جن لوگوں نے خدمات حاصل کرنے کا طریقہ قایم رکھا تھا انھیں اب بھی متوفیوں کے وارثوں کی خدمات حاصل ہو رہی تھیں اور ان خدمات میں سے ہر ایک پہلے ہی کی طرح کارآمد تھی لیکن جہاں خدمات کی بجائے بدل خدمت کا طریقہ رائج تھا وہاں اجرت بہ شکل زر دے کر مزدوروں کی صرف اتنی ہی تعداد حاصل کی جا سکتی تھی جتنی کہ پہلے بشرطیکہ اُجرت بھی مقررہ ہو۔ اگر اُجرت میں اضافہ ہوا[1] تو جاگیردار کو دو اعتباروں سے نقصان ہوتا تھا، ایک تو اس طرح کہ اس کو مالگزاری بہ شکل زر کم مقداروں میں وصول ہوتی تھی اور دوسرے اس طرح کہ اس کو جو کچھ وصول ہوتا تھا اس کی مالیت بھی کم ہو جاتی تھی اس لیے کہ اُسے ہر مزدور کو زیادہ اُجرت ادا کرنی پڑتی تھی۔ ۸۷

اگر ہم جاگیردار کی بجائے تھوڑی دیر کے لیے مزدور کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو معاملہ بالکل برعکس معلوم ہوتا ہے۔ اگر اموات کی تعداد معتدل رہتی تو

---

[1] اس میں شک نہیں کہ اُجرت کا اضافہ دیہات کی طرح شہروں میں بھی رُونما ہوا لیکن ہمارے لیے سر دست دیہات کی جانب توجہ مبذول کرنا زیادہ مناسب ہوگا اس لیے کہ یہاں اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔ جو لوگ شہروں میں اجرت پر مزدور حاصل کرتے تھے انھیں اضافۂ اجرت کو اس وقت مان لینا پڑا جب کہ حکومت کی کوششوں کو اضافے کی روک تھام میں ناکامی ہوئی۔ ان کے لیے سوائے اس کے کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہ تھا کہ زاید اجرت ادا کریں۔ لیکن دیہات میں، جیسا کہ آگے بیان ہوگا ایک دوسرا طریق بدل اختیار کیا گیا جو تباہ کن ثابت ہوا۔

جاگیردار کا فائدہ ہو سکتا تھا یا بہر طور اس کا کوئی نقصان نہ ہوتا، لیکن مکمل تباہی نے مزدوروں کے لیے تمام ممکنہ سہولتیں مہیا کر دیں۔ یہ تو غیر ممکن تھا کہ یہ سہولتیں کسی کو ۱۳۴۹ء کی تباہی میں نظر آئی ہوں جب کہ مزدور کے ساتھی اس کے ارد گرد ہزاروں کی تعداد میں مر رہے تھے، لیکن جب طاعون کم ہو گیا تو محنت کی مانگ کی بیشی نے توقع پیدا کر دی۔ اگر زرعی غلام (ول ین) خدمات کی بجا آوری کے بجائے بدل خدمت ادا کر رہا تھا تو اس کو وہی مقررہ مقدار مسلسل ادا کرنی پڑی، لیکن اس کے برخلاف اگر وہ اجرت پر کام کر رہا تھا تو اس اضافۂ اجرت سے فایدہ حاصل کر سکتا تھا جو ملک میں ہر طرف ہو رہا تھا۔ اس طرح جاگیردار اور اس کے اسامی کے اغراض بالکل ایک دوسرے کا ضد تھے۔ ایک طبقہ اضافۂ اُجرت سے خائف تھا اور دوسرا اضافۂ اجرت کی آس کر رہا تھا۔ جاگیردار کی یہ خواہش تھی کہ خدمات کی بجا آوری کے طریق کو برقرار رکھے اور زرعی غلام کی پہلے سے زیادہ یہ کوشش تھی کہ ان پابندیوں سے آزادی حاصل کرے۔ گویا یہ اس عظیم کشمکش کی ابتدا تھی جو تاریخ انگلستان میں مالدار اور مفلس طبقے یا اصل دار اور مزدور کے درمیان رونما ہوئی۔

پہلے تصادم کے موقعے پر "کالی وبا" کا زور و شور قایم تھا۔ اُجرت کا اضافہ خاص کر جوں جوں فصل کی کٹائی کا زمانہ قریب آتا گیا، زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اس وقت مزدوروں کی بن آئی تھی، ہر طرف ان ہی کی مانگ تھی، اور وہ کمیاب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اُجرت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو گیا۔ فصل کاٹنے کے لیے پہلے تو $\frac{1}{12}$ کوارٹر گیہوں ادا کیے جاتے تھے، لیکن اب $\frac{1}{8}$ کوارٹر کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ غلہ کوٹنے کے لیے جو شرح تھی اس میں ۳۰ فی صد اضافہ ہو گیا، عورتیں، جو دن بھر کام کرنے کے لیے پہلے ایک پنس طلب کرتی تھیں اب دو پنس اور تین پنس کا مطالبہ کرنے لگیں۔ لیکن اُجرت میں قیمتوں کی زیادتی کے تناسب بیشی نہیں ہوئی بلکہ اس سے متجاوز ہو گئی۔ اس لیے کہ مزدور پہلے سے زیادہ خوشحالی سے بسر کر رہے تھے

۸۸

یعنی جہاں انھیں کھانے کو پہلے محض لحم غنزیر میسر آتا تھا اب وہ مچھلی اور بکری کا گوشت کھانے لگے۔ بڑھتی ہوئی اجرت نے اضطراب اور بے چینی پیدا کروی اور لوگ اعلیٰ اجرت کی تلاش میں اپنے گاؤں چھوڑ کر دوسرے مقاموں کو جانے لگے۔ چنانچہ انگلستان میں اس سرے سے اس سرے تک لوگ آوارہ پھر رہے تھے۔ یہ قدیم شرح پر کام کرنے سے انکار کرتے تھے، اور کبھی خیرات پر اور اکثر چوری کر کے گزارہ کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا زراعتی نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔

اس اثنا میں جاگیرداروں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے انکے اکثر اسامی مر کھپ چکے تھے، کوئی والی وارث نہ رہا تھا، اور موت تو سب حساب چکا دیتی ہے، ایسی صورت میں ان سے کیا مل سکتا تھا۔ پس ماندہ اشخاص جن کے ذمے خدمات واجب الادا تھیں، ان کو غلامی سے نکل کر اجرت پر کام کرنے کی فکر تھی، اس لیے وہ چپکے سے نکل گئے لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ کدھر گئے۔ بدل خدمت لگان ادا کرنے والوں نے اپنی محنت کے مساوی معاوضہ قدیم شرحوں کے حساب سے ادا کیا جب کہ مزدوروں کی کثرت تھی اور اجرت ادنیٰ تھی۔ جب جاگیردار کو اپنی فصل کی کٹائی کی غرض سے قدیم شرح سے مزدوروں کی اتنی تعداد اجرت پر حاصل کرنی پڑی جو "۴۴۱ یوم کا کام کر سکیں" یا وہ جب ان ایام پر نظر بازگشت ڈالتا تھا جب کہ اس کے اسامیوں کے ذمے سرما میں دو ہزار یوم اور خزاں میں ۵۸۰ یوم کی خدمت واجب الادا ہوتی تھی اور جن کا معاوضہ اب بشرح نصف پنس اور ایک پنس فی یوم ادا کیا جارہا تھا تو اس کو اپنی تباہی کا یقین کامل ہوگیا۔[۱] "کالی وبا" کے بعد سے ایک عورت کی خدمت دن بھر نہ ملنے کی صورت میں جاگیردار کو دو پنس کا نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں بہت مشکلات پیش آرہی تھیں۔ یہ امر مشتبہ تھا کہ مزدوروں کی اتنی کافی تعداد

[۱] چنانچہ "ہیم" Ham اور "گریٹ ٹیو" Great Tew کے جاگیری موضعوں کی علی الترتیب یہی حالت تھی دیکھو ڈنٹن کی کتاب "پندرھویں صدی"

موجود تھی جو قدیم طریقے پر کاشتکاری کر سکتی تھی، اور ایسی صورت میں جب کہ مزدور کو دوہری اور تہری اجرت دینا ضروری تھی۔ اس کام کو انجام دینا واضح طور سے غیر ممکن تھا۔

پہلی اصلاحی تدبیر جو تجویز کی گئی تھی یہ تھی کہ قدیم شرح اجرت قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جون ۱۳۴۹ء میں جب کہ پارلیمنٹ معرض التوا میں تھی، بادشاہ نے ایک اعلان نافذ کیا جو بعد میں چل کر قانون مزدوران بابتہ ۱۳۵۱ء میں شریک کر لیا گیا۔ اس اعلان میں یہ بتایا گیا کہ وبا کے باعث محنت کی رسد کم ہو رہی تھی، زاید اجرت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور اکثر لوگ کام کرنے پر بھیک مانگنے کو ترجیح دے رہے تھے اس لیے یہ قرار دیا گیا کہ اگر کسی تندرست اور اچھے توئی کے مرد یا عورت کے پاس گزارے کے لیے ذاتی زمین موجود نہ ہو یا وہ بے کار ہو اور ایسی صورت میں اگر اس کو قدیم شرح اجرت پر یعنی کالی وبا سے پیشتر کے زمانے کی اجرت پر کوئی کام دیا جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ انکار کی سزا قید تھی، اور اگر مزدور زاید اجرت کا مطالبہ کریں یا زائد اجرت قبول کریں یا کوئی جاگیردار زاید اجرت ادا کرے تو ہر ایک کے لیے جرمانے کی سزا تھی۔ اگر مزدور کام ترک کر دے تو اس کو اسی طرح قید کیا جا سکتا تھا جس طرح مستنڈے فقیر کو بھیک دینے والے کو۔ اس قانون کا اطلاق نہ صرف فصل کاٹنے والوں، ہل چلانے والوں اور نام نہاد کاشتکاروں پر ہوتا تھا بلکہ نجاروں، خشت کاروں، پلاستر کاروں، معماروں اور دوسرے ان دستکاروں پر بھی ہوتا تھا جن کی محنت کو زراعت سے محض دور کا واسطہ تھا۔ لیکن یہ قانون یہیں تک نہیں رکا بلکہ اور بھی آگے گیا، یعنی اس میں اضافہ اجرت و اضافہ قیمت کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ یہ قرار دیا گیا کہ گوشت، شراب، روٹی اور مچھلی کو بہت زیادہ منافع سے فروخت نہ کیا جائے۔ اس قانون پر نکتہ چینی کرنے سے پیشتر اس کے انجام پر بھی نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ ۱۳۵۷ء میں جاگیرداروں کو جرمانوں کی رقم دی گئی، تاکہ ان کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ جرمانہ کرنے میں مستعدی دکھائیں۔ ۱۳۶۰ء میں سزائیں اور بھی زیادہ سخت کر دی گئیں جرمانوں کے بجائے قید کی سزا رکھی گئی اور جو لوگ اپنے کام سے بھاگ جاتے تھے انھیں راندۂ قانون قرار دیا جاتا تھا

اور اگر وہ گرفتار ہوتے تھے تو دغا کی پاداش میں ان کے جسم پر "یف"[1] کا نشان داغا جاتا تھا، اور دوسری طرف جو شہر انھیں پناہ دیتا تھا اس پر دس پاونڈ جرمانہ عاید کیا جاتا تھا۔

۹۰ یہی وہ آخری موضوعہ قانون ہے جو دشنام کا ہدف بنا اور جسکو زمینداروں کی پارلیمنٹ کی خودغرضی اور بربریت کا نمونہ کہا گیا اور وہ بلاشبہہ اس لحاظ سے نفرت انگیز ہے کہ اس میں ایسے افعال کو قابل سزا قرار دیا گیا جو موجودہ زمانے میں جائز اور حسب قانون قرار دیے جاتے ہیں یا جن سے کم از کم قانون کی شدید خلاف ورزی نہیں ہوتی۔[2] لیکن پارلیمنٹ کو محض اس ایک قانون کی بنا پر جانچنا حق بجانب نہ ہوگا، اس لیے کہ اس کا یہ فعل اس اشتعال کا نتیجہ تھا جو سابقہ اور نرم تر قواعد سے غفلت و بے پروائی کرنے سے پیدا ہوا تھا۔ سنہ ۱۳۶۰ء تک اس جھگڑے نے ترقی کر کے ایک تلخ کشمکش کی صورت اختیار کر لی ایک فریق کو اس پر اصرار تھا کہ "ہم قانون کی پابندی نہیں کر سکتے"، اور دوسرا فریق اس بات پر تلا بیٹھا تھا کہ "ہم اس کی پابندی کرائیں گے"۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، سنہ ۱۳۵۱ء کا "قانون مزدوران"[3] اس قدر تشدد آمیز رنگ میں نہیں بنایا گیا تھا۔ قیمتوں اور اُجرتوں کی نگرانی اس زمانے کے لحاظ سے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ زرعی مزدور کی اس طرح نگرانی کی جائے جس طرح دستکاروں کی انجمنوں کی طرف سے دستکاروں کی کی جاتی تھی۔ اگر پارلیمنٹ قیمتوں کی سطح کم رکھنے میں کامیاب ہوتی تو اجرتوں کے اضافے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ مزدور کے اس مطالبے سے کہ اس کو اعلیٰ اجرت اس لیے چاہیے کہ قومی مصیبت کے باعث اس کو مقابلۃً زیادہ سہولت حاصل ہو گئی تھی، قرونِ وسطیٰ کے انصاف پسندی کی

---

[1] یف F لفظ Falsity (دغا یا فریب) کا سر حرف ہے۔

[2] مثلاً یہ فعل یا حرکت کہ باقاعدہ اطلاع دیے بغیر کسی آجر کو چھوڑ دینا۔

[3] Statute of Abourers۔

خلاف ورزی ہوتی تھی۔ مزدور بعینہ ایک ربا خور ساہوکار کی طرح روپیہ اینٹھ رہا تھا جو اپنے اس روپے کے لیے بھاری سود طلب کرتا ہے جسے مستعار نہ دیا جاتا تو ایک پائی کی بھی آمدنی نہ ہوتی یا ایسے تاجر کی طرح جلب منفعت کر رہا تھا جو غلے کا احتکار مصنوعی قلت پیدا کر کے خود مستفید ہونے کے لیے کرتا ہے۔

اگرچہ پارلیمنٹ اپنے کیے پر اڑی رہی۔ لیکن خود زمیندار اپنے وضع کردہ قوانین کو خود ہی نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قانون مزدوران میں ناقابل یقین بے وقوفی سے اجرتوں کی شرح اس سے بھی اونی مقرر کی گئی جو "کالی وبا" سے پیشتر بالعموم پائی جاتی تھی۔ لیکن اس پیچیدہ صورت حال کا حل پھر بھی مزدوروں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جاگیرداروں کو مزدوروں کی سخت ضرورت تھی۔ سرکش زرعی ملازموں کو قید کرنے سے زمین کے جوتنے میں یا فصل کی کٹائی میں کوئی مدد نہیں ملی۔ بجائے اس کے کہ بدل خدمات ادا کرنے کا طریقہ موقوف ہو جاتا، جیسا کہ عام طور سے بیان کیا جاتا ہے، اب صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ اس میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ جاگیردار کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اور جو کچھ وہ لے سکتا تھا اس پر قناعت کرنی پڑی۔ اگرچہ غلاموں کی خدمات حاصل کرنے کی اُسے بہت خواہش تھی، پھر بھی وہ انھیں حاصل کرنے کے قطعی ناقابل تھا۔ اسے لامحالہ بدل خدمات کے طریق کو جاری رکھنا پڑا اور بعض اوقات ان اشخاص کے ذمے کی ادائیوں کو بھی کم کرنا پڑا جو عوض خدمت ادا کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاگیردار کے لیے کوئی دوسرا چارۂ کار یا طریقۂ بدل باقی ہی نہ رہا تھا۔ اس طریق کی مخالفت کے معنی محض یہ تھے کہ زرعی غلام جاگیردار کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جائیں اور اس طرح اُس کے کھیتوں میں سے ایک خالی پڑا رہے، اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ اس کو خود اپنی زمین سیر پر کاشت کرنے کے لیے کوئی مزدور نہ مل سکتا تھا۔ زرعی غلام دونوں طرح سے فایدہ حاصل کرتے رہے۔ اگر انھوں نے جاگیردار کو مجبور کر کے بدل خدمت کا طریق منوا لیا تو ان کا فایدہ ظاہر تھا، وہ اب کام آسانی سے اور اعلیٰ اُجرت پر حاصل کر سکتے تھے اگر ان کا جاگیردار سختی اور سنگدلی سے پیش آتا تو وہ اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے اور کوئی دوسرا جاگیردار تلاش کر لیتے تھے جو انکی محنت کو

۹۱

خود ان ہی کے شرائط پر حاصل کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔

لیکن زمینداروں کو یہ معلوم ہونے لگا کہ بایں ہمہ ان کی حالت مایوس کن نہ تھی۔ اگر قدیم جاگیری نظام شکست ہو رہا تھا تو دوسرے اور طریقے زمین سے کام لینے کے موجود تھے۔ جہاں کہیں ممکن ہو بدل خدمت کے طریقے کی مزید توسیع کی مخالفت بلاشبہ بہترین پالیسی تھی۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا جا سکا اور زرعی مزدور بدستور کمیاب، زیادہ اجرت کے طالب اور بے لگام رہے تو دوسرا بہترین طریق کار یہ تھا کہ کوئی ایسی تدبیر معلوم کی جائے جس کے ذریعے سے مزدوروں کی حتی الامکان کم ترین تعداد لگا کر زمین سے بیشترین افادہ حاصل کیا جا سکے۔ چنانچہ دو تدبیریں کامیابی کی امید دلا رہی تھیں ایک تو یہ کہ بھیڑیں پالی جائیں اور دوسرے یہ کہ اراضی کو معہ مویشی پٹے پر دیا جائے۔ بھیڑیں پالنے کے متعلق کسی آیندہ باب میں مفصل بحث کرنا ضروری ہوگا۔ یہاں ہمارا تعلق صرف اس کے آغاز سے ہے۔ انگلستان میں اون کی پیدائش ہمیشہ منفعت بخش رہی! اڈورڈ سوم نے اونی صنعت کو انگلستان میں جس کامیابی کے ساتھ ترقی دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونی مصنوعات کی زیادہ بکری کا موقع ہاتھ آگیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کھیتوں پر بھیڑوں کے گلے پالنے میں کاشتکاری کے مقابلے میں محنت بھی بہت کم درکار تھی۔ اس موقع پر قابل زراعت زمین کو رمنے میں مبدل کر دینا ایک معقول چارہ کار معلوم ہوا۔ لیکن زمین کے بڑے بڑے رقبوں کے اطراف باڑ گھیرنا ضروری تھا، اور باڑوں کی تیاری نے نئے نئے جھگڑے پیدا کر دیے۔ سردست یہی مناسب ہے کہ ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف یہ ذہن نشین رکھا جائے کہ "کالی وبا" کے اہم نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ غلے کی کاشت کے بجائے بھیڑوں کے گلے پالنے کے طریقے نے روز افزوں ترقی کی۔ ۹۲

رہی دوسری تدبیر تو اس کے ذریعے سے مشکلات کا مقابلہ ایک دوسرے طریقے سے کیا گیا۔ جاگیردار نے ایک طرف بھیڑوں کی پرورش شروع کی تو دوسری طرف یا تو بذات خود یا اپنے نمایندوں کے ذریعے سے زمین کی کاشت کا سلسلہ ایسے طریق پر قائم رکھا کہ پہلے کے مقابلے میں بہت کم مزدوروں سے اس کا کام نکل سکتا تھا۔ زمین کو پٹے پر دینے کے معنی یہ تھے کہ زمیندار مزدور سے معاملہ کرنے کی ذمہ داری ایک درمیانی

شخص یعنی اپنے آسامی کے سر منتقل کر دیتا تھا۔ اس اسامی کی حیثیت اب بالکل نئی ہوگئی تھی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسامی لگان ادا کرتے تھے جس کی نوعیت عام طور سے بدل خدمت لگان کی ہوتی تھی جو جاگیردار کو یا تو خدمت کے عوض یا کسی نہ کسی قسم کی وابستگی کے اظہار کے طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن نئے آسامی جو لگان ادا کرتے تھے وہ زمین کو استعمال کرنے اور اس سے فواید حاصل کرنے کا معاوضہ ہوتا تھا گویا اس لگان کی بنیاد اراضی تھی نہ کہ خدمات یا وابستگی۔ اس لحاظ سے نئے پٹے پر زمین حاصل کرنے والے اسامی، موجودہ زمانے کے زمیندار اور مزدور کے درمیان کام کرنے والے درمیانی شخص یعنی کسان کے پیش رو تھے۔ اگرچہ اراضی معہ مویشی کا پٹہ لینے والے اسامی اور موجودہ زمانے کے کسان کی عام خصوصیت ایک ہی سی ہے، پھر بھی ان میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں۔ آجکل کے کسان کو اپنے کھیت کے لیے تمام ساز و سامان بطور خود مہیا کرنا پڑتا ہے اس کو زمیندار سے زمین اور متعلقہ عمارتوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ رہا تخم، مویشی، آلات کشاورزی اور محنت تو اس کا انتظام خود کسان کے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن ۱۳۴۹ء کا اسامی صرف محنت مہیا کرتا تھا۔ محنت کی فراہمی اس کے ذمے تھی، اور زمیندار بہت خوش تھا کہ اُسے اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں پڑتا تھا۔ لیکن چونکہ نئے آسامی عام طور پر نادار اور اپنے طور پر زراعت کا ساز و سامان مہیا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے زمیندار کھیت کا ضروری ساز و سامان خود مہیا کر دیتے تھے، تاکہ آسامی کاروبار کے قابل بن جائیں۔ اس کے معاوضے میں آسامی زمین کے استعمال کے لگان کے ساتھ ساتھ ساز و سامان کے استعمال کا سالانہ لگان بھی ادا کرتے تھے، اور حقیقت اراضی کی مدت ختم ہونے پر آسامی اس کا پابند ہوتا تھا کہ اس کو جو کچھ زمیندار سے وصول ہوا ہو یعنی تخم، غلہ، گھوڑے، بھیڑ، مویشی اور آلات کشاورزی، ان سب کو اصل حالت میں یا انکا مساوی معاوضہ بہ شکل زر ادا کر دے۔ مثلاً ۱۳۰۶ء[1] کے ایک پٹے میں آسامی کو ایک بیل دو گھوڑے اور سات ہل جوتنے کے گھوڑے[2] جن میں سے ہر ایک کی

۹۳

[1] Affri

قیمت ۱۰ شلنگ ہوتی تھی، دس گائیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۱۱ شلنگ ہوتی تھی، ۴ بیل جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۸ شلنگ ۵ پنس ہوتی تھی، ملتے تھے۔ ان کے علاوہ چوبیس کوارٹر گیہوں جن میں سے ہر ایک کوارٹر کی قیمت چھ شلنگ ۸ پنس ہوتی تھی ملتا تھا، اور جو، ہٹر، دالوں اور جئی وغیرہ بھی اسیطرح دی جاتی تھی۔ کھیت چھوڑتے وقت اسامی پابند ہوتا تھا کہ یا تو یہ سب اشیا اصلی حالت میں زمیندار کو واپس کردے یا اُن کا مساوی معاوضہ مویشی، جنس یا زر کی شکل میں ادا کرے۔ بعض اوقات ایک انوکھا انتظام کیا جاتا تھا جس کے تحت آسامی صرف اس وقت مویشیوں کی بابجائی کا ذمہ دار ہوتا تھا جبکہ جانور قلیل تعداد میں مرتے تھے۔ چنانچہ پٹے میں یہ قرارداد ہوتی تھی کہ اگر مرض مویشی رونما ہو اور اس کے باعث "ایک سال کے اندر انتیس یا اس سے کم بھیڑیں اور سولہ یا اس سے کم بھیڑیاں ہلاک ہوں" تو آسامی ان کا دین دار ہوتا تھا، لیکن تعداد اس حد سے متجاوز ہو جانے کی صورت میں جاگیردار کو نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ ایک کھیت میں ۲۹۴ بھیڑوں اور ۱۶۰ بھیڑی کا گلہ ہوتا تھا جن میں سے ہر ایک کی قیمت علی الترتیب ایک شلنگ چھ پنس اور ایک شلنگ تین پنس ہوتی تھی لہذا کاشتکار صرف اس وقت دین دار ہوتا تھا جبکہ شرح اموات ۱۰ فی صد سے متجاوز نہ ہو۔ لیکن بسا اوقات اس تعداد سے زیادہ اموات لازمی طور پر واقع ہوتی ہونگی اور اس طرح جاگیردار کے منافع کا بیشتر حصہ مویشیوں کے نقصان سے زایل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۵۰۷ء میں مگڈالن کالج آکسفورڈ کو اپنے آسامیوں کے ساتھ جنھوں نے اراضی کا پٹہ معہ مویشی حاصل کیا تھا، ۶۰۷ بھیڑوں کی حد تک رعایت کرنی پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ اراضی معہ مویشی کے پٹے کے طریقے سے لوگ "کالی وبا" سے پیشتر بھی واقف تھے۔ لیکن "کالی وبا" کے باعث زراعتی حالات نے جو نازک صورت اختیار کرلی وہ اس طریقے کے اختیار کرنے میں بڑی حد تک محرک ہوئی۔ کیونکہ اس میں فریقین کو حقیقی فوائد اور سہولتوں کی توقع تھی۔ زمیندار

اپنی زمین کے کچھ حصے کو پٹے پر دینے کے قابل ہو گئے جس پر وہ کچھ زمانہ قبل مزدوروں کی قلت کے باعث کاشت نہ کر سکتے تھے اور آسامی ایسی شرائط کو ترجیح دیتے تھے جن کی بنا پر انھیں داروغۂ جاگیر کے پنجے سے رہائی ملتی تھی اور وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے نفع میں شریک ہو سکتے تھے۔ جاگیردار تو مزدور حاصل کرنے کی دقت کو رفع نہ کر سکے، لیکن آسامیوں کو اس میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ چنانچہ مطلوبہ محنت کا بیشتر حصہ آسامی اپنے طور پر اور اپنے اہل وعیال کی مدد سے مہیا کر لیتا تھا، اور اگر اجرت پر مزدور حاصل کرنے پڑتے تو اس قدیم زمانے کے بارے میں شکایت یا افسوس کیے بغیر جبکہ اجرت ادنیٰ تھی وہ نئی شرح ادا کر دیتا تھا جو اس نے پہلے کبھی ادا نہیں کی تھی۔ لیکن یہ آسامی ابتدۃً چند ہی مزدوروں سے کام لیتے تھے اور مطلوبہ کام کا بیشتر حصہ خود ہی انجام دیتے تھے۔ یہ آپس کا معاملہ بہت خوش آیند تھا، اس لیے کہ اس نے لوگوں کو کام کی تشویق دلائی اور تندہی اور جفاکشی کے ساتھ کام کرنے پر ابھارا۔ بات اصل میں یہ نہیں تھی کہ "کالی وبا" کے بعد لوگ کام کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھے بلکہ یہ کہ کام کے خواستگار تھے، البتہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے سامنے اجرت کی قدیم شرح کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔

ان نئے طریقوں سے مسئلے کو حل ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ زمیندار اور آسامی کا جھگڑا رفع دفع ہو جائے گا ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ۱۳۸۱ء کی کسانوں کی بغاوت شدید بے رحمی کے ساتھ رونما ہوئی۔ یہ ناگہانی بغاوت آخر کیونکر رونما ہوئی؟ اس کے اسباب کی تلاش کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوری سبب ۱۳۸۰ء کا تکلیف دہ اور احتسابی نفری محصول تھا جو چار سال میں تیسری دفعہ عاید کیا گیا تھا۔ لیکن ان غریبوں کی پیٹھ پر معاشی بوجھ پہلے ہی سے اس قدر بھاری اور تکلیف دہ تھا کہ اس آخری اور خفیف سے اضافے کی برداشت کی بھی سکت باقی نہ تھی۔

زرعی غلام (ول یین) جو عوض خدمت ادا کر رہا تھا اس کے لیے شکوہ و شکایت کی کوئی حقیقی بنیاد نہ تھی۔ اس کو اپنا سارا وقت اپنی زمین کے لیے وقف

کرنا پڑتا تھا اور وہ اپنے جاگیردار کا خفیف سے بدل خدمت لگان کے سوا
کسی کا دین دار نہ تھا، پھر بھی اس کو جو کچھ شکایت تھی وہ یہی تھی۔ اس کے
بدل خدمت لگان کی مقدار "کالی وبا" سے پیشتر کی اُجرتوں کے معیار کے
مطابق مقرر کی گئی تھی[1] اور جاگیردار کو اُجرت پر مزدور حاصل کرنے کے قابل
بنانے کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے کہ اب اُجرت کی شرح میں اضافہ ہوگیا تھا۔
اس لحاظ سے جاگیردار کو تباہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تباہی اس کو منظور نہ تھی
اسی لیے اس نے اپنی زمین سے کام لینے کے ان نئے طریقوں کو اختیار کر لیا
تھا، اور اس طرح بدل خدمت کا طریقہ جاری ہونے سے پیشتر کے زمانے کے
مقابلے میں وہ حقیقی طور پر زیادہ منافعہ حاصل کر رہا تھا۔ جاگیردار کا از سر نو
خوشحال ہو جانا زرعی غلام کو بہت ناگوار معلوم ہوا اس لیے کہ اس کی تو آرزو
تھی کہ اپنے قدیم دشمن کو بالکل نیست و نابود دیکھے۔ ۹۵

لیکن بعض اشخاص کے لیے ناراضی اور بے اطمینانی کی زیادہ ٹھوس بنیاد
موجود تھی، اور یہ آزاد مزدور تھے۔ کاشت کے لیے ان کے پاس ذاتی اراضی
نہ تھی اور وہ غالباً ان کھیتوں سے نکل چکے تھے جہاں وہ زرعی غلاموں کی حیثیت
سے وابستہ تھے۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش بجز ان کی محنت کے نہ تھا، اور اس
محنت کی مانگ اب بہت کم ہو گئی تھی یا بالکل نہ تھی۔ قدیم زمانہ جس کو وہ
اچھا سمجھتے تھے اب باقی نہ رہا تھا، اگرچہ وہ بہت زیادہ قدیم نہ ہوا تھا۔
بہر حال اس زمانے میں محنت اس قدر کمیاب تھی کہ مزدور اپنے حسب دلخواہ
اجرت طلب اور حاصل کر سکتے تھے۔ چونکہ اب زمین سے نئے طریق پر کام
لیا جا رہا تھا اس لیے زمین پر مزدوروں کے واسطے بہت کم گنجائش باقی تھی۔
چنانچہ جہاں کئی ایکڑ کے کھیت پر کاشت کرنے کے لیے مزدوروں کی بڑی

[1] کالی وبا کے بعد جہاں کہیں خدمات کی بجا آوری کے بجائے معاوضہ بشکل زر یا جنس ادا کرنے کے طریقے
پر عمل ہوا وہاں اسی معیار سے اتنا عمل قائم رکھا گیا اس لیے کہ جاگیرداروں کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ
اضافۂ اجرت کے بالمقابل لگان میں اضافہ کرنے کا بھی انھیں موقع نہ ملا۔

تعداد درکار ہوتی تھی وہاں اب اتنے ہی رقبے کے رہنے کی نگہداشت کے لیے ایک یا دو گلہ بان یا چرواہے کافی تھے۔ محنت کی کمی کو رفع کرنے کی خاطر جاگیرداروں نے ایسا طریقہ اختیار کرلیا جس کی بنا پر یہ قلیل سی تعداد بھی ضرورت سے زاید ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں چونکہ جاگیردار مزدوروں کی مطلوبہ تعداد حاصل کرنے پر قادر ہو گئے اس لیے ان مزدوروں کی نگرانی شاہت قدمی کے ساتھ کرنے کے لیے ان کی ہمت بڑھ گئی۔ مگر نافذ کردہ قوانین بالکل مہمل ثابت ہوئے تھے۔ لیکن ۱۳۶۱ء میں ناظم دیوانی[1] مقرر کیے گئے جن کے سامنے شاکی زمیندار ایسے مزدوروں کو پیش کرسکتے تھے جو پارلیمنٹ کی مقرر کردہ شرح اُجرت کو نہیں قبول کرتے تھے، اور جو مزدور اس کے بعد بھی ماننے سے انکار کرتے تھے انھیں ناظم قید کی سزا دیا کرتے تھے آخر کار جاگیرداروں کی مالی حیثیت ایسی ہوگئی کہ وہ قانونی کارروائی کرسکتے تھے۔ چنانچہ مزدور کے جیل میں مقید رہنے کے باوجود جاگیردار کی بھیڑیں پھلتی پھولتی رہتی تھیں، اور اون پیدا ہوتی تھی۔ مزدور یا تو قید میں پڑا رہتا تھا یا ادنی اُجرت پر کام کرتا تھا یا بے روزگاروں کے زمرے میں شریک ہو جاتا تھا۔

ایسے بدقسمت زرعی غلام جو بدل خدمت پیش کرنے کی کبھی قابلیت ہی نہیں رکھتے تھے گو چند ہی تھے، لیکن ان کی حالت اور بھی زیادہ خستہ و خراب تھی۔ اور اس طرح انھوں نے خود کو اُن مواقع سے فایدہ حاصل کرنے کے بالکل ناقابل پایا جو معاشری حالت کی درستی کے لیے اب موجود تھے۔ غالباً ان کی کوئی بڑی جماعت تو نہ تھی لیکن چونکہ ان کے شکوہ شکایت کی بنیاد معقول تھی اس لیے بغاوت وسرکشی میں یہ جماعت سب سے پیش پیش رہی۔ ۹۶

غرض یہ تھے بے اطمینانی و بے چینی کے معاشی اسباب جو سب پر اثر انداز ہو رہے تھے اور بعضوں کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوئے۔

[1] Justice of The Peace

تاہم جو شورش ہوئی وہ فرانس کے کاشتکاروں کی سرکشی کی طرح محض روندے ہوئے حشرات الارض کی کروٹ نہ تھی بلکہ غالباً امید سے بھری ہوئی بغاوت تھی۔ طاعون کے سلسلے میں قوانین فطرت نے بہت کچھ کر دیا تھا اب انسان کی باری تھی کہ اس سے زیادہ کر دکھائے۔ یہ واضح طور سے معلوم ہو گیا کہ ایک عظیم الشان زراعتی انقلاب واقع ہوا تھا اور زرعی غلام کی حیثیت کا باقی رہنا ایک بے قاعدہ بات معلوم ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جو لوگ معاشی حیثیت سے آزاد تھے وہ قانونی حیثیت سے پھر بھی جاگیری نظام کی قدیم سرفیت (غلامی) کے تحت تھے۔ زرعی غلام کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا طریق تو باقی نہ رہا تھا یا جلد غائب ہو رہا تھا، لیکن قانونی مجبوریوں کے معدوم ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ اگر "معاہدہ" تبدیل ہو رہا تھا تو "حیثیت" میں بھی تغیر ہونا لازم تھا۔ پس اس طرح بے اطمینانی نے منظم صورت اختیار کر لی اور "انجمن عظیم"[لہ] کی شاخیں ہزارہا موضعوں میں قائم ہو گئیں۔ باغیوں نے اشتمالیت کی کوئی قطعی تجویز نہیں پیش کی، پھر بھی ان کے مطالبات کافی قطعی تھے یعنی شخصی آزادی اور ہر قسم کی خدمات کے عوض فی ایکڑ ۴ پنس لگان۔

بدترین بلوہ لندن سے متصل علاقوں میں رونما ہوا اور کینٹ، ایسکس اور اور ہرٹ فورڈ شائر کے تمام کسانوں نے لندن پر چڑھائی کر دی۔ لیکن بلوہ صرف ان ہی مقامات تک محدود نہ تھا، بلکہ مشرقی علاقے یارک شائر اور ڈیون شائر بھی متاثر ہوئے۔ طریق کار یکساں نوعیت رکھتا تھا یعنی کسان یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ زرعی غلامی اور خدمات کی بجا آوری کے طریقوں کو منسوخ کیا جائے اور معقول شرح لگان پر زمین دی جائے۔ یہ امر کہ حملہ زیادہ تر جاگیرداروں کے خلاف تھا اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ جاگیرداروں کے سب مکان اور خاص کر پناہ گاہیں جلا دی گئیں کیونکہ یہ قابل نفرت زرعی غلام (سرفیت) کی علامات تھیں۔ جاگیرداروں کی گرنیاں اور چکیاں اس لیے تباہ کر دی گئیں کہ زرعی غلاموں کو یہیں غلہ پیسنے کے لیے

لہ۔ Great Society

مجبور کیا جاتا تھا۔ بعض قانون دانوں اور وکیلوں کو محض اس بنا پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا کہ یہ لوگ کسانوں کے خیال میں ان پر ظلم وستم کرنے والوں کے ساتھ شیر وشکر تھے۔ اگرچہ تعداد عام طور پر زیادہ نہ تھی، پھر بھی ان کی مقاومت ابتدائً کمزوری کے ساتھ کی گئی۔ سفوک کے باغیوں کی ایک بڑی جماعت میں سے جو جان ور او کی سرکردگی میں تھی، سترہ آدمیوں کے ایک دستے نے تھیٹ فورڈ پر حملہ کیا، میر بلد اور شہریوں کو طلب کیا اور اپنے سردار کے نام کا خوف دلا کر انھیں مجبور کیا کہ شہر کو بچانے کے لیے چالیس مارک بہ شکل طلا بطور فدیہ ادا کریں۔ خانقاہ کے صدر راہب کے گاڑی بان کی سرکردگی میں چار سو آدمیوں نے بنی ڈکٹ ڈی ہلم کی خانقاہ پر رات کے وقت حملہ کیا، لیکن راہب حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے نماز میں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بلوائیوں کو پسپا کر دیا۔ اس حملے میں کئی غیر مقبول زمیندار اور ناظم عدالت قتل ہو گئے۔ جان ڈی کیونڈش کا تعاقب کیا گیا تو وہ بھاگتے بھاگتے ندی کے کنارے آکر رکا اور ایک ناؤ میں سوار عورت کو آواز دی کہ اس کو ندی پار کرا دے لیکن عورت کو جب اس کا نام معلوم ہوا تو ناؤ کو ساحل سے ہٹا کر اس کو تعاقب کرنے والوں کے انتقام کے لیے چھوڑ گئی۔ چنانچہ شورشیوں نے اس کا سر کاٹ لیا۔ کیمبرج کے شہریوں نے کارپس کرسٹی Corpus Christi کی خانقاہ میں لوٹ مار کا منظر دیکھا، جہاں ایک بوڑھی لڑاکا عورت مارگریٹ اسٹار بیش بہا دستاویزات جلا کر ان کی راکھ ہوا میں اڑاتے ہوئے چلا رہی تھی کہ "محرروں کا علم مردہ باد"۔ جب بلوائی پایہ تخت کے قریب پہنچے تو ایک ہنگامہ مچ گیا اور رچرڈ نے آزادی اور معافی کے وعدے کر کے اہل ایسیکس کے جوش اور غصے کو فرو کیا۔ لیکن کسانوں نے اپنے احمقانہ ظلم وتشدد سے خود اپنے معاملے کو آپ بگاڑ لیا۔ انھوں نے غالباً یہ خیال کیا کہ بادشاہ کے وعدے پورے نہ ہوں گے اس لیے کہ ان کا پورا کرنا واقعی اس کے اختیار سے باہر تھا۔ انکو معافی تو وہ دے سکتا تھا، لیکن ان کے جاگیرداروں کے جو واجبات ان کے ذمے تھے ان سے رہائی نہیں دلا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں جب ان سے اپنی شکایتوں کو

۹۰

پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ اس کے سوا کوئی قطعی مطالبہ نہ کر سکے کہ زمین معقول شرح لگان پر اُٹھائی جائے۔ لیکن اس مطالبے کے بعد ہی انھوں نے کنٹربری کے اسقف اعظم، خزانچی اور نفری محصول کے ذمہ دار عہدہ دار کو قتل کر دیا تو قوم کے بڑے حصّے کو یہ بات فوراً محسوس ہوئی کہ بلوائیوں کو مغلوب کرنا ضروری تھا۔ اس طرح تائید ملنے پر رچرڈ بہت جلد صورت حال پر قابو حاصل کرنے کے قابل ہو گیا۔ بلوائیوں کے ساتھ بہت سختی کا برتاؤ کیا گیا اور ناروچ کے اسقف اسپنسر نے مشرقی اضلاع کے باغیوں کے خلاف خاص طور سے شدید کارروائی کی۔[۱] اس لیے مقدس پادری نے لندن چھوڑا اور اپنے لوگوں کی دستگیری کی غرض سے جس کے لیے وہ مجبور تھا آ پہنچا۔ شروع ہی میں جب کیمبرج میں کچھ بلوائیوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے بعضوں کو قتل کیا، بعضوں کو قید کیا، اور باقی کو اُن کے گھروں کو یہ سوگند لے کر واپس کیا کہ وہ آیندہ اس قسم کے کسی مقصد کے لیے پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔" بادشاہ نے اپنے ابتدائی مراعات کے جواز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور پارلیمنٹ نے یہ اعلان کر کے اس کی تائید کی کہ بغاوت کے زمانے میں جتنوں کو معافی اور رہائی دی گئی تھی وہ سب منسوخ کر دی گئی۔ اور یہ کہ جنھوں نے یہ شکایت کی کہ منشوروں اور دستاویزات کے جلا دیے جانے کی وجہ سے نقصانات برداشت کرنے پڑے انھیں اس کی اجازت دی گئی کہ ان دستاویزات کے مندرجہ حقوق کو اس طرح نافذ کریں کہ گویا دستاویز اور منشور ابھی تک موجود تھے۔ ہر اُس شخص کو جو بارہ سال کی عمر تک کاشتکاری میں حصہ لیتا رہا اپنا پیشہ ترک کر کے دوسرے پیشے میں جانے کی ممانعت کی گئی یا ناداروں کے بچوں کو تعلیم دینا ممنوع قرار دیا گیا کہ مبادا وہ کلیسا میں داخل ہو کر زرعی غلامی (سرفیت) سے بچ نکلیں۔

اس طرح کسانوں کی بغاوت اس موقع پر ناکام رہی۔ مزدوروں نے

---

[۱] دیکھو ای پاول کی کتاب "مشرقی انگلیا کا بلوہ"۔ Rising in East Anglia

آزادی عطا کرنے کے لیے جاگیرداروں کو دھمکی نہیں دی۔ ان کی آزادی اس وقت نہیں بلکہ آیندہ دو صدیوں میں جاکر بتدریج تکمیل کو پہنچی اور اس صورت میں بھی تشدد و ظلم کے ذریعے سے نہیں بلکہ قدرتی اسباب کی مستقل کارفرمائی کی وجہ سے آزادی حاصل ہوئی۔ چنانچہ قدرتی اسباب کی بنا پر زرعی غلاموں کی قدر و قیمت میں کمی ہو گئی۔ اس طرح انجام کار جاگیردار اس کو زیادہ دیر تک رکھنے کے قابل نہ سمجھ کر جلد دست بردار ہو گئے۔ اس خیال میں بظاہر ایک حد تک معقولیت پائی جاتی ہے کہ "کالی وبا" کے بعد جاگیرداروں نے مزدوروں کو ستانا شروع کیا یہاں تک کہ مزدوروں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور اس زنجیر کو توڑ دیا جس میں وہ بندھے ہوئے تھے۔ لیکن اصلی واقعات اس نظری توجیہ سے زیادہ پیچیدہ اور نتائج بہت دوررس ہیں۔ چنانچہ چودھویں صدی کی کشمکش کے نتیجے کا صحیح اندازہ قایم کرنے سے بیشتر ہمیں اس زمانے کے فسادات و مصائب کے دوررس اثرات و نتائج کا سراغ لگانا پڑے گا جیسے کہ تاریخ انگلستان کے متعاقب دور میں ملتے ہیں۔

باب

شہروں اور تجارتی جتھوں کی بعد کی ترقیاں

کالی وبا کے اثرات دیہات و اضلاع میں اس قدر شدید اور دوررس تھے کہ ان کو "انقلاب انگیز" کہنا سزاوار ہے۔ یہ اثرات انقلاب انگیز اس پالیسی کے لحاظ سے تھے جو جاگیردار اور مزدور دونوں نے اختیار کی تھی؛ یعنی ایک وضع آئین قوانین کی مدد سے رجعت پسندی کا اظہار اور مزید تغیر کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا، تو دوسرا معاہدے کی حقیقی آزادی کے لیے جد و جہد کر رہا تھا جو بڑی حد تک بالکل نئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی فریق بھی اپنا مقصد تمام و کمال حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ علاقہ داری زرعی غلامی (سرفیت) کی تجدید نہ تو بڑے پیمانے پر ہوسکی اور نہ اس کے برخلاف وہ کاشتکاروں کی بغاوت سے بالکل نیست و نابود ہوگئی۔ اس آویزش اور تصادم سے دولتمندوں اور ناداروں کے درمیان ایک تازہ مخالفت اور دشمنی پیدا ہوگئی اور ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ دوسرا اس کا دشمن ہے اور غیر معقول طور پر نقصان پہنچانے کا خواہاں ہے۔ لیکن مخالفت میں اس پیمانے پر ترقی نہیں ہوئی۔ دشمنی کی انتہائی حالت ختم ہوگئی اور

99

کاشتکاری، پٹہ داری اور گلہ بانی کے نئے طریقوں نے اس کو بتدریج جذب کر لیا یا اس کا رُخ پھیر دیا۔ لیکن چونکہ یہ طریقے بھی نئے تھے اس لیے انھوں نے انگلستان کی زراعتی تاریخ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یہ کہنا بلا شبہہ بہت ہی مہمل بات ہوگی کہ اگر کالی وبا کا واقعہ نہ ہوتا تو ملکی کاشتکاروں کی بڑی جماعت کبھی وجود میں نہ آتی اور انگلستان کبھی اون پیدا کرنے والا بڑا ملک نہ بنتا۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ تغیرات چودھویں صدی کے آخری حصے میں بہت تیزی کے ساتھ رونما ہوئے، ان کا سلسلہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں بھی جاری رہا اور کالی وبا کی عام تباہ کاری نے ان کے حق میں محرک کا کام کیا۔

کالی وبا کی تباہ کاری دیہات کے مقابلے میں شہروں میں کسی طرح کم نہ تھی۔ خواہ کوئی شخص لندن کا حال پڑھے جہاں پارلیمنٹ اجلاس کرنے سے خائف تھی، یا نارویچ کا حال پڑھے جہاں کلیسائی قبرستان اس طرح بھر گئے تھے کہ زمین کی سطح کو بلند کرنا پڑا اور اس کے بعد بھی لاشیں غیر مدفون پڑی رہیں یا کولچسٹر کا حال پڑھے، جہاں ہر تین شہریوں میں سے ایک فوت ہوا تھا ہر جگہ اموات کی تعداد کا ایک ہی رنگ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص دیہات کی حالت کو زیادہ صحت بخش تصور کرنے اور شہروں کو ان کے مقابلے میں امراض کا گھر خیال کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اس لیے کہ شہروں میں تنگ و تاریک گلیوں اور مکانوں کے ہجوم کے باعث حفظ صحت کے انتظام میں بہت سی مشکلات ہوتی ہیں، چنانچہ شہروں کے غیر صحت بخش ہونے کا یہ مفروضہ اس بنا پر پوری طرح حق بجانب ثابت ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی میں طاعون یا وبائی بخار کا مسلسل دور دورہ رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۴۰۶ء سنہ ۱۴۳۴ء اور سنہ ۱۴۷۹ء میں لندن پر اس کا شدید حملہ ہوا، سنہ ۱۴۷۶ء میں ہل میں بکثرت موتیں ہوئیں اور باقی ماندہ اشخاص فرار ہو گئے جس کی وجہ سے شہر بالکل ویران ہو گیا، اور سنہ ۱۴۷۷ء میں نارویچ پر دوبارہ حملہ ہوا۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وبا کے حملے سب کے سب شہروں پر ہوئے لیکن جب سنہ ۱۳۴۹ء اور

سنہ ۱۳۵۰ء میں شہر اور دیہات یکساں طور پر اس مرض میں مبتلا ہوئے تو شہروں میں کچھ خاص طور پر اہم یا انقلاب آفریں اثرات رونما نہیں ہوئے۔ معمولی اثرات بے شک رونما ہوئے، چنانچہ قوانین مزدوران سے معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں کے تغیر نے مزدوروں کی طرح دستکاروں کو بھی متاثر کیا۔ لیکن شہروں کی اُجرت اور قیمت ہمیشہ تجارتی جتھوں کی جانب سے اور بلدی ضوابط کے ذریعے سے حق و انصاف کے اصول پر مقرر کی جاتی تھی۔ جو چیز وقوع میں آچکی تھی اگر اس کو معقولیت کے ساتھ قبول کر لیا جاتا تو کوئی شدید تکلیف و مصیبت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ ملک کو سخت ترین مصائب محض اس لیے برداشت کرنے پڑے کہ زمیندار رفتار زمانہ کا ساتھ دینے کی بجائے رواج ہی کی پیروی کر رہے تھے، اور جب حالات میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا تو رواج کا عمل دخل باقی نہ رہ سکا۔ اشیائے خورد و نوش کی عارضی قلت کے سوا شہروں پر جو اثرات پڑے ان کا ماخذ و منبع شہر کے باہر تھا، چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ زرعی ہنگامے ان کا باعث تھے۔ شہر مزدوروں کے لیے جاذبیت اور دلکشی رکھتے تھے۔ اگر مزدور اپنی گزر بسر کے لیے ناکافی اُجرت قبول کرنے سے بچنے کے لیے متفکر تھے تو قدرتی طور پر ان کے لیے دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کسی شہر میں جا کر دستکاری سیکھیں اور اگر انھیں آزادی نہ ملتی تو کسی شہر میں ایک سال لاوارثی طور پر سکونت اختیار کرنے سے آزادی حاصل کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اسی وجہ سے مزدور دیہات سے شہروں میں منتقل ہو رہے تھے اور اس نقل و حرکت نے مخصوص قسم کی خرابیاں پیدا کیں، کیونکہ نو وارد بالعموم اس قدر غریب ہوتے تھے کہ تجارتی جتھوں کے داخلے کی فیس ادا کرنے تک کی ان میں استطاعت نہ ہوتی تھی یا وہ جتھوں کے قواعد و ضوابط سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح جتھوں کے ارکان کے معتوب بن جاتے تھے۔ اگرچہ اس چیز کو ایک حد تک کالی وباہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ براہ راست کالی وبا کا نتیجہ یا اثر نہ تھی۔ شہروں میں جو راست اثرات رونما ہوئے وہ حقیقی اموات کے قطع نظر بہت ہی کم تھے۔

۱۰۱

اڈورڈ اول اور اڈورڈ سوم نے خاص خاص مقامی حقوق و مراعات کی تحدید کرکے یا کسی طرح ان کو شاہی اقتدار کے تحت لاکر یا غیر ملکیوں کو ان کے حسب دلخواہ آمد و رفت اور خرید و فروخت کی اجازت دے کر سارے انگلستان کو ایک ہی معاشی رقبہ تصور کرنے کی جو کوشش کی اس کا حال مذکور ہوچکا ہے۔ اس قسم کی پالیسی کو انگریز تاجروں نے عام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بلکہ بادشاہ نے ان کو اطاعت پر مجبور کیا تھا اور اس طرح اڈورڈ سوم کے دور حکومت کے آخری پچیس سال میں اجنبیوں اور پردیسیوں کو تقریباً کامل آزادی سے متمتع ہونے کا موقع ملا۔ یوں تو یہ آزادی موجودہ زمانے کی آزاد تجارت کے حامی کی نظر میں چودھویں صدی کے لیے غیر معمولی روشن خیالی اور ترقی معلوم ہوتی ہے لیکن سچ پوچھو تو پارلیمنٹ کے نشوونما کی طرح جو اس دور حکومت اور لنکاسٹرین بادشاہوں کے عہد حکومت کی امتیازی خصوصیت تھی قبل از وقت تھی جس طرح بیت العوام کے اغراض بڑے بڑے بیرنوں کے خاندانوں کی باہمی کشمکش کے باعث پامال ہوئے اس طرح صارفوں کے احتیاجات و مطالبات کی شنوائی اس چیخ پکار میں نہ ہوسکی جو تاجر اور دستکار اجنبیوں کے خلاف مچا رہے تھے حقیقت یہ ہے کہ اڈورڈ سوم کی وفات کے بعد ہی ایک نیا دور شروع ہوگیا جس کو ردِ عمل کا دور کہنا چاہیے اس لیے کہ اس میں شہروں نے اپنے خاص خاص قدیم حقوق از سرنو حاصل کرلیے۔ رچرڈ دوم کی پالیسی ابتداءً تغیر پذیر رہی۔ ایک طرف رچرڈ پر اثر انداز ہونے والی شے اس کے جد کے زمانے کی روایات تھیں، نیز زمیندار بھی جو پارلیمنٹ پر چھائے ہوئے تھے اجنبیوں کو ناپسند نہ کرتے تھے بلکہ وہ دراصل یہ خیال کرتے تھے کہ اگر ان کی ہمت افزائی کی جائے تو انگریزی اون کی اچھی قیمت مل سکے گی۔ دوسری طرف شہری یہ چیخ پکار کر رہے تھے کہ پردیسی انگریزی تجارت میں حصہ لے کر ان کی روٹی چھین لے جا رہے تھے اور انھوں نے اس واقعے کی جانب کسی قدر زور دے کر اشارہ کیا کہ انگلستان میں جو پردیسی مقیم تھے وہ تو اپنی مرضی کے مطابق کاروبار چلاتے تھے اور بیرونی ممالک میں جو جو انگریز تاجر تھے انھیں بود و باش اختیار کرنے یا خوردہ فروشی کرنے کے بارے میں

۱۰۲

اس قسم کے حقوق حاصل نہ تھے بلکہ ان کے کاروبار پر بہت سختی کے ساتھ بندشیں عاید کی جاتی تھیں۔ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ بادشاہ زمینداروں کی تائید کرتا اور اور اگر یہ لوگ پورے جوش وخروش اور اتحاد سے کام کرتے تو یہ اغلب تھا کہ وہ ان کا ساتھ دیتا۔ لیکن انگریزی پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ انگریزی اون کی کھپت ملک ہی کے اندر زیادہ مقدار میں ہو رہی تھی اور بیرونی خریداروں پر اون نکالنے والوں کا انحصار گھٹتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے زمیندار اس معاملے میں بے پروائی کر رہے تھے۔ اہل شہر خاص کر لندن کے باشندے اپنے ارادے میں زیادہ مصمم ہوتے گئے۔ بادشاہ خود لندن ہی میں مقیم تھا اس لیے لندن والوں کے اکثر خیالات سے اس کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ رچرڈ دوم زیادہ تر لندن کے تاجروں سے قرض لیا کرتا تھا اور زر حاصل کرنے کی خاطر تاجروں کی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر اور بھی زیادہ مایل تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۹۲ء میں پارلیمنٹ نے یہ قانون نافذ کیا کہ چونکہ لندن اور دوسرے شہروں کو ان قوانین وضوابط سے بہت ضرر پہنچا تھا جن کی رو سے اجنبیوں کو آزادی عطا کی گئی تھی، اس لیے آیندہ سے نہ تو کوئی پردیسی تاجر کسی دوسرے اجنبی تاجر سے بجز سامان خورونوش کے کسی دوسری شے کی خرید وفروخت یا خردہ فروشی کرے اور نہ کوئی ایسا مسالہ برآمد کرے جو ایک دفعہ ملک میں درآمد کیا جاچکا ہو۔

اجنبی کے مقابلے میں انگریز تاجر کی یہ ایک فتح اور دیرپا فتح تھی۔ اجنبی کو اڈورڈ سوم کے دور حکومت میں جیسی آزادی ملی ہوئی تھی ویسی آزادی دوبارہ حاصل ہونے سے پیشتر صدیاں درکار تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ شہری ان بندشوں اور قیود کو اور آگے بڑھانے کے خواہاں تھے چنانچہ انھوں نے اجنبیوں کو نہ صرف آپس میں معاملہ کرنے اور خردہ فروشی کرنے بلکہ تھوک فروشی میں بھی حصہ لینے سے روکنے کی سعی کی بجز ان صورتوں کے جن میں فریق ثانی آزاد شہری ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہر اجنبی کو "میزبان" کی تحویل میں رکھیں، یعنی اجنبی کسی شہری کے پاس رہے تاکہ اس پر سختی کے ساتھ نگرانی رکھی جاسکے۔ لیکن ان مقاصد میں وہ صرف جزوی

۱۰۴۳

حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۴۰۶ء کے قانون نے اجنبیوں کو اس کی صاف طور پر اجازت دیدی کہ بادشاہ کی رعایا میں سے کسی سے بھی ٹھوک فروشی کریں۔ تاہم رائے عامہ اجنبیوں کی تجارت کی بہت شد و مد کے ساتھ مسلسل مخالف رہی جیسا کہ ۱۴۹۳ء میں "اسٹیل یارڈ" کے خلاف عظیم الشان ہنگامے سے ثابت ہوا۔ اجنبی تکلیف دہ محصولوں اور چنگی سے بھی نہ بچ سکے۔ یہ شکایت عام تھی کہ کیلے کی بندرگاہ پر ۳ پنس ادا کرنے کے بعد ڈوور پر بھی ۴ پنس ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ ۶ پنس ایک اقرار نامہ تحریر کرنے کے واسطے لیے جاتے تھے کہ درآمدہ اشیا کی قیمت کے ہمقدر انگریزی اشیا خریدی جائیں گی اور اتنی ہی فیس ایک نگران عہدہ دار کو ادا کرنی پڑتی تھی جس کا کام فریب و دغا وغیرہ کو روکنا تھا۔ اس طرح ہر گٹھری یا بہنگی پر سب ملا کر ۶ یا ۷ شلنگ محصول پڑ جاتا تھا۔ ۱۴۳۹ء کے ایک قانون کی رُو سے سب اجنبیوں پر یہ لازم گردانا گیا کہ وہ اپنی آمد کی اطلاع تین دن کے اندر حکّام متعلقہ کو کردیں۔ چنانچہ حکام متعلقہ انھیں مناسب "میزبانوں" کے یہاں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان میزبانوں پر یہ واجب گردانا گیا تھا کہ خزانے پر باقاعدہ فرد حساب بھیجتے رہیں اور اپنے مہمانوں کے لین دین کے متعلق ایک یادداشت رکھیں اور ان کے بیچے ہوئے یا خریدے ہوئے کل سامان تجارت کی قیمت پر بحساب فیصد کچھ وصول کریں۔ بندشوں اور جاسوسی کے اس نظام سے اُس زمانے کی تنگ خیالی کا پتا چلتا ہے۔

اگرچہ حکومت نے ملکی تاجروں کی خواہشیں تمام وکمال پوری نہیں کیں اور اگرچہ اجنبیوں کو "میزبانوں" کی تحویل و نگرانی میں رکھنے کا طریقہ پندرھویں صدی کے آخری حصے میں موقوف ہوگیا، پھر بھی ایک معاملے میں علٰحدہ رکھنے کی پالیسی کامیاب رہی۔ یعنی اجنبیوں کو خردہ فروشی میں حصہ لینے یا آپس میں تجارت کرنے سے روکا گیا۔ یہ دراصل اُس نئی تجارتی پالیسی کی ابتدا کی صرف ایک خصوصیت تھی جس کو اس کے بعد زیادہ تفصیل کے ساتھ جانچنا ضروری ہوگا۔ اس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ شہروں کے اُن خاص استثنائی حقوق کو بحال کیا جائے جو ایک حد تک معدوم ہو چکے تھے، اگرچہ اُن حقوق کی بنیاد وہی نہ تھی جو پہلے تھی۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ ابتداءً تجارتی جتھوں نے تاج سے بے تعلق رہ کر یا زیادہ سے زیادہ ۱۰۴

اس کی منظوری سے اپنا کام انجام دیا تھا، اور بعد میں چل کر تجارتی جتھے قطعی طور پر اس کے حکم کے تابع ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع ہی سے ان جتھوں کے اختیارات و احکام کا ماخذ شاہی منشور تھے۔ لیکن جو فرق رونما ہوا اکی نوعیت کسی حد تک یہ تھی کہ جوں جوں پارلیمنٹ کا اقتدار بڑھتا گیا اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور جتھوں کا اختیار گھٹتا چلا گیا۔ وہ آخر دنوں میں بھی بہت کچھ قوانین نافذ کرتے رہے، لیکن پارلیمنٹ کے حکم سے۔ گویا وہ کارندے تھے جن کے توسط سے پارلیمنٹ اپنا کام کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات بھی جاتی رہی اور براہِ راست آئین سازی کا طریق زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا چلا گیا۔

پندرھویں صدی میں شہروں کی عام حالت و ترقی کا حال بیان کرنے کی کوشش میں ہم دوبارہ اُس مشکل سے دوچار ہوتے ہیں جس سے اس سے پیشتر ہمیں سابقہ پڑا تھا۔ اگر ہم اپنے آپ کو تعمیمات تک محدود رکھیں تو یہ خطرہ ہے کہ یہ صرف ایک حد تک اور تخمیناً صحیح ہوں گے۔ سب شہر یکساں اور مقررہ مرحلوں سے نہیں گزرے اور اگر ترقی یکساں اور مقررہ بھی تھی تو وہ ایک ہی مقررہ وقت میں رُونما نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر شہر اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم انفرادی خصوصیات کو معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ممکن ہے کہ بے شمار تفصیلات میں پڑنے کی وجہ سے اصل ترقی کا حال نظر سے پوشیدہ ہو جائے۔ پس جب اس کا امکان ہے کہ تعمیمات غیر صحیح ہوں تو یہ ضروری ہے کہ جو کچھ عام نتائج اخذ کیے جا سکتے ہوں اخذ کر لیے جائیں اور ان کو لندن اور دوسرے بڑے شہروں میں سے ایک یا دو شہروں کے واقعات کی مثال سے واضح کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس خیال کو دل میں جگہ نہ دینی چاہیے کہ ایک شہر کے بارے میں جو بات صادق آتی ہے وہ لازمی طور پر دوسرے شہر کے بارے میں بھی صادق آئے گی۔

تیرھویں صدی میں شہری زندگی کی اساسی خصوصیت یہ تھی کہ تاجروں کے جتھے نمودار ہوتے تھے، جن کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کی کل جماعت کو جو شہر میں تجارت کرنا چاہتے تھے اپنا رکن بنالیں اور یہی جتھے تجارت اور صنعتوں کے لیے

بحیثیت مجموعی قواعد و ضوابط جاری کرتے تھے۔ چودھویں صدی میں صنعتیں زیادہ تخصیص یافتہ جماعتوں یعنی دستکاروں کے جتھوں کی نگرانی میں آگئیں جن میں سے ہر ایک تجارتی جتھے یا شہر کے حکام کی نگرانی میں اپنی حرفت کے ارکان کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کرتی تھی۔ چودھویں صدی کے دوران میں تجارتی جتھوں کی عملی اہمیت کم ہوگئی۔ محض نام اور کہیں کہیں اختیارات باقی رہ گئے لیکن یہ اختیارات بھی عام طور پر برائے نام تھے۔ اڈورڈ سوم نے شہروں کے خاص حقوق میں جو رخنہ ڈالا وہ حقیقت میں تھوڑے زمانے تک باقی رہا۔ تاہم جب رچرڈ دوم کے دور حکومت میں شہروں کو اپنے اکثر حقوق ازسر نو حاصل ہوگئے تو تجارتی جتھوں کو اختیارات واپس نہیں ملے۔ بلکہ میر بلد اور شہر کے عہدہ داروں یا حرفتی جتھوں کے متمول ارکان کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئے۔ اس طرح حرفتی جتھوں کی متعاقب تاریخ ہی کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ 105

خواہ ہم تجارتی جتھے کے لیے تجارتی انجمن یا حرفت یا پیشہ یا کمپنی میں سے کوئی سا لفظ ایک ہی قسم کے پیشوں کے آدمیوں کو متحد کرنے والے نظام کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کریں، واقعہ یہ ہے کہ جتھا بندی کا طریق ایک استثنا کے ساتھ تمام انگلستان میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک صنعت جو مستثنیٰ رہی بہت ہی اہم ہے اور وہ اونی صنعت ہے جو اس وقت تک سلطنت بھر میں پہلی صنعت تھی۔ اس کی انوکھی ترقی کی نسبت مکرر بحث کی ضرورت ہوگی۔[1] لیکن باقی پیشوں پر ایک ساتھ ملا کر بحث کی جا سکتی ہے۔ آغاز اس طرح ہوا کہ کسی شہر کے خاص پیشے کے مزدور اکٹھے ہو کر اور تجارتی جتھے یا بلدی حکام کی ماتحتی و نگرانی میں اپنی ایک جماعت قائم کر کے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئے۔ ان جماعتوں کا مقصد ابتداءً اس سے زیادہ نہ تھا کہ اپنے پیشے یا دھندے کو اس زمانے کے مثالی تصور کے مطابق منظم کریں۔ یہ لازم گردانا گیا تھا کہ عمدہ شے واجبی قیمت پر مہیا کی جائے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ کام کی نگرانی کی جائے تاکہ فریب اور بے ایمانی

[1] دیکھو باب۔

کی گنجایش نہ رہے، کسی پیشے کی تعلیم پانے والے بطور کار آموز رہیں؛ کوئی پیشہ کرنے والے اسی فن یا ہنر سے تعلق رکھیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جوں جوں تجارتی جتھوں کو زوال آتا گیا یا حرفتی جتھے ان کی جگہ لیتے گئے نئی تبدیلیاں اور ترقیاں رُونما ہونے لگیں۔

۱۰۶ (۱) حرفتی جتھے علحدگی پسند ہو گئے اور ایک لحاظ سے وہ فی الحقیقت ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ایسے لوگوں کی مسابقت کے خلاف ناراضی کا اظہار کیا جو اپنا پیشہ جتھے کا رکن بنے بغیر کرتے تھے۔ لیکن جتھوں نے جہاں ابتداءً بیرونی رقیبوں کی مخالفت کی وہیں جتھے میں ان کے داخلے کے لیے مشکلات پیدا نہیں کیں۔ داخلے کے لیے فیس مقرر تھی، لیکن وہ بہت زیادہ یا داخلے میں رکاوٹ پیدا کرنے والی نہ تھی اور ایک مرتبہ جتھے میں داخل ہو جانے کے بعد نئے رکن کی حیثیت ویسی ہی ہو جاتی تھی جیسی کہ کسی دوسرے شخص کی جو جتھے سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ لیکن پندرھویں صدی میں ایک بالکل ہی جداگانہ قسم کی علحدگی پسندی پائی جاتی ہے۔ جتھوں نے نہ صرف بیرونی مسابقت کو دبایا بلکہ نئے ارکان کے داخلے میں رکاوٹیں بھی پیدا کیں۔ کسی پیشے کو ارکان کے لیے اور ان کے بچوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ داخلے کی فیس بڑھادی گئی۔ نو واردوں کو ان اشخاص کی ضمانت حاصل کرنی پڑتی تھی جو پہلے سے پیشے میں کام کرتے تھے۔ کوئی شخص پیشے میں اُس وقت تک حصہ نہ لے سکتا تھا جب تک اُسے شہری آزادی حاصل نہ ہو جائے یا جب تک پیشے کے نگران کار اسکو اجازت نہ دیں یا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ سابقہ زمانے میں وہ عمدہ کاریگر تھا۔ بعض صورتوں میں پیشے اجنبیوں کو خارج کرنے کے بارے میں سند شاہی حاصل کرتے تھے یا بعض صورتوں میں بلدی حکام اسی طرح کے حق عطا کرتے تھے۔ ۱۴۳۷ء میں علحدگی پسندی کی طرف میلان اس قدر نمایاں ہو گیا کہ استادان پیشہ، جتھوں برادریوں اور دوسری کمپنیوں کے ارکان اور نگران کاروں نے جو "ناجائز اور ناواجب ضوابط" محض اپنی ذاتی منفعت کی غرض سے بنائے تھے اور جن سے عوام کو نقصان پہنچتا تھا ان کے خلاف

قانون نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ یہ قرار دیا گیا کہ نئے ضوابط عدالت کے ناظموں کے سامنے پیش کیے جائیں، لیکن چونکہ اہل یارک شہروں اور تجارتی طبقوں پر بڑی حد تک بھروسہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے جتھوں کی تائید کی اس لیے شہری شمشیر کا بنایا ہوا قانون ناکام رہا۔ پندرھویں صدی اور اس کی بعد کی صدی میں جتھوں کا رنگ خود غرضانہ رہا۔ اور ضوابط بنانے میں منصفانہ اور بے لاگ روش اختیار کرنے کی بجائے انھوں نے محض اپنی ذاتی منفعت کو پیش نظر رکھا۔ جتھوں نے اس کو یقیناً تسلیم نہیں کیا کہ ذاتی منفعت پیش نظر تھی بلکہ حقیقت میں اس کے خلاف زور و شور کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ محض مفاد عامہ ان کا مقصود تھا لیکن غیر جانب داری اور بے غرضی کے اعلانوں کے باوجود ان کی نظریں زیادہ تر اپنی ہی جیبوں پر تھیں۔ ۱۰۷

(۲) جماعتی اختلافات زیادہ نمایاں ہوگئے۔ ابتداءً جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے صنعت، زراعت کا محض ایک ضمیمہ تھی۔ حرفتی جتھوں کا نشو و نما ایک ترقی اور پیش قدمی تھا، اس لحاظ سے کہ اس میں ایسے اشخاص کی جماعت کا وجود مضمر تھا جو محض دستکار تھے، دستکاری کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے اور جنھوں نے صنعت و حرفت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ گو کہ استاد پیشہ زرعی مزدور سے مختلف تھا، تاہم وہ ایسے بہت سے کام ایک ساتھ خود ہی کرتا تھا جن میں سے ہر ایک کو ہم آج کل الگ الگ اشخاص کے ذریعے انجام پاتا دیکھتے ہیں۔ چونکہ وہ بطور خود کام کرتا تھا اس لیے اس کی حیثیت دستکار کی تھی۔ لیکن وہ عوام کے ہاتھ اشیا بھی فروخت کرتا تھا، اس حیثیت سے خردہ فروش تھا۔ اس کے پاس دو ایک کارآموز رہتے تھے، اس لحاظ سے وہ ایک حد تک آجر بھی تھا۔ وہ اصل دار اس لحاظ سے تھا کہ دکان، آلات، اور خام اشیا مہیا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کاموں میں کامل فرق و امتیاز نہیں تھا اور جب ہم صناع، تاجر، اصل دار، آجر اور دستکار وغیرہ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں تو گویا ہم موجودہ زمانے کے نقطۂ نظر سے ان کاموں کو

دیکھتے ہیں اور گویا ان موجودہ امتیازات کے مبادی کو جن سے ہم واقف ہیں جدید فقروں میں ادا کر رہے ہیں۔ بایں ہمہ رچرڈ دوم کے دور حکومت سے اور اس سے آگے پندرھویں صدی میں ایک جماعت دوسری سے الگ ہو گئی اور ان کے درمیان معاشرتی حد بندی سخت ہو گئی، جو جدید صنعتی حالات کے آغاز کی خصوصیت ہے۔ جس طرح زمین کی حد تک زمیندار اور مزدور کے درمیان خصومت و رقابت نشو و نما ہوئی ٹھیک اسی طرح حرفتی جتھوں میں بھی زیادہ متمول اُستادوں کی حیثیت اونچی ہو گئی اور ان کے نیچے کم متمول اُستادوں، کاریندوں اور کار آموزوں کی ایک جماعت صاف طور پر نمایاں ہو گئی۔ لندن کے جتھوں نے چند سری حکمراں جماعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ ابتداءً خالص وردی کا پہننا مخصوص نہیں قرار دیا گیا تھا، لیکن بعد میں مخصوص ہو گیا۔ وردیاں بیش قیمت تھیں اور محض دکھاوے اور نمود کے لیے ان کی ضرورت تھی تاکہ شہری تقاریب و رسوم کے موقع پر انھیں پہنا جائے۔ جتھوں کے کئی غریب ارکان اور آزاد شہریوں نے ان کو حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن چونکہ ان کے پاس وردیاں نہ تھیں اس لیے وہ باضابطہ اجلاسوں میں جب کہ کاروبار انجام دیے جاتے تھے حاضر نہ ہو سکتے تھے، اور اس طرح جتھوں کی حکومت ایسے اشخاص کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ متمول اور "وردی پوش" تھے۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء میں لندن کی ڈریپر کمپنی[1] کے ارکان کے منجملہ صرف ۱۱۴ اشخاص کے پاس حرفتی وردیاں تھیں[2]۔ جہاں یہ صورت حال تھی وہاں انتخاب کا اختیار اور حکومت اُن "وردی پوشوں" کے حصے میں آئی جو جتھوں کا خاص حکمراں طبقہ بن گئے۔ ان سے کسی قدر ملتی جلتی مجالس مددگاراں Conrts of Assistants تھیں جن کا انتخاب وردی پوشوں میں سے ہوا کرتا تھا اور یہی برادری کے معاملات کا انتظام کرتی تھیں۔

۱۰۸

---

[1] ۔ بزازی اور پارچہ فروشی کی کمپنی۔

[2] ۔ دیکھو اشلے کی کتاب "معاشی تاریخ" جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳۱۔

اس طرح اس زمانے میں جب کہ خود پیشے کے استادوں کے درمیان تقسیم اور تفریق ہو رہی تھی کار آموزوں اور کارندوں کی حیثیت کی بھی بہت زیادہ حد بندی ہوئی۔ پیشہ سیکھنے میں زیادہ یکسانی پیدا کر دی گئی۔ لندن میں کار آموزی کی مدت سات سال مقرر کی گئی، اگرچہ اس مدت میں کمی بیشی بھی ہو جاتی تھی۔ کار آموز اس وقت تک نہ لیے جاتے تھے جب تک ان کے والدین سالانہ بیس شلنگ خرچ کرنے کے قابل نہ ہوں اور نہ کوئی ایسا شخص لیا جاتا تھا جو آزاد نہ ہو[1] اس کے علاوہ تعداد محدود رکھی گئی تھی۔ ابتداً میں یہ قاعدہ تھا کہ کوئی اُستاد پیشہ کار آموزوں کی اس سے زیادہ تعداد نہ رکھے جس کی وہ دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ چونکہ کار آموزوں کو ان کی کار آموزی کے آخری سال کے سوا معاوضہ کبھی کبھار ادا کیا جا رہا تھا اسی لیے ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد رکھنے کی ترغیب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس خطرے سے بچنے کے لیے کہ کہیں پیشے میں ان کی تعداد حد سے بہت نہ بڑھ جائے کار آموز رکھنے کی آزادی پر بندشیں عاید کر دی گئیں۔ نیوکیسل کے سلیٹ کا کام کرنے والے صرف اس صورت میں دوسرا کار آموز لے سکتے تھے جب کہ پہلا کار آموز اپنا تعلیمی سال ختم کر رہا ہو۔ اس سے زیادہ عام قاعدہ یہ تھا کہ ہر کار آموز کے لیے دو یا تین مستری یا کارندے[2] مقرر کیے جاتے تھے۔ لیکن استادوں نے کار آموزوں کے داخلے پر قیدیں عاید کرنے پر اکتفا نہ کر کے ان کی راہ میں اور دشواریاں پیدا کیں جو داخل کیے جا چکے تھے۔ ابتدائً تو یہ ہوتا تھا کہ کسی کار آموز کو جو اپنا اقرار نامہ پورا کر لیتا تھا یہ امید ہوتی تھی کہ فوراً ہی نہیں تو کم از کم ایک مدت گزرنے یا کارندے کے طور پر چند سال کاٹنے کے بعد وہ اُستاد بن جائے گا۔ لیکن اب اُستادوں نے یہ کوشش

۱۰۹

[1] یہ قاعدہ ان لوگوں کو ہدف بناتا تھا جو جاگیری نگرانی سے بچنے کے لیے شہروں میں آبستے تھے۔

[2] Jonrney Men ایسے کار آموزوں کو کہتے تھے جنھوں نے اقرار نامے کے مطابق پیشے کا کام پوری طرح سیکھ لیا ہو لیکن جو ابھی استاد نہ بنے ہوں بلکہ استاد کی نگرانی میں اجرت پر کام کرتے ہوں۔

کی کہ دستکاروں کی حرفت یا پیشے کا پوری آزادی سے سیکھنا ان ہی لوگوں تک رکھا جائے جو جتھوں کے ارکان کی اولاد ہوں اور کارندوں کو اپنے طور پر کام شروع کرنے سے روکا جائے۔ چنانچہ یہ قرار دیا گیا کہ کارندے، کارندوں یا مستری ہی کی حیثیت سے رہیں، اور استادوں کے تحت اجرت پر کام کریں۔ اس کی وجہ سے بڑی بے اطمینانی اور بددلی پھیل گئی۔ چنانچہ بعض صورتوں میں کارندوں نے اپنے الگ جتھے بنا لیے جن کو استادوں نے ناپسند کیا اور یہ کوشش کی کہ استاد بننے کی اجازت یا اجرت حاصل کریں۔ ان کارندوں کے جتھے کو بعض اوقات "ملکی کسانوں کے جتھے" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت تو نہیں ملتا کہ اس قسم کے جتھے عام تھے یا انھوں نے اپنے ارکان کو بہت فایدہ پہنچایا۔ لیکن ان کی موجودگی استاد پیشہ اور مزدوروں کے درمیان ایک نئی حد فاصل قایم ہونے کا ثبوت دیتی تھی۔ یہ جتھے مزدور سبھاؤں کی حیثیت رکھتے تھے اور پیشے کے استادوں سے بہتر شرطیں حاصل کرنے اور اپنے ارکان کی خدمت میت سبھا **Friendly Society** کے طرز پر کرنے کی کوششوں میں انھوں نے مزدور سبھاؤں کا سا طریق کار اختیار کیا۔

جن تبدیلیوں کو ابھی بیان کیا گیا ان کی بدولت حرفتی جتھوں کی اندرونی حالت میں انقلاب پیدا ہو گیا اور مستقل اجیروں کی جماعت کے وجود میں آنے کی وجہ سے گھریلو نظام کی اساسی خصوصیتیں مٹ گئیں تاہم یہ علامتیں محض اس بات کی تھیں کہ سرمایہ داری کا وہ نظام آہستہ آہستہ ظہور میں آ رہا تھا جس کا اثر حرفتی جتھوں کی خارجی تاریخ اور ان کے باہمی تعلقات میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

ابتداءً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک حرفتی جتھے نے ایک ہی صنعت کی دوسری شاخ کو اپنے قابو میں لے لیا ہے، مثلاً ۱۳۲۷ء جیسے اگلے زمانے میں لندن کے زین ساز، ایک ہی طرح کے پیشوں مثلاً نجاروں، نقاشوں، اور گھوڑے کا ساز بنانے والوں کی چھوٹے چھوٹے قطعات کی نگرانی اور تنظیم کر رہے ہیں اور ۱۳۳۵ء میں موٹا اونی کپڑا بننے والے، کپڑا دھونے اور صاف کرنے والوں سے اجرت پر

۱۱۰ کام لے رہے ہیں، اگرچہ بوخرا لذکر پھر بھی اپنے گھروں ہی میں کام کر رہے ہیں۔ چار سال بعد برسٹل کے ایک باشندے تامس بلنکٹ نے پہلے انفرادی سرمایہ دار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

(۳) ان واقعات نے ایک اور جدید ترقی کی راہ نکالی یعنی تاجروں یا سوداگروں کی طاقتور انجمنیں اہل حرفہ یا دستکاروں سے بالکل الگ قایم ہوئیں۔ جتھے اب بھی ہیں لیکن صناعوں کا انحصار تاجروں پر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ۱۳۶۴ء میں بزاز ہی کپڑا تیار کرتے ہیں۔ نصف صدی کے بعد وہ محض تاجر رہ جاتے ہیں اور حقیقی صناع یعنی دھونے اور صاف کرنے والے جلاہے اور اون کترنے والے ڈریپرس ہال میں ہر نئے کار آموز کے لیے جو داخل ہوتا ہے فیس ادا کرتے ہیں۔ ۱۳۷۷ء میں جلاہے اہمیت کے لحاظ سے نویں درجے تک گر جاتے ہیں اور محض لندن کے "مستریوں" یا دستکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اڈورڈ سوم کے زمانے میں لندن کی گروسرز کمپنی[1] کو بڑے اختیارات حاصل ہو گئے تھے، چنانچہ اس کے سولہ ارکان میر بلد[2] کے شرکا تھے۔ لیکن یہ محض دوسری بڑی انجمنوں یا نام نہاد تجارتی کمپنیوں کی ایک قسم ہے۔ آخر میں بارہ بڑی کمپنیوں اور باقی تقریباً پچاس چھوٹی کمپنیوں میں تفریق ظاہر ہوئی[3]۔ چنانچہ ان ہی بارہ کمپنیوں میں سے میر بلد منتخب ہو سکتا تھا۔ ان میں سے تین تجارت خارجہ کا، چھ مصنوعات ملکی کا، ایک درآمدی تجارت کا اور صرف دو حقیقت میں صنعتی کاروبار کرتی تھیں یعنی ایک تو پارچہ فروشی کرتی تھی جو اس زمانے کی خاص صنعت تھی، اور دوسری زرگر تھی جو قیمتی دھات کا کاروبار کرنے کی وجہ سے دوسرے دستکاروں سے زیادہ مالدار تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کمپنیاں تجارتی نوعیت رکھتی تھیں اور

---

[1] Grocers Company - پنساری یا نیالوں کی تجارتی انجمنیں۔

[2] Alder Men -

[3] سولھویں صدی میں یہ تفریق واضح ہو گئی اگرچہ بلاشبہ یہ پہلے بھی موجود تھی۔

زیادہ تر سوداگر تھیں نہ کہ دستکار۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تفریق اس خیال کی وجہ سے ہوئی تھی کہ کسی حرفت میں دستی کام کرنا ان کمپنیوں کے ارکان کے لیے باعث ذلت اور ان کی شان کے لایق نہ تھا۔ لیکن اس کا کوئی بہت ہی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ دوسری طرف ایسے شخص کی حیثیت کو منظم کرنا دشوار تھا جو دستکار بھی تھا اور سوداگر بھی۔ ممکن تھا کہ اسے اپنی حیثیت سے فایدہ اٹھانے کی ترغیب ہوتی اور وہ معمولی منافع سے کم نفع پر اکتفا کرکے یا معمولی شرح اجرت سے کم اجرت خود دے کر دوسروں سے کم قیمت پر مال فروخت کرتا۔ چنانچہ صنعتی انقلاب کے زمانے میں[1] ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چھوٹے موٹے استادان پیشہ جو اپنے طور پر کام کرتے تھے تباہ کن نتیجوں کے ساتھ ایسا ہی کر رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پندرھویں صدی کے جتھوں کے ارکان منافعہ اور اجرت میں اس طرح کی کمی سے نقصان اٹھا رہے ہوں اور اس کو روکنے کے خواہاں ہوں۔ لیکن اس تفریق کی جانب لے جانے والا محرک کچھ ہی ہو یہ کمپنیاں حرفتی جتھوں سے جدا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ حرفتی جتھوں کے مثل معمولی قاعدوں کے تحت قایم شدہ اشخاص کی انجمنیں تھیں، وہ پیشہ ور دستکاروں کے ہم رتبہ اور برابر نہ تھیں؛ ان کے ارکان پیدایش اور تقسیم دولت کا کاروبار ملا کر نہیں کرتے تھے جیسا کہ دستکار کیا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف وہ ان اشیا کی تجارت کرتے تھے جن کو دوسرے بناتے تھے، وہ دولتمند تاجر تھے جو کم مالدار دستکاروں اور جتھوں کی برادری کے درجے سے بہت اونچی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی تفریق لندن میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن دوسرے کئی شہروں میں تقریباً اسی طرح کا عمل ہوا اور پندرھویں صدی کے ختم تک صناع اور سوداگر کے درمیان تفریق بالکل قطعی ہوگئی۔

۱۱۱

[1] دیکھو صفحہ ۲۶۹۔

علیحدگی اور تفریق کے اس ترقی پذیر جذبے کا اثر ان لوگوں پر نہیں پڑا جو زراعت چھوڑ کر دستکاری اختیار کرنا چاہتے تھے۔ کارآموز بننا بھی آسان نہ تھا۔ کارآموزی زرعی غلام کے لیے قانوناً ممنوع تھی اور بہت ہی غریب آدمی کے لیے بالکل ناممکن۔ ایک دفعہ کارآموز بنا لیے جانے کے بعد بندی کو سات سال بے یافت اس میں گزارنے پڑتے تھے، اور اس مدت کے ختم پر کارندے کی حیثیت بھی زیادہ پُر منفعت نہ ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے یہ میلان رونما ہوا جو سولھویں صدی میں بہت زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے کہ شہروں کے باہر بس کر تمام مشکلیں حل کر لی جائیں کیونکہ یہاں جتھے اور بلدی انتظامات موجود ہی نہ تھے اور دستکار کی رکاوٹ اور بندش کے بغیر کام کر سکتے تھے۔ منچسٹر، برمنگھم، اور شفیلڈ جیسے شہر جاگیرداری حکومت کے تحت ہونے کے باوجود پارچہ بافی، آہنی ظروف اور کاردگری کی صنعت و تجارت کے مرکز بن گئے تھے، چنانچہ ان شہروں کی ترقی اور مروجہ قوانین سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ کئی اشخاص حرفتی جتھوں کی نگرانی اور حکمرانی سے بچنے کے لیے چھوٹے گانوں اور قریوں میں جو ملک کے طول و عرض میں منتشر تھے جا بسے تھے اور وہاں کام کرتے تھے۔ جہاں کہیں اس قسم کی تحریک جاری ہوئی وہاں قدیم شخصیہ والے شہریوں کا لازمی طور سے نقصان یقینی ہے۔ انھیں نہ صرف باہر والوں کی مسابقت سے بلکہ کارندوں کے نقل مقام کر جانے اور اپنے طور پر کاروبار شروع کرنے کی وجہ سے بھی نقصان پہنچا۔ علاوہ ازیں انھیں یوں بھی نقصان ہوا کہ شہروں پر جو محصول لگایا جاتا تھا اس کے بڑھتے ہوئے حصے کا بار باقی ماندہ کم تعداد کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ اغلب ہے کہ ہنری ہفتم کے پُرامن و سکون دور حکومت نے نقل مقام کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ ممکن ہے کہ جس زمانے میں انگلستان کے امن و امان میں "گلابوں کی جنگ" کی وجہ سے خلل پڑا باشندوں نے شہر کی چار دیواری کے اندر پناہ ڈھونے کو ترجیح دی ہو۔ لیکن جب یہ ہنگامے ختم ہو گئے تو وہ شہروں سے باہر جا کر قیام کرنے کے لیے تیار

۱۱۲

ہو گئے ہوں۔ بہر حال پندرھویں صدی کے اختتامی اور سولھویں صدی کے ابتدائی حصے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم شہروں کی تباہی کی متواتر شکایتیں ملتی ہیں۔ اکثروں کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ ایک حد تک اجڑ گئے اور دوسرے اس درجہ مفلس ہو گئے کہ بادشاہ کو اپنے ذمے کے محاصل ادا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۴۸۷ء میں یارک نے بجائے ۱۶۰ پاونڈ کے ۱۸ پاونڈ ۵ شلنگ ادا کیے، دوسری جانب ۱۴۹۶ء میں بعض شہروں کا ۱۲ ہزار پاونڈ کا بقایا معاف کیا گیا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ بعض شخصیہ والے شہر اجڑ گئے ہوں، لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ پوری مملکت پر مجموعی حیثیت سے شہری یا صنعتی جد و جہد میں کوئی فرق یا خرابی آئی۔ محض صنعت ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہٹائی گئی تھی۔ بعض شہروں پر زوال آیا لیکن ان کی جگہ اور دوسرے شہر رونما ہو گئے۔ بہر حال شہروں نے قدرتی طور پر پارلیمنٹ سے فریاد کرتے ہوئے یہ استدعا کی کہ ان کو محصول کے بار سے سبکدوش کیا جائے۔ اس کے برخلاف خوشحال شہروں نے دور بینی سے خاموشی ہی میں اپنی بھلائی دیکھی۔ سب سے آخر میں تاجروں کی جماعت کا بڑھتا ہوا اثر اور روز افزوں اہمیت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ تنزل اور پستی تمام ملک میں عام نہ تھی۔

۱۱۳ مذہبی جماعتوں کی جائداد کی ضبطیاں ہنری ہشتم اور اڈورڈ ششم کے دور حکومت میں جاری رہیں اور جتھوں پر یہ ایک کاری ضرب تھی۔ یہ در اصل مذہبی جماعتیں تو نہ تھیں لیکن ان کے پاس بہت سی جائداد تھی جس کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہبی کاموں کے لیے وقف تھی، یا اراضی متروکہ تھیں جن کی آمدنی خیرات، وائن اور مردوں کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے استعمال کی جاتی تھی۔ ۱۵۴۷ء کے قانون کی رو سے موقوفہ خانقاہوں کی ضبطی عمل میں آئی، لیکن یہ قرار دیا گیا کہ جہاں کہیں کسی مذہبی جماعت کے پاس ایسی جائداد موجود ہو جو کچھ مذہبی اور کچھ دوسرے اغراض کے لیے استعمال کی جائے وہاں صرف

وہ حصہ بادشاہ کو ملے گا جو مذہبی اغراض کے لیے وقف ہو اور باقی کو ہاتھ نہ لگایا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مذہبی جماعتوں یا برادریوں میں جتھے بھی شامل کیے گئے۔ اگر قانون کے عین منشا کے مطابق ضبطیاں عمل میں لائی جاتیں تو ان جماعتوں کا کوئی بڑا نقصان نہ ہوتا، ان کی صرف وہ جایداد ہاتھ سے چلی جاتی جو مذہبی اغراض کیلیے وقف تھی۔ لیکن یہ خیال کرنے کا کافی سبب موجود ہے کہ حکومت نے جو امتیازی خط کھینچا تھا اس کو سامنے نہیں رکھا گیا، یعنی مذہبی اغراض کے لیے جو جایداد وقف تھی اس پر نہایت وسیع نظر ڈالی گئی اور ایسی جایداد کا بڑا حصہ ضبط کر لیا گیا جس کو قانوناً چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کہ اس تدبیر کا مقصد تجارتی جتھوں کو کمزور اور بے بس بنانا نہ ہو لیکن اس کے باوجود عملی طور پر یہی نتیجہ نکلا۔

ایسے زمانے میں جب کہ جتھوں کے قوت و اقتدار کا زوال شروع ہو چکا تھا ان کی آمدنی کے ایک جزو کی ضبطی نے بھی لازمی طور سے ان کے زوال میں کسی حد تک مدد دی ہوگی۔ ان کے ارکان کے باہمی اتحاد و اتفاق کا ایک بندھن ہٹا لیا گیا تھا، ان کی شان و شوکت ان سے ایک حد تک چھین لی گئی تھی اور انسانی دماغ پر ان کو جو جذباتی اختیار حاصل تھا اس سے وہ محروم کر دیے گئے تھے۔ یہ ضرب نہایت شدید تھی، لیکن وہ فوری ہلاک نہ تھی۔ شہر کے کاغذات و امسلہ نیز موضوعہ قوانین اور محاصل کے ان قوانین میں جن میں محصول کے قابل جایداد کی تشریح و توضیح کی گئی تھی جتھوں کا ذکر ۱۵۴۷ء کے بعد اسی طرح موجود ہے جس طرح اس تاریخ سے پیشتر موجود تھا لیکن ان جتھوں کی اہمیت بتدریج گھٹتی جا رہی تھی۔ اگرچہ سولھویں صدی کے ختم اور سترھویں صدی کے دوران میں ان ہی کے سے ادارے عارضی طور پر از سر نو رونما ہوئے لیکن شاہی اقتدار نے ان کو دبا لیا، ان کے بنائے ہوئے قاعدوں کی جگہ پارلیمنٹ کے احکام نے لے لی اور قومی نشوونما نے جو

۱۱۴

سولھویں صدی کے ختم کی امتیازی خصوصیت تھی ان جتھوں کے تصورات کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا۔

یہ جتھے بتدریج وہ شکل و صورت اختیار کرتے جا رہے تھے جو وہ اب قطعی طور پر رکھتے ہیں۔ یعنی قدیم زمانے کی جاذب نظر یادگار جن سے شہروں کی شان قایم ہے اور جو خیراتی کاموں اور اکثر جشن منانے میں نمایاں حصہ لیتے ہیں لیکن جو پیشوں اور تجارت میں نہ تو ثالث یا پنچ کا کام انجام دیتے ہیں اور نہ آزادانہ حکمرانی کا مرکز ہیں۔

باب ۸

بھیڑیں پالنے کے لیے احاطہ بندیاں اور اونی صنعت کی ترقی

کالی وبا سے زرعی حالات میں جو تغیر پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے زمیندار اور مزدور کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ زمینداروں نے بے احتیاطی سے ایسی پالیسی اختیار کی جو ابتدا ہی سے ناقص تھی۔ انھوں نے نئے حالات میں اگلے انتظامات کو جاری رکھنا چاہا۔ جب یہ پالیسی ناکام ہوئی اور یہ محسوس کیا گیا کہ قدیم شرح اُجرت پر مزدوروں کی کافی تعداد ہاتھ نہیں آسکتی اور کسی قسم کے قوانین خواہ وہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، صورت واقعہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تو زمینداروں نے نت نئی تدبیروں پر عمل کرنا شروع کیا۔ ایک نئی تجویز یہ تھی کہ اراضی کو متعلقہ ساز و سامان کے ساتھ پٹے پر دیدیا جائے، چنانچہ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن پٹہ دار زیادہ لگان ادا نہیں کر سکتے تھے۔ جو کچھ منافع ہوتا تھا وہ ناقابل وصول قرضوں اور کھیتی باڑی کے آلات کی مرمت اور جانور

بدلنے کے مصارف میں چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ آسان سے آسان شرطوں پر بھی آسامیوں کا تلاش کرنا دشوار تھا۔ لیکن اگر اراضی سے کسی دوسرے طریقے سے کام لیا جاتا جس میں کم مزدوروں کی ضرورت ہوتی تو یہ مشکلیں دور ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ اراضی کو کھیتی باڑی کی بجائے رمنے کے طور پر دیا جائے اور بھیڑوں کے بڑے بڑے گلے پالے جائیں جن کی دیکھ بھال چند چرواہے بہت آسانی سے کرسکتے تھے تو قدرتی طور پر بھیڑیں پالنے کا طریقہ عام ہوگیا۔ یہ طریقہ دو طرح سے مفید تھا۔ ایک تو یہ کہ زمیندار جس کو کاشتکار بہ مشکل ہاتھ آتے تھے اب ان سے بے نیاز ہوگیا۔ اگر کاشتکار زرعی غلام (ول ین) ہوتا تو اس پر دائمی نگرانی کی ضرورت ہوتی تھی کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے یا اگر وہ آزاد ہوتا تو ایسی اجرت مانگتا جو بظاہر بہت زیادہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ملکی کپڑے کی صنعت کی روز افزوں خوشحالی کی بدولت انگریزی اون کی مانگ بڑھ گئی جس کی وجہ سے اون کی قیمت میں اضافہ ہوگیا اور ان حالات میں بھیڑوں کی پرورش زراعت کے مقابلے میں زیادہ سودمند ثابت ہونے لگی۔ ۱۱۵

بڑے پیمانے پر بھیڑوں کی پرورش کرنے سے پہلے گلہ رکھنے کے لیے زمین کی احاطہ بندی ضروری معلوم ہوئی۔ اگلے زمانے سے کھلی کھیتی باڑی کا طریقہ رائج تھا۔ اس لیے انگلستان کی تقریباً سب اراضی بے باڑ کی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ گھاس کی کٹائی کے زمانے میں چراگاہوں کو اور فصل کی تیاری کے زمانے میں کھیتوں کو مویشیوں سے بچانے کے لیے باڑ لگانی پڑتی تھی، لیکن یہ باڑ مستقل نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مختلف اشخاص کی زمینوں کے درمیان حدِ فاصل کا کام نہیں دیتی تھی۔ البتہ زیرِ کاشت اراضی کو افتادہ یا غیر مزروعہ زمین سے علٰحدہ کرتی تھی۔ بہر حال احاطہ بندی کی نوعیت کچھ بھی ہو احاطے کے اندر کی زمین ایک یا کئی اشخاص کی ملک ہوسکتی تھی۔ اگر زمین سیر پر ہوتی تو اراضی جاگیردار یا امیر کی ملک ہوتی یا اگر غیر آزاد کسانوں کی زمین پر ہوتی تو

جاگیرداروں کے اسامیوں کے قبضے میں ہوتی یا اگر زمین بیسر میں دیہاتیوں کے کھیت بھی شامل ہوتے تو اراضی جاگیرداروں اور زرعی غلاموں دونوں کی ملک ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال بھیڑوں کی پرورش کے لیے مناسب نہ تھی۔ اگر کسی شخص کی زمین اس کے ہمسایے کی زمین سے الگ ہوتی تو اس کو اپنی زمین پر اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے میں سہولت تھی۔ لیکن جب تک زمین کی حد بندی نہ ہو قدیم رواج سے انحراف ناممکن تھا جب تک تمام لوگ راضی نہ ہوں۔

۱۱۶ پندرھویں صدی کے آخری نصف حصے اور پوری سولھویں صدی کے زمانے کی حدبندی کا تذکرہ کرتے وقت جو الجھن پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مختلف قسم کی اراضی کی احاطہ بندی کی جاتی تھی۔ اور بھیڑوں کی پرورش احاطہ بندی کا مقصد ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ بعض صورتوں میں جب کھلے کھیتوں کو تقسیم کیا گیا تو قدیم اسامی کو اس کی منتشر تیس[1] ایکڑ اراضی ایک ہی جگہ چند کھیتوں کی شکل میں ملتی تھی۔ اسامی ان پر من مانی کاشت کر سکتا تھا اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا ایسے کھیتوں کی احاطہ بندی کا نتیجہ یکساں طور پر مفید ہوتا تھا۔ لیکن بھیڑیں پالنے کی غرض سے احاطہ بندی سچ پوچھو تو جاگیرداروں کی طرف سے کی جا رہی تھی جو اپنی قابل زراعت زمین کو وسیع رمنوں میں تبدیل کرنا چاہتے تھے تاکہ ان پر بھیڑیں بکریاں بڑی کثیر تعداد میں رکھی جا سکیں۔ زرعی آبادی کی اس بیدخلی کی وجہ سے جو کالی وبا کے بعد ہوئی دیہی آبادی پھر مصیبت و پریشانی میں گھر گئی اور پارلیمنٹ کو اس سلسلے میں بہت سے قانون نافذ کرنے پڑے۔

اگر ہم اپنی توجہ اس حدبندی تک محدود رکھیں جو محض بھیڑیں پالنے کی

[1] ظاہر ہے کہ باڑ ایسی صورت کے مقابلے میں جب کہ کل زمین ایک ہی شخص کی ملک ہو اس حالت میں زیادہ ضروری ہوتی ہے جب کہ اراضی ایک سے زیادہ مالکوں کے قبضے میں ہو اور آبادی نہ گھٹی ہو۔ لیکن وہ کار آمد ضرور تھی۔

غرض سے کی گئی تھی تو ظاہر ہوگا کہ اس کے نتیجے زمین کی نوعیت اور قسم کے لحاظ سے مختلف ہوئے۔ زمین کی تین خاص قسمیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) زمین سیر اور زمین معافی، (۲) عام یا افتادہ زمین جس کو آج کل شاملاتی اراضی کہتے ہیں اور (۳) وہ زمین جس پر زرعی غلام Villeins یا معمولی اسامی کاشت کرتے تھے۔

زمین سیر کا مسئلہ سب سے آسان ہے۔ اگر زمین سیر دوسرے اسامیوں کے کھیتوں میں ملی ہوئی نہ ہوتی جیسا کہ بعض اوقات ہوتی تھی تو زمین سیر کی حد تک زراعت کے قابل زمین کو چراگاہ میں تبدیل کرنے کا عمل موجودہ حقوق کو متاثر کیے بغیر انجام دیا جاسکتا تھا۔ اگر زمین کا مالک اپنی زمین سے من مانے ڈھب سے کام لے تو قانون کی نظر میں اس کا یہ فعل کسی کے لیے بھی نقصان دہ نہیں قرار پاتا۔ لیکن از روئے قانون نقصان رساں نہ ہونے کے باوجود وہ سخت مصیبت اور پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ جاگیردار کو بھیڑوں کی پرورش کی ترغیب اس وجہ سے ہوئی کہ مزدور کمیاب اور اُجرتیں زیادہ تھیں۔ لیکن مزدوروں کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل جداگانہ تھا۔ وہ سیر کی زمین پر اُجرت لے کر کام کرنے کے عادی تھے۔ بعض صورتوں میں تمام سال اور بعض حالتوں میں گھاس اور فصلوں کی کٹائی اور تخم ریزی کے زمانے میں اُجرت پر کام کرتے تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی اُجرت ان کو ملتی وہ ان کے گزارے کے لیے بڑا سہارا تھی۔ جب سیر کی زمین چراگاہ بن گئی تو جاگیردار کو محنت کی بچت ہونے سے پورا اطمینان نصیب ہوا۔ مگر مزدور سخت افلاس میں مبتلا ہوگئے۔ گو چند مزدور چرواہوں کی حیثیت سے کام حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن ان کی اکثریت بے کار و بے روزگار ہوگئی۔ علاوہ ازیں جاگیرداروں میں اپنے دیہاتی مکانوں میں رہنے کا میلان بہت کم ہوگیا۔ جس وقت تک

۱۱۷

علہ Commons Land جس کو آج کل محض "کامنس" Commons یعنی عام چراگاہ یا شاملاتی کے نام موسوم کیا جاتا ہے۔

کافی پیداوار وصول ہوتی تھی انھیں اپنے جاگیری مکانوں میں رہنے سہنے اور پیداوار کے قریب رہ کر کھانے میں سہولت تھی۔ بجائے اس کے کہ پیداوار ان کے ہاں بھیجی جاتی۔ لیکن جب کھیتی باڑی کی جگہ گلہ بانی نے لے لی تو جاگیردار دور جا کر رہنے لگا اور اپنی آمدنی دربار میں صرف کرتا تھا۔ گھر سے متعلق آدمیوں کی تعداد میں کمی کر دی جاتی اور جاگیری مکان بند کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح بے روزگاری اور بڑھی۔ یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں کہ گلہ بانی کے خلاف جو لگاتار شکایتیں پیش کی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی کہ عمدہ اور خوش حال گھر اُجڑتے گئے۔ حال میں تقریباً اسی قسم کی صورت کوہستانی اسکاٹ لینڈ میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ یہاں سے کاشتکاروں کا اخراج ہوا اور اس اُصول کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی گئی کہ "آدمیوں کے بجائے" بھورے رنگ کی بھیڑیں پالی جا رہی ہیں"۔

لیکن احاطہ بندی، سیر کی زمین تک محدود نہ تھی۔ جاگیری گانوں کی اُفتادہ زمین جو بڑے پرانے زمانے سے جاگیردار اور کاشتکار دونوں کی بھیڑوں اور مویشیوں کو چرانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، گلہ بانی کے لیے بظاہر قدرتاً مناسب تھی، چنانچہ انتہائی خواہش سے اس کی حد بندی کر لی گئی۔ لیکن یہ حد بندی زمین سیر کی احاطہ بندی سے بہ لحاظ نوعیت مختلف تھی۔ شاملاتی زمین پر گلے چرانے کا حق جس طرح جاگیردار کو حاصل تھا اسی طرح زمین سیر کے اسامیوں کو بھی قانون مرٹن[1] (۱۲۳۵ء) کی رُو سے جاگیردار کو یہ اختیار ہو گیا کہ اُفتادہ زمین اور چراگاہ سے فائدہ اُٹھائے اس شرط سے کہ اسامیوں کے لیے ضرورت کے مطابق رمنہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ اگرچہ یہ محض آزاد کسانوں سے متعلق تھا پھر بھی عام خیال یہ تھا کہ زمین سیر کے سب اسامیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ چراگاہ سے کچھ نہ کچھ چارہ حاصل کریں اور گھاس کاٹنے اور جلانے کی لکڑی

۱۱۸

[1] Statute of Merton -

اکھٹی کرنے کے لیے اُفتادہ زمین استعمال کریں۔ جب تک جاگیردار کی گزر بسر زیادہ تر کھیتی باڑی پر تھی، افتادہ زمین نہ صرف اُس کی بلکہ دوسرے گانوں والوں اور چھوٹے آسامیوں کی بھیڑوں، مویشیوں اور سوروں کے لیے بھی اچھی چراگاہ کا کام دیتی تھی۔ لیکن جب جاگیردار گلہ بان بنا تو اس کی حرص نے یہ پٹی پڑھائی کہ گانوں والوں کی ضروریات کے لیے جہاں تک ہوسکے کم رقبہ چھوڑے۔ چنانچہ گانوں والوں نے جب رہنے اور چارے کی کمی محسوس کی تو انھیں نئے طریقوں کے متعلق سخت شکایت پیدا ہوئی۔ بعض صورتوں میں انھیں یہ خیال کرنے کی خاص وجہ تھی کہ اُن سے بدسلوکی کی گئی ہے۔ خاصکر جہاں جاگیردار پوری افتادہ زمین کو اپنے کام میں لاتے تھے قانونی چارہ جوئی اس قدر دشوار اور بیش خرچ تھی کہ مظلوم اسامی اس کو بہت کم اختیار کرسکتے تھے، چنانچہ ان میں سے اکثروں نے مایوس ہو کر مقبوضہ جایداد کا پورا تخلیہ کردیا۔

واروک شائر میں اسٹریٹن باسکرولی کی مثال تقلیل آبادی کے عمل کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ "ٹامس ٹوای فورڈ نے ہنری ہفتم کے دورِ حکومت کے چوتھے سال میں بیدخلی کا کام شروع کیا اور اس طرح چار بنگلے اور تین جھونپڑے تباہ کردیے۔" پھر ہنری ہفتم کے عہدِ حکومت میں یہ جاگیر ہنری اسمتھ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اور اُس ہنری اسمتھ نے مزید ۶۴۰ ایکڑ زمین کی حدبندی کی جس کی وجہ سے بارہ بنگلے اور چار جھونپڑے اُجڑ گئے اور اسّی آدمی جو یہاں بستے اور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے وہ تخلیہ کرنے اور مصیبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئے"[1]

یہ ممکن ہے کہ اس صورت میں جس زمین کی حدبندی کی گئی وہ افتادہ شاملاتی زمین نہ ہو بلکہ شاملاتی کھیت ہوں۔ للچائی ہوئی نگاہیں انھی شاملاتی

---

[1] ۔ دیکھو Dugdale کی کتاب واروک شائر کے آثار قدیم۔
Antiquities of Warwickshire

کھیتوں پر پڑتی تھیں جن پر رواج کے موافق اسامی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی حد بندی کی گئی تو اس کی وجہ سے سخت مصیبت اور تکلیف رونما ہوئی۔ جاگیردار اور اسامی کی باہمی دشمنی جس کا آغاز قانون مزدوران سے ہوا تھا اور جو کاشتکاروں کی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی بڑی مدت تک قایم رہی۔ کشمکش کی نہایت نازک حالت نے کسی فریق کی بھی پوری فتح نہ ہونے دی۔ نہ جاگیرداروں نے مزدوروں کو اگلی اجرت یا قدیم خدمت قبول کرنے پر مجبور کیا اور نہ مزدوروں کو پوری آزادی حاصل ہوئی۔ اکثر کے قبضے میں زمین اب بھی اس شرط پر تھی کہ وہ اس قبضے کے معاوضے میں خدمت انجام دینے کے بجائے خدمت کا عوض دیں گے۔ اگرچہ یہ معاوضہ ایک زمانے میں کافی تھا لیکن گرانی ہونے سے وہ اب ناکافی ثابت ہوا۔ اس لیے جاگیرداروں کو یہ امر ضروری معلوم ہوا کہ بہ مجبوری پیش کردہ خدمات یا ناکافی عوض خدمت کو کالعدم کردیں، تمام رسمی اسامیوں کو نکال باہر کریں اور شاملاتی کھیتوں کو چراگاہ میں تبدیل کردیں۔

۱۱۹

اس میں شک نہیں کہ جبر اور ظلم سے بھی ایسا کیا جاسکتا تھا اور انصاف سے بھی۔ خارج کردہ اسامیوں کو بجائے منتشر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ایک جگہ چھوٹے چھوٹے کھیت دیے جاسکتے تھے، اور جاگیردار صرف ایسی زمین لے لیتا تھا جو اس کو کسی کے لاوارث مرجانے کی صورت میں ضبطی میں ملتی یا ایسی زمین لیتا جو سیر سے متعلق ہوتی خواہ وہ اسامیوں کے کھیتوں سے ملی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس صورت میں اس کو بہت کم فایدہ ہوسکتا تھا۔ اور اگر وہ ظلم کرتا تو بہت فایدہ حاصل کرسکتا تھا۔ اس کی ترغیب اس لیے زیادہ قوی ہوتی تھی کہ پندرھویں صدی میں یہ واضح نہیں تھا کہ خارج کردہ اسامی قانون سے کوئی مدد حاصل کرسکیں گے۔ کالی وبا کے بعد ابتدا میں جاگیردار اپنے اسامیوں کو بیدخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ اپنی اسامیوں کو اپنے ہی

پاس رکھیں۔ لیکن جب اخراج کی خواہش پیدا ہوئی تو قانون جاگیرداروں ہی کی موافقت میں تھا۔ سنہ ۱۵۷۴ء تک یہ مسئلہ کہ آیا زرعی غلام کو کوئی حقوق حاصل تھے تصفیہ طلب رہا۔ مگر اُس وقت تک اسامیوں کے لگاتار اخراج نے اسامیوں کی موافقت میں عوام میں نہایت قوی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ ملکہ ایلزبتھ کے دورِ حکومت میں جب شاملاتی کھیتوں کی احاطہ بندی ہوئی تو اکثر جملہ زمینداروں کی رضامندی سے ایسا کیا گیا، اور زمین کسی ایک کے قبضے میں نہیں بلکہ سب میں دوبارہ تقسیم کی گئی۔ تاہم تحریک کے ابتدائی دور میں سنہ ۱۴۷۰ء تا سنہ ۱۵۵۰ء کے واقعات کی رفتار یہ بتاتی ہے کہ رسمی اسامیوں کا اخراج کیا گیا۔ سنہ ۱۵۱۷ء کے کمیشن نے بطور یادداشت یہ لکھا کہ پوری بید خلی عمل میں آئی، مکان برباد ہوئے اور مکین گھر چھوڑ کر بھاگ گئے بلکہ گرجا بھی کھنڈر ہو گئے اور یہ محض اس وجہ سے کہ دیہات کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور گلہ بانی کا رواج ہو گیا تھا۔ آبادی کا پورا تخلیہ کرائے بغیر بھی جاگیردار کے لیے بعض صورتوں میں یہ ممکن تھا کہ اپنے اسامیوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ عام طور پر ان کا قبضہ زندگی تک ہوتا تھا اور نئی منظوری دینے سے انکار کیا جا سکتا تھا یا جب مدت تین اشخاص کے تا زیست ہوتی تھی تو دوسرے اسامی سے اتنا بڑا جرمانہ طلب کرنا ممکن تھا کہ وہ اسے ادا نہ کر سکتا تھا اور اس صورت میں زمین مالک کی جانب پلٹ آتی تھی۔ اگر باوجود اس کے اسامی اپنے کھیتوں پر ڈٹے رہتے تھے تو مکان افتادہ زمینوں کی احاطہ بندی کی وجہ سے چراگاہ کے حقوق کا اتلاف اتنا تکلیف دہ ہوتا تھا کہ وہاں ٹھیرنے میں انھیں نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ کسی کامیابی کی توقع اور جہاں تک کھلے ہوئے کھیتوں کی احاطہ بندی کا تعلق ہے صورتِ حال یہ تھی کہ سب رہیں یا کوئی بھی نہ رہے۔ ایک یا دو اشخاص اپنے منتشر ایکڑوں کو اس صورت میں اپنے قبضے میں نہ رکھ سکتے تھے جب باقی سب وہاں سے نقل مقام کر چکے ہوں۔

زراعت کے قابل زمین کو اُجاڑ کر اتنے وسیع رقبے کو جب چراگاہ میں

۱۲۰

تبدیل کر دیا گیا تو یہ یقینی تھا کہ غلّے کی رسد میں کمی اور گرانی کی شکایت پیدا ہو۔ یہ صورت نمایاں طور پر کیوں نہیں پیدا ہوئی اس کے دو اسباب تھے۔ پہلے یہ کہ احاطہ بندیوں سے انگلستان کی سرزمین کا بہت بڑا حصہ متاثر نہ ہوا۔ جن ضلعوں میں سب سے زیادہ تبدیلی ہوئی وہ وسطی علاقہ تھا جو شمال میں لیسٹر شائر سے لے کر جنوب میں برکس شائر تک اور مغرب میں واروک شائر سے لے کر مشرق میں کیمبرج شائر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں بھی کل رقبے کے ۹ فی صد سے بھی کم حصے کی احاطہ بندی کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ احاطہ بندی سب کی سب گلہ بانی کی غرض سے اور زراعت کو موقوف کرنے کی خاطر نہیں کی گئی تھی۔ جہاں احاطہ بندی ہوئی لیکن بید خلی نہ ہوئی اور جہاں اسامیوں کو منتشر خطوں کے بجائے یکجائی زمین مل گئی وہاں زراعت بہت اچھی ہوئی اور غلہ زیادہ پیدا ہوا۔ ہر شخص مروجہ دوری فصل کا پابند رہنے کے بجائے اپنی زمین سے اپنے منشا کے موافق کام لے سکتا تھا۔ جب وہ اپنے کھیتوں میں سے کسی کھیت سے چراگاہ کا کام لیتا تھا تو اس کے مویشیوں کے کھاد سے اس کے کھیتوں کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ احاطے کی جھاڑیوں سے جانوروں کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ اس کی ملکیت تھی اس کے قبضے میں رہتا تھا اور اس بات کا کوئی خوف نہ تھا کہ جاگیردار کے بڑے گلے سب رمنے کو چر جائیں گے۔ زراعت کے لیے علیحدہ اور گھری ہوئی زمین کو کھلی ہوئی زمین پر اس درجہ فوقیت دی جاتی تھی کہ فٹنز ہربرٹ نے اپنی کتاب "بندوبست"[1] میں جو ۱۵۲۹ء میں تحریر کی گئی تھی، یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شہر سے قدیم انتظام کے تحت سالانہ ۲۰ مارک کی آمدنی ہوتی تھی، تو اس کو علیحدہ کر کے احاطہ بندی کرنے کی صورت میں ۲۰ پاونڈ آمدنی حاصل کی جا سکتی تھی۔ ۱۲۱

---

[1] Boke of Surveying

غالباً ان ہی اسباب کی بنا پر گلہ بانی کے احاطوں نے غلے کی رسد میں کوئی زیادہ کمی نہیں کی، لیکن ان سے تباہ کن نتیجے رونما ہوئے۔ بہت سے چھوٹے اسامیوں سے زمین چھن گئی اور ان سب مصائب میں وہ مبتلا ہوئے جو نیا کام تلاش کرنے میں لازماً پیش آتے ہیں۔ کچھ شہروں میں چلے گئے اور وہاں کے اس مفلس طبقے کی تعداد کافی بڑھا دی جو معاش کے ذریعے حاصل کرنے کی خاطر حرفتی انجمنوں کے خصوصی حقوق کے خلاف کشمکش کر رہا تھا۔ کچھ بھکاری بن گئے اور خیرات پر گزارہ کرنے لگے جس کے متعلق آیندہ بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہوگی۔ تمام ملک میں عام طور سے بے اطمینانی پھیل گئی۔ نارفوک میں کیٹ کی بغاوت زیادہ تر شمالاتی زمینوں کی احاطہ بندی سے متعلق تھی۔ حکومت بھی ان خرابیوں سے جو پیدا ہو رہی تھیں نا آشنا نہ تھی اگرچہ اس نے جو مداخلت کی وہ ہمدردی کی بنیاد پر اتنی نہ تھی جتنی اس خیال سے کہ دیہاتی آبادی کی تباہی کے معنی قومی خطرے کے تھے۔ ٹامس مور کی کتاب (Utopia) میں گلہ بانوں کی اس طرح برائی کی گئی ہے کہ وہ بڑے لالچی اور غارتگر تھے، جن کی حرکتوں سے شریف اور دیانت دار انسان تباہ ہوئے۔ ۱۴۸۹ء میں پارلیمنٹ نے آیل آف وائٹ[۱] میں احاطہ بندیوں کو روکنے کی کوشش کی، ۱۵۱۴ء میں ڈھنڈورا پٹوا کر یہ حکم نافذ کیا گیا کہ کوئی شخص ایک کھیت سے زیادہ نہ رکھے اور بادشاہ کے دور حکومت کے آغاز سے اس وقت تک جو مکان تباہ ہو چکے تھے ان کو از سر نو بنا دیا جائے۔ لیکن یہ آئین بظاہر کامیاب ثابت نہ ہوا۔ اس لیے کہ ۱۵۳۴ء کے ایک تازہ قانون میں اس امر کی شکایت موجود ہے کہ چراگاہ کے لیے زمینیں قبضے میں کی جا رہی تھیں، جس کی وجہ سے اشخاص کی بڑی تعداد اور ان کے اہل و عیال بے روزگار ہو گئے تھے، اور

[۱] Isle of Wight

افلاس کی بنا پر ان کی حالت اتنی گر گئی تھی کہ وہ آئے دن چوری اور ڈکیتی کرتے یا بھوک یا سردی کی تکلیف سے بیکسی کی حالت میں مرجاتے تھے۔[1] اس کے بعد اس قانون کی رُو سے یہ حکم نافذ کیا گیا کہ کوئی شخص دو ہزار بھیڑوں سے زیادہ نہ رکھے۔ سنہ ۱۵۳۶ء میں یہ قرار دیا گیا کہ بادشاہ کو اُس زمین کے منافعے کا نصف حصہ ادا کیا جائے گا جس پر کاشتکاروں کے مکان تباہ ہو گئے تھے اور ان مکانوں کے بننے تک یہ حصہ ادا کیا جائے گا۔ جب خانقاہیں تقسیم کر دی گئیں تو نئے مالکوں پر یہ لازم کیا گیا کہ وہ مکانوں کو اچھی حالت میں ہمیشہ آباد رکھیں اور پچھلے زمانے میں زمین پر کے جتنے حصے پر کاشت کرتے تھے اُتنے ہی حصے پر اب بھی کاشت کریں۔ یہ قوانین کافی سخت تھے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئے کیونکہ جب سولھویں صدی کے ختم پر وہ منسوخ ہوئے تو اُنھیں فوراً دوبارہ نافذ کرنا پڑا۔ ان کے نافذ کرنے والے عام طور پر ایسے لوگ ہوتے تھے جن کا مفاد اسی میں تھا کہ ان کو نظر انداز کیا جائے۔ اگر کسی کھیت پر ہل کا ایک نشان کھنچا ہوا ہو تو اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ جُتا ہوا ہے۔ ایک کاشتکار صرف دو ہزار بھیڑیں رکھ سکتا تھا، لیکن اگر اس کے بچوں کے پاس اور ایک ہزار بھیڑیں ہوں تو اس سے کوئی قانون شکنی نہ ہوتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قانون کی زد سے بچنا آسان تھا۔ اس لیے مجموعی حیثیت سے پارلیمنٹ ناکام رہی ایک سو پچاس سال تک احاطہ بندی کا سلسلہ جاری رہا۔[2] سولھویں صدی کے ختم پر جب

[1] ۔ گلہ بانی کے نتائج اور اثرات کے متعلق اُس زمانے میں جو خیالات تھے ان کی تشریح ٹامس بیسٹرڈ کی کتاب کرسٹولے روس Christoleros کے حصہ چہارم (مطبوعہ سنہ ۱۵۹۸ء) کے بیسویں قطعہ سے ہوتی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بھیڑیں نہ صرف سب زمینوں اور چراگاہوں، غلہ، جنگلوں، دیہاتوں اور شہروں کو چر گئیں بلکہ متعدد

اس میں کمی ہوئی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ گلہ بانوں کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ احاطہ بندی نامناسب تھی بلکہ وہ اتنی سود مند نہ رہی تھی جتنی پہلے تھی۔

کالی وبا کی وجہ سے واقعات کا جو بڑا سلسلہ رُونما ہوا اُس پر تبصرہ کرنے میں یہ معلوم ہوتا ہے کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ زمینداروں کی وہی جماعت جو ابتدا میں اپنے مقطعوں پر اپنے اسامیوں کو سرفیت یا غلامی کی حالت میں رکھنے پر مُصر تھی بعد میں خود ان کی بے دخلی کے درپے ہو گئی۔ احاطہ بندیوں نے اور اُن کے نتیجے کے طور پر اسامیوں کی بے دخلی نے جاگیری نظام کا خاتمہ کر دیا اور اسی کے ساتھ خدمت انجام دینے کے طریق اور سرفیت کو بھی نیست و نابود کر دیا۔ یہ کل نظام ازکار رفتہ اور موجودہ زمانے کے لیے نامناسب ہو گیا تھا۔ ایلزبتھ کے دورِ حکومت میں شاہی زمین پر زرعی غلام موجود تھے۔ لیکن ملکہ نے ان کو آزاد کر دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ قانون میں کسی تبدیلی کے بغیر سرفیت بتدریج معدوم ہو گئی۔ اس وجہ سے نہیں کہ عوام کے جذبات میں اس کے خلاف کوئی ہیجان پیدا ہوا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ معیشت کے دیہی نظام کے نئے حالات میں زرعی غلام کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ سولھویں صدی کے ختم تک یہ طریقہ ملک سے معدوم ہو گیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کبھی مزدوروں کی برطرفی بڑی تیزی سے ہوتی ہے تو اُن کو مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ حد بندی کے زمانے میں بھی یہی ہوا لیکن مزدوروں کے مصائب میں اس وجہ سے کمی ہو گئی کہ زمینات سے بیدخلی کے بعد ان کو بآسانی اونی کپڑے کی صنعتوں میں جگہ مل گئی۔ اڈورڈ سوم کے دورِ حکومت سے ان صنعتوں کی ترقی بہت تیز رہی۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ تجارت بڑھ گئی۔ بلکہ ایک نئے طریق پر بھی اس میں اضافہ

۱۲۳

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دولتمندوں، بیواؤں اور یتیموں کو بھی کھا گئیں۔ اس کے علاوہ قوانین اور نافذہ احکام کو بھی اپنے دانتوں سے چبا ڈالا۔ یہ بھیڑیں کیا تھیں خونخوار درندہ تھیں۔

ہوا۔ ہم پہلے حرفتی جتھوں کے خصوصی حقوق کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ یہ جتھے اپنے متعلقہ پیشوں میں نوواردوں کے داخلے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن جلاہوں نے سب سے اول جتھوں کی نگرانی سے آزادی حاصل کی، اور اس کے ساتھ ہی ایک نیا حرفتی نظام رُونما ہوا۔ چنانچہ اس کے تحت بھی چھوٹے چھوٹے کاریگر تھے جو گھر پر کام کرتے تھے، کار آموزوں اور دو ایک مزدوروں سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ لیکن پہلے کی طرح یہ کاریگر حرفتی جتھوں کے ارکان نہ تھے۔ چنانچہ وہ نہ تو جتھوں کے قواعد کے تحت کام کرتے اور نہ جتھوں کی مقرر کردہ قیمتوں پر اشیا فروخت کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عوام کے ہاتھ مال فروخت کرنے کی بجائے وہ کسی کپڑے والے کے ہاتھ جس کی حیثیت ایک درمیانی شخص کی ہوتی تھی فروخت کرتے تھے جو اون کو پہلے صاف کرنے اور بل نکالنے والوں کو دیتا تھا اور اس صاف شدہ اون کو لے کر دُھنیوں اور کاتنے والوں کے پاس روانہ کرتا تھا اور ان سے سوت لے کر بُننے والوں کو دیتا تھا اور اس کے بعد بنے ہوئے کپڑے کو علی الترتیب کلف دینے والے اور رنگنے والے کے پاس بھیجتا تھا۔ اس طرح نئے نظام میں کپڑے والے کی مرکزی حیثیت تھی۔ وہ اون ۱۲۴ صاف کرنے والوں، دُھنکنے والوں، کاتنے والوں، بُننے والوں، رنگنے والوں، اور کلف دینے والوں سے اُجرت دے کر کام لیتا تھا۔ جو کچھ پیداوار ہوتی تھی اُسی کی ہوتی تھی اور تیار شدہ کپڑے کو فروخت کرنا وہ خود اپنے ذمے لیتا اور بازار کے خطرے بھی وہ اپنے ہی سر لیتا تھا۔ دستکاروں کو اب یہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی کہ انھیں کون سا کپڑا بنانا چاہیے اور نہ انھیں اپنے مال کی نکاسی کے لیے بازار تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جو کچھ کپڑے والا فرمائش کرتا اسی کے مطابق وہ کام کیا کرتے تھے اور ایک باقاعدہ اور مقررہ شرح پر جو اس ضلع میں عام طور سے رائج ہوتی تھی انھیں کام کے حساب سے نقد اجرت ادا کر دی جاتی تھی۔

اس زیادہ مکمل تنظیم کے تحت جو ۱۴۵۰ء کے بعد سے مشرقی انگلیہ[1] اور مغربی انگلستان میں عام ہو گئی اور ان ضلعوں سے باقی ملک میں پھیل گئی، اونی صنعت نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور طرح طرح کے مختلف کپڑے تیار کیے جانے لگے، مثلاً برسٹل کے اطراف و اکناف میں رنگین یا شعاعی رنگوں کے کپڑے، کینڈال میں موٹے قسم کا اونی کپڑا، کوینٹری میں فریز[2] اور گلڈفورڈ کپڑے سرے میں بنائے جاتے تھے۔ نئی قسموں سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ کپڑے کی برآمد میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۳۰۰ء میں شہر ہنسرڈون[3] نے صرف چھ قسم کے کپڑوں پر محصول ادا کیا اور اس وقت وہی اصل برآمد کرنے والے تھے۔ ۱۴۲۲ء تک انھوں نے ۴۴ قسم کے کپڑے اور ۱۵۰۰ء میں ۹۸۳ اور ۲۱ قسم کے کپڑے برآمد کیے اگرچہ اس وقت وہ کپڑے کے خاص بیوپاری نہ تھے۔ کپڑوں کی کل برآمد جو ۱۳۵۴ء میں ۵۰۰۰ تھانوں سے بھی کم تھی ۱۵۰۹ء میں بڑھ کر ۸۰۰۰۰ تھان اور ۱۵۴۷ء تک ۱۲۰۰۰۰ تھان ہو گئی۔ اور جوں جوں کپڑے کی برآمد میں اضافہ ہوتا گیا اون کی برآمد گھٹتی گئی۔ چنانچہ اڈورڈ سوم کے دور حکومت میں اون پر محصول کی مقدار ۶۸ ہزار پاونڈ تھی۔ لیکن ۱۴۴۸ء تک یہ مقدار گھٹ کر صرف ۱۲ ہزار پاونڈ رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ اب اون کی کھپت زیادہ تر ملک ہی میں ہونے لگی تھی۔ یہی ترقی صرف کپڑے کا بیوپار کرنے والی ڈریپرس کمپنی[4] کے کاروبار کی وسعت سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ابتدائی منشور ۱۳۶۴ء میں ملا، اور اس نے بہت جلد ترقی کر کے قوت حاصل کر لی، چنانچہ اس کو لندن میں خردہ فروشی کا اجارہ اور اسی کے ساتھ سب بزازوں پر نگرانی کا حق بھی حاصل تھا۔ یہ بزاز اپنا مال کمرۂ پارچہ فروشان (Drapers Hall) میں لانے پر مجبور تھے جہاں اس کو فروخت کیا جاتا تھا۔ انگریزی اونی صنعت میں جو نئی جان پڑی اس کی وجہ سے

---

[1] East Anglia - [2] Frieze یہ بھی ایک قسم کا موٹا اونی کپڑا تھا۔

[3] Hansaros [4] Drapers' Company

ایک اور طاقتور متحدہ جماعت وجود میں آئی جس کو مہم پسند تاجر
(Merchant Adventurers) کہتے تھے۔ یہ ملکی تاجروں کی ایک جماعت ۱۲۵
تھی جو انگریزی کپڑا بر اعظم یورپ کو برآمد کرتی تھی۔ یہ تاجر ابتداءً
بروجس[1] سے تجارت کرتے تھے، لیکن پھر فلیمش پارچہ فروشوں کے محسود
بن کر وہ محض انٹورپ تک اپنی تجارت کا دائرہ محدود رکھنے پر مجبور
ہو گئے۔ جب انگلستان اور برگنڈی کا باہمی اتحاد سنہ ۱۴۳۴ء میں منقطع ہو گیا
تو فلینڈرز میں انگریزی کپڑا درآمد کرنے کی سخت ممانعت کردی گئی۔
انگلستان نے انتقاماً انگریزی اون کا فلینڈرز روانہ کرنا ممنوع قرار
دیا، اور چونکہ انگلستان سب سے بڑا اون پیدا کرنے والا ملک تھا،
اس لیے فلیمش تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔ سنہ ۱۴۹۶ء میں رابطہ عظیم[2]
کی رُو سے ہنری ہفتم نے انگریزی پارچہ دوبارہ فلینڈرز روانہ کرنے کی
اجازت حاصل کی تو فلیمش تجارت کی پستی کی ابتدا ہوئی جس کی
رفتار الوا[3] نے تیز کردی اور آخرکار جب فلیمش تجارت کا خاتمہ ہو گیا
تو میدان میں انگلستان کا کوئی رقیب باقی نہیں رہا۔

پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی کو حکومت مجموعی حیثیت سے
پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ سب کپڑوں کو یکساں طول وعرض کا رکھنے
کے بارے میں جو حدبندی کے ضابطے مرتب کیے گئے تھے ان میں بتدریج
نرمی کردی گئی۔ سب سے اول نئی وضع کے کپڑوں کو مستثنیٰ کیا گیا۔ اس
کے بعد جب ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو پارلیمنٹ[4] نے یہ قرار
دیا کہ ان نئی وضع کے کپڑوں میں سے ہر ایک کپڑے کی نوعیت اور ساخت
کے مطابق اس کو بہترین طریقے پر تیار کرنا چاہیے۔ اور آخر میں اڈورڈ ششم
کے دورِ حکومت میں کپڑے والوں، بزازوں اور پارچہ کے تاجروں کو

---

۱ - Bruges　　۲ - Great Intercourse　　۳ - Alva

۴ - سنہ ۱۴۸۳ء میں

دارالعوام میں گواہی کی غرض سے طلب کیا گیا اور ان کے مشورے کے مطابق ”کرسیز“[۲] مختلف قسم کے کپڑوں کے لیے قواعد مرتب کیے گئے۔ کپڑوں کی یہ قسمیں مقامی رسم و رواج پر مبنی تھے اور ان قاعدوں میں جو طول و عرض مقرر کیا گیا اس میں کافی رعایت رکھی گئی۔ یہاں حکومت ان قدیم اصول کی پیروی کر رہی تھی کہ تجارت کو ناقص یا پُر فریب کام کی مضرت سے بچایا جائے۔ اس سے زیادہ راست حوصلہ افزائی ۱۴۶۳ء میں کی گئی یعنی باہر سے اونی کپڑوں کی درآمد روک دی گئی۔ اور کپڑے پر محصول برآمد میں کمی کر کے اون کے محصول میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا۔ اور آغاز ہی سے تجارتی جتھوں کی بے تعلقی پر روک قایم کی گئی کیونکہ بزازوں کی انجمن (Drapers Company) نئی پارچے کی تجارت کو اپنا اجارہ بنانا چاہتی تھی۔ ۱۴۰۵ء میں یہ طے کر دیا گیا کہ کپڑا فروخت کرنے والے، دوسرے تاجروں کیطرح بادشاہ کی رعایا میں سے ہر ایک کے ہاتھ ٹھوک طریقے پر مال فروخت کر سکتے تھے۔

۱۲۶

اونی صنعت میں ایک نئی چیز پیدا ہو گئی تھی۔ جلاہوں کو اس شکل میں اکھٹا کیا جا رہا تھا جس کو ہم آج کل فیکٹریوں یا کارخانوں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس معاملے میں حکومت نے مداخلت کرنا ضروری خیال کیا۔ اس قسم کے آجر کی ایک قدیم مثال جان ونچ کومب کی ہے جو ”جیک آف نیوبری“[۱] کے لقب سے مشہور تھا اور جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ ایک سو کپڑا بننے کے چرخے وہ اپنے گھر میں چلوا رہا تھا۔ یہ صحیح ہو یا غلط، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ونچ کومب کے کپڑے براعظم یورپ میں مشہور تھے، چنانچہ انگریز سفیر مقیم انٹورپ نے ۱۵۴۹ء میں سمرسٹ کو لکھا تھا کہ ونچ کومب کر سیز کے ایک ہزار تھان

لہ - Jack of Newbury   ۲ـ ـ لانبے اونی دھاگوں کا بنا ہوا موٹا کپڑا Kersies

ایک قرضے کی ادائی میں روانہ کیے جائیں۔ ایک اور مالدار کپڑے کے تاجر اسٹمپ (Stump) نے خانقاہ مالمبری کو ہنری ہشتم سے خرید لیا اور اس کے ایک حصے میں راچھیں نصب کیں، تقریباً اسی زمانے میں کپڑے کا ایک کارخانہ سایئرن سسٹر میں قایم کیا گیا لیکن سرمایہ دارانہ صنعت کے تحت بڑے کارخانوں کی اس ترقی میں ۱۵۵۵ء کے قانون پارچہ بافان[1] نے رکاوٹ پیدا کر دی اور جلاہوں کی شکایت پر کہ مالدار کپڑے والے ان پر ستم ڈھا رہے تھے، اس قانون نے یہ قید عاید کر دی کہ جو کپڑے والے شہروں اور تخصیصاتی قصبوں سے باہر رہتے ہوں اپنے گھر میں ایک سے زیادہ راچھ نہ رکھ سکیں گے اور نہ راچھوں کو کرایے پر چلا کر نفع کما سکیں گے۔ البتہ دیہاتی جلاہوں کو فی گھر دو راچھ رکھنے کی اجازت تھی وہ اس سے زیادہ نہیں رکھ سکتے تھے اور نہ دو سے زیادہ کار آموزوں کو رکھ سکتے تھے۔ اس قانون کے تحت جلاہوں کو ایک چھت کے نیچے بڑی تعداد میں جمع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ صنعت گھریلو کاروبار سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اس طرح اپنی کئی شاخوں اور نئی ترقیوں کی بدولت اونی صنعت اس قابل ہو گئی کہ زراعت کے قابل زمین کو چراگاہوں میں بدل دینے سے جتنے مزدور بیکار ہو گئے تھے انھیں اپنے کام پر لگا سکے۔ اکثر کاشتکار جن کو زمینوں سے بیدخل کر دیا گیا تھا جلاہے، پنبہ دھنکنے اور کپڑا صاف کرنے والے بن گئے اور ان کی روزی صنعت ہی سے وابستہ ہو گئی۔ دوسری صورتوں میں راچھ زراعت کے معاون کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس نے مزدور کو ایسے زمانے میں کام پر لگا دیا جب کہ طوفانی موسم کے سبب سے یا جاڑوں میں دن چھوٹا اور راتیں بڑی

۱۲۷

[1] Weavers Act -

ہو جانے کی وجہ سے وہ کھیتوں میں کام نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ایک ذیلی یا ضمنی صنعت کی حیثیت سے سوت کاتنے کی صنعت کپڑا بننے کی صنعت سے زیادہ کار آمد تھی۔ سوت کاتنے والا جس رفتار سے سوت کات سکتا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے کپڑا بننے والا سوت کو صرف کر سکتا تھا اور سوت کاتنے کا کام گھر کی عورتیں بھی انجام دے سکتی تھیں، اسی طرح وہ بھی معقول آمدنی پیدا کرنے کے قابل ہو گئیں۔ اگرچہ ان حالات میں وہ تکلیف اور مصیبت کچھ نہ کچھ کم ہو گئی جو اون کی بڑھتی ہوئی مانگ اور اس کے نتیجے کے طور پر احاطہ بندیوں کی وجہ سے رونما ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگلستان کی اون کی مانگ کی وجہ سے احاطہ بندی کی تحریک پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے اصل محرک نئے حالات تھے۔ یعنی قیمت کا اضافہ اجرت کے اضافے کا باعث ہوا، جس کی وجہ سے زراعت کے مقابلے میں چراگاہیں قایم کرنا زیادہ مفید ہو گیا۔ یہ صورت انگلستان میں اون کی مانگ بڑھنے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ اتفاق سے انگلستان نے اونی کپڑا تیار کرنیکا کام خود ہی شروع کر دیا تھا اور بھیڑوں نے زراعت سے جن مزدوروں کو ہٹا دیا تھا ان کے لیے اونی صنعت کی صورت میں ایک نیا پیشہ نکل آیا۔ لیکن یہ صورت ممکن نہ ہوتی اگر اونی صنعت بجائے انگلستان کے اپنے قدیم گھر فلینڈرز میں ترقی پاتی۔ اس صورت میں بھی انگریزی اون کی مانگ اتنی ہی زیادہ ہوتی اور زمینوں کی احاطہ بندی کی ترغیب بھی بدستور رہتی، لیکن نتیجہ اس سے بہت کچھ مختلف ہوتا۔ جو لوگ کھیتوں سے نکال باہر کیے گئے تھے انھیں کوئی نیا پیشہ نہ ملتا جس کو وہ اپنی معاش کا سہارا بنا سکتے۔ افلاس اور فاقہ کشی سایے کی طرح ساتھ رہتی۔ احاطہ بندیوں کی وجہ سے جو سخت نقصان اور بے اطمینانی پیدا ہوئی تھی وہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہو جاتی اگر اون اندرون ملک روزگار مہیا کرنے کے بجائے باہر بھیج دی جاتی۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

پارلیمنٹ نے بیرونی پارچے کی درآمد روک کر اور اون کی برآمد پر بھاری محصول لگا کے ملکی صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے جو کچھ بھی کیا نہایت دانشمندی کے ساتھ کیا۔ اگر ہم اس پالیسی کو تامینی کہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم ایک ایسی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں جو آج کل معاشی حیثیت سے بہت بری ہے۔ لیکن اس معاملے میں یہ پالیسی کسی طرح اعتراض کے قابل نہیں قرار دی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان صورتوں میں سے ایک صورت ہے جس میں تامینی پالیسی وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے برمحل اور مناسب کہی جا سکتی ہے۔ ۱۲۸
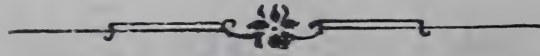
اگر ہم انگلستان کی تجارتی پالیسی کا مقابلہ ٹیوڈروں کے زمانے کی پالیسی سے کریں تو ہم پر ایک بڑا فرق فوراً واضح ہو جائے گا، موجودہ حالت میں تجارت "آزاد" ہے۔ یعنی حکومت تجارت کی تنظیم کو مجموعی حیثیت سے اپنے اختیار میں نہیں سمجھتی۔ تجارت بجز چند صورتوں کے آزاد ہے۔ جہاں کہیں اس میں دخل دہی اور حد بندی کی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ بالواسطہ محصول کے ذریعے سے آمدنی پیدا کی جائے یا یہ کہ اخلاقی حیثیت سے اس کو حق بجانب قرار دیا جائے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ان صنعتوں میں مداخلت جائز ہے جو خطرناک خیال کی جاتی ہوں، چنانچہ آمیزش پر بندشیں کی جاتی ہیں اور منشیات اور دوسری اسی قسم کی چیزوں پر نگرانی رکھی جاتی ہے۔ اس لیے اگر تجارت میں آزادی قوم کے لیے مفید نہ ہوگی۔ لیکن حکومت اس سے آگے قدم نہیں بڑھاتی۔ حکومت کو ان چیزوں سے سروکار نہیں کہ تاجر کیا

خریدتا اور کیا فروخت کرتا ہے۔ خام اشیا برآمد کرتا ہے یا مکمل مصنوعات
اپنا مال بھیجنے کے لیے انگریزی جہاز استعمال کرتا ہے یا غیر ملکی جہاز اور
اپنے خریدے ہوئے سامان کی قیمت کس شکل میں ادا کرتا ہے۔ آجر
من مانے ڈھب پر جو شئے چاہے اور جہاں چاہے بنائے۔ یہ سب
مسایل شخصی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ٹیوڈروں کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔
حکومت تجارت پر کافی نگرانی رکھتی تھی۔ اشیا کی خرید و فروخت
اور درآمد و برآمد میں وہ برابر دخل دیا کرتی تھی، اور ایسا کرنے میں
اس کا خاص مقصد ہوتا تھا۔ وہ بعض صنعتوں کو عمدہ خیال کرتی تھی۔
اور بعض کو خراب اور اسی کے مطابق وہ عمدہ صنعتوں کی پرورش اور
نام نہاد خراب پیشوں کی حدبندی میں سرگرم رہتی تھی لیکن چونکہ موجودہ
زمانے میں حکومت اس قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتی اور انفرادی
حیثیت سے ہر شخص کی نگاہ میں کسی پیشے کا برا یا بھلا ہونا اس کے
کم یا زیادہ مفید ہونے پر منحصر ہے۔ اس لیے زیادہ مفصل طور سے اسے
دیکھنا ضروری ہے کہ قدیم تفریق کس بنیاد پر قایم تھی۔

اگر مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو فرق یہ ہے کہ سولھویں صدی
میں حکومت کل قوم کو پیش نظر رکھتی تھی اور قوم کو قوی بنانا اسکا نصب العین
تھا، خواہ یہ ایک فرد کے نقصان سے ہی کیوں نہ ہو اس کے خلاف
موجودہ زمانے میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز افراط سے ہو اور ہر فرد کو
یہ موقع دیا جائے کہ منشا کے مطابق کاروبار کرے۔ خواہ اس سے وہ
ملک کے اقتدار کو کمزوری کیوں نہ کر ڈالے۔ ایک مثال سے اس
فرق کو اور بھی زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے۔ آج کل ہر تاجر اپنا مال
بے کھٹکے انگریزی یا غیر ملکی جہازوں میں روانہ کر سکتا ہے اور اس پر
کوئی روک نہیں۔ اگر غیر ملکی جہازوں کو انگلستان مال پہنچانے یا انگریزی
سامان لے جانے کی ممانعت کر دی جائے تو نقل و حمل کے مصارف میں
اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ انگریزی جہاز والے مسابقت کی

زد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا مقصد "افراط" ہے لیکن ایک ٹیوڈر سیاسی مدبر اس سے بالکل ہی مختلف خیال رکھتا تھا۔ بیرونی جہازوں سے کام لینا اس کے نزدیک انگریز کا حق تلف کر کے بیرونی باشندے کی مدد کرنا تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ برا یہ تھا کہ انگلستان ایک ایسے شعبے میں کمزور ہو جاتا جس میں قوی ہونا اس کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری تھا۔ یہ ممکن تھا کہ تاجر اور صارف بیرونی جہازوں کے اخراج سے نقصان اٹھائیں۔ لیکن اس کو غیر اہم خیال کیا جاتا تھا۔ کوئی عقلمند ایک فرد کے معمولی نفع یا نقصان کو کل قوم کی طاقت کے مقابلے میں اہم نہیں خیال کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس خیال کے تحت جہازرانی کے قوانین نافذ ہوئے اور ان کی بنا پر بیرونی جہازوں کو انگریزی سامان کی نقل وحمل کرنے یا اپنے اپنے ملکوں کی خام پیداوار کے سوا کوئی اور شے انگلستان میں درآمد کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

۱۳۰ قومی اقتدار اور طاقت کا یہی تخیل تھا جس نے حکومت کو سولھویں اور سترھویں ان دونوں صدیوں میں متاثر کیا، اور اس قومی اقتدار اور قوت کے قیام و استحکام کے لیے جو تدبیریں کی گئیں ان ہی کو "تجارتی نظام" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جن تدبیروں سے کام لیا گیا وہ ہمیشہ مقررہ اور یکساں نہ ہوتی تھیں بلکہ زمانے کے خیالات اور رنگ کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ باوجود اس کے دو صدیوں تک نصب العین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اصل مقصد یہی تھا کہ تجارت کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ انگلستان کی طاقت اور اس کا اقتدار بڑھے۔ عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ اگر کل قوم کسی تحریک کی گرفت میں آ جائے تو اس کی ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ یہی حالت اقتدار کی پالیسی کی رہی اور جب زوال ہونے لگا تو وہ بھی آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ عام طور سے دیکھا جائے تو سولھویں اور سترھویں صدی تجارتی نظام کے عروج

کا زمانہ تھا جب کہ تجارتی مسایل قومی اقتدار و قوت کے اصول پر تصفیہ پاتے تھے، اور انفرادی اغراض کا لحاظ بہت کم کیا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں تجارتی نظام کو زوال ہوا۔ اس زمانے میں قومی اقتدار کا تخیل کمزور ہو چکا تھا۔ بلکہ اس کے بجائے بیرونی مسابقت کے مقابلے میں ملکی کاشتکار اور ملکی دستکار کو مامون اور محفوظ رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یہ پالیسی تجارتی نظام کا جزو تھی۔ لیکن اس کو پورے طور پر تجارتی نظام نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تجارتی نظام میں تامین عام تھی اور اب اس کی حقیقت جزوی رہ گئی تھی۔ اس میں بھی کمی ہوتی گئی یہاں تک کہ انیسویں صدی میں تجارتی پالیسی کا خاتمہ ہو گیا۔ جس طرح زوال کا زمانہ طولانی رہا ٹھیک اسی طرح پندرھویں صدی میں استحکام کا زمانہ بھی طویل رہا جب کہ پالیسی کی تشکیل ہوئی، تجربات عمل میں لائے گئے اور نئے ضابطے مرتب ہوئے۔ اس تمام دوڑ دھوپ کا منشا قومی اقتدار تھا گو یہ مقصد واضح نہیں تھا اور نہ اس کو اچھی طرح سمجھا گیا تھا۔ تجارتی نظام کے اساسی اصول اور ان کے نفاذ کے زمانے کا حال معلوم ہونے کے بعد یہ اندازہ ہو گا کہ حقیقی ترقی کس قدر تدریجی ہوئی۔

(۴۱) تجارتی نظام کے مقاصد کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) جہازرانی کے قوانین کے ذریعے سے ملکی جہازرانی کی ترقی کی پالیسی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں جہازوں اور ملاحوں کی تعداد بڑھے، تاکہ اعلیٰ درجے کا بحری بیڑا قایم کیا جا سکے۔ (۲) ملکی کاشتکاروں کی امداد اور تامین کی پالیسی تاکہ انگلستان بیرونی ممالک کے غلے کا محتاج نہ رہے اور اپنی آبادی کی غذا ہمیشہ خود ہی مہیا کرنے کے قابل ہو جائے (۳) ملکی صنعتوں کی تامین کی پالیسی اور ملکی دستکاروں کو کام پر لگانے کی غرض سے نئی صنعتوں کا قیام۔ اور آخر میں (۴) باہر سے کافی زرسمیٹ کر ملک میں جمع کرنے کا اصول۔ ان چاروں مقصدوں میں سب سے اہم مقصد آخری ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک لحاظ سے

دوسرے سب مقصدوں کو گھیر لیتا ہے جن کو اس طرح ترتیب دیا گیا
تھا کہ وہ زر کی فراہمی اور انگلستان کو مالی حیثیت سے مضبوط بنانے میں
معاون ہوں - ان مقاصد کے تحت جو بھی طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں
وہ سب ٹیوڈروں کے زمانے میں موجود تھے - بلکہ ان میں کے اکثر
اس سے بھی پہلے سے چلے آرہے تھے - ان طریقوں کی ابتدا معلوم
کرنے کے لیے رچرڈ دوم کے عہد حکومت سے پہلے کے زمانے پر
نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں - اڈورڈ سوم جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا
ہے؎ ایک لحاظ سے آزاد تجارت کا حامی تھا - اس کا مقصد یہ تھا کہ
تجارت اور دولت میں توفیر ہو اور اس نے قوت و اقتدار کا کوئی
لحاظ نہیں کیا - یہ اور بات ہے کہ اس نے یہ خیال کیا ہو کہ جب فراوانی
اور خوشحالی ہوگی تو اقتدار آپ ہی آپ حاصل ہو جائے گا - لیکن یہ
واقعہ ہے کہ حکومت کا اقتدار بڑھانا اس کا منصب العین نہیں تھا؛
ورنہ وہ انگلستان میں اون کے بازار منتقل نہ کرتا جس کا نمایاں نتیجہ
یہ ہوا کہ نقل و حمل کی تجارت اغیار کے ہاتھوں میں چلی گئی - رچرڈ دوم
بڑی حد تک تجارتی گروہ کے زیر اثر رہا - جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا
ہے؎ اس کے دور حکومت کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ باہر کے لوگوں
کے خلاف شہری خصوصی حقوق بحال کیے گئے - اڈورڈ کے زمانے کی اس
ایک روایت کا ٹوٹنا تھا کہ بہت جلد باقی روایتیں بھی ٹوٹ گئیں -
سب سے اول انگریزی جہاز رانی کی ترقی کی پالیسی کو لیجیے -
سنہ ۱۶۵۱ء میں جو جہاز رانی کا قانون نافذ ہوا اس سے ہم واقف ہیں -
یہ قانون سنہ ۱۶۶۰ء میں اور ابھی سخت کر دیا گیا - لیکن بجز اس کے کہ
یہ قانون انگلستان کے تجارتی رقیبوں یعنی ولندیزیوں کے لیے ایک ۱۳۲
ارادی ضرب تھا اور غیر معمولی سختی کے ساتھ محض اس خیال سے

؎ - دیکھو باب (۷) -

مرتب کیا گیا تھا کہ انہیں انگلستان کی نوآبادیاتی تجارت میں حصّہ لینے سے محروم کر دیا جائے، اس قانون میں کوئی نیا اصول پوشیدہ نہ تھا۔ یہ پرانی تجویز کہ بجز انگریزی جہازوں کے دوسرے جہازوں میں انگریزی مال کی برآمدگی یا بیرونی مال کی درآمد کرنے کی ممانعت کی جائے چارلس اول کے دورِ حکومت میں بھی نافذ رہی۔ چنانچہ چارلس اول کو یہ شکایت رہی کہ اس قانون کا عمل درآمد بحر بالٹک کی تجارت میں نہیں ہو رہا تھا۔ جیمس اوّل کے دورِ حکومت میں بھی اس کا نفاذ کیا گیا، چنانچہ اس بادشاہ نے قوانین کے عمل درآمد کے متعلق تحقیقات کی۔ اگرچہ ایلزبتھ کے دورِ حکومت میں کسی قدر کم سختی کی گئی لیکن ملکہ نے شراب کی تجارت کی حد تک بیرونی جہازوں کو استعمال کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ یہ سلسلہ ہنری ہشتم کے عہدِ حکمرانی تک رہا، چنانچہ ۱۵۴۰ء میں بحری بیڑے کے قیام و انتظام کی غرض سے ایک قانون بنایا گیا جس میں یہ واضح کیا گیا کہ بحری بیڑہ نہ صرف مفید اور ضروری تھا بلکہ اس کے ذریعے سے ملک کی مدافعت اور امن و امان کی حفاظت اور ضمانت ہوتی تھی اور ملاحوں کو روزی پہنچتی تھی، اس لیے تجارتِ خارجہ کے لیے انگریزی جہاز استعمال کیے جائیں اور اغیار کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ بھی ان سے کام لیں۔ اس سلسلے میں ہم آگے بڑھ کر رچرڈ دوم کے عہدِ حکومت تک بھی جا سکتے ہیں۔ اڈورڈ سوئم کے ضابطوں کے نفاذ کے بعد بحری بیڑے میں اس درجہ کمی ہو گئی تھی کہ ۱۳۸۱ء میں جہاز رانی کا ایک قانون نافذ کرنا ضروری ہو گیا جو قوانین کے طولانی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور اس کی رو سے یہ قرار دیا گیا کہ انگلستان کا کوئی باشندہ بجز انگریزی جہازوں کے کسی دوسرے جہاز میں تجارتی مال کی درآمد و برآمد نہ کرے۔ یہی انگریزی جہاز رانی کو ترقی دینے کی پالیسی کا آغاز تھا۔ اور جیسا کہ قدرتی امر تھا ابتداءً اس پر پوری پابندی کے ساتھ عمل نہ ہوا۔ انگریزی جہاز کبھی کبھی نہیں ملتے تھے

اور اس صورت میں قاعدے میں ترمیم کردی جاتی تھی پھر بھی ۱۴۶۳ء
میں قانون دہرایا گیا اور ہنری ہفتم نے گیس کنی سے شراب برآمد کرنیوالوں
کو بھی مجبور کیا کہ اگر انگریزی جہاز مل سکیں تو ان کے استعمال میں
کوتاہی نہ کی جائے۔ لیکن ہنری ہشتم نے جہاز رانی کے قوانین کی قدر
اور اُن کا نفاد محض اس وجہ سے کیا کہ استثنائی اجازت نامے فروخت
کرکے مزے سے آمدنی حاصل کرے۔

لیکن جہاز رانی کے قوانین ہی ایک ذریعہ نہ تھے جن سے
انگریزی جہازوں کی سرپرستی مقصود تھی۔ ہنری چہارم نے بحری بیڑے کی
تنظیم کے سلسلے میں کچھ کام کیا، اور ہنری ہفتم نے بڑے اور بہتر جہاز
بنوائے نجی مالکوں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔
ہنری ششم کے دور حکومت میں ایک تاجر ولیم کینن جیس[1] نامی ۲۸۵۳
ٹن وزن کے جہازوں کا مالک تھا، جن میں سے ایک جہاز ۹۰۰ ٹن
کا تھا۔ سمندر کو بحری لٹیروں کی لوٹ سے محفوظ رکھنے کی کوششیں کی گئیں
اگرچہ وہ کسی قدر ناکام رہیں۔ ہنری ہشتم نے دریائے ٹیمز کے بحری
رہنماؤں کو منشور عطا کیا اور اس طرح ٹرینٹی ہوز Trinity House قایم
کیا جس کی نگرانی کے لیے ایک گورنر اور کئی محافظ مقرر کیے گئے جن کا
کام ملاحوں کے لیے قاعدے بنانا تھا اور ان کو ایلزبتھ نے بحری
علامتوں اور روشنی کے مینار تعمیر کرنے کا اختیار عطا کیا۔ ہنری ہشتم نے
گودیاں تعمیر کرکے تباہ شدہ بندرگاہوں کو بحال کرنے کی جانب بھی
بہت کچھ کیا۔ اس نے ٹیمز کی مورچہ بندی شروع کی اور ڈیٹ فورڈ میں
بحری اسلحہ خانہ قایم کیا۔ ایلزبتھ کے دور حکومت میں جہاز سازی کے
ساز و سامان کی عمدہ رسد مہیا کرنے کے بارے میں قاعدے اور ضابطے
جاری کیے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ سن کی کاشت کی جائے، شاہ بلوط

۱۳۳

[1] William Canynges

کے درخت لگائے جائیں اور اس وقت بلوط کے درختوں کی جڑوں کو کھود کر نکالا نہ جائے۔ ماہی گیری جو بحیثیت ایک صنعت کے ملاحوں کی گہوارہ تھی اس کی حوصلہ افزائی ۱۵۴۸ء میں ایک قانون کے ذریعے سے کی گئی، اور اگلے روزوں کے دنوں میں مچھلی کے استعمال پر زور دیا گیا، اس کی خلاف ورزی کرنے کی سزا جرمانوں سے دی جاتی تھی، اس قانون کا مقصد محض سیاسی تھا کیونکہ ۱۵۴۸ء کے زمانے میں حکومت مذہبی لحاظ سے روزہ رکھنے کے طریقے کو پسند نہیں کرتی تھی چنانچہ مقدمے میں بیان کیا گیا ہے کہ قانون کی غرض وغایت یہ تھی کہ ماہی گیروں کو کام پر لگایا جائے۔" ایلزبتھ نے بھی کم و بیش یہی قانون نافذ کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ملکی ماہی گیروں کو یہ اجازت دیدی تھی کہ وہ بلا محصول مچھلی برآمد کریں اور نمکین مچھلی کی درآمد کی حد بندی کرکے اس کی تجارت میں اپنا حصہ محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ملکہ کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی چنانچہ ۱۶۶۰ء کے جہازرانی کے قانون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ولندیزوں کے ہاتھ میں انگریزی ماہی گیروں کے مقابلے میں زیادہ تجارت تھی۔

ممکن ہے کہ یہ ضابطے و قوانین بظاہر کسی قدر کم اہم معلوم ہوں۔ لیکن خود اپنے زمانے میں ان کی یہ صورت نہ تھی۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ایک طاقتور بحری بیڑا قائم کرکے انگلستان کو قوی بنایا جائے۔ یہی پالیسی غلے کے کاروبار میں بھی نمایاں تھی جس کے دو مقاصد تھے۔ نہ صرف یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ ملک کے پیدا کیے ہوئے غلے کی مقدار بڑھائی جائے تاکہ جنگ کے زمانے میں تاجر کی غیر یقینی حالت پر بھروسہ نہ کرنا پڑے بلکہ اس کے علاوہ زرعی آبادی کو ملک کی پشت و پناہ تصور کیا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ جس طرح ماہی گیروں میں بہترین ملاح مل سکتے تھے اسی طرح مزدوروں اور گھٹیا کاشتکاروں میں بہترین سپاہی دستیاب ہو سکتے تھے۔ اگر ان کی تعداد میں کمی ہو تو اعلیٰ درجے کی فوج فراہم کرنا دقت طلب ہو سکتا تھا اور حقیقت میں احاطہ بندی کی وجہ سے

۱۳۴

گاؤں جو اُجڑ رہے تھے اس سے زرعی آبادی میں کمی ہونے کا اندیشہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پارلیمنٹ مداخلت کرتی اور اعلان کر دیتی کہ کاشتکار اپنی مقبوضہ زمینوں پر قانونی حق رکھتے ہیں اور ان کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ احاطہ بندیوں کے خلاف کئی قوانین نافذ کر کے اس بات کی کوشش کی کہ زراعت کے قابل زمین کا رقبہ اتنی تیزی سے گھٹنے نہ پائے۔ لیکن پارلیمنٹ اس سے بھی آگے گئی اور غلے کی درآمد کی مخالفت کر کے اور اس کی برآمد کی اجازت دے کر کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی۔ ان تدبیروں کا مقصد یہ تھا کہ غلے کی قیمت بڑھا دیجائے اور غلے کی کاشت کو زیادہ مفید بنا دیا جائے۔

رچرڈ دوم کا پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے غلے کی برآمد کی اجازت دیدی۔ اور یہ کارروائی اڈورڈ سوم کی پالیسی کے برعکس تھی۔ اڈورڈ سوم نے غلے کو ملک ہی کے اندر رکھنے کی سعی کی تھی تاکہ وہ زیادہ اور سستا دستیاب ہو۔ لیکن نئی حکمت عملی نے کاشتکاروں کے لیے اس وقت بیرونی بازار کا دروازہ کھولا جب کہ غلے کی قیمت ملک کے اندر بہت ادنیٰ تھی۔ اور اس واقعے کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ اس سے ملکی باشندوں کو زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ سنہ ۱۴۳۶ء میں ایک خاص قیمت معین کر دی گئی۔ برآمد کی اس وقت اجازت تھی جب کہ انگلستان میں قیمت گھٹ کر ۶ شلنگ ۸ پنس فی کوارٹر یا اس سے بھی کم ہو جائے۔ سنہ ۱۴۶۳ء میں ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا اور اس کا باعث تاجران ہنزا کے غلہ درآمد کرنے کے متعلق شکایتیں تھیں کیونکہ اس درآمد سے انگریزی زراعت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ ۶ شلنگ ۸ پنس فی کوارٹر سے نرخ کم ہونے کی صورت میں درآمد ممنوع قرار دی گئی۔ ان تدبیروں کا مقصد یہ تھا کہ غلے کی قیمت اس قیمت سے قریب رکھی جائے، اور سال بہ سال جو تغیرات ہوتے تھے ان کو گھٹایا جائے۔ یہ قیمت اتنی

کافی تھی کہ اس سے کاشتکار کو اچھا خاصا منافعہ مل سکتا تھا۔ ۱۵۳۴ء
میں درآمد بجز بادشاہ کی اجازت کے ممنوع قرار دی گئی۔ لیکن اجازت
بہت عام طریقے سے دی جاتی تھی۔ ایلزبتھ اور خاندان اسٹورٹ کے
عہد حکومت میں برآمد کی اجازت ایک مقررہ شرح سے دی گئی اور
اگرچہ یہ شرح بڑھادی گئی لیکن اس کی وجہ یہ خواہش نہ تھی کہ کاشتکار
کو اُس وقت غلہ برآمد کرنے سے روک دیا جائے جب کہ ملک کے اندر
قیمتیں کم ہوں بلکہ اس کا سبب قیمتوں کا عام اضافہ تھا جو سترھویں صدی
میں "نئی دنیا" سے چاندی کی برآمد کی وجہ سے جاری رہا۔ اس زمانے
سے لے کر اٹھارویں صدی کے ختم تک یہی اصول رہا اگرچہ درآمد و برآمد
کی جو حدیں معین کی گئیں ان میں بہت اختلاف ہوتا رہا۔ پالیسی کبھی
گرم رہی اور کبھی نرم مثلاً سترھویں صدی کے ایک حصے میں درآمد کی
پوری ممانعت کردی گئی تھی یا ۱۶۸۹ء میں برآمد کے لیے مالی امداد مقرر
کی گئی بشرطیکہ قیمت ۴۸ شلنگ فی کوارٹر سے نیچے گر جائے۔ بہرصورت
مقصد یہ تھا کہ انگلستان میں غلے کی کاشت کی حوصلہ افزائی کی جائے
تاکہ معمولی سالوں میں فراوانی رہے، اور جب نہایت اچھی فصلوں کے
باعث رسد وافر ہو تو بیرون ملک بازار تلاش کرنے میں آسانی ہو، اور
قلت کے زمانے میں وسیع زرعی رقبے سے جس پر غلہ کاشت کرنے کی
کسانوں کو ترغیب دی گئی تھی کم از کم اتنی پیداوار ہو جو آبادی کی غذا
کی ضرورت کو پورا کرسکے۔

یہ پالیسی بڑی مدت تک مجموعی حیثیت سے کامیاب رہی۔ اتفاق
سے بعض سال ایسے بھی آئے جب کہ رسد کی قلت رہی اور درآمد کی ضرورت
ہوئی۔ لیکن عام طور سے انگلستان اپنی ضرورت کی تکمیل آپ کر لینے کے قابل
تھا باوجود اس امر کے کہ زمینداروں کے سامنے کھیتی باڑی موقوف کرنے
اور اس کو چراگاہ سے بدل دینے کی ترغیب موجود تھی۔ اٹھارھویں صدی
کی ابتدا میں غلے کی بہت کافی مقداریں برآمد ہوئی، یہ صورت حال

قوت و اقتدار کی پالیسی کے مطابق تھی۔ یہ واقعہ تسلیم تھا کہ غلے کے قوانین کی وجہ سے غلے کی قیمت انگریز صارف کے لیے زیادہ ہوگئی تھی، لیکن یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے جو خرابی یا نقصان ہوتا تھا وہ اس معاشی منافع سے بڑی حد تک زایل ہو جاتا تھا جو ایک سرگرم زرعی آبادی کے وجود سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اعلی قیمتوں کے باعث لگان میں جو اضافہ ہوا اس نے اس سے کم مخالفت پیدا کی جس کی کوئی شخص توقع کر سکتا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ زمیندار سب سے زیادہ نفع میں رہے، لیکن سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک حد تک حق بجانب تھا۔ کیونکہ آج کل کے مقابلے میں اس وقت محصول کا بار زمین پر زیادہ پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی استدلال کیا جاتا تھا کہ اگر لگان اعلی ہو اور زمیندار مالدار ہو جائیں تو اس فنڈ کی مقدار بھی زیادہ ہو جائیگی جس سے محاصل وصول ہوں گے۔ محصول عاید کرنے کے طریقے کی حیثیت سے یہ چیز موجودہ خیالات سے الگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک ظاہری سہولت یہ تھی کہ ایک جماعت موجود تھی جس سے سیدھے سادے طریقے پر محصول وصول کیا جا سکتا تھا، اس لحاظ سے پورے نظام کو برا قرار نہ دینا چاہیے، خواہ نئے زمانے کے نقطۂ نظر سے وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، کیونکہ اس واقعے کو نظر انداز کرنا حق بجانب نہ ہوگا کہ اس زمانے میں حکومت کا نظریہ مختلف تھا۔ چنانچہ وہ زیادہ گھٹیا اشیا مہیا کرنے کی بجائے ملک کو قوی بنانا چاہتی تھی۔ کثیر آبادی کو غذا فراہم کرنے کا اس وقت کوئی سوال ہی نہ تھا جس پر قانون سازوں کو غور کرنا ضروری ہوتا۔

ٹھیک اسی جذبے نے ملکی صنعتوں کی تامین پر ابھارا تھا۔ خردہ فروشی میں مداخلت کرنے والے اجنبیوں پر رچرڈ دوم نے جو بندشیں عاید کی تھیں انھیں بیان کیا جا چکا ہے[1]، لیکن بہت زمانہ گزرنے نہ پایا کہ

[1] دیکھو باب ہفتم۔

ان اجنبیوں کے تھوک فروشی کے کاروبار کے خلاف بھی اسی طرح کی شکایتیں پیش ہوئیں۔ بازار میں اشیا خریدنے اور انھیں وہیں فروخت کرنے، ملک سے زر برآمد کرنے اور خردہ فروشی کرنے کے متعلق جو قدیم الزامات اجنبیوں پر لگائے گئے تھے ان میں سب سے زیادہ بڑا الزام یہ تھا کہ وہ اون اور ٹن برآمد کرتے تھے اگر یہ دونوں برآمد نہ کیے جاتے تو انگریز دستکاروں کو کام پر لگا سکتا تھا۔ اطالویوں اور خاص کر وینس کے باشندوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اس برآمد میں حصہ لے رہے تھے اور یہ الزام اس وجہ سے اور بھی زیادہ سنگین ہو گیا تھا کہ ان کے مبادلے میں وہ جو اشیا درآمد کرتے تھے وہ تعیشات کی قسم سے تھیں مثلاً مسالہ یا عمدہ مصنوعات جن کے ملک میں درآمد ہونے کی وجہ سے نہ صرف ملکی باشندوں کو کوئی کام نہیں مل سکتا تھا بلکہ ملک کا زر باہر چلا جاتا تھا۔ لمبارڈ جن ریشمی اشیا کی تجارت کرتے تھے ان کی درآمد ۱۴۵۵ء میں ممنوع قرار دی گئی؛ اور اڈورڈ چہارم نے اسی پالیسی پر اور زیادہ سختی سے عمل کیا۔ ۱۴۶۳ء میں مختلف قسم کی بیرونی اشیا مثلاً اونی اور ریشمی کپڑے، لوہا، فولاد دھاتیں اور چمڑے کا سامان، کارچوب، کشیدہ کاری اور چھوٹی چھوٹی نفیس کی چیزیں مثلاً ٹینس کی گیند، تاش اور دستی بٹوے وغیرہ کی درآمد روک دینے کے لیے ایک قانون نافذ کیا گیا۔ گنتی کی ان چند اشیا کی درآمد ممنوع کرنے سے تاجین کا دائرہ اتنا تنگ ہو گیا کہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں جو اصول پنہاں تھا وہ کافی واضح ہے ممنوع الداخلہ اشیا سب کی سب مصنوعات یعنی دیسی اشیا نہیں جن سے ملک کے مزدوروں کو کوئی کام نہیں مل سکتا تھا اور جن کے متعلق عوام کا یہ خیال تھا کہ انہیں خود انگلستان ہی میں بخوبی بنایا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ان پر بندشیں عاید کی گئی تھیں۔ تجارت خارجہ کے بارے میں یہ سوال کیا جاتا تھا کہ وہ انگریز دستکاروں کو کس طرح متاثر کرتی ہے؟ اگر اس کا جواب پارلیمنٹ کے پاس یہ تھا کہ اس تجارت کی بدولت یا تو انگریزی مصنوعات

۱۳۷

برآمد کی جائیں گی یا یہ کہ ایسے خام اشیا درآمد کیے جائیں گے جن سے ملک کے اندر مصنوعات بنائی جاسکتی ہوں، تو یہ تجارت حوصلہ افزائی کی مستحق تھی۔ اگر اس کے خلاف اس تجارت کی وجہ سے خام اشیا ملک کے باہر چلی جائیں یا ایسی مصنوعات اور اشیا درآمد کی جائیں جو ملک کے اندر تیار کی جاسکتی ہوں یا جو انگریزی اشیا کو بازار سے ہٹا کر خود مقبول عام بن جائیں یا جو خالص تعیشات کی قسم سے ہوں اور اس لحاظ سے غیر ضروری ہوں تو ایسی تجارت ضرر رساں اور نقصان دہ تھی۔ تقریباً اسی قسم کی جانچ پڑتال بیرونی ممالک سے آکر بسنے والوں کی بھی کی جاتی تھی۔ البتہ ان کی صورت حال اس قدر سادہ نہ تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اجنبی اپنے ساتھ نئی صنعتیں لاتے یا کپڑے کو رنگنے یا صاف کرنے کے طریقوں میں جن میں انگلستان اپنے رقیبوں سے پیچھے تھا کوئی اصلاح و ترمیم کرنا یا جدت دکھانا جانتے تو ان سے ایسا سلوک کیا جاسکتا تھا، گو اس صورت میں بھی انھیں بہت کچھ مقامی حسد اور دشمنی سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کے خلاف وہ ایسی صنعتوں میں گھس جاتے جن میں انگریز دستکار پہلے سے بہت مہارت رکھتے تھے یا خردہ فروشی کی تجارت میں حصہ لینے کی کوشش کرتے تو انھیں روک دیا جاتا تھا۔

اس کل پالیسی کا اندازہ زر کے قوانین سے ہوسکتا ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، اس کی انتہائی کوشش کی گئی کہ سکوں کو محفوظ رکھا جائے یعنی بیرونی ملکوں کے خراب زر کی درآمد پر بندشیں عاید کی جائیں بلکہ ملک کے زر کی برآمد کی بھی روک تھام کی جائے۔ اڈورڈ سوم کے دور حکومت میں یہ اندیشہ کیا جارہا تھا کہ شاید ملک کا زر بالکل غائب ہوجائے۔ لیکن موجودہ زمانے میں ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ زر کا رواج سے پورے طور پر غائب ہوجانا ناممکن ہے، کیونکہ اگر زر ملک سے باہر چلا جائے تو قیمتیں گر جائیں گی اور بیرونی تاجر ادنیٰ قیمتوں کی ترغیب اور تحریص سے اشیا خریدنے کے لیے انگلستان آئیں گے اور خود مال بھیجنے سے دست کش

۱۳۸

رہیں گے۔ اگر وہ اپنے خریدے ہوئے سامان کی قیمت اشیا کی شکل میں ادا نہ کریں تو زر ادا کرنا ضروری ہوگا اور اس طرح ملک میں زر کی درآمد دوبارہ شروع ہو جائے گی پھر بھی اس قانون کے آسان اور جلد عملدرآمد کے لیے یہ ضروری ہے کہ بین الاقوامی تجارت پوری طرح ترقی یافتہ ہو۔ لیکن اس صورت حال کے پیدا ہونے سے پہلے جب تجارت قلیل المقدار تھی یہ ممکن تھا کہ اگر بیرونی تاجر زر کی زیادہ مقدار ملک سے باہر لے جاتے تو جو کچھ زر باقی رہ جاتا وہ آلہ مبادلہ کا کام بخوبی انجام نہ دے سکتا۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ قیمتوں میں تیزی سے کمی ہوگی جو تجارت کے حق میں نہایت مہلک ہے بلکہ زر دشواری سے مل سکے گا اور معمولی حالات میں زر کے واپس ہوئے میں بہت دیر لگے گی۔ ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے حفاظتی تدبیریں کرنا حق بجانب تھا۔ اس کے علاوہ خراب اور کھوٹے سکوں اور بیرونی ملکوں کے جعلی زر کی درآمد کی روک تھام بھی بہت ضروری تھی۔ کیونکہ ایسی احتیاطی تدبیریں نہ کرنے کی صورت میں اس کا امکان تھا کہ ملک کے زر کی حالت بھروسے کے قابل نہ رہے۔ اسی وجہ سے چند قاعدے بنا لیے گئے، اور وہ یہ تھے کہ بیرونی تاجر کے لیے انگلستان میں اپنے بیچے ہوئے سامان کی قیمت کا کچھ حصہ خرچ کرنا لازم تھا اور اون برآمد کرنے والے انگریز تاجروں کے لیے یہ ضروری تھا کہ ۴ شلنگ یا جیسا کہ حکم دیا گیا ۱۳ شلنگ ۴ پنس فلز کی شکل میں درآمد کریں تاکہ اس طرح سکہ سازی کے لیے زیادہ مقداریں فلز مل سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں زر کی کافی مقدار موجود رہے۔

جہاں تک کہ زر کا تعلق ہے تجارتی پالیسی بالکل جداگانہ اصول پر مبنی تھی۔ اس بارے میں یہ استدلال کیا گیا تھا کہ زر دولت کی سب سے مرغوب اور واضح شکل تھی، اگر کوئی شخص زر کثیر مقداریں رکھنے سے دولتمند ہو سکتا ہے تو کوئی ملک بھی ان ہی حالات کے تحت دولتمند ہو سکتا تھا

دولتمند ہونا طاقتور ہونے کے مثل تھا۔ زر دولت کی بہت ہی کار آمد اور موزوں شکل تھی۔ اگر کسی ملک میں زر کا کافی ذخیرہ نہ ہو تو وہ دوسری قوموں سے مسابقت نہ کر سکے گا کیونکہ اس کا ہتھیار کمزور ہو گا۔" سچ پوچھو تو یہ استدلال نہایت معقول تھا۔ کسی ناگہانی ضرورت کے وقت زر کی زیادہ سے زیادہ مقدار کا قبضے میں رہنا ملک کے استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ آج کل بھی بعض ممالک ایسا ہی خیال کرتے ہیں[1] اور ایسے زمانے میں جب کہ آمدورفت کے وسیلے اس قدر آسان نہ تھے، صنعت میں بھی اتنی گرما گرمی نہ تھی اور سامان کا جمع اور ذخیرہ کرنا بہت مشکل تھا، زر نقد کی معقول مقدار رکھنے کا فائدہ اور بھی زیادہ نمایاں تھا۔ اس زمانے میں جب کہ تجارتی نظام نے قطعی شکل اختیار کی انگریزوں نے دیکھا کہ ان کے سب سے بڑے رقیب ہسپانیہ کے پاس چاندی کا بہت بڑا اور بظاہر غیر محدود ذخیرہ موجود تھا۔ ایسی حالت میں یہ قدرتی امر تھا کہ انگلستان حفاظتی تدبیریں اختیار کرتا تاکہ خود کو دشمن کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار کر سکے۔ اسی وجہ سے تجارئیین نے ملک کے اندر سونے اور چاندی کا بہت بڑا ذخیرہ رکھنا اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ ان کی دانست میں یہ انگلستان کی بدنصیبی تھی کہ اس کے ہاں سونے اور چاندی کی کانیں نہ تھیں۔ اگر ہوتیں تو زر کے لیے دوسروں کا محتاج نہ ہونا پڑتا۔ لیکن کانوں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے زر کا باہر سے درآمد کرنا ضروری تھا۔ اسی لیے تجارئیین کی یہ خواہش تھی کہ جو کچھ زر ملک میں موجود ہو وہ ملک ہی میں موجود رہے اور تا امکان زیادہ سے زیادہ مقدار باہر سے درآمد کی جائے۔ چنانچہ ابتدائً براہ راست قانون سازی کی آزمائش کی گئی اور اس طرح رچرڈ دوم کے عہد حکومت میں تجارتی اصول کے آغاز

---

[1] - جرمن حکومت جنگی اغراض کے لیے سونے کا بہت بڑا ذخیرہ اسپانڈر وہیں رکھا کرتی تھی۔

کا پتا چلتا ہے۔ سنہ ۱۳۸۱ء میں سونے یا چاندی کی برآمد ممنوع قرار دی گئی۔ کیونکہ "برآمد کو زیادہ مدت تک جائز رکھنے سے ملک کے بہت جلد تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔" یہاں یہ واضح نہیں ہوتا کہ پارلیمنٹ کو ملک کو نقصان پہنچنے کا جو اندیشہ ہوا وہ سکوں کے باہر چلے جانے کی بنا پر تھا یا سونے اور چاندی کے ذخیرے کے کم ہو جانے کی بنا پر لیکن اس امر سے کہ صرف زر کا ہی نہیں بلکہ فلز کا بھی ذکر کیا گیا ہے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا مقصد کرنسی کی حفاظت کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ بعد کی صدی میں زر ملک کے اندر رکھنے کے خیال سے بہت سے قوانین بنائے گئے۔ اجنبیوں پر لازم کیا گیا کہ وہ اسباب کی ضمانت دیں کہ فلز برآمد نہ کریں گے اور پاپائی تاجروں پر خاص نگرانی رکھی جاتی تھی اور انھیں مشتبہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ دوسری جانب اڈورڈ چہارم کے دور حکومت میں سکہ برآمد کرنا ایک سنگین جرم بن گیا۔ ۱۴۰

لیکن بظاہر ان سب تدبیروں کے نتیجے بھروسے کے قابل نہ تھے۔ کیونکہ زر کی چور تجارت کی روک تھام تقریباً ناممکن تھی۔ جب تک تاجر زر کو باہر بھیجنا چاہیں تو قوانین کے نفاذ کے باوجود زر کی کچھ نہ کچھ مقدار کی برآمد کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے عوام نے یہ سوال کیا کہ "تاجر زر برآمد کرنے کے کیوں خواہاں ہوتے ہیں؟" اگر برآمد کی خواہش یا ضرورت سے دست بردار ہو جائیں تو قوانین وضع کرنے کی مزید ضرورت نہ ہوگی۔ تمام معاملات خود بخود عمدگی سے چلیں گے۔ اسی خیال سے مختلف پیشوں اور صنعتوں کی نگرانی اور جانچ کی جاتی تھی تاکہ یہ معلوم ہو کہ آیا ان میں زر کے برآمد کرنے کی ضرورت تھی یا نہیں اور اس نتیجے تک بہت جلد رسائی ہوگئی۔ انگریزوں کے درمیان انگریزی مال کی تجارت ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ ملک کے اندر کا زر والا ذخیرہ کچھ بھی متاثر نہ ہوتا تھا اور اس کو نظر انداز

کیا جاسکتا تھا۔ بیرونی تاجر جو مال انگلستان میں لاتا تھا اس کی قیمت انگریز ادا کرتے تھے اور بیرونی ممالک کو انگلستان جو سامان بھیجتا تھا اس کی قیمت بیرونی تاجر کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ بہرصورت مطالبات کی ادائی زر کی شکل میں کی جاتی تھی[1] اس لیے تجارت درآمد کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ زر کو باہر لے جاتی ہے، اور اس کے برخلاف تجارت زر کی برآمد کو اندر لاتی ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس میں تجارئیین کے زر کا نظریہ ان کی پالیسی کے باقی تمام شعبوں کے مطابق نظر آتا ہے۔ غلے کی کاشت کی ہمت افزائی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب کبھی ضرورت سے زیادہ غلہ پیدا ہو تو اس کو برآمد کیا جائے تاکہ زر درآمد ہوسکے۔ بدترین حالت میں بھی اگر انگلستان محض اتنی پیداوار تیار کرے جس سے صرف اس کی ضرورت پوری ہو تو یہ حالت اس صورت سے کہیں بہتر تھی جس میں کہ باہر سے غلہ منگا کر زر باہر بھیجنا پڑتا۔ انگریزی جہازوں سے یہ فائدہ تھا کہ انگریزی سامان کی نقل و حمل کا جو کرایہ بیرونی جہازوں کو دیا جاتا وہ بچ رہتا۔ اس کے علاوہ انگریزی صنعتوں کی امداد کرنے سے بھی بچت ہوتی تھی۔ اگر ملک میں دیسی مال کی بجائے بدیسی مال آکر بکنے لگے تو زر ملک سے باہر چلا جائے گا۔ اس کے خلاف انگریزی مال برآمد کرنے اور اس کو بیرونی اشخاص کے ہاتھ بیچنے کے معنی دوہرے نفع کے تھے، یعنی ایک تو مال بیچنے والے کو نفع ملتا تھا، دوسرے قوم بھی فایدہ اٹھاتی تھی کیونکہ زر کی یہ زائد مقدار اس کی حدوں کے اندر آجاتی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تجاریت کے حامی کی نظر میں مال برآمد کرنے والا محب وطن اور درآمد کرنے والا وطن کا دشمن تھا۔ لیکن اس میں شرط یہ تھی کہ خام اشیا کی برآمد کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کو ملک ہی کے اندر پیدا کرنے کے بعد ان سے زیادہ قیمتی مصنوعات تیار کرکے برآمد کرنا

۱۴۱

[1] یہ مفروضہ تجارتی نظریے کے اصل مغالطوں میں سے ایک مغالطہ تھا۔

زیادہ بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اون کی برآمد ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اس کے خلاف ریشم کی سی خام اشیا جو ملک کے اندر نہ مل سکتی تھیں اور جن کی مصنوعات تیار کر کے دوبارہ بیچا جا سکتا تھا ان کو درآمد کی اجازت تھی۔ یہ درآمد اتنی نقصان رساں نہیں خیال کی جاتی تھی جتنی کہ مصنوعات اور اشیائے تعیش کی درآمد جس کی وجہ سے زر ملک سے بالکل باہر چلا جاتا تھا۔

تجارت کو ملک میں سونے اور چاندی کے ذخیرے کی فراہمی کا ذریعہ قرار دینا اس پالیسی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی جس میں فلز کی نقل و حرکت پر راست بندشیں عاید کر کے سونا اور چاندی فراہم کرنے کی کوشش کیجاتی تھی۔ حکومت اس بات پر اڑی رہی کہ زر کی برآمد نہ ہونی چاہیے۔ جو اجنبی انگلستان میں مال خریدیں وہ اپنا زر وہیں خرچ کریں، اور جن انگریزوں کے ذمے بیرونی اشخاص کے قرضے واجب الادا ہوں وہ انھیں بہ شکل اشیا ادا کریں۔ لیکن بتدریج یہ واضح ہوتا گیا کہ بعض اشیا کی تجارت کے لیے فلز کی برآمد ضروری تھی۔ چنانچہ ایسی تجارت جزائر شرق الہند سے ہو رہی تھی۔ قدیم نقطۂ خیال سے یہ تجارت ہر لحاظ سے خراب تھی۔ اس میں فلز برآمد کرنا ضروری تھا، اور جو اشیا وہاں سے درآمد کی جاتی تھیں وہ یا تو فضول خرچی میں داخل تھیں مثلاً مسالے جن کی کوئی ضرورت نہ تھی یا ریشمی یا سوتی مصنوعات جیسی اشیا تھیں جو انگریزی اونی کپڑوں کے بجائے استعمال کی جا رہی تھیں اور جن کا خریدنا کفایت شعاری کے خلاف تھا۔ لیکن یہ تجارت اتنی نفع بخش تھی کہ قدیم خیالات کے تحت اُسے ترک نہیں کیا جا سکتا تھا، اور اس کے حامیوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ نہ صرف جہازرانی کو ترقی دے رہی تھی بلکہ سچ پوچھو تو ملک کے زر کو بھی تلف ہونے سے بچا رہی تھی کیونکہ ان مشرقی اشیا کو اجنبیوں کے ہاتھ اتنے منافع پر فروخت کیا جا سکتا تھا جس سے کھویا ہوا زر واپس مل جائے۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں خود تجارتی نظام کے پیروؤں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک جماعت جو فلزیین[1] کہلاتی تھی

۱۴۲

[1] Bullionists

جو فلز کی نقل و حرکت پر براہ راست بندشیں عاید کرنے کی حامی تھی اور ہندوستانی تجارت کے مخالف تھی۔ دوسری جماعت "تجارتیین[1]" کی تھی جو سونے اور چاندی کو کسی حد تک آزادی کے ساتھ برآمد کرنے اور ہندوستانی تجارت کی تائید میں تھی۔ دونوں جماعتوں میں کافی عرصے تک بحثوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آخر کار موخر الذکر جماعت کامیاب ہوئی اور اس کی کامیابی کے بعد قطعی طور پر یہ رائے قایم کی گئی کہ کونسی پالیسی آیندہ کے لیے مناسب ہوگی۔ چنانچہ طے پایا کہ راست بندشوں کا طریقہ ترک کیا جائے اور صرف تجارت کی ترقی نصب العین ہو جس کا نتیجہ درآمد سے برآمد بڑھی رہے۔ اس وقت تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تجارتی توازن" انگلستان کے "موافق" ہے اگر جیسا کہ فرض کیا جاتا تھا اس کی قیمت زر کی شکل میں ادا کی جاتی تو اس کو بہت بہتر اور مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ دانشمند حکومت کا کام یہ تھا کہ تجارت کو مفید بنائے اور اس کا اندازہ کہ تجارت نفع بخش تھی یا نہیں تجارت کے توازن سے کیا جا سکتا جو برآمد و درآمد کے اعداد سے ظاہر ہوتا تھا۔ اگر فاضلات زیادہ ہوں تو اس کو ملک کی دولت میں توفیر سمجھا جاتا اور فاضلات میں کمی ہو تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قومی دولت گھٹ رہی ہے۔ اگر تجارت کا توازن غلط سمت میں جا پڑے اور درآمد کے مقابلے میں برآمد کے لحاظ سے کم ہو جائے تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایسے ملک کی حالت ٹھیک اُس شخص کی سی ہوگی جو آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے اور اس طرح دیوالیہ ہو جاتا ہے۔

خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا گیا ہو، فلزیین کی یا تجارتیین کا راست بندشیں عاید کرنے کا یا تجارتی توازن کو موافق رکھنے کا ہر حالت میں نصب العین بدستور وہی رہا اور وہ بالکل واضح اور قطعی طور پر یہ تھا کہ ۱۴۴

[1] Mercantilists

ملک میں سونے اور چاندی کا ذخیرہ کیا جائے تاکہ ملک طاقتور بن جائے۔ سب کا اس امر پر اتفاق تھا کہ یہ صحیح طریقہ تھا۔ اگر کسی صنعت یا تجارت کی روک تھام کی جاتی تو اس کے حامی یہ کہہ کر تائید کرتے کہ اس سے تجارتی توازن پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ یہ دلیل پیش کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ تجارت کے توازن کا موثر ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس قسم کا استدلال مضر بھی تھا۔

بہرحال اٹھارھویں صدی کے تقریباً آخری حصے تک انگلستان میں جہازرانی، زراعت، صنعت اور سونا اور چاندی یہ سب اقتدار کی پالیسی کے تحت رہے۔ انیسویں صدی تک اس پالیسی کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد لارڈ پیل نے غلے کے قوانین نافذ کر کے باقی اثرات کو ختم کر دیا۔ لیکن اس قانون کے نفاذ کے کچھ پہلے سے یہ پالیسی کمزور ہو چکی تھی۔ زر کی اہمیت جو اس پالیسی کا بنیادی پتھر تھا بہت پہلے نظر انداز کی جا چکی تھی اور پابندیوں کے بجائے غیر امتیازی تامین کا طریقہ رائج ہو گیا تھا جس کے تحت انگلستان کی تمام صنعتوں کو غیر ملکی سامان کے مقابلے میں تامین حاصل ہو گئی تھی۔ اس پالیسی کے زوال کے زمانے کا حال کسی بعد کے باب میں آئے گا۔

باب ۱

ایلزبتھ کی قانون سازی

صنعتی و تجارتی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ایلزبتھ کا دورِ حکومت اکثر اعتباروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں تجارتی نظام نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی جس کی سختی کے ساتھ پیروی آیندہ کئی بادشاہوں کے عہد میں ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ ایلزبتھ کے دورِ حکومت سے ان بحری مہموں کی امنگ کو بھی منسوب کیا جا سکتا ہے جن کے ذریعے سے انگلستان زبردست بحری طاقت بن گیا ہے جس کے مقبوضات اور نوآبادیات تمام روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور جس کی تجارت اس کے مقبوضات اور نوآبادیات سے بھی زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ ملکی تجارت کو ان نئے بازاروں سے بہت فایدہ پہنچا جو تجارت کے لیے بیرونی ممالک میں کھل گئے تھے۔ اسی طرح مذہبی رواداری کی پالیسی بھی نہایت فایدہ رساں تھی کیونکہ اس کی بدولت فرانس، ہالینڈ و بلجیم کے دستکاروں کو یہاں آنے اور ظلم و جور سے محفوظ رہ کر امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ترغیب

۱۴۴

ہوئی۔ ایلزبتھ کا ایک اور کارنامہ سکہ سازی کی اصلاح تھی ہنری ہشتم اور اڈورڈ چہارم نے سکوں کی حالت اس درجہ ناقص اور ابتر کردی تھی کہ تجارت میں ماہر ہر قدم پر رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں کیونکہ اس زر کے قدر کا صحیح اندازہ مشکل ہو گیا تھا۔ یہ اصلاح بجائے خود بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اور جس کامیابی اور اعتدال کے ساتھ یہ اصلاح کیگئی نہ صرف اس کے لحاظ سے قابل ستایش ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ اس نے مستقل مزاجی سے موقعوں کا لحاظ کیے بغیر اس بات کا ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہی ہو اصلاح کو تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ اسی عہد حکومت میں صنعت و تجارت میں اصل نے زیادہ اہم حصہ لینا شروع کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں تجارت ہو وہاں اصل کی موجودگی لازم ہے۔ یعنی ایسا اصل جو ذخیرے کی شکل میں کسی خاص کام کے لیے وقف ہو اور جو آسانی سے کسی دوسرے کام میں نہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ بڑھئی کے آلات، جلاہے کا کرگہ اور راچھ اسی معنی میں "اصل" ہیں۔ لیکن اصل کی ایک اور شکل بھی ہے، یعنی وہ اصل جو اتنی زیادہ مخصوص شکل نہ رکھتا ہو اور زیادہ وسیع طریقے پر استعمال کیا جا سکتا ہو۔ اِس کی بہترین مثال "زر" ہے اور سولھویں صدی کے آخری حصے میں کچھ تو انگلستان کی خوشحالی کے باعث اور کچھ اس نئی چاندی کے سبب سے جو امریکہ سے درآمد ہوئی، زر بہ افراط موجود تھا۔ اس زر کا اکھٹا کرنا اور اس کو اصل کی شکل میں کسی ایسے کاروبار میں لگانا جس میں منافعے کی توقع ہو آسان تھا۔ اس طرح اس خصوصیت کی ابتدا ہوئی جو آجکل عام ہے کہ مانگے تانگے کی اصل سے لوگ تجارت کرتے ہیں اور اصل ایسی کمپنیوں میں مصروف کیا جاتا ہے جن کے انتظام میں اصلدار کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ اصل زیادہ سیال بن گیا۔ اور جوں جوں اصل زیادہ سیال اور نقل پذیر بنتا گیا محنت بھی زیادہ نقل پذیر بن گئی۔ جھتوں کی بندشیں بڑی حد تک دور ہو چکی تھیں اور اس لحاظ سے لوگوں کو پہلے کے مقابلے میں

زیادہ آزادی حاصل تھی کہ جس پیشے میں چاہیں اور جہاں چاہیں کاروبار کریں۔ سچ پوچھو تو انھیں پوری آزادی حاصل نہیں ہوئی اور جیساکہ آیندہ بیان ہوگا، تھوڑی بہت آزادی جو حاصل ہوئی تھی اس میں بھی چارلس دوم کے قانون بندوبست Law of Settlement سے کمی ہوگئی۔ اس کے باوجود سترھویں صدی کے مزدور اس درجہ پابند نہ تھے جتنے کہ سولھویں صدی کی ابتدا میں ان کے پیشرو۔ ۱۴۵

تجارت کے بارے میں ایک باقاعدہ اور مکمل پالیسی بحری قوت کی ترقی، برطانیہ کی عظمت کے تخیل کی ابتدا، تجارت میں توسیع و ترقی، سکہ سازی اصلاح اور جدید طرز پر اصل کے استعمال اور ترقی کا آغاز یہ سب ایلزبتھ کے دور حکومت کی امتیازی خصوصیتیں تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی خصوصیات ہیں۔ اس عہد حکومت میں دو مشہور قوانین نافذ ہوئے:۔ ایک کار آموزوں کا قانون[1] اور دوسرا مفلسی کا قانون[2]۔ پہلا قانون دور حکومت کے ابتدائی حصے میں اور دوسرا دور حکومت کے آخری حصے میں منظور ہوا۔ صرف یہ قوانین ہی اس دور کو یادگار بنادیتے ہیں۔ ان قوانین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اپنے فرایض کے دائرے کو وسیع کرے۔ دونوں قوانین مزدوروں کے مسایل سے متعلق ہیں۔ پہلا قانون ان مسایل سے راست متعلق ہے اور دوسرا بالواسطہ۔

ملکۂ ایلزبتھ کے دور حکومت میں مزدوروں کے مسئلے پر توجہ کرنے کے کئی اسباب تھے۔ احاطہ بندی کی ترقی اور زرعی کھیتوں کو چراگاہوں میں بدل دینے کے عمل نے بہت سے مزدوروں کو بے روزگار کردیا تھا، اور اگرچہ اون کی ترقی پذیر ملکی صنعت میں اکثر خارج شدہ مزدوروں کی کھپت ہوگئی تھی تاہم سب روزگار سے نہیں لگ سکے۔ خانقاہوں کی

[2] Poor-Law.   [1] Statute of Apprentices.

برخانقاہی اُن کی متعلقہ زمینوں کی ضبطی اور متعدد مذہبی اور نیم مذہبی اوقاف اراضی کی ضبطی نے بھی کاموں اور پیشوں میں بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے بھی بے نشان ہو گئے جن سے مفلسوں کو بہت کچھ آرام پہنچتا تھا اگرچہ خیرات کے طریقے اعتراض کے قابل تھے۔ اس کے علاوہ حرفتی جتھوں کی تباہی سے صنعت و حرفت بے سہارا ہو گئی تھی اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب کہ تنظیم بہت زیادہ ضروری معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ زر کی قدر میں بار بار تغیرات ہونے سے صنعت و حرفت کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ان تغیرات کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب یہ تھا کہ ہنری ہشتم اور اڈورڈ ششم نے سکوں میں کھوٹ ملادی تھی۔ دوسرے یہ کہ "نئی دنیا" کی کانوں سے نکلی ہوئی چاندی اسپین ہو کر تمام یورپ میں پہنچ رہی تھی۔ ان دونوں اسباب سے قیمتوں میں کافی اضافہ ہو گیا۔ لیکن جو واقعات ظاہر ہوئے کسی قدر تفصیل سے ان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

۱۴۶

سکے کو دو طریقوں سے بگاڑا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ چاندی کی خوبی اور عمدگی میں کوئی تبدیلی کیے بغیر سکوں کی دبازت گھٹا دی جائے۔ دوسرے اس طرح کہ سکوں میں کھوٹ زیادہ ملائی جائے۔ ان دونوں طریقوں پر عمل ہوتا تھا۔ اڈورڈ سوم کے دورِ حکومت میں چاندی کے پنس کے وزن میں تقریباً ۱۰ فیصد کمی کر دی گئی تھی۔ یہ فرق کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، لیکن ۱۴۱۲ء اور ۱۴۶۴ء میں مزید کمی کی گئی یہاں تک کہ ہنری ہفتم کے دورِ حکومت تک سکے کے اصل وزن میں ۲۵ فیصد کمی ہو چکی تھی۔ یہ چیز خود قیمت میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھی، اور ایک حد تک ہوا بھی ایسا ہی۔ لیکن قیمتیں اس وجہ سے زیادہ نہیں بڑھنے پائیں کہ یورپ میں زر کی جو مقدار موجود تھی اس کے مقابلے میں وہاں مانگ زیادہ تھی۔ اس لیے زر کی مقدار میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا اس کی کھپت بہت جلد ہو گئی۔ اس کے علاوہ چلن میں سکے بہت کم ہو گئے تھے کیونکہ ہنری ہفتم نے اپنے خزانے کو بھرنا شروع کر دیا تھا۔

ہنری ہشتم نے نہ صرف اپنے باپ کے خزانے کو بہت جلد خالی کر دیا بلکہ سکوں کو کم قدر کر دیا۔ چنانچہ اُس نے پنس کے وزن کو گھٹا کر دس گرین اور اڈورڈ ششم نے اس کو کم کرکے ۸ گرین کر دیا۔ اس نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ سکے میں کھوٹ ملانی شروع کر دی۔ ۱۵۲۷ء میں ۱۲ اونس دھات سے جس میں $11\frac{1}{12}$ اونس چاندی اور $\frac{11}{12}$ اونس کھوٹ شامل ہوتی تھی ۳۷، شلنگ بنائے جاتے تھے، ۱۵۵۱ء میں ۱۲ اونس دھات سے جو ۹ اونس کھوٹ اور صرف ۳ اونس چاندی پر مشتمل ہوتی تھی ۷۲ شلنگ بنائے جانے لگے۔ لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ نئی دنیا کی دریافت کی تاریخ سے چاندی کی درآمد یورپ میں شروع ہوئی۔ ابتداً چاندی زیادہ تر اسپین گئی، اس لیے انگلستان کی قیمتیں کچھ عرصے کے بعد چاندی کی اس آمد سے متاثر ہوئیں۔ لیکن ۱۵۴۵ء سے جب کہ پوٹوسی کی کانیں دریافت ہوئیں اسپین میں چاندی بکثرت آنی شروع ہوئی اور اسپین کی جنگوں نے اس کو تمام یورپ میں پھیلا دیا۔ ایک تخمینے کے مطابق ۱۴۹۱ء اور ۱۵۴۵ء کے درمیان یورپ میں زر کی مجموعی مقدار ۵۰ فی صد بڑھ گئی اور ۱۶۰۰ء تک چوگنی ہوگئی۔ یہ سمجھنا آسان ہے کہ ایلزبتھ کے دور حکومت کے شروع میں جب کہ سکوں کی قدر پہلے کے مقابلے میں $\frac{1}{2}$ رہ گئی تھی اور چاندی کی مقدار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا تو قیمتوں میں تبدیلی کے ساتھ غیر یقینی حالات کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اگر ۱۵۱۱ء - ۲۰ء اور ۱۵۴۱ء - ۵۰ء کے دو عشروں کی اوسط قیمتوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گیہوں کی قیمت فی کوارٹر ۶ شلنگ ۸ پنس سے بڑھ کر ۱۰ شلنگ ۸ پنس ہوگئی تھی۔ اسی طرح جو کی قیمت ۴ شلنگ سے بڑھ کر ۶ شلنگ ۲ پنس، جئی کی قیمت ۲ شلنگ ۲ پنس سے بڑھ کر ۴ شلنگ تھی، بیل جو پہلے ۱ پاؤنڈ ۳ شلنگ کو ملتا تھا اب ۲ پاؤنڈ ۲ شلنگ میں ملنے لگا، اور بھیڑ کی قیمت بجائے ۲ شلنگ ۶ پنس کے ۵ شلنگ ہوگئی تھی۔ قیمتوں کا یہ فرق کافی زیادہ ہے، لیکن ۱۵۴۵ء اور

۱۴۷

۱۵۵۱ء کے درمیان سکوں میں جو ملونی اور ان کی ناکارگی جاری رہی اس کا پورا اثر ظاہر ہونے پر صورت حال اور بھی خراب ہو گئی۔ سکے اس قدر بے اعتبار ہو گئے تھے کہ ملک میں از سر نو بارٹر کا طریقہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ اشیاء کا اشیاء سے مبادلہ ہونے لگا اور اجرت جنس کی شکل میں ادا کی جانے لگی۔ جہاں کہیں زر استعمال ہوتا تھا ضروریات کی قیمت میں کم از کم ۱۰۰ فی صد اضافہ ہو گیا۔ اگر اجرت کی شرح میں بھی مناسب اضافہ ہوتا تو اس اچانک تبدیلی سے بہت زیادہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن ۱۵۵۰ء تک اجرتوں میں اکثر صورتوں میں ۳۰ فی صد سے بھی کم اضافہ ہوا تھا، اور اس کے بعد بھی وہ ۵۰ فی صد سے زیادہ نہ بڑھنے پائیں حالانکہ ضروریات کی قیمت میں ۱۰۰ فی صد اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اجرت اکثر مزدوروں کی گزر بسر کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ لوگوں نے ایسے پیشے چھوڑ دیے جن سے ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا، اور بھیک مانگنے اور خیرات پر بسر کرنے لگے۔

اس طرح ایلزبتھ کو مزدوروں کے ایسے اُلجھادے کا سامنا کرنا پڑا جو ایک ساتھ کئی اسباب کا نتیجہ تھا۔ گلہ بانی کے لیے اراضی کی احاطہ بندی، خانقاہوں اور مذہبی اداروں کی برخواست، سکوں کی تخریب اور ان کی نامقبولیت، تجارتی جتھوں کی کمی، ان سب چیزوں نے مزدوروں کو بیکار اور بیروزگار کر دینے یا کام کو غیر مفید بنانے یا ان وسیلوں کو تباہ کرنے میں جو مفلسوں کو مصیبتوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کا باعث ہوئے تھے حصہ لیا تھا۔ چونکہ اس مسئلے کے کئی پہلو تھے اس لیے اس کے علاج بھی متعدد تجویز کیے گئے۔ احاطہ بندی کی روک تھام اور ملک ہی میں غلہ اُگانے کی حوصلہ افزائی کر کے زرعی کساد بازاری کو دور کرنے کے بارے میں جو تدبیریں کی گئیں انھیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ بیروزگاروں یا ایسے لوگوں کے لیے جن کو حالات سے مجبور ہو کر محض اپنی بقا کے لیے ان تھک کشمکش کرنی پڑتی تھی

۱۴۸

کیا کیا گیا۔ یہ لوگ مختلف قسم کے تھے۔ ایک تو وہ جو بیروزگار ہو گئے اور کام حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو بیکار تھے مگر مسنڈے ہونے کے باوجود خیرات پر فقیرانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور آخر میں ایسے ضعیف، مفلس اور مریضوں کا نمبر تھا جو کام ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ان سب جماعتوں کے بارے میں الگ الگ چارہ کار اختیار کیا گیا۔ ایسی صورت میں جب کہ کئی قسم کے چھوٹے سکوں کے علاوہ تین مختلف قسم کے شلنگ اور چار مختلف قسم کے اسکس میں رائج تھے، پیچیدگی اور بدنظمی کا ہونا ضروری تھا۔ اس صورت حال کی اصلاح آسان نہ تھی۔ تمام سکوں کو واپس طلب کر لینا لازمی تھا چنانچہ ۱۵۶۰ء میں ایسا ہی کیا گیا۔ پرانے سکوں کے معاوضے میں نئے سکے ان کی اصلی قدر کے لحاظ سے ادا کیے گئے اور اس بات کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے پرانے سکے جلد واپس کیے جائیں، ہر ایک پونڈ چاندی ادا کرنے پر کچھ انعام مقرر کیا اور ایک حکم جاری کیا گیا کہ مقررہ مدت گزرنے کے بعد قدیم زر قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ تمام کام نہ صرف کامیابی سے انجام پایا بلکہ سچ پوچھو تو اس سے حکومت کو نفع بھی ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ قیمتوں میں اتنی کمی نہیں ہوئی جتنی کہ توقع کی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ امریکہ سے نکلی ہوئی بہت سی چاندی ملک میں آ رہی تھی حقیقت میں یہی وہ چیز تھی جس نے نئے سکوں کے رواج کو اتنا آسان بنا دیا۔ گو قیمتیں گھٹ کر اپنی قدیم سطح تک نہیں پہنچیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تجارت میں فوراً کافی آسانی ہو گئی۔ صنعت نے دوبارہ قدم آگے بڑھایا۔ تجارتی کاروبار کے لیے گرانی کا زمانہ عام طور سے سرگرمی اور توسیع کا زمانہ ہوتا ہے اس شرط سے کہ یہ گرانی زر کی تخریب کی وجہ سے نہ پیدا ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں معقول منافعہ ملتا ہے اور اصل جمع کرنا اور اس کے شغل کی حوصلہ افزائی کرنا آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ سکے کی بحالی کے بعد انگریزی تجارت میں جلد ترقی ہوئی۔

۱۴۹

نئے سکے نے بڑا کام کیا۔ اس نے آیندہ تجارتی ترقی کے لیے ایک نہایت مستحکم بنیاد قایم کردی۔ لیکن وہ معاشی مشکلوں کا پورا حل ثابت نہیں ہوا۔ بڑھتی ہوئی قیمتیں ان لوگوں کے لیے اطمینان کا سبب ہوسکتی ہیں جو کاروباری دھندے میں لگے ہوئے ہوں اور منافع حاصل کرتے ہوں، لیکن ان لوگوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں جو مقررہ آمدنیاں رکھتے ہوں یا جن کی آمدنیوں میں بہت دیر اور مشکل سے تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی موخر الذکر جماعت میں اجرت پانے والے شامل ہیں۔ آج کل بھی جب کہ اجرتوں میں بڑی مستعدی سے اضافہ کیا جاتا ہے اجرتوں کی بیشی کی شرح قیمتوں کے مقابلے میں عام طور پر سست ہوتی ہے۔ یہی صورت ملکۂ ایلزبتھ کے دور حکومت میں پائی جاتی تھی، یعنی ضروریات کی قیمت کے اضافے کے مقابلے میں اجرت کی بیشی کی رفتار سست تھی۔ موجودہ زمانے میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزدور اجرت کے اضافے کی تاک میں رہتے ہیں اور جب کبھی موقع ملتا ہے متحدہ محاذ پیش کر کے دھمکیاں دیکر اور ہڑتال کر کے اپنی اجرتوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سولھویں صدی میں ایسی تدبیریں بمشکل کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں اور اگر سنجیدگی سے انھیں کوئی تجویز بھی کرتا تو حکومت ہر طریقے سے مزدوروں کے اس طرح کی متحدہ کارروائی کو روکنے کی کوشش کرتی۔ قدیم طریقہ یعنی حرفتی جتھوں یا شہری نظاموں کے ذریعے سے اجرتوں اور قیمتوں کی نگرانی غیر موثر اور ناکافی تھی۔ تاہم ایسا انتظام کیے جانے سے پہلے ہی حکومت کے لیے کوئی نہ کوئی طریق کار اختیار کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ ایلزبتھ کی قانون سازی کو اس کام کی تکمیل تصور کیا جاسکتا ہے جس کی ابتدا ملکۂ کے پیشروؤں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

زرعی مزدوروں کی کمی اور شخصیہ والے شہروں کا زوال، یہ دونوں ملکہ ایلزبتھ کے دور حکومت کی سب سے بڑی خرابیاں تھیں۔ زراعت اور منظم صنعت دونوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ جہاں ابتداً زرعی مزدور

اس وجہ سے بیکار ہو گئے تھے کہ چراگاہوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا وہاں اب کھیتوں پر اس لیے کام بند تھا کہ فصل کی کٹائی کرنیوالوں کی کمی تھی۔ پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ قدیم تخصیصہ والے شہر بھی زوال پذیر ہو رہے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک یہ نئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی کہ بڑے دیہات اور منڈی والے چھوٹے قصبوں میں دستکار جوق در جوق آرہے تھے۔ ان میں سے کچھ مزدور تھے جو زرعی زندگی کو چھوڑ کر صنعت میں داخل ہونا چاہتے تھے اور باقی ایسے دستکار تھے جو تخصیصے والے قصبوں کی منظم صفت کے سخت قاعدوں سے بچنا چاہتے تھے۔ اس طرح ایک یہ نئی خرابی رونما ہوئی کہ اکثر کارآموزوں نے اس مدت تک کام نہیں کیا جس کی تکمیل ان پر اقرار نامے کے موافق واجب تھی، اور جو بھی کام کیا وہ خراب قسم کا تھا۔ ان سب پر طرہ یہ کہ کام کا ملنا روز بروز غیر یقینی ہوتا جارہا تھا۔ ان تمام گتھیوں کو سلجھانے میں ظاہر ہے کہ ملکۂ ایلزبتھ کو سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔

گو ان مسایل کا حل مشکل تھا۔ پھر بھی ملکہ نے حالات کی اصلاح کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ ۱۵۶۳ء میں "قانون کارآموزی"[1] کے نام سے ایک جامع قانون منظور ہوا جو کم از کم اس وقت کے لیے ان تمام خرابیوں کو دور کرنے میں غیر معمولی طور پر موثر ثابت ہوا جن سے انگریزوں کی خوشحالی باقی نہ رہنے کا اندیشہ تھا۔

زرعی مزدوروں کی کمی کو دور کرنے کے لیے یہ قانون نافذ کیا گیا کہ ضرورت کے وقت سب تندرست اور اچھے قویٰ کے مزدور کھیتوں میں کام کریں اور فصل کی کٹائی کے زمانے میں کسی کو بھی مستثنیٰ کیے جانے کی منظوری نہ دی جائے۔ کام پر رہنے کی جو غیر یقینی صورت حال تھی اس کی اصلاح کے لیے قانون میں ایک دفعہ رکھی گئی جس کی بموجب یہ لازم تھا کہ مزدوروں

[1] Statute of Apprenticesor Statute of Artificeers

کو یہ یک وقت کم از کم ایک سال کے لیے اجرت پر رکھا جائے اور سب کار آموز سات سال تک خدمت انجام دینے کے بارے میں لندن کے رواج کی تقلید کریں۔ آخر میں شخصیہ والے قصبات کو بھی یہ فایدہ ہوا کہ یہاں ۴۰ شلنگ کے معافی داروں کے لڑکوں کو بطور کار آموز رکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف منڈی کے قصبوں میں بطور کار آموز رکھے جانے والے کے باپ کے لیے کم سے کم شرط یہ تھی اس کے پاس ۶۰ شلنگ کی معافی داری ہو۔

اس قانون کی تعمیل کرانے کے لیے جو انتظامی عملہ قایم ہوا وہ لایق ذکر ہے۔ زوال پذیر حرفتی جتھوں کا از سر نو قیام عمل میں لایا گیا تاکہ وہ کار آموزوں کی بھرتی اور کام کی خوبی کی نگرانی کریں آیندہ سے عدالت دیوانی کے ناظموں سے اجرتیں معین کرانے کے بعد پریوی کونسل کی منظوری حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں اس معنی خیز امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اجرتوں کی کوئی زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہیں کی گئی تھی۔ اس بات کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ صنعتی کمپنیاں، جو اس قانون کی شرطوں پر عمل پیرا ہوئیں، اُن قدیم حرفتی جتھوں سے بہت مختلف تھیں جن سے یہ کمپنیاں بنیں ان میں اب زیادہ اچھی حیثیت والے شامل تھے اور اکثر ایک ہی کمپنی میں مختلف پیشوں اور دھندوں کے نمایندے شریک ہوتے تھے۔ ۱۵۱

اس انتظام سے بہت حیرت افزا اور پوری کامیابی ہوئی۔ زراعت نے اس درجہ ترقی کر لی کہ جیمس اول کے لیے احاطہ بندیوں پر سے تمام بندشیں ہٹا لینا ممکن ہو گیا۔ شخصیے والے قصبے نئی قوت اور تازہ توانائی کے ساتھ ترقی کرنے لگے۔ اجرتوں کا تعین بھی اس وقت کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ یہ کوئی نیا طریقہ نہیں تھا۔ یہ کام رچرڈ دوم کے دور حکومت کے تیرھویں سال سے دیوانی ناظموں کے باقاعدہ فرایض میں داخل چلا آ رہا تھا۔ سابق میں پارلیمنٹ نے چند حدیں مقرر کی تھیں جن سے اوپر اجرتیں نہیں بڑھائی جا سکتی تھیں، لیکن

اب یہ حد بندی توڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ یہ ایک انوکھی بات تھی اور یہی ملکۂ ایلزبتھ کے منظورہ دستور العمل کی خاص خوبی تھی۔ نگرانی کے باوجود قیمتوں میں اضافہ ہوگیا تھا اور یہ واجبی بات تھی کہ اجرتیں بھی بڑھتیں اس قسم کے قوانین عام طور پر بہت تفصیلی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ہنری ششم کے دور حکومت کے ایک قانون میں ان اجرتوں کی تفصیلی شرحیں معین کردی گئی تھیں جو مختلف دھندوں کے لیے مناسب ہوسکتی تھیں۔ مثلاً ایک دہقان کے لیے سالانہ اجرت ۲۰ شلنگ اور لباس کے لیے ۴ شلنگ معمولی ملازم کے لیے ۱۵ شلنگ اور ۳ شلنگ ۴ پنس خادمہ کے لیے ۱۰ شلنگ اور ۴ شلنگ۔ دوسری طرف دستکاروں کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا جن میں سے ہر ایک درجے والے کو بترتیب ۴، ۳ پنس، ۲ پنس اور ۱/۲ ۱ پنس یومیہ دیے جاتے تھے اور کھانا نہ دینے کی صورت میں ہر دستکار کو مزید ۱/۲ ۱ پنس دیے جاتے تھے۔ پارلیمنٹ نے جو حد مقرر کردی تھی کہ اجرتیں اس سے متجاوز نہ ہوں اس کا منشا یہ نہیں تھا کہ اجرتوں کو گرایا جائے بلکہ اصل غرض یہ تھی کہ اجرتیں اتنی زیادہ نہ بڑھنے پائیں کہ ان کو غیر مناسب خیال کیا جائے۔ لیکن نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ قوانین کچھ سخت ہوگئے۔ دیوانی کے ناظموں کا یہ خیال حق بجانب ہوسکتا تھا کہ اجرتوں کو قانونی حد سے نیچے رکھنا چاہیے۔ اور اگرچہ پارلیمنٹ نے کبھی کبھی شرحوں میں اضافہ کیا، تاہم یہ تدبیریں ایسی نہ تھیں کہ انھیں بدلنے والے حالات پر آسانی سے منطبق کیا جاسکتا۔ ایلزبتھ کے منظور کردہ "قانون کار آموزان" میں اجرت کے اضافے پر سے پابندیاں ہٹالی گئیں اور اس معاملے کو بالکل دیوانی کے ناظموں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ ہر سال ایک کمیٹی کرنے اور مشورہ کی غرض سے ایسے سنجیدہ اور دور بین اشخاص کو طلب کرنے کا اختیار دیا گیا جنھیں وہ مناسب خیال کریں تاکہ ان کی رائے کے مطابق وقت کی کمی و بیشی کا لحاظ رکھ کر ان کے متعلقہ ضلعوں میں ہر سال زرعی، صنعتی اور خانگی

۱۵۴

ہر قسم کے کام کی اجرت بحساب فی یوم، ہفتہ یا سال معین کریں۔
اس انتظام کے مطابق کس حد تک عمل ہوا اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ ۱۵۹۷ء کے ایک قانون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غالباً اس پر عام طور سے عمل نہیں ہوا۔ چنانچہ ۱۶۰۴ء کے قانون میں اس کو زیادہ موثر بنانے کے متعلق قرارداد موجود ہے۔ لیکن اس کا ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ کہاں تک اس پر عمل ہوا۔ دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناظمان دیوانی بھی اجرت معین کیا کرتے تھے اور ان کی باریک بینی کی تفصیلوں سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مقرر کردہ اجرتوں پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں بمقام بیری سنٹ ایڈمنڈس اجرتوں کا جو تعین کیا گیا تھا اس میں ۸۰ مختلف کاموں اور پیشوں کا ذکر کیا گیا ہے جو زیادہ تر بڑی بڑی قسموں کے تحت درج کیے گئے ہیں اور ان کی شرحیں اس طرح مقرر کی گئی ہیں جن سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اجرت گوشت پانے کی صورت میں کیا ہو گی اور نہ پانے کی صورت میں کیا ہو گی؟ مثلاً اعلیٰ درجے کے نجاروں، پہیا یا گاڑی بنانے والوں، آرا کشوں، لکڑی کی پٹی کاٹنے والوں، ادنیٰ درجے کے معماروں، اینٹ جمانے والوں، کھپرا رکھنے والوں، تارمیں رکھنے والوں، سیسے کا کام کرنے والوں، بت تراشوں، چھانے والوں، سرکنڈے کا کام کرنے والوں کو جو ماہر کاریگر تھے ۸ پنس یومیہ گوشت اور شراب کے ساتھ اور ۱۶ پنس بے گوشت اور شراب کے دیے جاتے تھے۔ اس کے برخلاف کھلونے بنانے والوں، چونا جلانے والوں، ٹوکریاں اور پنکھے بنانے والوں، گاڑیوں کی مرمت کرنے والوں، موچیوں، درزیوں، نقاشوں، زین سازوں، پیپے بنانے والوں، پرانے برتن جوڑنے والوں، خشت سازوں، کھپرا بنانے والوں، باغبانوں، سنگتراشوں اور سبزہ زاروں اور دلدلوں میں گہری نالیاں بنانے والوں کو ۶ پنس روزانہ گوشت اور شراب کے ساتھ اور ۱۲ پنس سوکھے دیے جاتے تھے۔ ملازموں

اور کارآموزوں کو اس سے کچھ کم اجرت دی جاتی تھی، کیونکہ ایک حد تک
ان کی عمر کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔ دن میں کام کرنے والے مزدوروں کو
۶ پنس اور ۱۲ پنس بہ ترتیب وار دیے جاتے تھے بجز ان دنوں کے جو
مائیکل مس[1] اور یوم مریم[2] کے درمیان ہوتے تھے جب کہ ترتیب کے لحاظ
سے ۴ پنس اور ۸ پنس دیے جاتے تھے۔ گھسیاروں، غلہ گاہنے والوں (ان کی ۱۵۳
پانچ قسمیں تھیں اور سب کی شرح اجرت مختلف تھی) لکڑہاروں، کھیت کے
ملازموں، ناظروں، خادماؤں، گلون کی نگہبانی کرنے والی عورتوں،
کپڑے والوں، عام ملازموں، دباغت کرنے والوں، چھری چاقو بنانے والوں،
آہنگروں، نعل بندوں، کمان بنانے والوں اور متعدد دوسرے پیشے والوں
کی اجرت بھی مقرر کی گئی تھی اور دیوانی کے ناظموں نے ٹھیکے کے کام کی
اجرت بھی اسی طرح معین کر دی تھی۔ اس قسم کی تفصیلی نگرانی سے بچنا بہ مشکل
ممکن تھا۔

قانون کارآموزان کا یہ منشا نہیں تھا کہ اجرتوں کو زمینداروں
کو فایدے کی خاطر گرایا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ناظمان دیوانی نے ہمیشہ
انصاف سے اس کی تکمیل نہ کرائی ہو ممکن ہے کہ انھوں نے وقت کی کمی و بیشی کا
پوری طرح لحاظ نہ کیا ہو اور یہ یقینی ہے کہ وہ اس قیمت کے اضافے کی توجیہ
کرنے یا اس کو ملحوظ رکھنے سے قاصر رہے جو نئی چاندی کی وجہ سے رونما
ہوا تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ جو لوگ قانون کی تعمیل کراتے تھے انکی
خود غرضی یا غلطیوں کے باعث بعض اوقات قانون کا عمل سخت ہو گیا
ہو۔ یہ سچ ہے کہ قانون میں سزا ان لوگوں کے لیے تجویز کی گئی تھی جو
مقررہ شرح اجرت سے زیادہ ادا کرتے تھے اور ان لوگوں کے لیے
کوئی سزا نہ تھی جو مقررہ شرح سے کم ادا کرتے تھے، پھر بھی اس کو اس
بات کے ثبوت کے طور پر نہ ماننا چاہیے کہ اجرتوں کو گرانا مقصد تھا۔

[1] Michaelmas.

[2] Lady Day.

جن اشخاص نے قانون بنایا تھا وہ ایک قدیم رسم کی پیروی کر رہے تھے جس کا وجود چودھویں صدی میں پایا جاتا ہے۔ اس رسم کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی جب کہ اجرت پانے والے اپنے آجروں کے مقابلے میں معاملہ طے کرنے کی زیادہ قوی حیثیت رکھتے تھے اس کے علاوہ قانون کے مقدمے میں اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ "قیمتوں کی زیادتی" کی وجہ سے اجرت کی شرحیں "بہت ادنیٰ" ہو گئی تھیں۔ اور اس نظام کو قوت پہنچانے کے لیے سنہ ۱۶۰۴ء میں جو قانون نافذ کیا گیا اس میں مذکور ہے کہ شرح اجرت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہ کی جائے بلکہ کم سے کم حد مقرر کی جائے۔

اس نزاعی سوال سے قطع نظر کہ آیا قانون پر عام طور سے عمل ہوا یا نہیں، یہ قانون ایک بہت ہی قابل عمل تدبیر تھا۔ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے اس قانون میں کوئی نامناسب بات نہ تھی اور نہ وہ ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔ اگر کوئی ضابطہ حد سے زیادہ سخت اور برداشت کے ناقابل ہو تو وہ بہت جلد ترک ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ابتداءً ملک کے ایک حصے میں منصفانہ اور دوسرے ۱۵۴ حصے میں نامنصفانہ ثابت ہو۔ لیکن کار آموزوں کے قانون کی حد تک اس قسم کی مشکلیں پیش نہیں آئیں، کیونکہ اس قانون کے تحت مقامی لوگوں کو پورا اختیار تھا کہ عارضی اور مقامی طور پر اجرتوں کی شرح معین کریں۔ اس امر کے ثبوت میں کہ یہ قانون مجموعی حیثیت سے اطمینان بخش تھا یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے مزدوروں نے جن کی زندگی کو نئے انتظام اور صنعتی انقلاب نے پُر آشوب بنا دیا تھا یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ دوبارہ ایلزبتھ کے مرتبہ نظام اور اجرتی تعین کے طریقے کو اختیار کیا جائے[۱]۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کی

[۱]۔ اجرت کی کم سے کم شرحیں مقرر کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں سنہ ۱۷۹۵ء سنہ ۱۸۰۰ء اور

ابتدا میں ان پیشوں میں[1] جو ملکۂ ایلزبتھ کے دورِ حکومت کے بعد رونما ہوئے تھے اور جو ۱۵۶۳ء کے قانون کے تابع نہ تھے بہت کچھ مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ پیشے جن میں سرکاری بندشیں کم تھیں دوسرے پیشوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ خوشحال اور ترقی پذیر نہ تھے۔

سکون کی بحالی اور واجبی اُجرت کے تعین کا طریقہ اختیار کر لینے کے بعد یہ امید کی جا سکتی تھی کہ صرف ان لوگوں کے لیے معاش کا انتظام کرنا باقی تھا جو کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ قانون کار آموزان کی منظوری کے تیرہ سال بعد پارلیمنٹ کو آوارہ گردوں کی فہرست میں ان لوگوں کو بھی شامل کرنا پڑا جنھوں نے اپنے علاقے میں ایسی اُجرتوں کے لینے سے انکار کیا جو واجبی تھیں اور عام طور سے دی جاتی تھیں۔ اس طرح جو کام سامنے تھا وہ صرف یہی نہیں تھا کہ معذور مفلسوں کی امداد کی جائے بلکہ ایسے آوارہ گردوں اور اوباشوں کی روک تھام بھی کی جائے جو کام کے مقابلے میں بھیک مانگنے کو زیادہ نفع کا پیشہ سمجھتے تھے۔ موخر الذکر ذمہ داری کوئی نئی چیز نہ تھی۔ قانون مزدوران کے نفاذ کے بعد سے "نڈر بھک منگوں" کے خلاف لگاتار قوانین بنائے گئے۔ لیکن یہ خیال کہ معذوروں کی امداد کا انتظام حکومت کرے بالکل نیا تھا۔ یہ لوگ اب تک انفرادی خیرات پر بسر کر رہے تھے۔

ٹیوڈروں کے قوانین ملکہ ایلزبتھ کے ۱۶۰۱ء کے قانون مفلسی کا پیش خیمہ تھے۔ ان پر نقد و تبصرہ کرتے وقت ۱۵۳۶ء سے شروع کرنے میں سہولت ہوگی۔ اس سال جو قانون منظور ہوا اس سے واضح ۱۵۵

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۱۸۰۶ء میں تحریکیں پیش ہوئیں۔ قانون کار آموزان میں اجرت سے متعلق جو دفعات تھیں ان کو ۱۸۱۳ء میں منسوخ کیا گیا۔

[1] انھیں "اختیاری پیشے" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ موزے بننے کی مشین کے مزدور اس کی ایک مثال ہیں۔

طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کا ایک قدم آگے بڑھایا گیا تھا۔ اس وقت کافی قوانین نہ صرف ایسے مسٹنڈے بھک منگوں کے خلاف موجود تھے جو کام دیے جانے کی صورت میں اس کے کرنے سے انکار کرتے تھے بلکہ ایسے آوارہ اوباشوں کے خلاف بھی جو اہلِ خیر کے لیے بھاری بوجھ بنے ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ بات ہمیشہ مانی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے تھے جنکو بے بھیک مانگے چارہ نہ تھا۔ اس سے مراد ایسے لوگ نہ تھے جو بے روزگار ہو گئے ہوں کیونکہ خیال یہ کیا جاتا تھا کہ کام سب کے لیے موجود تھا اگر وہ کام کرنے پر آمادہ ہوں، بلکہ مراد ایسے لوگوں سے تھی جو معذور تھے یہ کام کی صلاحیت ہی نہ رکھتے تھے یا ایسے افراد سے جو بعض حق دالی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے پاس بھیک مانگنے کے اجازت نامے تھے، مثلاً جامعات کے محرر اور بحری اور بری سپاہی۔ سنہ ۱۵۳۱ء میں ایک نہایت حد بندی کا قانون منظور ہوا جس کی بموجب ہٹے کٹے اور غیر اجازت یافتہ بھک منگوں کو کوڑے مارے جا سکتے تھے اور انہیں انکے وہیں واپس کیا جا سکتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۵۳۶ء کا قانون اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ چنانچہ اس کی رو سے کھلم کھلا بھیک مانگنے کی سخت ممانعت کردی گئی۔ نڈر بھک منگوں کو یہ صداقت نامہ پیش کرنے پر کہ انھیں کوڑے لگائے جا چکے ہیں اپنے وطن لوٹتے وقت راستے میں ہر دس میل کی منزل پر طعام و قیام کی مدد دی جا سکتی تھی۔ اگر وہ راستے ہی میں رک جائیں تو ان کے کان چھیدے جا سکتے تھے، اور تیسری دفعہ جرم سرزد ہونے کی سزا موت تھی یہ صحیح ہے کہ ان کے وطن لوٹ جانے کی صورت میں ان کو ان کے وطن میں کام پر لگانے کا کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا بجز اس مشورے کے کہ پیرش اسے خیرات حاصل کریں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہو سکتے تھے جو کام چاہتے تھے مگر نہ مل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نئی بات یہ تھی کہ معذور مفلسوں کو بھی بھیک مانگنے کی اجازت نہ تھی بلکہ ان کی امداد کرنا ان کے پیرشوں کا فرض تھا۔ اس

غرض کے لیے معین مدت میں خیرات کا اصول کیا جانا ضروری تھا اور اہل کلیسا کو یہ حکم تھا کہ وہ سب کو خیراتی چندہ دینے کی ترغیب دیں۔ عام خیرات[1] ممنوع قرار دی گئی اور سب چندوں کا پیرش بھیج دیا جانا ضروری تھا۔ اس طرح وصول شدہ رقمیں معذوروں میں سے سب سے زیادہ مستحق محتاج کی تکلیف دور کرنے کی غرض سے استعمال کی جاتی تھیں۔

بھک منگوں کی اس روک تھام کے بعد ہی خانقاہیں توڑ ڈالی گئیں اور پھر اڈورڈ ششم کے دور حکومت میں مزید ضبطیاں ہوئیں ممکن ہے کہ ان مذہبی جماعتوں کی طرف سے جو خیرات دی جاتی تھی اسکے اندازے میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ناواجب طریق پر مسٹنڈوں، معذوروں، بدمعاشوں اور نیک لوگوں کو برابر کی خیرات دی گئی ہو اور اس کا برا اثر پڑا ہو، ممکن ہے کہ شفاخانوں اور لنگر خانوں کی تعمیر کی غرض سے خیراتی اوقاف کا انتظام بے احتیاطی سے کیا گیا ہو اور ان سے مفلسوں کے مقابلے میں خود مہتموں اور محافظوں کو زیادہ فایدہ پہنچا ہو۔ غالباً اسی بنا پر ایک معاصر نے لکھا تھا کہ "خیرات خانوں کا مال کھا کھا کر پادری پھول رہے تھے"۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مالدار ضلعوں میں الللے تللے سے اور مفلس ضلعوں میں بہت ہاتھ روک کر امداد دی گئی ہو۔ لیکن یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی کہ مذہبی انجمنوں کی خیرات کا انتظام کسی طرح دانشمندی کے ساتھ نہیں کیا گیا اور اس سے مصیبت زدوں کو آرام پہنچنے کے بجائے بھک منگوں کے پیدا ہونے کا قرینہ تھا، ان انجمنوں کی برخاستت اس وقت کے مفلسوں کے لیے ایک کاری ضرب تھی۔ اگرچہ خانقاہیں مستحق اور غیر مستحق میں امتیاز نہ کر سکیں، پھر بھی وہ غریبوں کی مدد کرتی رہیں۔ خیرات خانوں اور شفاخانوں نے چند غریبوں کو پناہ دی لیکن غالباً ان سب کو پناہ نہیں دی جن کو دینی چاہیے تھی۔ تجارتی جتھوں نے

[1] ۔ جو خانقاہوں یا بڑے گھروں سے مانگنے والوں میں بٹتی تھی۔

بیواؤں اور یتیموں یا مفلسوں کی جانب امداد کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ یہ یہ سچ ہے کہ بعض صورتوں میں شفا خانوں اور خیرات خانوں کی برخواست کے بعد ان کی جمع کی ہوئی رقمیں خیراتی کاموں ہی پر خرچ کی گئیں اور فرق صرف اتنا ہوگیا کہ ان کو تقسیم کرنے والے بدل گئے۔ لیکن ٹھیک ایسے زمانے میں جب کہ امداد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی امداد کے ذریعوں میں بہت کمی ہوگئی۔ سنہ ۱۵۲۷ء تا سنہ ۱۵۳۶ء میں لگاتار فصلیں خراب ہوئیں اور خانقاہوں کی برخاست نے بہت سوں کو بے سہارا کردیا۔ چنانچہ ان میں سے اکثر بھک منگوں میں جا ملے، بعض ضرورتوں کے تحت اور بعض شوق سے۔ اور اس طرح اسی قانون سے جس نے خیرات کے ایک بہت بڑے ذریعے کو کھو دیا تھا خیرات کرنے والوں کی جیبوں پر پہلے سے زیادہ بار پڑ گیا۔

۱۵۷ یہ مناسب نہ ہوگا کہ اڈورڈ ششم اور ملکہ میری کے دور حکومت کی قانون سازی کو نظر انداز کرکے محض اس واقع کا ذکر کردیا جائے کہ اوباشی کی اچانک ترقی سے سنہ ۱۵۴۷ء میں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہوئی جو آوارہ گردوں اور بے کاروں کے خلاف نافذ کردہ قوانین میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ چنانچہ اس کے مقدمے میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ اگلے قوانین اس وجہ سے بے سود ثابت ہوئے کہ جن پر ان کے نفاذ کی ذمہ داری عاید کی گئی تھی وہ غلط طریقے پر رحم و کرم کی آڑ پکڑتے تھے۔ لیکن اس قانون نے جذباتی خیرات کے بارے میں یقیناً غلطی نہیں کی۔ کیونکہ اس کی رو سے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مساوی طور سے پہلی مرتبہ جرم کی سزا یہ تجویز کی گئی تھی کہ لوہا گرم کرکے داغا جائے، دوسری مرتبہ جرم کی سزا یہ کہ ان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا جائے اور تیسری مرتبہ جرم کی سزا موت تھی۔ سنہ ۱۵۴۹ء میں یہ قانون منسوخ کردیا گیا اور ہنری ہشتم کے قوانین نئے سرے سے نافذ کیے گئے۔

اس وقت تک حکومت نے ارادی اور اختیاری ضرورت کے طریقے پر

اکتفا کی تھی خواہ وہ خانگی ہو یا پیرش سے متعلق۔ لیکن ایلزبتھ کے دورِ حکومت کے پہلے قانون مفلسی سے یہ ثابت ہوا کہ اختیاری خیرات کافی نہیں تھی۔ اڈورڈ ششم نے غریبوں کے لیے خیرات اکھٹی کرنے کی غرض سے خاص اہلکاروں کے تقرر کا انتظام کیا تھا اور اس خدمت کا بجا لانا ان لوگوں پر لازم کیا گیا جس کی خلاف ورزی کی سزا ۲۰ شلنگ جرمانہ تھی۔ اگر کوئی چندہ دینے سے انکار کرے تو پیرش کے پادری پر ضروری تھا کہ وہ اس کو ترغیب دے کر آمادہ کرے اور اس پر بھی وہ راہ راست پر نہ آئے تو اسقف اسے سمجھائے۔ ۱۵۶۳ء کے ایک قانون نے خیراتی چندہ دینے سے انکار کی سزا بڑھا کر دس پونڈ جرمانہ کردی اور یہ حکم دیا گیا کہ جو کوئی چندہ دینے سے انکار کرے اسے آخری چارہ کار کے طور سے دیوانی کے ناظموں کے سامنے پیش کر کے قید کردیا جائے۔ اس طرح چندہ دینے کا جبری طریق پہلی مرتبہ نافذ کیا گیا اور مفلسوں کی مدد کرنا خیراتی کام نہ رہا بلکہ ایک فرض بن گیا۔ حکومت نے غریبوں کو خیرات کرنے والوں کی اتفاقی فیاضی اور کرم پر چھوڑنے کی بجائے ان کی امداد کو اپنے ذمے لے لیا۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی نئے طریق کو مستحکم کرنے کے لیے دوسری تدبیریں بھی کی گئیں۔ ۱۵۷۲ء کے قانون کی رو سے پھر آوارہ گردوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ آوارہ گرد کی تعریف میں ایسے دادو غہ اور مہتمم بھی شریک کیے گئے جو ملکہ سے بے اجازت نامے حاصل کیے شفاخانوں کے لیے گھر گھر خیراتی چندہ جمع کرتے پھرتے تھے۔ بٹیر باز بھالو والے، مطرب، مداری، کھیل کے درمیان تماشا کرنے والے اور رتال بھی اسی زمرے میں تھے۔ یہ سب لوگ سچ پوچھو تو گداگر نہ تھے، لیکن ان کے پیشے پیوریٹانزم Puritanism کے اس میلان کے خلاف تھے جو بیت العوام میں روز افزوں تھا۔ آوارہ گردوں کے بچوں کے متعلق یہ حکم جاری کیا گیا کہ وہ اپنے ماں باپ کی سرپرستی سے ہٹا لیے جائیں اور انھیں کار آموز بنایا جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر اپنے والدین کی طرح کاہل نہ بن سکیں بوڑھے مفلسوں کے لیے مکان بنائے گئے، غریبوں کا سمواری رجسٹر

۱۵۸

قایم کیا گیا اور خیراتی چندوں کی مقدار معین کردی گئی اور باقاعدگی سے مطالبہ کیا جانے لگا۔ گو عدالت کوارٹر سیشنز[1] میں اس کے خلاف مرافعہ کیا جا سکتا تھا، تاہم چندہ دینے سے انکار کی سزا قید رکھی گئی۔ ۱۵۷۶ء میں یہ انتظام کیا گیا کہ مفلسوں کو اونی اور سن کی سبی اشیاء کے کام پر لگایا جائے اور ان کی اجرتوں کی ادائی کے لیے ایک خاص محصول عاید کیا جائے یا رضاکارانہ چندے وصول کیے جائیں۔ اس کام کے سلسلے میں اجرتوں کی ادائی اور سامان کی فروخت چندہ جمع کرنے والوں کے سپرد تھی۔ اگر مفلس کام سے انکار کرتے تو انھیں دارالاصلاح بھیج دیا جاتا تھا جہاں ان کے کوڑے لگائے جاتے، لوہے کی زنجیروں میں جکڑا جاتا اور پھر کام پر لگایا جاتا تھا۔

۱۵۹۷ء اور ۱۶۰۱ء کے قوانین تمام اگلے قوانین کا اعادہ اور مجموعہ تھے۔ ان میں ملکۂ ایلزبتھ کے مفلسی کے قوانین کی سب خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایسے اشخاص کے لیے مالی امداد مقرر تھی جو کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور یہ امداد ان ہی کے پیرشوں میں جبری محصول کی شکل میں سب سے وصول کی جاتی تھی اور ادا نہ کرنے کی صورت میں قرقی کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا جو لوگ کام کر سکنے کے باوجود کام سے جی چراتے تھے ان کو سزا دی جاتی تھی اور اس کا اختیار بھی مقامی حکام کو دیا گیا تھا۔ سزا کے طور پر یا تو کوڑے لگائے جاتے تھے یا دارالاصلاح بھیج دیا جاتا تھا۔ مفلسوں کے بچوں کو بطور کارآموز رکھا جاتا تھا اور ایسے لوگوں کے لیے کام نکالا جاتا تھا جو کام کے لیے آمادہ تھے مگر جنھیں کام نہ مل سکتا تھا۔ اس آخری معاملے کے متعلق قوانین میں غریبوں کو کام پر لگانے کے بارے میں عام ہدایتیں دی گئی تھیں اور اس سلسلے میں سن کے ذخیرے مہیا کرنے کے بارے میں بھی کچھ تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ اگر ملکۂ ایلزبتھ کے قانون سازوں کو اطمینانی قاعدے اور ضابطے مرتب کرنے میں دقت محسوس ہوئی ہو تو کوئی تعجب

[1] Quarter Sessions.

کی بات نہیں۔ کیونکہ خود ہمارے زمانے میں کوئی یہ نہیں کہ سکتا کہ بیروزگاری کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ لیکن دوسرے اعتباروں سے یہ طریقہ بیشک اطمینانی تھا۔ مقامی عہدہ داروں کے سر ذمہ داری عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ضلع اپنے طور پر نگرانی کرنے لگا اور یہ صورت مرکزی انتظام کے تحت ممکن نہ تھی۔ اس طرح آوارہ گردوں کی تعداد تیزی سے گھٹنی گئی' معذور مفلسوں کی شکایتیں کم ہو گئیں اور یہ پورا انتظام لچکدار ہونے کی وجہ سے دیر پا ثابت ہوا۔ ملکۂ ایلزبتھ کے مفلسی کے دانشمندانہ قانون کے کارگر ہونے کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر حصے میں جب لوگ اس کے اصول سے پھرنے لگے تو لگا تار مصیبتوں میں گھر گئے۔ 159

اس طرح انگلستان کی صنعتی ترقی کی تاریخ میں ملکۂ ایلزبتھ کے دور حکومت کا نہایت اہم مقام ہے۔ حکومت نے ان تمام مصیبتوں کا خاتمہ کردینے کا بیڑا اٹھایا جو ہنری ہشتم کی سکہ سازی میں بد دیانتی اور قدیم صنعتی اور خیراتی نظام کے درہم برہم ہو جانے سے پیدا ہوئے تھے اور مجموعی حیثیت سے حکومت کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ سکہ سازی کی اصلاح سے یہ سہولت ہوئی کہ اس زمانے کے وسیع حالات کے ساتھ صنعت اور تجارت نے بھی ترقی کی۔ قانون کار آموزان' اچھا کام مہیا کرنے اور مزدوروں کو معقول اجرت دلانے میں کارگر ثابت ہوا تو دوسری طرف قانون مفلسی نے بیکاروں اور ایسے آوارہ گردوں کی تعداد میں کمی کر دی جو آئے دن چوری' ڈکیتی اور کبھی کبھی سنگین جرائم کیا کرتے تھے اور یہ عام اصول تسلیم کر لیا کہ حادثے یا پیرانہ سالی کے باعث جو مفلسی اپنے طور پر کام کرنے کے قابل نہ رہیں انھیں یہ مطالبہ کرنے کا قطعی حق ہو گا کہ مملکت اور ان کے زیادہ خوشحال بھائی یہ دونوں ان کی مدد کریں۔

باب ۱۱

تجارتی کمپنیاں اور نوآبادیات کی توسیع کا آغاز

۱۶۰

۶ جنوری ۱۵۵۸ء کو کیلے نے اطاعت قبول کر لی اور جب دو ہفتے بعد کیلے کا نواحی قلعہ گینے بھی ہاتھ سے نکل گیا تو براعظم یورپ میں انگلستان کے قبضے میں کوئی علاقہ نہ تھا۔ ملکہ میری کو اس کا بے حد صدمہ ہوا اور وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اس کے مرنے پر لفظ "کیلے" اس کے دل پر نقش کیا ہوا ملے گا۔ گو اس بندرگاہ کے نقصان سے خفت اور ذلت ضروری ہوئی لیکن یہ نقصان اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کہ معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اس سے پہلے ہی انگلستان کی حوصلہ مندیوں کے لیے ایک نیا راستہ کھل گیا تھا۔ انگلستان کے لیے یہ بات شدنی تھی کہ اپنی فوجی قوت بڑھا کر فرانس پر تسلط جمانے کی بجائے ایک بحری طاقت بنے اور مشرق و مغرب میں اپنے مقبوضات پھیلائے۔

عظیم تر انگلستان کی ترقی میں دو منزلیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھا جائے تو پہلی منزل ملکہ ایلزبتھ اور شاہانہ اسٹورٹ کے دورِ حکومت پر مشتمل ہے اور دوسری منزل اٹھارھویں صدی کا زمانہ ہے۔ پہلے دور میں

جو کچھ حاصل ہوا وہ زیادہ تر خانگی دوڑ دھوپ، مہم جو اشخاص کے بحری سفروں یا ایسٹ انڈیا کمپنی یا پلائمتھ کمپنی کی سی تجارتی کمپنیوں کی روانہ کی ہوئی مہموں یا آبادکاروں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ تاج انکی کارگزاریوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ چنانچہ ملکہ ایلزبتھ نے خانگی طور سے ڈریک کی حوصلہ افزائی کی اور مالِ غنیمت میں حصہ قبول کیا اگرچہ یہ عام اعلان کیا جاچکا تھا کہ وہ ڈریک کے اعمال و افعال کی قطعاً ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس طرح شاہان اسٹورٹ نے نئی دنیا کے آبادکاروں کو منشور عطا کیے۔ پھر بھی آبادکاری اور علاقوں کی تحصیل کی کوئی قومی پالیسی طے نہ ہوئی۔ چنانچہ اس زمانے کے معاہدوں میں نوآبادیات کا تذکرہ سرے سے ہی نہیں یا بہت کم ہے۔ البتہ جو علاقے ہاتھ لگے ان میں سے ایک قابل ذکر بمبئی ہے جو بشمول ٹینجیر کیتھرائن آف براگنزا کے جہیز میں ملا تھا اور چارلس دوم کے ساتھ اس کی شادی کی یادگار تھا۔ دوسرا علاقہ نیویارک تھا جسے ولندیزیوں نے حوالے کیا تھا۔ انگلستان کو نئی دنیا پر قبضہ کرنے کے لیے ہسپانیہ سے دوبارہ کشاکش پر اکسانے والا در اصل کرامول تھا۔ اگرچہ کرامول کو اپنی مہم میں سینٹ ڈومنگو کے قریب شکست ہوئی لیکن اس نے ہسپانیوں سے جمائیکا چھین لیا۔ دوسری طرف بحری بیڑے نے سونے اور چاندی سے لدے ہوئے ہسپانوی جہازوں پر چھاپے مار کر سمندری ڈاکوؤں کی داستان دہرائی۔ اس وقت ہسپانیہ ہی تنہا انگلستان کا حریف نہ تھا بلکہ جہازرانی کے قانون کی زد میں ہالینڈ کے بھی آنے کی وجہ سے چارلس دوم کے پورے دورِ حکومت میں ولندیزیوں کے ساتھ دشمنی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس دورِ حکومت میں ایک اور چیز بھی ہوتی رہی اور وہ تخت کے کاروبار سے قومی کاروبار کی جانب تغیر تھا۔ اس طرح مذکورہ بالا دونوں منزلوں کے درمیان نمایاں تضاد پایا جاتا ہے۔ سترھویں صدی کے بے نتیجہ معاہدوں کے مقابلے میں اٹھارھویں صدی میں بڑے فایدے حاصل ہوئے۔ موخر الذکر زمانے میں تقریباً ہر معاہدے کے نتیجے کے طور پر جو جنگ کے خاتمے پر ہوا نوآبادیات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوا۔ معاہدۂ یوٹریخت Utricht سے جب کہ

۱۶۱

انگلستان کو نواسکوشیا Novascotia اور سنٹ کٹس St. Kits ملے، جزیرہ نیوفاونڈلینڈ اور ہڈسن بے کے علاقے پر حقوق حاصل ہوئے اور بحرۂ روم میں ایک بحری اڈا قایم ہوگیا۔ معاہدہ پیرس کی بموجب ٹوباگو Tobago سنٹ لوشیا St. Lucia. مورشیس Mauritius سیلون اور راس امید پر انگلستان کا پورا قبضہ ہوگیا۔ غرض ان دونوں معاہدوں کی درمیانی مدت میں مسلسل یہ میلان پایا گیا کہ فرانس، ہسپانیہ اور ہالینڈ کے نقصان سے انگلستان کے نوآبادیاتی مقبوضات میں توسیع ہوئی۔

انگلستان کی اٹھارھویں صدی کی توسیع اور ترقی کا ذکر پھر کیا جائے گا۔ یہاں اس دور کی بعض خصوصیتیں کا ذکر مناسب ہوگا جن سے اس دور کو ابتدائی دور کے مقابلے میں امتیاز حاصل ہے۔ ابتدائی دور میں زیادہ تر ایسے علاقوں پر قبضہ ہوا جو پہلے غیر مقبوضہ یا وحشیوں کے قبضے میں تھے۔ بعد کے دور میں مفتوحہ علاقے یورپی حریفوں سے چھینے ہوئے تھے۔ انگلستان کے حریف مختلف زمانوں میں مختلف رہے۔ ابتدا میں ہسپانیہ اور پرتگال سے مقابلہ رہا۔ کچھ عرصے بعد ہالینڈ سے جھڑپ ہوئی۔ لیکن آگے بڑھ کر زیادہ تر فرانس سے کھینچا تانی رہی۔ ابتدا میں نوآبادیات سے قیمتی فلز حاصل کرنے کا خیال محرک بنا رہا گو کہ انگلستان اس خیال کا حامی اتنی سختی سے نہ تھا جتنا کہ ہسپانیہ رہا۔ البتہ اٹھارھویں صدی میں نوآبادیات کی قدر اس لحاظ سے کیجانے لگی کہ ان سے تجارت میں اضافہ ہوگیا۔

۱۴۹۲ء میں کولمبس نے بحر اوقیانوس کو عبور کرکے نئی دنیا میں قدم رکھا اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے راس امید کے گرد گھوم کر شرق الہند کے جزیروں کا بحری راستہ دریافت کیا ان دونوں دریافتوں کا اثر یہ ہوا کہ تجارت جو پہلے دریاؤں، خلیجوں، جھیلوں اور بحیروں کے راستے ہوا کرتی تھی اب ترقی کرکے بحری راستوں سے ہونے لگی اور اس طرح تمام روئے زمین پر پھیل گئی۔ اب تک بحیرۂ روم تجارتی شاہراہ تھا جس کے بندرگاہ وینس، جینوا، بارسیلونا اور مارسیلز اہم تجارتی مرکز تھے۔ لیکن بحر اوقیانوس

١٦٢

تجارتی شاہراہ بن گیا تو اس کے ساحلی ممالک ہسپانیہ، پرتگال، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کو نئے مواقع ہاتھ آئے۔ تجارت بحیرۂ روم سے فوراً نہیں ہٹی بلکہ مشرقی تجارت کے بڑے حصے کے راستے بڑی حد تک وہی تھے جو پہلے تھے۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ ولندیزی قوت کی ترقی تک یورپ میں مشرقی ممالک کے اشیا کی زیادہ درآمد بحری راستے سے نہیں ہونے پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بحیرۂ روم کے بندرگاہوں کا زوال تدریجی طور سے ہوا۔ لیکن یہ ایک شدنی اور ناگزیر بات تھی، کیونکہ بحیرۂ روم کے ساحلی ممالک نئی دنیا کی تجارت میں ان ملکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جو بحر اوقیانوس کے کنارے واقع تھے۔

انگلستان کو نئے حالات سے فایدہ اٹھانے میں کافی دیر ہوگئی۔ ہسپانیہ نے اپنا اقتدار غرب الہند کے جزیروں اور وسطی امریکہ تک وسیع کر لیا تھا۔ پرتگال، برازیل اور جزائر شرق الہند پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے بعد نئی دنیا کے لیے انگلستان کی مسابقت شروع ہوئی۔ ایک مہم انگلستان سے روانہ ہوئی اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ انگریز کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں۔ ۱۴۹۷ء میں جان کیبٹ اور اس کے تین لڑکے برسٹل سے روانہ ہوئے انھوں نے شاہی پروانہ حاصل کیا جس سے انھیں غیر تہذیب یافتہ انسانوں کی کوئی نئی بستی دریافت کرنے اور اپنے قبضے میں لانے کا حق تھا۔ دو مہینے کی دریانوردی کے بعد ان کو زمین نظر آئی جو غالباً لیبرا ڈار تھا اور اس طرح امریکہ کا اصل علاقہ دریافت کرنے میں یہ لوگ کولمبس کے پیشرو بنے۔ ۱۴۹۸ء میں ایک اور مغربی سمت میں بحری سفر کیا گیا۔ یہ لیکن ابتدائی کوشش جو انگریزی قیادت میں نہیں بلکہ ایک وینیشین کی قیادت میں ہوئی ناکام رہی۔ اس میں کلام نہیں کہ سولھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں انگریزی

۱۰۴۳

جہاز ماہی گیری کے سلسلے میں نیو فاونڈ لینڈ تک گئے تھے، ۱۵۳۰ء میں ولیم ہاکنس برازیل پہنچا تھا اور مغرب کی طرف تھارن، ٹامسن اور ہور بحری سفر کیے تھے۔ لیکن ہسپانیہ اور پرتگال کے کارناموں سے اس زمانے کی انگریزی مہم کوئی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کورٹز نے میکسیکو کو فتح کر لیا تھا اور بالبوا خلائنائے ڈیرین کو عبور کر کے بحرالکاہل میں جا گھسا اور اس طرح اس نے پیرو Peru. کے لیے راستہ کھول دیا گیا جہاں اس کے بعد پای زارو[1] جا پہنچا۔ اسی اثناء میں میگیلن[2] بحرالکاہل پہنچا جہاں سے وہ زمین کے گرد گھوما اور جزائر فلپائن کو ہسپانوی علاقے میں داخل کیا۔ کیبرال نے برازیل دریافت کیا اور پرتگالیوں نے وہاں بس کر پہلی مستقل یورپی نوآبادی قائم کی۔ مشرقی سیاحت و تجارت میں بھی پرتگالی دوسروں سے آگے رہے۔ چنانچہ ان کی تجارت جنوب مشرقی افریقہ، چین، جاپان اور اسپائس کے جزیروں سے جاری تھی۔ الگزینڈر ششم پاپائے روم کے مشہور "فرمان" میں روئے زمین کو پرتگال اور ہسپانیہ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اب یہ تقسیم حقیقت میں عملی جامہ پہنتی معلوم ہو رہی تھی!

انگلستان کی مہم جوئی کی راہ میں دو واقعوں نے بڑی رکاوٹ ڈالی پہلے یہ کہ سولھویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں انگلستان اصلاح مذہب کے کام میں گھرا رہا۔ مذہبی کشاکش کے ہیجان سے انگریزوں کی پوری توجہ وطن ہی کی جانب رہی۔ اس کے خلاف دوسری قومیں اپنے وطن سے باہر نظریں دوڑا رہی تھیں۔ دوسرے یہ کہ جب مہم جوئی کا ولولہ بڑھا تو پہلے اس کا رخ غلط سمت میں رہا۔ "سمندر کی علاقہ واریت[3]" کا خیال بہت قوی ہو گیا تھا۔ نہ صرف مشرق و مغرب ہسپانیہ

۱۶۴

۱۔ Pizarro

۲۔ میگیلن Magellan ایک پرتگالی ہسپانیہ کا ملازم اثنائے سفر ہی میں مر گیا۔ اس کے جہاز کا نام "ٹرینی ڈاڈ" تھا جس میں بیٹھ کر اس نے زمین کے گرد پہلا سفر طے کیا۔

۳۔ سمندر کی علاقہ واریت Territoriality of the Sea کی اصطلاح بین قومی

اور پرتگال میں بٹے ہوئے تھے بلکہ بحرا و قیانوس میں عبور اور مرور کے راستے اور راس امید کے گرد کا راستہ بھی ہسپانوی اور پرتگالی حلقوں میں تقسیم تھا۔ ہسپانیہ اور پرتگال نے دوسروں کو نہ صرف اپنے نوآبادیات سے تجارت کرنے سے روکا بلکہ سمندروں میں دوسروں کی جہازرانی کو گویا اپنے علاقوں میں بے جا مداخلت خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی مہم جوی نے پہلے مشرق کی جانب ایک ایسا نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی جو پورے طور پر برطانیہ کے لیے مختص ہو اور اسی میں اسباب کی توجیہہ بھی چھپی ہوئی ہے کہ شمال مشرقی یا شمال مغرب کے بحری سفروں میں کیوں اتنا زیادہ وقت لگا اور جانیں ضایع ہوئیں اگر شمال مشرقی یا شمال مغربی راستہ انگریز دریافت کر لیتے تو وہ محض انگریزوں کے استعمال کے لیے مخصوص رہتا۔ اس کے علاوہ اس سے ایک اور فایدہ یہ ہوتا کہ سرد ممالک سے ہو کر گزرنا پڑتا اور وہاں کے باشندے خاص انگریزی برآمد یعنی کپڑا خوشی سے خرید تے جو ان گرم ممالک میں جہاں ہسپانوی اور پرتگالی پہنچ چکے تھے خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ اس موہوم شمالی مغربی راستے کی تلاش کا سلسلہ بہت زمانے تک جاری رہا۔ ۱۵۷۶ء میں فرابشر شمال مغرب کی جانب بحری سفر کے لیے روانہ ہوا اور دوسرے سال اس نے کیتھے تک پہنچنے کے راستے کی مزید تلاش میں پھر سفر کیا۔ دس سال بعد ڈیوس ان ہی برفانی علاقوں کے طوفانوں سے لڑتا رہا اور راستہ مل جانے کی امید اس کو بڑھاتی رہی لیکن انجام میں اس کو ناکامی کا بھیانک منھ دیکھنا پڑا۔ ۱۶۰۷ء میں ہنری ہڈسن نے شمال مشرقی راستے کا کھوج لگانے میں دریانوردی کی لیکن وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: ہے قانون کی فنی زبان سے ماخوذ ہے۔ ہر ملک کے ساحل کے برابر کا سمندر کچھ فاصلے تک اس ملک کے علاقے اور عملداری میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خلاف کھلے سمندر کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کوئی قوم بھی بجز اپنے ان جہازوں کے جو ان پر چلیں ان سمندروں کی مالک نہیں ہے۔ سولھویں صدی میں قوموں نے اس سے زیادہ وسیع بنیادوں پر حقوق کی بنیاد قایم کی اور وہ دریافت کے حقوق تھے۔

نواز یمبلا[1] کے مشرق تک بھی نہ پہنچ سکا۔ ۱۶۱۰ء میں اس نے اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرا اور خلیج ہڈسن میں پہنچ کر فرط مسرت سے یہ سمجھ لیا کہ اس کی امید بر آئی اور راستہ مل گیا۔ لیکن اس کی بدبختی[2] نے بفن کو ۱۶۱۵ء میں اور فاکس اور جیمس کو ۱۶۳۱ء میں انھی سمندروں کی مہم پر جانے سے باز نہیں رکھا گو ان کی کوششوں کا نتیجہ بھی پہلے کی طرح یاس انگیز رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بحری سفروں نے انگریز جہاز رانوں کی عظمت و شوکت میں ہمیشہ کے لیے چار چاند لگا دیے۔ لیکن یہ نتیجہ خیز یا سود مند ثابت نہیں ہوئے اور نہ سونے، چاندی اور مسالے کی شکل میں ان سے کوئی نفع بخش چیز حاصل ہوئی جس کی تلاش ایلزبتھ کے دور حکومت کے مہم جو اشخاص یا اُن تاجروں کو تھی جو ان لوگوں کو مہم پر روانہ کیا کرتے تھے۔

165

انگریزی تجارتی راستے کی تلاش میں جو بھی ابتدائی بحری سفر کیے گئے ان میں کا پہلا سفر تجارتی حیثیت سے بہت اہم تھا اور چونکہ یہ ایک خالص انگریزی مہم تھی اس لیے وہ دنیا کی تجارت میں حصہ لینے کے بارے میں انگلستان کی کشاکش کے آغاز کو ظاہر کرتی ہے۔ ۱۵۵۳ء میں سر ہیو ولوبی اور رچرڈ چانسلر تین جہاز لے کر شمالی مشرقی راستے سے چین تک کا بحری سفر کرنے کے لیے دریائے ٹیمز سے روانہ ہوئے ناروے کے ساحل سے پیچھے طوفان میں پھنس کر یہ جہاز ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ولوبی اور اس کے آدمی بحر شمالی میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرنے کے بعد موسم گرما کے آخر میں لیپ لینڈ پہنچے اور یہاں انھوں نے سرما کا موسم گزارنے کی ٹھانی۔ لیکن سردی سے اکثر کو بھوکوں مرنا پڑا۔ مگر چانسلر جو ایک جہاز "ایڈورڈ بوناوینچر" نامی میں روانہ ہوا تھا وہ خوش نصیبی سے سفید بحرہ میں جا پہنچا اور ساحل کے اُس حصے کے قریب لنگر انداز ہو کر جہاں آج کل آرکینجل ہے ایسے باشندوں کے علاقے میں اتر پڑا جو ایوان مہیب[3] کے

[1] Nova zembla.

[2] ہڈسن کے آدمیوں نے بغاوت کر دی اور اس کو ایک کھلی کشتی میں سوار کر کے اس وسیع خلیج میں جو اس کے نام سے موسوم ہوئی اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

[3] Ivan the "Terrible

زیر حکمرانی تھا۔ چانسلر بری سفر کرتا ہوا آخر ماسکو پہنچا جہاں اس نے زار روس
کو انگلستان سے تجارت کی ہمت افزائی کی طرف مایل پایا۔ یہ واقعہ پہلے
روسی سفیر کے انگلستان آنے اور ایک کمپنی بنام "مسکوی" کمپنی کی استواری کا
باعث ہوا۔

انگریزی مہم جوی نے اس دشمنی کے باعث جو بڑی مدت تک ایلزبتھ
اور فلپ ثانی میں جاری رہی اور ارمیڈا Armada[1] سے ٹکر پر ختم ہوئی ایک
نئی سمت میں رخ پھیرا۔ اس واقعے کی بنا پر کہ ہسپانیہ ایک نوآبادیاتی قوت اور
کیتھولک رد عمل کا حامی تھا، انگریزوں کو اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر
اپنے لیے ایک بحری سلطنت قایم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ
جس وقت تک ملکہ میری تخت نشین رہی اس نے اپنے شوہر کے مغربی مقبوضات
میں بے جا مداخلتوں کو روکا۔ لیکن میری کی وفات کے پہلے ہی سے ہسپانیہ کے
خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ انگریزوں پر خود ان کے ملک کے اندر
جو ظلم و ستم ڈھائے گئے اور ملک کے باہر مجلس احتساب Inquisition کی دستبرد سے
ان کو جن مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا وہ نفرت پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔
جوں جوں فلپ کی دشمنی ایلزبتھ سے بڑھتی گئی، انگریزوں میں ہسپانیہ کو اس ۱۶۲
کے مغربی مقبوضات میں نقصان پہنچانے کی خواہش آئے دن قوی ہوتی گئی۔ یہ
خواہش حب وطن پر مبنی تھی اور ساتھ ہی اس کے مفید ہونے کا بھی امکان تھا۔
کیونکہ جنوبی امریکی چاندی کی کانوں کی دریافت کے بعد اس دھات کی کثیر
مقداریں بحر اوقیانوس کے راستے ہسپانیہ آرہی تھیں۔ اسی وجہ سے ہسپانوی
مقبوضات پر یورش ایک باقاعدہ اور اہم تجارتی مہم بن گئی۔ انگلستان کے تاجروں
نے رقم فراہم کی اور نئی دنیا کے بحری سفر کے لیے جہازوں کو تیار کیا اور مہم پر
ہر ایک جانے والے کی یہ آرزو ہوتی تھی کہ دھات سے لدے ہوئے ہسپانوی
جہازوں کو راستے میں روک چھاپہ مارے۔ اس قسم کے طرز عمل سے مہم جو اشخاص پر

[1] ہسپانوی جنگی بیڑا۔

بحری قزاقی کا دھبہ لگ گیا۔ لیکن ان میں ہر ایک یہ جانتا تھا کہ اگر وہ چاندی
کی اینٹیں یا ہسپانوی سکے کافی مقدار میں لے کر وطن لوٹے جس میں سے ملکہ کو
بھی کافی حصہ دیا جا سکے تو وہ ہسپانوی سفیر کی شکایتوں کو بے اثر کر سکے گا چنانچہ الزبتھ
داد رسی کرنے اور خاطی کو سزا دینے کا وعدہ تو کر لیتی تھی لیکن وعدہ پورا کرنے کی
نوبت کبھی نہ آتی تھی۔

اس دور "جہاز رانی" میں فرانسس ڈریک ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔
ابتدا میں اس کا تعلق ولیم ہاکنس اور جان ہاکنس سے رہا جو مشہور ولیم ہاکنس کے دو بیٹے
تھے جس نے ۱۵۳۰ء میں برازیل تک بحری سفر کیا تھا۔ بڑا لڑکا زیادہ تر وطن ہی
میں ٹھیرا رہتا اور مہموں کے مالی انتظامات کرتا تھا۔ اس کے خلاف چھوٹا لڑکا ہسپانوی
مقبوضات کے پہلے انگریز بردہ فروش کے برے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
۱۵۶۲ء میں وہ مغربی افریقی ساحل سے تین سو حبشیوں کی ایک ٹولی ہسپانیولا
لے کر گیا اور وہاں انھیں بیچ کر ان کی معاوضے میں چمڑا، ادرک، شکر اور موتی
ساتھ لیے پلٹا۔ یہ مہم ایسی نفع آور رہی کہ ملکہ نے اپنا ایک شاہی جہاز جیسز
Jesus نامی دوسری مہم کے لیے عارضی طور پر اس کے حوالے کر دیا
حبشی اکھٹے کر کے ہاکنس نے دوبارہ ہسپانوی سلطنت کا رخ کیا۔ لیکن اس دفعہ
اس نے ہسپانویوں کو غلام خریدنے پر آمادہ نہ پایا جس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ہسپانویوں
کو غلام نہ خریدنے کے احکام مل چکے تھے۔ لیکن ہاکنس نے ہتھیاروں سے لیس
اپنے ایک سو آدمیوں کو ساحل پر اتار کر بستی والوں کے پس و پیش کو دور کیا
اور اپنے لائے ہوئے غلاموں کے ایک حصے کو وینی زویلا میں بمقام بر براتا
اور باقی کو ریو ڈی لا ہاچا Rio de La Hacha میں بیچ ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ
ہسپانوی جو پہلے سے غلام خریدنے کی جانب زیادہ تر مائل تھے اس مظاہرے ۱۶۷
سے ان کو احکام کی خلاف ورزی کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ۱۵۶۷ء میں تیسرا چکر کیا گیا
جس میں ہاکنس کے ساتھ ڈریک بھی تھا۔ اب کی دفعہ بحری قافلہ چھ جہازوں پر
مشتمل تھا جن میں سے دو شاہی بیڑے کے تھے۔ جب پانچ سو غلاموں کی ٹولی
اکھٹا کر لی گئی تو قافلہ پہلے کی طرح مغرب کی طرف روانہ ہوا اور ہسپانویوں کو

پھر غلام خریدنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن اس دفعہ مہم کا انجام کچھ اچھا نہیں رہا۔ کیونکہ بمقام ویرا کروز Vera Cruz جہازی قافلہ پر ہاکنس کے بقول دھوکہ دے کر حملہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو جہاز بچ کر وطن لوٹے اور ڈریک بال بال بچا۔ چونکہ "جیسز" جہاز کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مال غنیمت بھی کم ہاتھ آیا تھا اس لیے ملکہ ناراض ہوئی اور ہاکنس کو خفت اٹھانی پڑی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہسپانیہ سے لڑا بلکہ اس لیے کہ اس کی مہم ناکام رہی اور ملکہ کے دو جہاز تباہ ہو گئے۔
۱۵۷۰ء اور ۱۵۷۱ء میں ڈریک پھر ہسپانوی سمندروں میں جا پہنچا اور ۱۵۷۲ء میں اس نے تہتر آدمیوں کو ساتھ لے کر نامبرے ڈی ڈیاس Nombre de Dios (یعنی خزانۂ عالم) پر حملہ بول دیا۔ شہر اس اچانک دھاوے سے فتح تو ہو گیا لیکن اس پر قبضہ نہ رہ سکا، اور جو خزانہ ہاتھ لگا اس کو بھی ڈریک ساتھ نہ لے جا سکا لیکن ہسپانویوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود ڈریک ساحل کے قریب لنگر ڈالے رہا پھر اٹھارہ آدمیوں اور تیس میرون Maroons. کے ساتھ کارڈیلیرا کو عبور کر کے پناما کے دروازوں کے قریب جا پہنچا۔ اس طرح وہ پہلا انگریز تھا جس نے بحر الکاہل دیکھا۔ اس نے خچروں کے ایک قافلے کو لوٹ لیا جو سونے اور چاندی سے لدا ہوا نامبرے کی طرف جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ حیرت انگیز طریق پر جان بچاتے ہوئے آخر وہ مال غنیمت لیے ہوئے سمندر تک پہنچا اور اگست ۱۵۷۳ء میں انگلستان لوٹا۔ ڈریک کے لیے بحر الکاہل کو ایک دفعہ دیکھنا کافی نہیں تھا۔ اس کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا اس نے ارادہ کیا چنانچہ ۱۵۷۷ء میں وہ پانچ جہاز لے کر پھر اس مشہور بحری سفر پر روانہ ہوا جس کے ذریعے سے اس نے دنیا کے گرد چکر لگایا۔ برازیل پہنچ کر اس نے جنوب کا رخ کیا اور تنگنائے میگیلن کو عبور کر کے چلی اور پیرو کے ساحل کے پیچھے جا نکلا جہاں اس سے پہلے کوئی انگریز نہیں گیا تھا اور جہاں ہسپانوی اس کے مقابلے کی بہت ہی کم صلاحیت رکھتے تھے۔ اس نے ویلپرائزو Velpraiso اور کیلاؤ Callao کو لوٹا، ایک بڑے ہسپانوی بادبانی جہاز کیکافیوگو جو خزانے سے لدا ہوا تھا پکڑ لیا اور شمالی امریکہ کے ساحل تک عرض البلد ۴۲ درجے

۱۶۸

شمال تک گیا۔ پھر بحرالکاہل کو عبور کر کے ملوکس، جاوا اور راس امید کے گرد چکر لگاتا ہوا وطن لوٹا۔ اس بحری سفر میں تقریباً تین سال صرف ہوئے۔ یہ سفر نہ صرف اس لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب رہا کہ لوٹ کا مال لانے کے سلسلے میں جو حملے کیے گئے تھے ان کے منجملہ اس میں سب سے زیادہ دولت ہاتھ آئی تھی بلکہ اس نے انگریزوں کے لیے جنوبی سمندر کا پورا علاقہ کھول دیا۔

یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کیونڈش بھی ڈریک کے سفر کے چند سال بعد دنیا کا چکر کاٹنے گیا یا جان آکسن ہم کو اس کے سفر کے دوران میں ہسپانویوں نے دریائی لٹیرے پن کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا یا انڈریو بارکر اور والٹر بیجٹ بھی ایل ڈوراڈو کی تلاش میں نکلے تھے۔ اس لیے کہ ایک یا دو مثالیں سب کی نمایندگی کرتی ہیں، خاص کر اس وجہ سے کہ ان کی اہمیت اس امر میں پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر شخص نے کتنے جہاز لوٹے اور ڈبوئے یا کتنے شہروں پر چھاپہ مارا یا وہ کتنی دولت لے کر وطن لوٹا۔ بلکہ وہ اپج اور ولولہ اہمیت رکھتا ہے جو بحری جہاز رانی کے لیے سارے ملک میں پایا جاتا تھا۔ اگر یہ کہنا ٹھیک ہے کہ سمندر سے برطانوی خوب واقف اور مانوس ہیں تو یہ بھی واقعہ ہے کہ بحری مہم پر جانے کا ولولہ ان کے دل میں ملکۂ ایلزبتھ کے دور حکومت ہی سے پیدا ہوا۔ ہسپانوی مقبوضات تک بحری سفر کرنے کے زمانے میں انھوں نے سمندر سے محبت، اپنی ذات پر بھروسا، خطروں، رکاوٹوں اور ناکامیوں کو خاطر میں نہ لانا سیکھا۔ چنانچہ اکوینیز اور ال ڈریک[1] کے ناموں سے ہسپانوی تھراتے تھے۔ ان ہی خوبیوں کی بدولت انگریز ہسپانوی جنگی بیڑے Armada کو شکست دینے کے قابل ہوئے چونکہ ڈریک ان مہموں کا روح رواں تھا اس لیے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کی نظر میں انگلستان کا بحری قوت بننا کس قدر اہمیت رکھتا تھا۔ یہ اس بات پر برابر اڑا رہا کہ

[1] Aquinez. اور El Draque کے الفاظ ہسپانوی زبان میں ہاکنس اور ڈریک کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

جب ہسپانوی جنگی بیڑا (ارمیڈا) بندرگاہ سے باہر آئے تو اس کو تباہ کرنے یا آشنائے کے بجائے کھلے سمندر میں اس کا مقابلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ جب آرمیڈا کے نابود ہو جانے سے اہم خطرہ دور ہو گیا تو اس نے یہ تجویز پیش کی کہ انتقامی کارروائی کے طور پر ہسپانیہ اور اس کی نوآبادیوں پر جہازوں سے حملہ کیا جائے۔ لیکن ملکہ کے ہچکچانے اور تنگ دلی نے اس تجویز کو سرسبز نہ ہونے دیا کورنا Corunna اور وائیگو Vigo کو جلا ڈالنے لسبن کے لیے مسخر ہو جانے کا خطرہ پیدا کرنے اور ہسپانوی سمندر سے تقریباً ایک سو جہاز پکڑ لے جانے میں ڈریک کی کارگزاری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب بحری بیڑے کی قیادت پختہ امداد کے ساتھ کی جائے بیڑا کتنا ڈراونا جان لیوا ہتھیار بن سکتا ہے۔ ڈریک کے جنگی بیڑے کی کارگزاری اٹھارھویں صدی کے بحری بیڑے کے کارناموں سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس کے بعد کرامویل بھی اسی پالیسی پر چلا۔ ۱۶۹

اس وقت تک ہم نے صرف یہ بحث کی ہے کہ انگلستان کی ترقی بحری قوت کی حیثیت سے کیسی رہی۔ لیکن ڈریک اور ہاکنس کا عمل تعمیری کی بجائے تخریبی رہا۔ گو انھوں نے انگلستان کے فائدے کی خاطر ہسپانیہ کا ستیاناس کیا۔ لیکن ان کی حیثیت گھومنے والے سیاحوں سے زیادہ نہ تھی۔ انگریزی مقبوضات ان دونوں کی لوٹ مار سے ہاتھ نہیں آئے۔ انگریزی نوآبادیوں کی تاریخ کی ابتدا ہسپانوی علاقوں کی بجائے کسی دوسری ہی جگہ سے ہوتی ہے۔

اس کا آغاز عجیب و غریب طریقے پر حوصلہ شکن تھا۔ امریکہ میں انگریزوں کی بستی بسانے کی اجازت ملکہ ایلزبتھ سے حاصل کر کے ۱۵۸۳ء میں سر ہمفری گلبرٹ پانچ جہازوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہ مہم نیو فاؤنڈلینڈ پہنچی اور گلبرٹ نے اس پر ملکہ کے نام سے قبضہ کر لیا۔ لیکن بر اعظم کی طرف آگے بڑھ کر راس برٹین کے قریب سخت طوفان میں گھر گیا۔ یہاں پر جہاز زمین میں پھنس کر تباہ ہو گیا اور گلبرٹ کو وطن کی طرف لوٹنا پڑا۔ واپسی کے وقت راستے میں اس کو خراب موسم سے لڑنا پڑا اور وہ اپنے چھوٹے جہاز اسکوٹرل کے ساتھ ڈوب گیا۔ اس مہم سے صرف ایک جہاز اچھی حالت میں انگلستان لوٹا۔ لیکن ریلے نے اس

کام کو استقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۵۸۴ء میں اس نے ایک مہم میں ورجینیا پر قبضہ کرلیا اور دوسرے ہی سال ریلے نے سر رچرڈ گرین وال کو روانہ کیا جس نے نئی دنیا میں پہلی انگریزی بستی بسائی اور یہاں بسنے والوں کو ریلف لین کی نگرانی میں چھوڑا نوآبادکاروں نے ابتدا میں ملک کی قدرتی دولت سے استفادہ کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ لیکن وہ بہت جلد وحشیوں سے الجھکر مصیبت میں گھر گئے اور ۱۵۸۶ء میں جب ڈریک نے ان سے وطن لے چلنے کے لیے کہا تو انھوں نے بڑی خوشی سے اسے قبول کرلیا۔ ان کی روانگی کے بعد ہی جب گرین ول یہاں پہنچا تو کسی کو نہ پاکر اس نے اپنے پندرہ آدمی اس بستی پر قبضہ رکھنے کے لیے چھوڑے۔ ۱۵۸۷ء میں ریلے نے ۱۵۰ آدمیوں کی ایک تازہ مہم جان وائٹ کی سرکردگی میں روانہ کی لیکن یہ بھی ناکام ہوئی البتہ خود وائٹ رسد لینے کے لیے وطن لوٹ آیا اور ۱۱۸ آدمی اپنے پیچھے چھوڑے۔ ۱۵۹۰ء میں جب وہ نوآبادی کو واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ آبادکار ملک کے اندرونی حصے میں منتقل ہوئے اور وہیں مرکھپ گئے۔

170

اس طرح اس بڑی دوڑ دھوپ کے باوجود ملکہ ایلزبتھ کے دور حکومت کے آخر تک براعظم امریکہ میں کوئی علاقہ انگلستان کے ہاتھ نہیں آیا۔ ملکہ کے دور حکومت کی مہموں کی ناکامی کا باعث یہ تھا کہ اچھے آبادکار نہیں بھیجے گئے تھے۔ جو لوگ گئے تھے ان میں دریائی لٹیرے پن کا بہت زیادہ جوش پایا جاتا تھا اور وہ زیادہ تر اعلیٰ طبقے کے افراد سونے کی تلاش میں تھے۔ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ نوآبادیوں میں دولت بھری پڑی ہے جو محض اکٹھا کرنے کی محنت سے ہاتھ آسکتی ہے وہ ایسے کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو زمین کی قدرتی زرخیزی سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے ضروری تھے۔ جو لوگ گئے تھے ان میں سے اکثر اپنے رہنے سہنے کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے ان تکلیفوں اور مصیبتوں کو نہ جھیل سکے جن کا نئی سرزمین پر برداشت کرنا ضروری تھا اور بے صبری اور مایوسی کی فضا چھا گئی۔ تدریج نے تجربے کے دردناک سبق پڑھائے۔ جیمس اول کے دور حکومت تک لوگوں کو معلوم ہونا شروع ہوا کہ

نئی دنیا کاہلوں کے لیے موزوں جگہ نہ تھی۔ بیکن نے بھی نوآبادیوں کو جانے والوں کو یہ عملی مشورہ دیا کہ "زمین کے تحتی طبقوں میں بہت زیادہ مشقت نہ کرو۔" جوں ہی زراعت کرنے کے حق میں سونا حاصل کرنے کا خیال چھوڑا ترقی کا میدان امکانات سے بھر گیا۔ اس کے علاوہ ایک نیا خیال وطن چھوڑنے میں محرک ثابت ہوا، اور یہ ایسا وطن حاصل کرنے کی خواہش تھی جہاں لوگ اپنے مذہب کی پیروی پر امن طریقے پر کر سکیں۔ نیو انگلینڈ کے وطن چھوڑنے والے پادریوں (Pilgrim Fathers) یا میری لینڈ کے کیتھولکوں کی بستیوں کی سی بستیاں ایسی مستقل حیثیت رکھتی تھیں جن کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ کیونکہ آباد کاروں کی یہ خواہش ہی نہ تھی کہ روپے سے اپنی جیبیں بھریں اور وطن لوٹ کر اسے خرچ کریں۔ وطن ان کی نگاہ میں ایسی ایسی جگہ تھی جہاں وہ اپنے مذہبی بھائیوں کے ساتھ رہ سکیں اور تعزیری قوانین کی زد یا ظلم سے محفوظ رہ کر اپنے خاص طریقے پر خدا کی یاد کر سکیں۔ اسی وجہ سے جہاں ایلزبتھ کے نوآباد کاروں کو ناکامی ہوئی تھی وہاں ان کے بعد شاہان اسٹورٹ کے دور حکومت میں بسنے والوں کو ایک پُر امن گھر ڈھونڈ رہے تھے اور سادہ زندگی بسر کرنے کے لیے محنت کرنے پر قانع تھے، زیادہ خوشحالی نصیب ہوئی۔

نوآباد کاروں کی پہلی ٹولی جو ۱۶۰۷ء میں بمقام جیمس ٹاؤن آباد ہوئی اور موجودہ زمانے کے ریاستہائے متحدہ کی بنا تھی اس کو لندن کمپنی نے روانہ کیا تھا۔ اس ٹولی کی خوش قسمتی سے اس کو جان اسمتھ سا اپنا قائد ملا جو نوآبادیا کے حوصلہ مندانہ کاروبار کی کامیابی کے ضروری اصولوں سے واقف تھا اور ابتدائی نوآباد کاران سے بہت کم واقف تھے۔ اس نے ایک طرف نوآباد کاروں کو اپنا مطیع بنانے اور خوش رکھنے میں استقلال سے کام لیا تو دوسری طرف ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ شمال مغربی راستے یا سونے کی بے پروائی کے طریق پر تلاش محض وقت گنوانا اور بیہودہ تھی۔ بلکہ اس کے خلاف "محض محنت ہی سے پھل ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔" اس نوآبادی کو بھی زمانے کے نشیب و فراز

۱۷۱

سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے سنہ ۱۶۰۹ء میں اور پھر سنہ ۱۶۱۱ء میں یہ بستی تقریباً خالی کردی گئی۔ لیکن برے دن جلد گذر گئے اور گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ خوشحالی پلٹ آئی۔ ابتدائی ۱۰۵ وطن چھوڑنے والوں کی تعداد سنہ ۱۶۱۹ء تک بڑھ کر ۶۰۰ ہوگئی اور دوسرے سال یہ تعداد ۲۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ سنہ ۱۶۱۹ء میں پہلی مجلس عام ہوئی اور پھر برابر ترقی ہوتی رہی۔ ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۶۲۰ء میں ایک جہاز "مے فلاور"[1] نامی روانہ ہوا اور دیس چھوڑنے والے پادریوں[2] کی نئی بستی بسی۔ یہ لوگ زیادہ تر سیپریٹسٹ[3] تھے جو چرچ آف انگلینڈ کی پیروی کرنے کے بجائے سنہ ۱۶۰۷ء میں انگلستان سے رخصت ہوکر کچھ زمانے سے ہالینڈ میں جلاوطنوں کے طور پر رہتے تھے۔ جب وہ نئے وطن امریکہ میں جاکر آباد ہوگئے تو اس کا نام انھوں نے اسی بندرگاہ کے نام پر رکھا جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے یعنی پلائی متھ اور اس طرح ریاستہائے نیو انگلینڈ کی بنیاد ڈالی۔ اس زمانے کے بعد سے نوآبادیوں میں تیزی سے ترقی ہونے لگی۔ سنہ ۱۶۲۹ء میں منشور سے خلیج مساکوسٹس کی نوآبادی قایم ہوئی۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں بوسٹن کی داغ بیل پڑی۔ سنہ ۱۶۳۳ء میں ولندیزیوں کی مخالفت کے باوجود کنکٹی کٹ میں بستی بسائی گئی اور اسی سال لارڈ بالٹی مور نے رومن کیتھولکوں کے لیے میری لینڈ کی نوآبادی قایم کی۔ سنہ ۱۶۴۳ء میں کنکٹی کٹ، نیو ہیون، پلائی متھ اور خلیج مساکوسٹس کی نوآبادیوں نے باہمی حفاظت کے لیے آپس میں ایکا کیا۔ سنہ ۱۶۸۰ء میں ولیم پن نے کویکرس[4] نامی ایک مظلوم فرقے کی جائے پناہ کے طور پر پن سلوانیا کی تاسیس کی۔ جزیروں میں بھی عام طور پر بستیاں بستی رہیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں باربیڈاز اور برموڈاز آباد ہوئے اور نیشکر کی کاشت کرکے اور غلاموں سے کام لے کر نوآبادکاروں نے خوب دولت کمائی۔ ان تمام تفصیلوں سے

---

[1] Mayflower - [2] Pilgrim Father

[3] Separatists یعنی چرچ آف انگلینڈ سے علیحدگی اختیار کرنے والے۔

[4] Quakers

اس دوڑ دھوپ کا حال معلوم ہوتا ہے جو غیر ممالک میں آبادکاری کے سلسلے میں کی گئی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کام زیادہ تر افراد یا کمپنیوں نے انجام دیا۔ بادشاہ وقت کی جانب سے منشور عطا کیے گئے اور بعض صورتوں میں گورنر بھیجے گئے اور نوآبادیوں سے ایک مرتبہ تجارت شروع ہو جانے کے بعد اس میں مداخلت بھی کی گئی۔ لیکن حکومت نے نوآبادیاتی توسیع میں عام طور پر بہت کم دلچسپی لی بجز اس صورت کے جب کہ اس توسیع نے تجارتی نظام کے تحت انگریزی تجارت کو متاثر کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۲۲ء میں اونی تجارت کے زوال کی تحقیقات کرنے اور انگلستان میں کام کرنے والے بیرونی دستکاروں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۶۲۵ء میں چارلس اول نے ایک تجارتی کمیٹی بنائی جس کو تجارت و صنعت پر نگرانی کا زیادہ وسیع اقتدار دیا گیا' اگرچہ اس کمیٹی کا پہلا باضابطہ اجلاس جنوری سنہ ۱۶۲۶ء میں ہوا۔

تجارتی کمپنیوں کے کارناموں نے جبلی طور پر انگریزوں کی توجہ کو مشرق کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ ہندوستان کی انگریزی سلطنت اس قسم کی ایک کمپنی کے کارنامے کی مستقل اور زندہ یادگار ہے۔ گو ایسٹ انڈیا کمپنی ایسی سب تجارتی کمپنیوں میں زیادہ اہم تھی' لیکن وہ سب سے قدیم نہیں تھی' تجارتی کمپنی بنانے کا طریقہ انگلستان میں بہت عام تھا۔ نارمن فتح سے پہلے بھی بیرونی تاجروں کی ایک جماعت جو "شہنشاہ کے آدمیوں" پر مشتمل تھی اپنی ایک بستی لندن میں بنام اسٹیل یارڈ رکھتی تھی۔ تاجران ہنزا[1] اور تاجران اسٹیپل[2] بھی موجود تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت اجنبیوں سے تجارت کرنے میں عام آزادی حاصل نہیں تھی اور جو کچھ حقوق دیے جاتے تھے وہ فرمانرواؤں کے باہمی معاہدوں کا نتیجہ تھے اس وقت یہ ضروری تھا کہ تجارت معروف اور ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں رہے۔ سنہ ۱۴۰۷ء کے بعد سے ہم جو تاجروں کی کمپنی[3] انگریزی کپڑے کی تجارت کرتی تھی۔ ان کی تجارت اسٹیپلرز (Staplers) ۱۷۳

---

[1] House Merchants [2] Merchants of the Staple

[3] English Company of Merchant Adventurers

کی طرح کسی مقررہ بندرگاہ تک لازمی طور پر محدود نہ تھی بلکہ جہاں کہیں ان کا جی چاہتا تھا وہ ہمت کر کے جاتے تھے ۔ چنانچہ پندرھویں صدی کے اختتام تک انھوں نے اپنے جہاز ہسپانیہ، ہالینڈ، وینس اور بحیرۂ روم کی دوسری بندرگاہوں اور بحیرۂ بالٹک میں روانہ کیے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کس طرح چانسلر اور ولونوربی نے روسی تجارت کا راستہ ڈھونڈا تھا اور کس طرح اس تجارت کی غرض سے مسکووی کمپنی کی مضبوطی ظاہر ہوئی ۔ ۱۵۵۵ء میں ایلزبتھ نے پرشیا یا ایسٹ لینڈ کی تجارتی کمپنی منظم کی ۔ ۱۵۸۱ء میں لیوانٹ کمپنی کو جو بری راستے سے مشرق سے تجارت کراتی تھی منشور عطا ہوا ۔ ایک باربری کمپنی اور ایک گنی کمپنی بھی موجود تھی جیمس اول کے دور حکومت میں ہمیں لندن کمپنی اور پلائی متھ کمپنی کا حال معلوم ہو چکا ہے کہ کس طرح انھوں نے نئی دنیا میں نوآبادیاں قائم کرنے میں مدد دی تھی ۔ غرض اس قسم کی کمپنیاں انگلستان میں کافی عام ہو چکی تھیں ۔ دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس کے کاروبار کو غیر معمولی اور غیر متوقعہ کامیابی ہوئی ۔ دوسری کمپنیاں آہستہ آہستہ ہٹ گئیں اور ان کی کوئی نشانی بھی نہیں رہی ۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگریزوں کے لیے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی ۔

اس انوکھی تجارتی کمپنی کے اس کارنامے پر حیرت کا اظہار کافی نہیں ہے کیونکہ اس نے انگریزی مقبوضات میں ایک ایسے ملک کا اضافہ کیا جو وسعت اور آبادی کے لحاظ سے روس کے سوا تقریباً سارے یورپ کے برابر ہے ۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ اضافہ کیسے ہوا اور کس طرح عمل میں لایا گیا ۔ اس کی بحث کسی باب میں آگے آئے گی ۔ سردست اس کی ابتدائی باتوں پر یہاں روشنی ڈالنا مناسب ہوگا ۔ اٹھارھویں صدی تک ارضی مقبوضات کا کوئی خیال کمپنی کی پالیسی میں نہیں تھا ۔ آزاد تجارت کا پروانہ حاصل کرنا، کارخانے کھولنا، میدان مقابلہ سے پرتگالیوں کو مار ہٹانا، ولندیزیوں کی روک تھام کرنا اور ان کی مسالے کی تجارت میں امکانی حصہ حاصل کرنا، غیر مجاز یا غیر رکن

تاجروں کی مدد سے کمپنی کو محفوظ رکھنا تاکہ وہ کمپنی کی تجارت پر چھاپے نہ مار سکیں حصہ داروں کو ان کا نفع تقسیم کرنا یہ سب کمپنی کے ابتدائی مقاصد تھے لیکن اس صورت میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے پیشروؤں سے مختلف تھی۔ چنانچہ ایسٹ لینڈ کمپنی اور مرچنٹ ایڈونچررز منظم کمپنیاں تھیں اور ہر دو کمپنی کا ہر رکن اپنے سرمایے سے اور اپنے ذاتی جوکھم پر کاروبار کرتا تھا اور اس کا منافع بھی خود ہی حاصل کرتا تھا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مشترک سرمایہ کمپنی تھی۔ یہ کمپنی یا اس کی مجلس نظمار مشترکہ اصل سے کاروبار کرتی تھی اور اس اصل میں ہر رکن کے حصے کے مطابق منافع تقسیم کیا کرتی تھی۔ یہ فرق بظاہر تو معمولی معلوم ہوتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ کمپنی ایک وحدت کی حیثیت سے انفرادی تاجروں کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور تھی۔ مشترک تجارتی انجمن ہونے کی وجہ سے وہ مضبوط اور محفوظ رہی۔ اس کے سرمایے کی مقدار بھی نسبتاً زیادہ تھی چنانچہ وہ بہت زیادہ وسیع پیمانے پر کاروبار کرنے کا بیڑا اٹھا سکتی تھی۔ اس کی پالیسی میں یکرنگی اور یکسانی پائی جاتی تھی۔ وہ ایک مشترک نصب العین رکھتی تھی جو منفرد کاروبار میں ناپید تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی منظم کمپنی ایک سلطنت کو اس طرح مضبوط نہیں کر سکتی تھی جس طرح اس مشترک سرمایہ کمپنی نے کی۔

۱۷۴ اس کی ابتدا بالکل معمولی طور پر ہوئی۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں ملکہ نے ایک منشور عطا کیا اور سال کے شروع میں سر جیمس لنکیسٹر پانچ جہازوں کے پہلے بیڑے کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس بارے میں بہت کچھ سوچ بچار ہوتا رہا کہ کیا کیا چیزیں ساتھ لے جانی چاہئیں۔ جہاز کا مال زیادہ تر لوہا کاٹنے کے اوزار، بانات اور شیشے پر مشتمل تھا۔ لیکن تاجروں کو جو منشور عطا ہوا تھا اس کے تحت انھیں نقلہ برآمد کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی اور یہی وہ شے تھی جس کی برآمد عام طور پر روک دی تھی۔ اس سفر کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسالے کی تجارت میں حصہ لیا جائے۔ چنانچہ لنکیسٹر نے سماٹرا پہنچ کر شاہ آچین سے ایک معاہدہ کیا۔ لیکن اسپانیس ۱۵۹۸ء میں ولندیزی انگریزوں سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے

چنانچہ انھوں نے یہ شکایت شروع کی کہ انگریزوں کی کارروائی اس خطے
میں مداخلت تھی جس کو ولندیزی اپنا حلقۂ اجارہ داری سمجھتے تھے۔ ۱۶۱۳ء
اور ۱۶۱۵ء میں لڑائی ہوئی اور ۱۶۲۳ء میں ولندیزی یہ خبر پاکر کہ امبائنا
کے قلعے کی تسخیر کی سازش کی جارہی تھی، انگریزی کمپنی کے چند ملازموں کو
حراست میں لے لیا اور ان کو جسمانی سزا دے کر جو بھی شہادت فراہم کی گئی
اس کی بنا پر ان سب انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو جزیرے میں
موجود تھے۔ چنانچہ اس "قتل امبائنا" سے مشرق میں بڑی مدت تک دشمنی
کی آگ بھڑکتی رہی لیکن ولندیزی ہر طرح اپنے مفاد کی حفاظت کرسکتے تھے۔
اس طرح سترھویں صدی میں انگریزی مہم کو اسپائس آئلینڈز میں بہت کم
کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن براعظم ایشیا میں انگریز زیادہ خوش قسمت رہے۔
۱۶۱۲ء میں بسٹ نے مغل شہنشاہ سے ایک فیکٹری بمقام سورت قائم کرنے کی
اجازت حاصل کی۔ ۱۶۱۵ء میں تامس رو پہلے سفیر کی حیثیت سے مغل شہنشاہ
کے دربار میں باریاب ہوا اور ایک جدید رعایت حاصل کرلی جس کی رو
سے مزید فیکٹریوں کے قیام اور تجارت کی توسیع کی اجازت مل گئی۔ ۱۶۱۲ء
میں خود کمپنی کی تنظیم جدید عمل میں آئی[1]۔ اس کے سرمایے میں اضافہ کیا گیا اور
اس کا کاروبار ایک مجلس نظما کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ اس کی تجارت میں
تیزی سے توسیع اور ترقی ہوئی۔ ۱۶۴۰ء میں مدراس میں اور ۱۶۴۲ء میں
ہوگلی میں بستیاں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۶۶۸ء میں چارلس دوم کیجانب
سے بمبئی تحفے میں مل گیا۔ لیکن ۱۶۳۹ء میں مدراس اور ساحل کورومانڈل کی بستی
کو ولندیزیوں اور پرتگالیوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے سنٹ جارج اور

[1]۔ ابتداءً ہر ایک کاروباری مہم کے لیے ایک علٰحدہ مشترک سرمایے کا فنڈ تھا جس میں کوئی رکن اپنے حسب خواہش واستطاعت حصے لے سکتا تھا۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منافعہ اسی مہم تک محدود رہتا تھا۔ جدید تنظیم کے تحت ہر رکن کمپنی کے مجموعی کاروبار کے منافعے میں سے اپنے شریک کیے ہوئے سرمایے کے تناسب سے حصہ پاتا تھا۔

آرمے گان کے قلعے تعمیر کیے گئے ۔ پرتگالی خطرناک نہ تھے لیکن ولندیزیوں کی حالت ان کے برعکس تھی ۔ انھوں نے انگریزوں سے پہلے تجارت شروع کی تھی ۔ وہ کھلم کھلا ہسپانیہ سے برسر جنگ تھے ۔ برخلاف اس کے انگلستان پرامن طریقے پر کاروبار کر رہا تھا اور ویسی کوئی تاخیر نہیں ہوئی جیسی کہ ایلزبتھ نے ظاہر کی تھی ۔ جب پرتگال ہسپانیہ میں جذب کر لیا گیا تو ولندیزیوں نے مشرق میں پرتگالی فیکٹریوں کو بہت ہی آسان شکار پایا ۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۵۹۱ء میں قایم ہوئی تھی اور سترھویں صدی میں اس نے امسٹرڈم کو مشرقی پیداوار کا نہایت اہم مرکز بنا دیا تھا ۔ چنانچہ بنک آف امسٹرڈم نے تجارت کے لیے جیسی سہولتیں بہم پہنچائیں وہ انگلستان کو نصیب نہ تھیں ۔ سنہ ۱۶۷۵ء تک ولندیزی انگریزوں کے سب سے خطرناک رقیبوں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ ہسپانیہ کی قوت کم ہو چکی تھی ۔ فرانس سے رقابت کا ابھی آغاز ہی نہیں ہوا تھا ۔ لیکن ہالینڈ کی قوت عروج پر تھی اور یہ اغلب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف انگریزی دوڑ دھوپ کو مشرق میں دبا دے گی بلکہ دنیا کی تجارتی نقل حمل بالکل اس کے قابو میں آ جائے گی ۔ خانہ جنگی کے زمانے میں انگریزوں کے جزائر غرب الہند کے نوآبادیات کی تقریباً ساری تجارت ولندیزی جہازوں کے ذریعے ہوئی تھی ۔ سنہ ۱۶۵۱ء اور سنہ ۱۶۶۰ء کے جہازرانی کے قوانین کے نفاذ کا مقصد اسی چیز کو روکنا تھا ۔ چنانچہ ان قوانین کی رو سے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور انگلستان کے درمیان اشیا کی درآمد یا برآمد بجز ایسے جہازوں کے ذریعے جو انگلستان میں بنائے جائیں اور جن کے مالک اور چلانے والے انگریز ہوں ممنوع قرار دی گئی ۔ انگریزی نوآبادیات میں غیر ملکیوں کو تاجر یا گماشتے بننے سے روکا گیا اور ولندیزی بندرگاہوں سے مشرقی اشیا لانے کی ممانعت کر دی گئی ۔ اس کا امکان تھا کہ ان بندشوں کی وجہ سے جنگ چھڑ جائے ۔ باوجود اس کے کسی نے بھی اس بارے میں تامل و پس و پیش نہیں کیا ۔ سنہ ۱۶۵۰ء سے سنہ ۱۶۷۴ء تک ولندیزی انگریزوں کے جانی دشمن رہے ۔ آبنائے میں جو خونریز جنگ ایک جانب بلیک، مونک، ڈیوک آف یارک اور دوسری جانب وان ٹرامپ اور ڈی روئٹر کے

درمیان ہوئی وہ مشرق میں حمل و نقل کی تجارتی اور اقتداری غلبے کے لیے ایک کشمکش تھی۔ ہیئیشم نے کہا تھا کہ وہ جرمنی میں لڑکر امریکہ فتح کرے گا۔ لیکن مساوی صداقت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ سترھویں صدی کے آخر میں انگریز جزائر مشرق الہند کے بیچے آبنائے میں جنگ کر رہے تھے۔ یہ جنگ نہایت سخت اور خون آشام تھی اور جس حد تک محض لڑائی کا تعلق تھا ولندیزی بہت زیادہ گھاٹے میں نہیں رہے۔ لیکن انجام کار فایدہ انگلستان ہی کا ہوا۔ ہالینڈ جو ایک چھوٹی قوت تھی انگلستان سے بحری جنگ کرنے کی زیادہ متحمل ہی نہیں ہوسکتی تھی خاصکر اس کو براعظم میں فرانس سے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ چنانچہ جب اٹھارھویں صدی رونما ہوئی تو ہالینڈ بالکل کمزور ہوچکا تھا اور اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے قوی تر رقیبوں یعنی فرانس و انگلستان سے برابر کا مقابلہ کرسکے۔

انگلستان کو پہلے ہسپانیہ کو لوٹنے اور پھر اس سے نفرت کرنا سیکھنے میں ڈیڑھ صدی گزر گئی۔ اس زمانے میں انگلستان تجارتی راستہ تلاش کرنے کے سلسلے میں قطب شمالی جہاں ڈالا امریکہ کے مشرقی ساحل پر قبضہ کرکے اس کو بسایا اور مشرق میں اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ تھا اس کارنامے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے اگر ہم یہ ذہن نشین رکھیں کہ اس کا باعث زیادہ تر خانگی کاروباری مہم تھی اور جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ یہ عظیم الشان نتیجہ نہایت ہی حقیر ذریعوں سے نکلا تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ ہسپانوی اور پرتگالی جہاز انگریزی جہازوں سے عام طور پر بڑے ہوتے تھے۔ ان میں آدمیوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی تھی اور ان کی مہمیں بھی بہت اہتمام اور احتیاط کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔ مشرقی بحری سفروں میں یہ عدم مساوات اس قدر نمایاں نہیں تھی لینکیسٹر کا جہاز "دی ریڈ ڈریگن"[1]، جس میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی

---

[1] The Red Dragon

پہلی مہم سر کی تھی ۲۰۰ ٹن وزن کا تھا اپنے زمانے کے اعتبار سے یہ یقیناً ایک بڑا جہاز تھا۔ لیکن بعض پرتگالی جہازوں کے مقابلے میں واقعی وہ بہت چھوٹا تھا۔ بحر شمالی یا مغربی سمندروں میں جو جہاز گئے تھے وہ اس سے بھی چھوٹے تھے۔ فرابشر کا بیڑا دو ۲۵ ٹن وزنی جہازوں اور ایک ۱۰ ٹن وزنی جہاز پر مشتمل تھا۔ ڈریک سنہ ۱۵۷۲ء میں "پاشا" نامی جہاز میں جس کا وزن ۷۰ ٹن تھا روانہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ۲۵ ٹن وزنی جہاز "سوان" بھی تھا۔ یہ جہازی قافلہ جوانوں اور لڑکوں کو ملا کر صرف ۷۳ نفوس پر مشتمل تھا اور اس کے باوجود اس نے نامبرے پر قبضہ کر لیا، سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے ہسپانوی جہازی قافلے کو لوٹا اور بحیرۂ کیریبین میں ابتدا سے آخر تک ۲۰۰ جہاز چھین لیے۔ اپجر کاہل کے لیے جو مہم روانہ کی گئی تھی وہ اس سے بڑے پیمانے کی تھی۔ ایک جہاز "پیلی کن" جس کا نام بعد میں "گولڈن ہنڈ" رکھا گیا ۱۰۰ ٹن وزن کا تھا اور "ایلزبتھ" نامی جہاز کا وزن ۸۰ ٹن تھا لیکن ۱۵ ٹن وزنی جہاز "کرسٹوفر" کو بھی اتنا چھوٹا نہیں سمجھا گیا کہ ساتھ لے جانے کا خیال چھوڑ دیا جاتا۔ ہڈسن شمال مشرقی راستے کی دریافت کی پہلی مہم میں اپنے ساتھ صرف دس آدمی اور ایک لڑکا لے گیا۔ گو کہ تعداد کے لحاظ سے اس کے بعد کے زمانے یعنی سنہ ۱۸۹۱ء میں فان سین کے بحری سفر کی تاریخ میں ایک نظیر ملتی ہے۔[1] لیکن حالات کے اختلاف کو ملحوظ رکھا جائے تو ہڈسن کا کارنامہ کسی طرح نان سین کے کارنامے سے کم قابل داد نہیں ہے۔ "اسکوئرل" نامی جہاز جو گلبرٹ کے ساتھ ڈوب گیا تھا اس کا وزن صرف ۱۰ ٹن تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ بڑے جہاز بالکل نہ تھے۔ بلکہ بڑے جہاز بھی تھے۔ چنانچہ ہنری ہشتم کے جہاز "گریٹ ہیری" نامی کا وزن تقریباً ۱۰۰۰ ٹن تھا اور ۷۰۰ آدمی اس میں سفر کر سکتے تھے۔ یہ اس زمانے کے انگریزی بیڑے میں سب سے بڑا جہاز تھا۔ بلکہ ایلزبتھ اپنے معمول کے مطابق مہم جو اشخاص کو جو جہاز مستعار

[1] چنانچہ فریم Fram نامی جہاز میں کل ۱۳ نفوس تھے۔

دیتی تھی، وہ اکثر خانگی جہازوں سے بڑے ہوا کرتے تھے۔ بلکہ کے زمانۂ حکومت کے ملاحوں کی جانفشانی اور پامردی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اس زمانے کے جہاز اور ملاح اپنے دشمنوں کے جہازوں اور ملاحوں کے مقابلے میں بہت چھوٹے اور تھوڑے ہونے کے باوجود ان کو فوقیت اور غلبہ رہتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جہازوں کو بڑی مہارت سے چلاتے اور اپنے قابو میں رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایسے جری اور دلیر تھے کہ دشمنوں کے ٹڈی دل کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

۱۷۸

باب ۱۲

انگریزی صنعتوں پر ایک نظر

سنہ ۱۶۶۰ء تا سنہ ۱۷۶۰ء

اٹھارھویں صدی کا آخری حصہ اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں صنعت و تجارت کو بہت نمایاں توسیع و ترقی ہوئی جس کی وجہ سے انگلستان دنیا کا بہت بڑا صنعتی ملک بن گیا۔ اس صنعتی انقلاب (جیسا کہ اس کو بعض اوقات موسوم کیا جاتا ہے) کی اہم خصوصیتوں کا اندازہ کرنے کے لیے ان صنعتی حالات کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا ضروری ہے جو ابتدا میں کلوں اور بعد میں بھاپ کی قوت کے استعمال سے بیشتر پائے جاتے تھے۔ کیونکہ مشین اور بھاپ کی قوت ہی نے قدیم حالات میں تبدیلی کر کے جدید حالات پیدا کیے۔ اگر اٹھارھویں صدی میں صنعتی تاریخ اس لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں انگلستان کے جدید نظام کی ابتدا ہوئی تو سترھویں صدی بھی اپنی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے جو نوعیت کے لحاظ سے ان واقعات سے بہت ممتاز و مختلف ہے جو اس کے بعد ظاہر ہوئے۔

کیونکہ سترھویں صدی کے آخری حصے میں غیر ملکی دستکاروں کی درآمد سے
انگلستان کو سب سے بڑا اور آخری فایدہ حاصل ہوا۔

اس طریقے سے انگلستان نے جو کچھ فایدہ حاصل کیا اس کی داستان
بیان کرنے میں ہمیں بہت پہلے کے زمانے پر نظر دوڑانی پڑے گی۔ چنانچہ
ہمیں ان فلیمش جلاہوں کی نوآبادی سے شروع کرنا پڑے گا جو نارمن فتح
کے بعد ہی انگلستان آئے تھے اور جن کو انگریزوں کی دشمنی سے ولیم اول
کی بیوی متلڈا آف فلینڈرز نے محفوظ رکھا تھا۔ غیر ملکی دستکاروں کو شاہی
حفاظت میں لینے کی یہ پالیسی اڈورڈ سوم کے دور حکومت میں مکرر اس وقت
رونما ہوئی جب کہ فلیمش جلاہوں کی ایک نئی جماعت جس پر ظلم و ستم ڈہائے گئے
تھے وطن سے بھاگ کر انگلستان میں پناہ گزین ہوئی اور اپنے ساتھ اپنے
ہنر لیتی آئی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ان غیر ملکی دستکاروں کی آمد نے
انگلستان کی پارچہ بافی کی صنعت کے حق میں محرک کا کام کیا جس کا سلسلہ
پندرھویں صدی کی احاطہ بندیوں اور انگریزی کپڑے کی تجارت برآمد کے
آغاز تک برابر جاری رہا۔ جوں جوں انگریزی صنعت نے ترقی کی فلینڈرز
کی صنعت گھٹتی گئی۔ لیکن کپڑا دھونے اور رنگنے اور اعلیٰ درجے کا کپڑا بنانے
میں انگلستان ابھی بہت پیچھے تھا لیکن جو نقصان کونٹ آف فلینڈرز اور
فلپ آف ویلائے کے ہاتھوں چودھویں صدی میں شروع ہوا تھا وہ
سولھویں صدی میں ڈیوک آف الور کی تباہ کاری سے پورا ہو گیا۔ اور
ایذا رسانی کی وجہ سے فلینڈرز کے سینکڑوں پراٹسٹنٹ جلاہے وطن چھوڑ کر
بھاگ گئے۔ اس کے بعد جو طویل جنگ جاری رہی اس نے باقی ماندہ لوگوں کی
صنعت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ یہ واقعہ کہ ہسپانیہ جیسی قوت کے ہاتھوں فلینڈرز
کی پارچہ بافی کی صنعت تباہ ہوئی اور اس طرح انگلستان کا کوئی رقیب
میدان میں باقی نہیں رہا، تاریخ کی ستم ظریفی کی ایک انوکھی مثال ہے۔
انگلستان اور فلینڈرز کی باہمی مسابقت کے آغاز ہی میں فلینڈرز گھاٹے میں رہا
کیونکہ انگلستان ہی واحد اون پیدا کرنے والا ملک تھا جسکی برآمد کو

روک کر اپنے حریف کی تجارت میں افرا تفری پیدا کر سکتا تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس نے ایسا کیا بھی۔ لیکن پندرھویں صدی میں ہسپانیہ نے اون پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنی شروع کی۔ بعضوں کا خیال تھا کہ اڈورڈ چہارم کی احمقانہ فیاضی کی وجہ سے ایسا ہوا کیونکہ اس نے انگریزی بھیڑوں کو تحفہ کے طور پر شاہ اراگون کے پاس بھیجا تھا اور اس طرح فلینڈرز کا انحصار خام اون کی حد تک صرف انگلستان پر نہیں رہا۔ جب ہالینڈ اور ہسپانیہ ایک بادشاہ کے زیر نگیں آگئے تو کوئی ملک بھی ایسے ممالک سے قریبی تجارتی رشتہ جوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا جن میں سے ہر ایک کو دوسرے سے کافی فایدے حاصل ہونے کی توقع تھی۔ لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس رونما ہوئی۔ ہسپانوی ایذا رسانی نے فلینڈرز کی صنعت کا گھونٹ دیا اور اس طرح خود ہسپانیہ کے لیے اون کا بازار ختم ہو کر رہ گیا۔ مظالم اور ایذا رسانی نے بغاوت پیدا کر دی اور محکوم باغیوں ہی نے ہسپانیہ سے اس کی ساری دولت چھین لی جو اس نے نئی دنیا سے حاصل کی تھی۔ دوسری طرف ملحد انگلستان نے جو ہسپانوی نظروں میں ہالینڈ کی ہی طرح قابل نفرت تھا، مفرورین کو پناہ دی اور ان کی فنی مہارت سے فایدے حاصل کیے۔

تجارت میں خصوصی حقوق کے اس رجحان کا کچھ حال بیان کیا جا چکا ہے۔ جو پندرھویں صدی میں اڈورڈ سوم کے کیے ہوئے کام کا خاتمہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہو گیا۔[1] اس کی سب سے نمایاں خصوصیتوں میں ایک غیر ملکیوں سے حسد تھا۔ چنانچہ بادشاہ یا اس کی رعایا نے غیر ملکی دستکاروں کا خیر مقدم کبھی خندہ پیشانی سے نہیں کیا حالانکہ ان کی آمد کا سلسلہ آہستہ آہستہ اور چھوٹے پیمانے پر اس صدی کے سارے دوران میں برابر جاری رہا۔ رچرڈ سوم کے قانون میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ دستکار

[1] دیکھو صفحہ ۱۰۶۔

اور دوسرے غیر ملکی کثرت سے ملک میں آبسے اور کپڑا اور دوسری دستی مصنوعات تیار کرنے لگے جس کی وجہ سے بادشاہ کی رعایا مفلس اور بدحال ہوگئی اور اس کو گوارا نہیں کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کی رعایا ان کے ساتھ بلگیر کام کرے۔ چنانچہ سلطنت انگلستان کے کسی حرفتی و ہندے میں اس قسم کی دستی مصنوعات کا استعمال روک دیا گیا۔ غیر ملکیوں سے دشمنی کا اظہار ۱۵۱۷ء میں "ایول مے ڈے"[1] کے ایک سخت بلوے کی صورت میں ہوا جب کہ بمقام اسپٹل ڈاکٹر بل کی ایک ہیجانی تقریر سے بھڑک اُٹھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ انگریزوں کو زمین اس لیے دی گئی تھی کہ اس سے وہ خود فایدہ اُٹھائیں، اس کے سہارے گزر بسر کریں اور غیر ملکیوں کو نقصان پہنچائیں تقریباً ایک ہزار کا ایک جتھا جو کار آموزوں اور کارندوں پر مشتمل تھا یہ تقریر سن کر مجلس پر لوٹ پڑا اور چند قیدیوں کو جو وہاں تھے چھڑا لیا۔ اس کے علاوہ اس نے غیر ملکیوں پر حملہ کیا، ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور ان کے مکان تباہ کر دیے۔ گو بلوائیوں کا فرلے نے سخت تدارک کیا، لیکن ملکی تاجروں اور کاریگروں کی ہمدردی ان کو بڑی حد تک حاصل رہی۔ اس صورت میں بھی جب کہ انگریزوں اور غیر ملکی پناہ گزینوں نے رومہ کے خلاف متحدہ محاذ قایم کیا، حکومت نے فوراً غیر ملکیوں کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے نہیں کیا۔ ہنری ہشتم کا رجحان رواداری کی طرف نہیں تھا۔ گو تھامس کرامول نے تغیر انس کو امان دی اور سمرسٹ نے ان کی ہمت افزائی کی، لیکن ملکہ میری کی چیرہ دستی سے انھیں سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ملکہ ایلزبتھ کے دور حکومت کے قبل تک غیر ملکیوں کی آمد خاصکر ہالینڈ سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ۱۵۶۸ء تک تقریباً پندرہ سو فلینڈرز کے باشندے اور ویلونؔ[2] (۱۸۱) نارو چ میں بس چکے تھے اور دوسرے ہی سال یہ تعداد دونی ہوگئی۔ اسی طرح کولچسٹر لندن، ساوتھ ورک، کنٹربری، ساوتھمپٹن اور سینڈوچ میں پناہ گزینوں کی

---

[1] Evil May Day [2] Walloons

نو آبادیاں قایم ہو گئیں۔ ان کا استقبال سب جگہ ایک سا نہیں ہوا عوام
ان ہیں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے اور جلا ہوں کو ان سے
حسد تھا۔ لیکن ملکہ اور ان لوگوں نے جو قومی حسد و تعصب سے دور رہ کر
سلطنت اور قوم کے مفاد کو بڑی بات سمجھتے تھے، پناہ گیروں کو خوش آمدید
کہا، کیونکہ موخر الذکر اپنے ساتھ ایسے ہنر اور صنعتی مہارت لائے تھے۔
جو اب تک انگلستان میں ناپید تھے وہ کپڑا دھونے اور رنگنے میں ماہر تھے
اور اعلیٰ درجے کے کپڑے مثلاً بیز و سیز[1] موکاڈوز[2]، اراس[3]، کرسیز[4] اور
اسی طرح کی دوسری اشیا بنانے میں مشاق تھے جو انگلستان میں نہیں بنایا
جاتا تھا۔ غرض ایلزبتھ کے زمانے میں نئی نئی وضع کے کپڑے[5] بننے لگے۔
چنانچہ بومبازین[6] کا فیشن جیمس اول کے دور حکومت میں اس قدر بڑھ گیا تھا
کہ اس کی بدولت نارویچ کی خوشحالی پلٹ آئی۔ بیز اور سیز کولچسٹر کے
سارے شہر میں مقبول تھے۔ چنانچہ ان کی قدر اور اہمیت کا یہ حال تھا کہ
جس وقت فیر فیکس نے اس شہر کا محاصرہ کیا تو اس کے دوران میں یہاں
کے صناعوں نے جو کپڑے تیار کیے تھے انھیں پارلیمنٹ خرید نے کو
تیار ہو گئی۔ غرض یہ سب کپڑے اور ان کی دوسری قسمیں نو واردوں نے
تیار کیں جس سے نہ صرف ان کا فایدہ ہوا بلکہ انگلستان کے اکثر نئے
پیشے سیکھنے والے غریبوں اور ساتھ ہی سلطنت کو بھی فایدہ ہوا۔
ان حالات میں پارچہ بافی پہلے سے زیادہ ملک کی معیاری صنعت
بن گئی۔ غیر ملکی زیادہ تر مشرق میں آباد تھے۔ اس کے علاوہ مغربی انگلستان میں

---

[1] Bays and says

[2] Moccodos

[3] Arras

[4] Kersies

[5] ان کو New Drapery اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ اڈورڈ سوم کے دور حکومت کے پرانی وضع کے کپڑوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

[6] Bombazine

میں دوسرے شہر صنعتی مرکز بن گئے، شمال میں خاصکر یارک شائر میں ویسٹ رائڈنگ مشہور تھا۔ اکزیٹر اور ٹانٹن میں سرج بنائی جاتی تھی۔ ٹیورٹن، بارن اسٹیپل، ٹارنگٹن اور کریڈیٹن میں کرسیز، بیز اور فریزا ڈوز تیار کیے جاتے تھے۔ کریڈیٹن اپنے مہین دھاگے کی وجہ سے مشہور تھا۔ ویسٹ رائڈنگ میں موٹا کپڑا بنایا جاتا تھا۔ ویکفیلڈ، ہیلی فیکس اور کیلی کے شہروں میں بھی کپڑوں کے کارخانے قایم ہو گئے۔ ۱۶۳۶ء میں لیڈز کے کئی ہزار بزازوں کی جانب سے ایک شکایت پیش ہوئی گو ان بزازوں یا کپڑے والوں کی یقینی تعداد ظاہر نہیں کی گئی، لیکن بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ صنعت کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ "تجارتی مرکز" اور "کپڑے والے" وغیرہ الفاظ استعمال کرنے میں ہمیں غلط فہمیوں سے بچنا چاہیے۔ صنعت زیادہ تر گھریلو تھی اور وہ بھی منتشر حالت میں۔ ایسی بھی چند کرنیاں تھیں جن میں پارچہ بافی کا کام ایک ہی چھت کے نیچے اور ایک ہی اُستاد کی نگرانی میں انجام پاتا تھا۔ لیکن ایسی صورتیں بہت کم تھیں اور ایلز بتھ نے اس قسم کے کاروبار کی حوصلہ شکنی کی تھی[۱]۔ کاریگر عام طور پر اپنے ہی گھروں میں اون دھنتے، دھاگا کاتتے اور کپڑا بنتے تھے۔ آلات اور اوزار تقریباً اسی قسم کے استعمال کیے جاتے تھے جیسے کہ صدیوں سے استعمال کیے جا رہے تھے یعنی کاتنے کا چرخہ اور دستی راچھ۔ نال ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کی جاتی تھی اور اس کی وجہ سے ایک آدمی کے لیے پون گز سے زیادہ عرض کا کپڑا بننا ناممکن تھا۔ اس سے زیادہ عرض کا کپڑا بننے کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت تھی تاکہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں نال منتقل کریں۔ بعض ضلعوں میں کاریگر "کپڑے والوں" کے لیے کام کیا کرتے تھے۔ یہ کپڑے والے خود ہی اون خرید کر دیتے تھے۔ اس اون کو یکے بعد دیگرے دھنیوں، کاتنے والوں اور بننے والوں کے سپرد

۱۸۶

[۱]۔ دیکھو صفحہ ۱۲۶۔

کرتے تھے۔ ان کاریگروں میں سے ہر ایک کو ان کے کام کے مطابق اجرت دیتے تھے اور کپڑا تیار ہو جانے کے بعد اپنے طور پر بیچا کرتے تھے۔ لیکن سب جگہ ایسی حالت نہیں تھی۔ ڈیون شائر میں ہر آدمی اپنے طور پر کام کرتا تھا۔ شریف کاشتکار اپنی اون بازار لے جاتے تھے جہاں اون صاف کرنے یا کاتنے والے اس کو خریدا کرتے تھے۔ وہ اپنے ذمے کا کام پورا کر کے سوت یا "تاگے کو جلاہے کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے جو اس کا کپڑا بن کر ہفتہ واری بازار میں لے جاتا تھا جہاں اس کو "کپڑے والا"[لہ] خرید کر لنڈن روانہ کر دیتا تھا یا ایسا تاجر اس کپڑے کو خرید لیتا جو کپڑے کو کلف دینے والے کے پاس اور بعض اوقات رنگنے والے کے پاس بھیجنے کے بعد جہاز کے ذریعے ملک کے باہر روانہ کرتا تھا۔ یہاں "کپڑے والے" سے مطلب "تاجر پارچہ" ہے نہ کہ تاجر۔ اس اصطلاح کا ایک تیسرا مفہوم بھی لیڈز کے محضر سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں "کپڑے والے" کے معنی "جلاہے" کے ہیں۔

جس طرح صنعت کی یہ منتشر حالت موجودہ کارخانوں (فیکٹریوں) کے ارتکاز کے برعکس نظر آتی ہے اسی طرح اس وقت کی حکومت کا طرز عمل بھی آج کل سے مختلف تھا۔ ہر شخص کو ایک مقررہ طول کا کپڑا بنانے پر مجبور کرنے کی سعی تو ترک کر دی گئی تھی، لیکن حکومت نے مال کی خوبی کو یقینی بنانے کی کوشش برقرار رکھی۔ کپڑے کی بنائی کی نگرانی کے لیے نگران کار اور "ناظر مقرر کیے گئے تھے" تا کہ وہ اس امر کی تصدیق کریں کہ کپڑا عمدگی سے بنا گیا۔ کپڑے میں کھینچ تان کرنے کے غیر دیانت دارانہ عمل یا درمیان میں ادنیٰ درجے کا تاگا استعمال کرنے کے برے طریقے یا کپڑے کو چپٹے کے آٹے، چربی یا گوند کے ذریعے دبیز بنانے کے طریقوں کے خلاف اعلان جاری کیے جاتے تھے۔ انگریزی کے بارے میں بھی شرطیں

۱۵۴۳

لہ Clothier

مقرر کی گئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۸ء جیسے بعد کے زمانے تک انگلستان کے انگریز اتنے ماہر نہ تھے جتنے کہ براعظم کے انگریز ۱۶۶۸ء میں ہالینڈ کے۔ ۵ باشندے جنھیں والون[1] کہا جاتا تھا انگلستان لائے گئے جنھوں نے انگریزی کا نسبتاً بہت بہتر طریق سکھایا جس کے نتیجے کے طور پر مصارف میں ۱۴ فی صد کی بچت ہوسکتی تھی۔ خراب سامان مثلاً آلڈر[2] کے پوست کا سریش، لوہے کا برادہ، گوند، شیرہ یا کوئی اور دھوکا دینے والی شئے استعمال کرنا ناروا قرار دیا گیا[3]۔ اگرچہ اسباب کی کافی نگرانی کی جاتی تھی کہ گاہک دھوکے سے بچیں اور تجارت بدنامی سے۔ پھر بھی حکومت نے تجارت کو ترقی دینے میں کوئی کوتاہی یا غفلت نہیں کی۔ چنانچہ اس کی ایک انوکھی مثال چارلس دوم کا ایک قانون ہے جس کی رو سے یہ لازم تھا کہ مرنے والے کی تکفین کے لیے سوتی کپڑے کی بجائے جو اس کام کے لیے عام طور سے استعمال کیا جاتا تھا، اونی کپڑا استعمال کیا جائے۔

پناہ گیروں نے بہت سی دوسری صنعتوں کو بھی رواج دیا اور اگرچہ تمام صورتوں میں یہ یقین کے ساتھ کہنا ناممکن ہے کہ یہ صنعتیں انگلستان میں اس سے پہلے ناپید تھیں، پھر بھی ان کی وجہ سے صنعت وحرفت کو کافی مدد پہنچی۔ سترھویں صدی میں ریشم بافی، فیتہ بافی، سوتہ بافی، شیشوں کی نقاشی، طباعت، جلد بندی، کنگھی، توتام، چینی کے مرتبان، زیور، ٹوکریاں، چرمی کاغذ، سوئی تاگہ وغیرہ تیار کرنے کی طرف ان پناہ گیروں کی توجہ رہی، جو لوگ کنوس، کاغذ، صابون، شورہ، تار اور کاریگری کے دھندوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں عام طور سے غیر ملکیوں کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ مانچسٹر کے سوتی کپڑے بھی اصلیت میں غالباً بدیشی تھے۔ پناہ گیروں نے کانیں کھودنے اور ہتھیاروں کے بنانے میں

[1] Walloon.

[2] بید کی قسم کا ایک درخت

[3] ریشمی کپڑے رنگنے کی حد تک ان چیزوں کے استعمال کی خاص طور سے ممانعت کی گئی تھی۔

میں بھی کافی اصلاح اور ترقی کی۔ دلدلوں کو خشک اور صاف کرنے میں فن انجینیرنگ کی مہارت کی جیسی ضرورت تھی وہ بھی غیر ملکیوں ہی سے حاصل ہوئی۔ ایلزبتھ کے دور حکومت میں اس سمت میں جو کوششیں کی گئیں اور کارہائے آب اور گودیوں کی اصلاح و ترقی کے بارے میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں غیر ملکیوں کا مشورہ ہمیشہ شامل رہا چنانچہ اطالیوں سے بعض اوقات لیکن ولندیزیوں سے عام طور پر مشورہ کیا گیا۔ ایک ولندیزی ماہر کارنیلیس ورموئیڈن[1] نے یارک شائر میں ہٹ فیلڈ چیز کے دلدل سے پانی نکالنے کے لیے ولندیزی مزدوروں سے کام لیا اور ستر ہزار ایکڑ زمین کو خشک اور صاف کیا۔ اسی قسم کا کام آیل آف اکس ہالم[2] اور فینز کی بڑی دلدلوں میں انجام دیا گیا۔ حالانکہ ورموئیڈن کی راہ میں دلدلی علاقے کے باشندوں نے بڑی حد تک رکاوٹیں پیدا کیں کیونکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس اصلاح و ترقی سے ان کی قدیم شاملاتی زمینیں اور عام حقوق چھن جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے غیر ملکی مزدوروں پر بارہا حملہ کیا، ان کے بنائے ہوئے سنگین پشتے توڑ ڈالے اور اس طرح بنے بنائے کام کو بگاڑ دیا۔ جب تدریج سے خیالات میں اعتدال پیدا ہوا تو زمین سے پانی نکالنے کے فایدوں کا احساس ہوا۔

اب تک زیادہ تر فلینڈرز سے ماہر دستکار آیا کرتے تھے۔ لیکن چارلس دوم کے عہد حکومت میں فرانس سے کافی تعداد میں دستکار آئے۔ ۱۶۸۵ء میں نانٹیس کے کلیسائی حکم کی تنسیخ نے ہیوجی ناٹ طبقے کے سیکڑوں افراد کو مجبور کردیا کہ اگر وہ اپنا مذہب نہ چھوڑیں تو ملک چھوڑ دیں۔ اس طرح جن لوگوں کو بچنے کا راستہ سمندر کی طرف ملا وہ زیادہ تر انگلستان بھاگ آئے۔ ان وطن چھوڑنے والوں میں فرانس کے وہ بہترین مزدور بھی تھے جن کا پیشہ ریشمی پارچہ بافی تھا۔ اتفاق سے یہ ایک ایسا پیشہ تھا

۱۸۴

---

[1] Cornelius Vermuydsn [2] Isle of Axholme

جس کا اس زمانے کے خیالات کے مطابق انگلستان میں قائم کرنا مناسب خیال کیا جا رہا تھا۔ سترھویں صدی کے معاشی خیالات کے مطابق انگریزی اونی کپڑے استعمال کرنا اور غیر ملکی ریشمی کپڑے سے بچنا بڑی بات ہوتی، لیکن اس پر عملدرآمد کی امید بے سود تھی۔ اگر ریشمی کپڑے استعمال کرنا ناگزیر تھا اور یہ واضح تھا کہ وہ ضرور استعمال کیے جائیں تو اُن کا انگریزی ساخت کا ہونا لازمی تھا۔ گو جیمس اول کے دور حکومت میں ریشمی کپڑا بُننے والوں، رنگریزوں اور ریشم بٹنے والوں کو اطالیہ سے بلا کر اور ریشم کے کیڑوں کے پالنے کی ہمت افزائی کر کے انگریزی صنعت کی اصلاح و ترقی کی کوشش کی گئی، لیکن انگریزی کپڑے قسم، خوبی اور وضع کے لحاظ سے فرانسیسی کپڑے کے مقابلے میں ادنی اور گھٹیا تھے۔ لیکن اس صورت میں بھی ہسپانیہ کی طرح خود انگریزوں کے رقیب مذہبی ایذا رسانی سے تنگ آ کر بھاگ آئے اور انگریزوں کے مددگار بن گئے۔ ۱۶۸۱ء میں[1] چارلس دوم کی جانب سے ملکی حقوق عطا کیے جانے کے باعث حوصلہ افزائی ہوئی تو ایک ہزار سے زاید اشخاص انگلستان آ گئے اور اپنے ساتھ نہ صرف مال تجارت، آلات اور اوزار بلکہ فنی مہارت بھی لیتے آئے۔ اس نقل وطن کا سلسلہ اتنا بڑھا اور پھیلا کہ ۱۶۷۰ء اور ۱۶۹۰ء کے درمیان ۸۰ ہزار سے زیادہ لوگ انگلستان آئے جن میں سے تقریباً ایک تہائی لندن کے ارد گرد خاص کر اسپٹل فیلڈز میں بس گئے اور بقیہ کنٹربری، سینڈوچ، نارویچ، ساوتھمپٹن، برسٹل وغیرہ میں رہ پڑے اور بعض ایڈنبرا اور آئرلینڈ کے سے دور افتادہ مقاموں میں آباد ہوئے چونکہ نقل وطن کر کے آنے والے زیادہ تر ریشمی کپڑے بُننے والے تھے

۱۸۵

[1] ۱۷ جون ۱۶۸۱ء کو ایک کلیسائی حکم جاری کیا گیا جس کی رو سے پروٹسٹنٹ والدین کے بچوں کی تبدیلی مذہب کی عمر بجائے ۱۲ سال کے ۷ سال کر دی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں فرانس سے ہیوجی ناٹ پہلی دفعہ بڑی تعداد میں باہر نکل بھاگے۔

اس لیے اس صنعت کو انگلستان میں کافی مدد ملی۔ چنانچہ ۱۶۸۹ء میں ۴۰ ہزار خاندانوں کا گزارہ اسی پر تھا۔ ۱۶۹۴ء میں بلیک فرائیرز[1] میں ایک ہزار ارا کھ کام کر رہے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز پر یہ اندازہ لگایا گیا کہ ۱۶۶۴ء کے مقابلے میں تجارت بیس گونہ اضافہ ہو چکا تھا۔ نئے سامان میں نئے نئے فیشن اور نئی نئی وضع قطع کے کپڑے کمخواب، نرم اور گاڑھا ریشم، گون کے سیاہ و رنگین ریشم، سیاہ مخمل اور چکدار ریشم شامل تھے۔ چنانچہ سب سے آخری قسم کا کپڑا بنانے والوں نے اس کے لیے ایک علٰحدہ کمپنی رائل لسٹرنگ نام کی کمپنی[2] قایم کی تھی۔ نانٹیس کے کلیسائی حکم کی ۱۶۸۵ء میں تنسیخ سے پہلے انگلستان میں سالانہ دو لاکھ پونڈ قیمت کا چکدار ریشم درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۶۹۸ء تک اس کی درآمد کو بالکل روک دینا ممکن ہو گیا۔ کیونکہ ملکی پیداوار اب بہت کافی ہونے لگی تھی۔ کمخواب اور پھولدار ریشم کی وضع اور ساخت میں بہت بڑی اصلاح و ترقی ہوئی۔ فیشن کی حد تک اب بھی فرانس کی پیروی کی جاتی تھی اسی لیے فرانس کا مال پہلے بک جاتا تھا اور پھر انگلستان کے مال کی نوبت آتی تھی۔ لیکن انگریزی کپڑے ایسی تجارت میں اچھی طرح مقابلہ کر سکتے تھے جس میں وہ پہلے بری طرح پیچھے تھے۔ انگلستان کو جو فایدہ پہنچا اس کے متعلق بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ بخیر روادارانہ پالیسی کی خرابی کا نمایاں ثبوت یہ تھا کہ ٹورس میں نانٹیس کے کلیسائی حکم کی تنسیخ (Revocation)[3] سے پہلے جہاں ۷۰۰ کرگنیاں تھیں وہاں صرف ۷۰ رہ گئی تھیں۔

ہیوجی ناٹ ریشمی پارچہ بافی کے علاوہ دوسری صنعتوں کو بھی چلا رہے تھے جن میں سے بعض نئی تھیں اور بعض اس سے پہلے کے

سلہ۔ Black Friars ۔ سلہ۲ Royal Lustring Company

سلہ۳ - Revocation

نقل وطن کرکے آنے والوں کے ساتھ انگلستان آئی تھیں۔ انگلستان نے بادبانی کپڑا بنانا ان ہی لوگوں سے سیکھا۔ چنانچہ ایک ہیوجی ناٹ لون ہومی نامی اپسوچ میں رہنے والا یہ کام سکھانے کا ذمہ دار تھا۔ مشجر بنانے کا فن فرانس کے ایک سابق پادری نے سکھایا اور اس کا ایک کارخانہ فلہم میں قایم ہوا۔ ٹوپی کی صنعت میں بھی بہت کچھ اصلاح اور ترقی ہوئی۔ گو نئے سرے سے اس کا قیام نہیں ہوا پھر بھی ماہر پناہ گیر جدت سے کام لے کر سنجاب تیار کرتے اور اس کو ٹوپی میں لگاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے فرانس کے ہاتھ سے یہ تجارت بالکل نکل چکی تھی، اور حالت یہ ہوگئی تھی کہ رومن پادریوں یعنی کارڈینلز کی ٹوپیاں پروٹسٹنٹ انگلستان کے وانڈسورتھ کے کارخانے سے تیار ہو کر جاتی تھیں۔ پناہ گیروں نے کاغذ بنانے کا فن بھی سکھایا ان کی آمد سے پہلے انگلستان میں صرف بھورے رنگ کا کاغذ تیار ہوتا تھا اور اعلیٰ قسموں کو درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن بورڈو اور آورن[1] سے نقل وطن کرکے آنیوالے اپنے ساتھ اپنے ہنر لائے اور بہت زمانہ گزرنے نہ پایا کہ انگلستان اپنی ضرورتوں کے مطابق جملہ سامان تیار کرنے کے قابل ہو گیا۔ گھڑی سازی اور اس کے مثل میکانی صنعتیں مثلاً قفلوں گوشت بھوننے کے لیے سیخ دان اور میکانی کھلونوں کی صنعتیں انگلستان میں باہر سے آئیں اور شیشے کے تختے بنانے کی صنعت بھی بیرونی مہارت سے کافی قوی ہوئی۔ لیکن یہ سب صنعتیں یکساں طور پر سرسبز نہیں تھیں۔ ایک عرصے کے بعد جب فرانس کو اپنا نقصان محسوس ہوا تو اس نے اپنے بھاگے ہوئے مزدوروں کو رشوت دے کر

---

[1] Auvergne اور Bordeaux

[2] شیشہ سازی کی اکثر اصطلاحیں فرانسیسی زبان سے لی گئی ہیں گھلائے ہوئے شیشے کو "فاؤنڈ" (Found) کہا جاتا ہے جو فرانسیسی لفظ "فانڈرے" (Fondre) سے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح وہ مقام جہاں گھٹائی رکھی جاتی ہے "سیج" (Siege) کہلاتی ہے جو فرانسیسی سے ماخوذ ہے۔

واپس بلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انگلستان میں بادبان کا کپڑا بنانے کے کاروبار میں اس سے بہت کچھ رکاوٹ پیدا ہوئی یہاں تک کہ جارج اول کے دور حکومت میں انگریز اتنا بھی تیار نہیں کر سکتے تھے جتنے کی ملک میں ضرورت تھی۔ اسی طریقے سے بعض ٹوپی بنانے والوں کو بھی فرانس لوٹ آنے کی ترغیب دی گئی جہاں پہنچ کر انھوں نے بھولے ہوئے فن کو پھر زندہ کیا۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے انگلستان کو بہت کافی معاشی فائدہ پہنچا۔ ایسے زمانے میں جب کہ کلوں کا رواج نہیں ہوا تھا یا کم ہوا تھا مہارت اور فنی اسرار خاص اہمیت رکھتے تھے اور ان کی حفاظت کا ملک میں عام طور سے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ لیکن فرانس کی مذہبی ایذا رسانی کی پالیسی نے اس زمانے کے معاشی خیالات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ جب فرانسیسی دستکاروں کو ان کے وطن سے نہایت بے پروائی کے ساتھ نکال دیا گیا اور انھوں نے انگلستان کو اپنا مسکن بنایا تو وہ اپنے ساتھ اپنی مہارت، اپنے کاروباری طریقے اور تجارتی راز لیتے آئے اور انگلستان میں اپنا دھندا شروع کر کے انگریزوں کو اس کی تعلیم دی۔ ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ کسی چیز کے بتا دینے کے بعد اس کا واپس لینا ناممکن تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دیسی اپنے وطن لوٹ گئے ہوں یا مر کھپ گئے ہوں، لیکن انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کے نتیجے باقی رہے۔ سترھویں صدی کے آخر میں غیر ملکیوں کی آمد نے انگریزی صنعتوں کو جو مدد پہنچائی اس کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا کہ ایک صدی بعد کلوں اور مشینوں کے رواج سے ہوا۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ پردیسیوں سے انگریزی صنعتوں کو بڑی مدد پہنچی۔ بل صرف اتنا تھا کہ پردیسیوں کی بدولت اصلاح و ترقی زیادہ تر مہارت میں ہوتی اور موخر الذکر صورت میں رفتار میں۔ لیکن بہر صورت نتیجہ ایک ہی تھا یعنی انگریزوں کو اپنے پڑوسیوں پر تجارتی فوقیت حاصل ہو گئی۔

۱۸۷

ف ۱۔ اکثر برانڈنبرگ کو چلے گئے جس نے انگلستان کی طرح ان کے طفیل میں خاصی صنعتی ترقی کی۔

گو سترھویں صدی میں غیر ملکیوں کی آمد نے انگریزوں کی صنعتی خوشحالی کو سب سے زیادہ مدد پہنچائی لیکن اس زمانے میں ملکی صنعتیں بیکاری کی حالت میں نہیں تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں تین چیزیں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ ایک تو کوئلے سے لوہا پگھلانے کے ابتدائی تجربے دوسرے آیرلینڈ میں سوتی کپڑے کی صنعت کا قیام اور تیسرے پہاڑی نمک کی دریافت۔

کانوں کے لوازم کوئلے کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کا طریقہ تیرھویں صدی سے رائج تھا اور کوئلے کی بڑی مقدار لندن اور دوسرے شہروں کو سمندر کے ذریعے سے روانہ کی جاتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب کہ نقل و حمل سمندر کے راستے کی جاتی تھی، کوئلے کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ سنہ ۱۶۳۸ء میں ۳۶ بشل کوئلے کی قیمت لندن میں ۱۹ شلنگ تھی اور ہر کالڈرن یا ۳۶ بشل پر ۴ شلنگ محصول چنگی مقرر تھا۔ اس اعلیٰ قیمت کی ذمہ دار وہ روک تھی جو نیوکیسل کے بلدیہ نے اس کی تجارت پر لگادی تھی کہ وہ اپنی جماعت کے آزاد افراد کے سوا کسی دوسرے کو اس تجارت میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے گا۔ لیکن سامان لادنے، اتارنے اور خراب سڑکوں پر ڈھونے کی دقتوں کو بھی قیمت کے بڑھانے میں بڑا دخل تھا۔ لیکن کوئلہ ان علاقوں میں بہت سستا تھا جہاں اس کی کانیں تھیں اور اس کا بڑا حصہ بیکار جاتا تھا۔ اسٹافورڈشایر میں جہاں بعض صورتوں میں اس کو سطح سے کھود کر نکالا جاسکتا یا کان کو ۸ تا ۲۰ گز سے زیادہ گہرا کھودنا نہیں پڑتا تھا، کوئلہ کافی مل جاتا تھا۔ ڈڈلے نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ سنہ ۱۶۶۰ء میں بیس لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا اور پانچ ہزار ٹن کوئلے کا چورا ہر سال بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا تھا۔ جہاں کوئلہ اتنا ضایع

۱۸۸

ؔ۔ برنڈلے کی نہر ورسلے سے مانچسٹر تک تیار ہونے سے پہلے تک موسم سرما میں موخر الذکر شہر کو کوئلہ پہنچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ گھوڑے کی پیٹھ پر کوئلہ لاد کر لایا جاتا تھا۔

ہو رہا تھا لکڑی کمیاب ہوتی جارہی تھی۔ ایک حصہ لکڑی کا کوئلہ حاصل کرنے کے لیے دو حصے لکڑی کی اور ایک ٹن لوہے کو پگھلانے کے لیے دو حصے کوئلے کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوہے کے کارخانوں میں مزدوروں سے زیادہ تر لکڑی کاٹنے اور لکڑی کا کوئلہ تیار کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ کوٹ کے تین کارخانوں میں خاص کر کوئلہ تیار کرنے میں دو ہزار پانچ سو آدمی مصروف تھے سسکس میں جو لوہے کی تجارت کا مرکز تھا ایک سو سے زاید بھٹیاں اور ہتوڑے تھے اور سرے میں شیشہ سازی کے کئی کارخانے تھے جن میں سے بعض میں تین چار چھکڑے کوئلہ روزانہ جلایا جاتا تھا۔ بیشک اس کا بڑا خطرہ تھا کہ لوہے کے کارخانے ملک کے جنگلوں کا بالکل صفایا کردیں گے اس کے باوجود ایندھن اتنا مہنگا تھا کہ آئرستانی سلاخ کا کوئلہ فی ٹن ۵ پونڈ تا ۱۰ پونڈ کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ جنگل خالی ہوتے جارہے تھے اور پارلیمنٹ کو اس ڈر سے کہ جہاز بنانے والوں کے لیے لکڑی نہیں رہے گی مداخلت کرنی پڑی۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ جو کوئی درخت کاٹے وہ نیا درخت لگائے اور نئی بھٹیاں بنانے کو روک دیا گیا۔

جب آہنی بھٹی والوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں تو فطری طور سے انھوں نے بدل کے طور پر کوئلے کی جانب رخ کیا۔ سنہ ۱۶۱۲ء میں اسٹرٹی وانٹ کو لوہا پگھلانے کی غرض سے کوئلہ استعمال کرنے کا خاص پروانہ ملا لیکن یہ عمل کامیاب نہیں ہوا اس کے بعد ڈڈلے نے جو کوشش کی وہ زیادہ کامیاب رہی۔ خود اسی کے بیان کے مطابق سلاخ کا لوہا ۱۳ پونڈ فی ٹن کے حساب سے ایسا اچھا تیار کیا کہ اس سے شکاری بندوق بنائی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ کئی مشکلوں میں گھر گیا۔ اس کا پہلا کارخانہ طغیانی میں تباہ ہوگیا اور اس نے جب دوبارہ آنکھیں برج میں کارخانہ کھولا جس میں سات ٹن فی ہفتہ پیداوار تیار ہونے لگی تو لکڑی کا کوئلہ بنانے والے حاسدوں نے اس لیے اس پر حملہ کیا اور اس کے کارخانے کو تباہ کردیا کہ

۱۸۹

جب اجارے منسوخ ہو چکے تو اس کا پروانہ بھی کچھ نہ رہا۔ قانونی کارروائیوں کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ قرض کے سلسلے میں اس کو قید بھگتنی پڑی اور جب وہ قید سے چھوٹا تو اس کے نئے شریکوں نے اس کو دھوکا دیا۔ اس کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی اور چونکہ ڈڈلے رائلسٹ (بادشاہ کی طرفدار جماعت کا رکن) تھا، اس لیے پارلیمنٹ نے اس سے پروانہ چھین کر اپنے طرفداروں میں سے کسی کو دیدیا۔ مجموعی حیثیت سے وہ مثل دوسرے موجدوں کے کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں رہا۔ لیکن اس کو یہ اطمینان تھا کہ اگر وہ اپنے خاص طریقے کو استعمال نہ کر سکتا تھا تو دوسرے بھی اس طریقے کو اس سے چھین نہیں سکتے تھے۔ اس کو جنتی کامیابی ہوئی دوسروں کو اتنی بھی نصیب نہ ہو سکی، حالانکہ تجربے اس صدی کے ختم تک ہوتے رہے۔ ایک دقت یہ تھی کہ لوہے میں گندھک اور فاسفورس کی ملونی لوہے کو گرم یا سرد حالت میں بے لوچ بنا دیتی تھی۔ ڈڈلے نے کہا کہ وہ اس خرابی کو دور کر سکتا تھا۔ ناکامی کی ایک اور وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافی طاقت کی بھٹی استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ اس قسم کی بھٹی آبی قوت[1] کی مدد سے نہایت اچھی بنائی جا سکتی تھی، پھر بھی اس وقت تک عمدہ بھٹی استعمال میں نہیں آئی جب تک دخانی انجن کا بخوبی علم نہ ہو گیا۔ اس طرح ڈڈلے کی عارضی کامیابی کے باوجود ایندھن کی کمی کے سبب سے ابراہیم ڈاربی[2] باشندۂ کولبروک ڈیل اور روبک باشندۂ کیرن کے زمانے تک لوہے کی تجارت بودھی سی رہی۔

---

[1] ۱۷۶۰ء میں بمقام کیرن بھٹیاں پانی کی قوت سے چلائی جاتی تھیں اگرچہ پانی کو اوپر کھینچ لینے کے لیے دخانی انجن استعمال کیا جاتا تھا۔

[2] اس نام کے تین مشہور آہنی بھٹی والے تھے جن میں سے سب سے بڑا ۱۷۱۷ء میں فوت ہوا۔ اس نے لوہے کو ڈھالنے کے طریقوں میں اصلاح و ترقی کی اور سب سے اول کوک (پتھر کا کوئلہ) استعمال کیا۔ ۱۷۳۰ء میں اس کا بیٹا اور ہنام اس کے کارخانے کے انتظام میں اس کا جانشین بنا اور اپنے باپ کی اصلاح و ترقی کو مزید وسعت دی۔

اسٹرافورڈ نے آیرلینڈ میں سوتی کپڑے کا جو کارخانہ قایم کیا تھا وہ بھی اسی طرح گردش میں سے گزرا۔ اس کاروبار کی ابتدا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہوئی تھی۔ آیرلینڈ میں زندگی کے مصارف کم ہونے کی وجہ سے انگریزی کپڑے والوں میں یہ تحریک شروع ہوئی کہ قدیم عمل کے مطابق گاڑھا کپڑا (فریزلہ) جس کا رواج ملکی باشندوں میں پہلے سے تھا بنانے کے علاوہ اعلیٰ درجے کی پارچہ بافی شروع کی جائے۔ لیکن انگریز کپڑا بننے والے آیرشانی جلاہوں سے بہت جلتے تھے۔ چنانچہ آیرلینڈ میں پارچہ بافی موقوف کرادی گئی۔ کتان بافی کے بارے میں اس قسم کے اعتراضات نہیں تھے، اسی لیے کہ اس سے انگلستان کی کسی بڑی صنعت پر زد نہیں پڑتی تھی۔ اس صنعت کو قایم کرنے میں اسٹرافورڈ نے بہت دوراندیشی سے کام لیا۔ ایک زمانے تک یہ نئی صنعت بہت کامیاب رہی۔ چنانچہ اسٹرافورڈ نے لکھا کہ "میں نے لوکر کے ہاتھ سن کے کچھ بیج منگوائے تو معلوم ہوا کہ گزشتہ برسوں کا تجربہ اس ملک میں بہت کامیاب رہا۔ چنانچہ میری یہ آرزو ہے کہ ان علاقوں میں کتان کی تجارت قایم کردوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدا نے چاہا تو اس کی بدولت ملک کی دولت میں بے مثل زیادتی اور ترقیات ہونگی۔" وہ عورتوں سے سوت کاتنے کا کام لینا بہت مناسب سمجھتا تھا۔ اس نے ایک ہزار پونڈ قیمت کے سن کے بیج لوئے، چرخے قایم کیے، ہالینڈ سے مزدور بلائے اور اس کو یقین تھا کہ وہ فرانس یا ہالینڈ سے ۲ فیصد کم قیمت پر مال بیچ سکے گا۔ لیکن وقت سے پہلے کا یہ اندازہ غلط نکلا کیونکہ بغاوت عظیم نے اس کے کیے ہوئے کام کے بڑے حصے پر پانی پھیر دیا اور جب پھر امن کا زمانہ پلٹ آیا اور صنعت میں نئے سرے سے جان آئی تو یہ صنعت شمالی ہی میں رہی اور اسٹرافورڈ کی امید کے خلاف ملک بھر میں

۱۹۰

لہ یعنی فریز Frieze بنانے کے جو کہ ایک اصلی دیسی صنعت تھی۔

نہ پھیل سکی۔

آئرلینڈ کے علاوہ جس ملک نے کتان بافی میں سب سے زیادہ ترقی کی وہ اسکاٹ لینڈ تھا۔ یہاں اون کے بارے میں چارلس دوم کی پالیسی کی پیروی سنہ ۱۶۸۶ء کے ایک قانون میں کی گئی جس کی رو سے یہ قرار دیا گیا کہ سب مردوں کو کتان کا کفن دیا جائے۔ سن کی فراہمی کے لیے مختلف تدبیریں کی گئیں اور اس کے کاتنے اور کپڑا بننے کے بارے میں پورے ملک میں ہدایتیں جاری کی گئیں۔ اسکاٹ لینڈ کے اتحاد سے پہلے اور بعد انگلستان کے بنانے والوں میں کچھ لوگ اسکاٹ لینڈ کے کتان کو ایک خاص حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انگریزوں کی خواہش یہ تھی کہ اسکاٹ لینڈ والوں کو کتان کا تانا گا درآمد کرنے سے روکیں جس کو انگریز صناع خود تیار کر سکتے تھے۔ اس روک تھام کو اسکاٹ لینڈ میں ناپسند کیا گیا۔ کتان فطری طور سے سوتی پارچہ بافی کی جانب رہبری کرتا ہے۔ یہ رجحان اس زمانے میں اور بھی زیادہ پایا جاتا تھا، کیونکہ ان دونوں صنعتوں میں بہت قریبی تعلق تھا۔ سنہ ۱۶۴۱ء میں جب لوئی رابرٹ مانچسٹر اور بولٹن کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ یہاں قبرس یا سمرنا سے اون ملا ہوا سوت خریدا جاتا تھا جس سے گاڑھا کپڑا، شنگرفی کپڑا اور بوٹے دار کپڑا تیار کیا جاتا تھا تو ممکن ہے کہ اس بنا پر ہم یہ سمجھ لیں کہ سوتی صنعت ہی کا ذکر کیا گیا تھا۔ لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ سترھویں صدی کے "سوتی" کپڑے سب کے سب کتان اور سوت یا اون اور سوت کی ملاوٹ سے بنائے جاتے تھے، کیونکہ اس زمانے میں انگلستان میں سوت اتنا مضبوط نہیں کاتا جا سکتا تھا کہ اس کو تاگے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا اور اسی وجہ سے گاڑھا یا بوٹے دار کپڑا کتان کے تانے اور سوتی بانے سے بنایا جاتا تھا۔ اسی قسم کا کپڑا اسکاٹ لینڈ اور ڈیون شائر میں بنایا جاتا تھا جہاں اس کو اونی کپڑے کے نامناسب بدل کی حیثیت سے ناپسند کیا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگ کہتے تھے کہ "اے پلیٹو بنانے والو تم پر لعنت اور تباہی ہو کہ تم

191

اون کے بغیر کپڑا بناتے ہو"۔ یہ صنعت اگرچہ سوتی صنعت نہ تھی پھر بھی وہ اچھی خاصی پھیلی ہوئی تھی بڑے پیمانے پر چل رہی تھی۔ شہر مانچسٹر کی جانب سے جو محضر پیش ہوئے ان میں بیان کیا گیا ہے کہ اس شہر کی آبادی جو ۱۵۸۰ء میں دس ہزار تھی بڑھ کر ۱۶۳۵ء میں دگنی ہوگئی۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو آبادی کے اس اضافے کو بڑی حد تک نئی صنعت کی جانب منسوب کیا جا سکتا ہے۔ کیلیکو اور چھینٹ جیسے سوتی کپڑے مشرق سے آتے تھے اور ان کے خلاف اس وجہ سے غصے کا اظہار کیا جاتا تھا کہ وہ انگریزی ساخت کے اونی کپڑوں کو رواج سے مٹا رہے تھے۔ خود انگلستان کی بنی ہوئی چھینٹ کو ایسی بری نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ اس کے پہننے والوں پر بلوائیوں نے شورے کا تیزاب پھینکا۔ ملکہ این کے دور حکومت میں غیر ملکی چھینٹ پر بھاری محصول لگایا گیا اور ۱۷۲۰ء میں ان کی درآمد بالکل روک دی گئی۔ انگریزی صنعت کی تائید اور موافقت میں حکومت کا یہ دخل دینا تجارتی و تامینی جذبے کا پورا نمونہ تھا کیونکہ یہ قابل نفرت اشیا بھاری محصول لگائے جانے کے باوجود ان اونی اشیا کے مقابلے میں بہت زیادہ سستی تھیں جن کو انھوں نے رواج سے مٹا دیا تھا۔ لیکن انگریز پارچہ بافوں کا مفروضہ مفاد حکومت کی آمدنی اور انفرادی فائدے کے خیال پر غالب رہا۔

نمک کی تجارت کی سرگزشت اس بغض و حسد کی ایک اور مثال ہے جو پرامن پیشوں اور حرفتوں میں رونما ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ۱۶۷۰ء سے پہلے نمک انگلستان میں دو طریقوں سے بنایا جاتا تھا۔ پرانا طریقہ یہ تھا کہ سمندر کے پانی کو گرم کر کے تبخیری عمل کے ذریعے سے نمک بنایا جاتا تھا اور یہ طریقہ کئی ساحلی شہروں خاص کر شیلڈس، برسٹل اور ساؤتھمپٹن میں رائج تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ورسسٹر شائر اور چیشائر میں گڑھوں میں کھارا پانی جمع کر کے نمک بنایا جاتا تھا۔ لیکن دونوں طریقوں سے جو رسد جمع ہوتی تھی وہ

۱۹۲

جملہ طلب کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ فرانس سے نمک کی بڑی مقدار درآمد کرنی پڑتی تھی۔ انگریز نمک ساز مسابقت کا نام سن کر ڈرتے اور شکایت کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ فرانس کے بحری نمک میں "۱/۲ کوڑا، غلاظت، مری ہوئی مچھلیاں، جانوروں اور انسانوں کی سڑی ہوئی لاشیں شامل ہوتی نہیں"۔ اسکاٹ لینڈ کے نمک کے داخلے کے خلاف بھی وہ بڑبڑا رہے تھے۔ چنانچہ جس وقت کرامول نے اسکاچ نمک پر محصول معاف کیا تو انگریز نمک سازوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔ اگر اس قسم کے خیالات صرف بیرونی نمک بنانے والوں یعنی فرانس اور اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف ظاہر کیے جاتے تو ان کو حب وطن سے منسوب کیا جا سکتا تھا لیکن سنہ ۱۶۷۰ء میں ایک انکشاف نے رسد کا تازہ راستہ کھول دیا جو تمام انگریزی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ ایک شخص نارویچ کے قریب کوئلہ کھود رہا تھا، ایک دفعہ اس کی کدال ایک ایسی چیز پر لگی جو پھٹکری کی طرح سخت تھا اسے اچنبا ہوا پھر معلوم ہوا کہ وہ پہاڑی نمک تھا۔ جب گڑھا کھودا گیا تو نمک کی تہ ۲۵ فٹ موٹی پائی گئی۔ اتنی رسد باہر سے نمک درآمد کرنے کی زحمت سے بچا سکتی تھی اور نمک خو وطن کے شیدائیوں یعنی سمندر کے پانی اور گڑھوں سے نمک بنانے والوں کو جو غیر ملکی نمک کی درآمد کی مخالفت اور انگریزی صنعت کی تائید میں سب سے زیادہ غل مچاتے تھے، خوشی منانے کا اچھا موقع تھا اگر وہ اپنے اصول پر جمے رہتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اصول کا کوئی خیال نہیں رکھا اور حب وطن پر ذاتی نفع کمانے کا دھیان چھا گیا یہ ڈر تھا کہ فرانسیسی یا اسکاچ نمک کے مقابلے میں پہاڑی نمک زیادہ خطرناک رقیب بن جائے۔ اس لیے انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ "چیشائر کے پہاڑی نمک میں اتنی خرابیاں تھیں کہ حقیقت میں فطرت ہی کا مقصد اس کے استعمال نہ کیے جانے کا تھا"۔ انھوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ پہاڑی نمک کی کھدائی گڑھوں کے نمک کی رسد کو گھٹا دے گی، نیز یہ کہ پہاڑی نمک

۱۹۳

ہر جگہ تیار کیا جا سکتا تھا اور اس طرح محکمۂ جنگی کو دھوکا دیا جا سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے پارلیمنٹ سے درخواست کی کہ نئی صنعت پر بھاری محصول لگایا جائے کیونکہ وہ ان کے بنائے ہوئے نمک پر فوقیت رکھتی تھی۔ یہ تامین کی بدترین صورت کی ایک مثال ہے۔ جن دھندوں کی بنیاد اس مفروضے پر ہوتی ہے کہ بیرونی مسابقت سے ان کی تامین کرنی چاہیے وہ نتیجے میں اتنی مقدس اور اتنی اہم سمجھی جانے لگتی ہیں کہ ہر تبدیلی یا ہر ندرت کے مقابلے کے لیے جس سے ان کی دانست میں ضرر یا نقصان پہنچنے کا امکان ہوتا ہے تامین ضروری سمجھ لی جاتی ہے۔ ملک کے استحکام اور تجارت کے ابتدائی تصور کو پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اور اصلاح و ترقی کے ہر قدم کو معاندانہ سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی صنعتیں اغیار کے خلاف متحدہ محاذ قایم کرنے کی بجائے آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگتی ہیں۔ چونکہ ان کو رقیبوں پر نظر رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے اس لیے وہ وطن کے رقیبوں کو غیر ملکی رقیبوں سے زیادہ خطرناک پاتے ہیں۔ غرض جب اس قسم کے خیالات و احساسات عام ہو گئے تو تجاریت کو زوال آیا۔ کوئی فہم کے قابل اور معقول قومی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے ہر ایک قایم کی ہوئی صنعت کی تامین کے لیے کشمکش کا رجحان پیدا ہو گیا جو جملہ صنعتی ترقی کا دشمن ثابت ہوا۔

باب ۱۳

بنک کاری کی ترقی

کسی جدید بنک مثلاً بنک آف انگلینڈ کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک کام نہیں بلکہ کئی کام انجام دیتا ہے۔ مثلاً وہ گاہکوں سے انکی رقم لے کر جمع کرتا ہے اور انھیں اجازت دیتا ہے کہ اسے من مانے ڈھب سے جب چاہیں اور جس قدر چاہیں واپس لے لیں۔ وہ ہنڈیوں کی ضمانت پر زر قرض دیتا ہے، ان پر بٹہ کاٹتا ہے اور اس طرح اپنے دیے ہوئے قرضوں پر سود وصول کرتا ہے وہ نوٹ جاری کرتا ہے جو قانونی زر ہوتے ہیں اور زر ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھیجتا ہے۔ غرض بنک کے کاموں میں سے یہی چند کام ہیں۔ لیکن اگر ہم بنک کاری کی تاریخ سے خواہ انگلستان کی حد تک یا اس سے آگے بڑھ کر پورے یورپ کی حد تک اپنا تعلق رکھیں تو یہ واضح ہوگا کہ کسی جگہ بھی بنک کا آغاز اس طرح نہیں ہوا کہ وہ ابتدا ہی سے سب کام کرنے لگا ہو۔ انھوں نے پہلے کس کام کو شروع کیا؟ قرضوں کا لین دین کیا یا امانتیں جمع کیں یا نوٹ جاری کیے یا زر کی ترسیل کی؟ یا

۱۹۴

یہ کہ انھوں نے ان کاموں میں سے کسی کو بھی انجام نہیں دیا اور ان کے قیام کا مقصد کچھ اور ہی تھا جواب پس پشت جا پڑا ہے؟ اس سوال کا جواب محض "ہاں" یا "نہیں" نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بنکوں کی ابتدا مختلف مقاموں پر مختلف طریقوں سے ہوئی۔ بنک کاری کی تاریخ ہر ملک کی بنک کاری کے نظام کی تاریخ اور بعض صورتوں میں انفرادی بنکوں کی سرگزشت بھی ہونی چاہیے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ایک بنک نے دوسرے کی پیروی کی اور اس سے سبق سیکھا اور اس طرح سب بنک ایک سطح یا مشترکہ معیار پر پہنچ گئے۔ لیکن ان کے ابتدائی حالات عام طور پر ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں۔

جدید بنک جو اہم فرائض ادا کرتے ہیں ان پر ذرا سا غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان میں سے کس فرض کے متعلق اس کا زیادہ امکان ہے کہ اس کا آغاز سب سے پہلے ہوا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے زمانے کے حالات پر نظر ڈالتے وقت ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اس زمانے میں عوام کو بنکوں پر ویسا ہی بھروسا رہا ہوگا جیسا اب ہے۔ لیکن کسی ملک میں بنک کاری کی کسی شکل کے وجود میں آنے کے لیے تحفظ کا کچھ یقین ضروری تھا۔ تاوقتیکہ زر کا نظام کسی بڑی حد تک سیدھے سادھے فطری نظام معیشت کی جگہ نہ لے لے، کچھ دولت جمع نہ ہو جائے، شغل اصل کے مواقع پیدا نہ ہوں، تجارت خارجہ اور رسل و رسایل کا سلسلہ قایم نہ ہو، بنکوں کا وجود ہی ممکن نہیں، کیونکہ ان چیزوں کے بغیر اس کے لیے کوئی کام نہیں رہتا۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی قوم ترقی کی اس حالت پر پہنچ چکی ہے، زر کے استعمال کی خوگر ہو گئی ہے، کچھ تجارت میں بھی حصہ لیتی ہے اور دولت پس انداز کرنے لگی ہے تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رقموں کی امانت داری، نوٹوں کے اجراء، زر کی ترسیل یا قرضوں کے لین دین وغیرہ کاموں میں سے کون سے کام ہیں کم سے کم بھروسے کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

جب تک یہ کام یا اسی قسم کا دوسرا کام کم سے کم سطح تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک بنکوں کا آغاز ہی ممکن نہیں۔

امانتیں حاصل کرنا اور بنکوں کے مطالبے کے وقت رقعے جاری کرنا ایسے کام ہیں جن میں عوام کی جانب سے بھروسے کے اظہار کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن جیسا کہ بیجہٹ نے بتلایا ہے "یہ دونوں کام ایک ہی نوعیت کے نہیں ہیں۔ کوئی بنک کچھ خانگی امانتیں اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ لوگوں کی بڑی تعداد امانتیں رکھانے کا پکا ارادہ کرلے۔ ظاہر ہے کہ ایک وقت میں کئی لوگ کسی بنک یا ساہوکار پر بھروسا کرنے کے لیے اسی وقت آمادہ ہوں گے جب کہ فایدہ یقینی اور واضح ہو۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص پہلے تجربہ کرے۔ اگر تجربہ کامیاب ہوا تو کیا کہنا اس کے بعد وہ خود بھی ایسا ہی کرنے کے متعلق غور کرے گا۔ لیکن نوٹوں کا آغاز کرنے کے لیے بنک کار کو قدم بڑھانا چاہیے نہ کہ عوام کو۔ "نوٹوں کو گردش میں لانے کے لیے اشخاص کی بڑی تعداد کو کوئی خاص عمل کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں بنکر کے جاری کردہ نوٹ معمولی کاروبار کے دوران میں وصول ہوتے ہیں اور صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ ان نوٹوں کو بنک میں سکہ حاصل کرنے کی غرض سے نہ پیش کریں۔ اگر عوام اس سے باز رہیں تو کاغذی زر فوراً رواج پا جاتا ہے[1]۔" واقعہ یہ ہے کہ نوٹوں کا جاری ہونا بنکر کے اعتبار کو شہرت دیتا ہے اور جب بھروسا ہو جاتا ہے تو امانتیں آنے لگتی ہیں۔ جوں جوں بنک کاری پھیلتی اور مقبول ہوتی جاتی ہے نوٹوں کی نقد پذیری کی ذمہ داری امانتوں کے مقابلے میں کم ہوتی جاتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں ابتدا میں نوٹوں کے اجرا سے زیادہ نفع ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب ان کی اہمیت امانتوں کے مقابلے میں گھٹتی جا رہی ہے۔ ۱۸۳۰ء تک انگلستان میں نوٹوں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور امانتیں

[1] دیکھو بیجہٹ کی کتاب "لمبارڈ اسٹریٹ" صفحہ ۸۸۔

ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اب صورت حال پلٹ گئی ہے۔ لیکن ان ملکوں میں جہاں بنک کاری مقابلتہً پست حالت میں ہے نوٹوں کی واجب الادا رقمیں امانتوں کی واجب الادا رقموں سے بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کاغذی زر کا اجرا رفتہ رفتہ امانتوں کی مقداروں میں اضافے کا باعث ہو۔ اس طریقے سے جو بنک قایم ہوتے ہیں ان کا ذکر مناسب ہوتا۔ لیکن اس طریقے سے جداگانہ طریقے پر بھی بنک قایم ہوتے ہیں۔

چنانچہ جینوا کا بنک آف سینٹ جارج اور دوسرے اطالوی بنک جو بنک آف سینٹ جارج کی پیروی کرتے تھے نیز بنک آف امسٹرڈم بالکل مختلف مقصدوں کے تحت قایم کیے گئے۔ سہولت کی خاطر ہم پہلے بنک آف امسٹرڈم سے بحث کریں گے اگرچہ اس بحث میں تاریخ وار ترتیب پوری باقی نہیں رہے گی، کیونکہ اطالوی بنک سب سے قدیم ہیں اور اس سے پہلے دوسری قوموں نے اطالوی بنکوں کی پیروی شروع کی سینکڑوں برس تک یہ بنک کامیابی سے کاروبار کرتے رہے۔ لیکن بنک آف امسٹرڈم کا حال سود کے مسئلے کو چھیڑے بغیر بیان کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ سود اور ربا کے مسئلے کی نسبت خیالات میں جو تبدیلی ہوئی اس کا ذکر ابتدائی اطالوی بنکوں کے کاروبار اور انگلستان کے زرگروں کی نجی بنک کاری کی ترقی کا باہمی تعلق واضح کرنے کے سلسلے میں کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۶

جب ہالینڈ نے تجارتی ملک کی حیثیت سے اہمیت حاصل کی تو اس کو اور دوسری چند چھوٹی ریاستوں کو جن کی خارجی تجارت بڑھی ہوئی تھی ایک ایسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا جس سے بڑی بڑی حکومتیں کم و بیش بچی ہوئی تھیں۔ ہالینڈ کا زر خود ولندیزی زر پر پورا مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں ان ممالک کے زر بھی شامل تھے جن سے وہ تجارت کیا کرتا تھا۔ بہرطور اس صورت حال سے بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ لیکن جب یہ بیرونی زر کترا ہوا یا وزن میں ہلکا یا بعض صورتوں میں کھوٹا ہوتا تھا تو صورت حال بہت زیادہ پیچیدہ ہو جاتی تھی۔ اگر اس قسم کے مختلف سکے بیرونی ہنڈی

ادا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تو ان کی غیر یقینی قدر، مبادلے کو بڑی حد تک ملک کے خلاف بنا سکتی تھی[1]۔ اس کے علاوہ چونکہ قانون گرشیم کے بموجب خراب زر نے اچھے زر کو رواج سے ہٹا دیا تھا اور اچھے زر کو یا تو اندوختہ کیا گیا یا گلا دیا گیا یا برآمد کیا گیا، اس لیے زر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور مبادلہ زیادہ سے زیادہ ناموافق ہو گیا چنانچہ اسی خرابی کو دور کرنے کی غرض سے بنک آف امسٹرڈم کھولا گیا[2]۔ اس بنک نے مزید خرابی کو اس طرح دور کیا کہ ہر قسم کے زر کو اس کی حقیقی قدر (جیسی کہ عمدہ مسکوک زر کی ہو سکتی تھی) کے لحاظ سے قبول کرنے لگا اور اس کے عوض حامل زر کو "بنک کے زر" کی شکل میں اعتبار مہیا کیا جاتا تھا۔ چونکہ قانون کے لحاظ سے ایک مقررہ مالیت سے زیادہ کی منڈیوں کو بنک کے زر کی شکل میں ادا کرنا ضروری تھا اس لیے ہر تاجر کو بنک کا کھاتہ دار بننا پڑا اور چونکہ بنک کے زر کی قدر یکساں اور سب کو معلوم تھی اور اس زر کی ہمیشہ مانگ رہتی تھی، اس لیے ناموافق شرح مبادلہ غائب ہو گئی۔ گو بنک ان لوگوں کو جو اپنا بنک کا زر واپس لینا چاہتے تھے سکہ نہیں دیتا تھا، پھر بھی چونکہ وہ دھات بطور امانت لیا کرتا تھا اور اس کی رسید دیا کرتا تھا، اس لیے جس کے پاس بنک کا زر ہوتا تھا اور جو دھات لینا چاہتا تھا ان رسیدوں میں سے ایک رسید پیش کرنے پر بنک اس کو اس شرط پر فلزہ ادا کرتا تھا کہ رسید کا حامل بنک میں اسی قدر بنک کا زر ادا کرے جو پہلے اس کے پیش کردہ دھات کے معاوضے میں ادا کیا گیا تھا۔ اس طرح بنک آف امسٹرڈم

۱۹۷

[1] - خراب زر ہمیشہ یہی نتیجہ پیدا کرتا ہے چنانچہ ولیم سوم کے دور حکومت میں پرانے سکوں کی واپسی اور نئے سکوں کے اجرا سے قبل شرح مبادلہ انگلستان کے اس قدر مخالف تھی کہ انگریزوں کو ہر ۱۰۰ پونڈ پر جو امسٹرڈم کے توسط سے روانہ کیے جاتے تھے ۱۳۰ تا ۱۴۰ پونڈ ادا کرنے پڑ رہے تھے۔

[2] - سنہ ۱۶۰۹ء میں۔

معمولی بنک کاری کے کئی فرائض ادا کرنے لگا۔ وہ زر کی ترسیل کرتا تھا اور بالواسطہ طریقے پر امانتیں حاصل کرتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد زر کی اصلاح و ترقی تھا۔

اب اس بحث کو ختم کرکے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے تین صدی پیشتر کے زمانے پر نظر دوڑانا اور اطالوی بنکوں کی سرگزشت شروع کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ زر ان بنکوں کی نظر میں ایک مقصد تھا لیکن اصل مقصد نہیں تھا۔ جینوا کا بنک آف سینٹ جارج اور دوسرے بنک جو اس کی پیروی میں قایم ہوئے تھے در اصل اعتباری کمپنیاں تھیں جو حکومت کے لیے رقمیں اکھٹی کرتی تھیں۔ ان بنکوں کا تعلق ابتدا میں افراد سے قطعاً نہیں تھا۔ وہ ریاستوں کو قرضے دیتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کا دائرہ عمل وسیع ہوتا گیا اور ان کی ہنڈیاں اور اعتباری رقعے ایک ملک سے دوسرے ملک کو ترسیل زر کے سلسلے میں استعمال کیے جانے لگے۔ جینوا، لکا، سینا، اور فلورنس سے آئے ہوئے اطالوی تاجروں میں سب سے زیادہ شہرت پیروزی اور بارڈی کی اعتباری کوٹھیوں کو حاصل ہوئی اور یہی وہ لوگ تھے جو لنڈن کی اس سڑک کو جہاں بنک واقع ہیں "لمبارڈ اسٹریٹ" کہے جانے کا سبب بنے۔ یہ تاجر نہ صرف اون کی خریداری کے ساتھ پاپائی محاصل وصول کرتے اور ان محاصل کی آمدنی کو ہنڈیوں کے ذریعے سے بھیجا کرتے تھے۔ بلکہ ان سے ہنری سوم، اڈورڈ اول اور اڈورڈ سوم قرضے بھی حاصل کرتے تھے تاکہ اپنی جنگوں کے لیے رقم اکھٹی کریں۔ اڈورڈ سوم نے قرضے کی ادائی میں دیر کرکے کئی اطالوی اعتباری کوٹھیوں کو جن میں بارڈی کی کوٹھی بھی شامل تھی، تباہ کردیا جس کی وجہ سے فلورنس کے مالی حلقوں میں خوف و ہراس پیدا ہوگیا۔ بادشاہوں کو محاصل یا کروڑگیری کی کفالت پر قرضے دیے جاتے تھے۔ چنانچہ محصول وصول کرنے کا کام یا محاصل کی متاجری عام طور پر ان ہی اطالویوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو ایک حیثیت سے تاجر اور دوسری حیثیت سے ساہوکار تھے لیکن اس جماعت نے محض بادشاہوں سے

۱۹۸

لین دین کرنے کی حد تک اپنے کاروبار کو محدود نہیں رکھا بلکہ وہ خانقاہوں، سفیروں اور بعض اوقات بادشاہ کی رعایا کو بھی قرضے دیا کرتی تھی۔ اس حد تک ان کا کاروبار بہت پُرخطر تھا۔ گو انھوں نے بے شبہ انگلستان میں کاروبار کے لیے ایسی سہولتیں بہم پہنچائیں جو ان کے بغیر شاید ناممکن ہوتیں، تاہم جوں ہی اس کا علم ہوا کہ ان کا تعلق سود کے لین دین سے تھا ان کی طرف سے انتہائی بدظنی پیدا ہو گئی۔

قرضوں کے لین دین اور سود خواری کے مذموم ہونے کے بارے میں جو خیالات تھے ان کو انگلستان میں بنک کاری کی ترقی کی بحث سے پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ خاص کر اس لیے بھی ضروری ہے کہ سود خواری کے بارے میں جو اخلاقی اعتراض ہے اگر وہ ذہن نشین نہ ہو تو فطری طور پر یہ سمجھا جائے گا کہ بنک کاری کا آغاز قرض کے لین دین سے ہوا جس میں بظاہر عوام کی جانب سے بھروسے کی کچھ ایسی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بنک کاری قرض کے لین دین سے شروع نہیں ہوئی۔ چنانچہ نفع کی خاطر قرضہ دینا قانوناً ممنوع تھا یا یہ عمل قانون کے خلاف نہ بھی رہا تو اس کو اخلاق کے لحاظ سے برا ضرور سمجھا جاتا تھا۔ سود خواری کی ممانعت مسیحی تعلیمات کا جز تھی جو انجیل کے اس حکم پر مبنی تھی کہ "قرضہ دو مگر اس کی واپسی کی امید نہ رکھو"۔ کونسل آف نیسیا کے وقت سے اہل کلیسا کو سود خواری کی ممانعت تھی اور سود خواری کی صورت میں ان کا درجہ کم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن نویں صدی میں اس ممانعت کو عوام سے بھی متعلق کر دیا گیا۔ اس کے برعکس چونکہ رومن قانون دیوانی سود خواری کی اجازت دیتا تھا، اس لیے جیسے جیسے عوام میں اس قانون کا مطالعہ بڑھتا گیا قرض دینے کی طرف رجحان زیادہ ہوتا گیا حالانکہ کلیسا نے اس کو رد کرنے کی بہتیری کوشش کی۔ کھلے بندوں سود خواروں کو نہ تو عشائے ربانی میں شریک کیا جاتا تھا اور نہ عیسائی طریقے پر وہ دفن ہو سکتے تھے[1]۔ سنہ ۱۲۷۴ء میں

---

[1] چنانچہ سنہ ۱۱۷۹ء میں ایسا ہی ہوا۔

۱۹۹ گریگری دہم نے یہ حکم صادر کیا کہ رعایا میں سے کوئی شخص سود خواروں کو مکان کرائے پر نہ دے اور نہ ان کو اپنے گھروں میں پناہ دے سود خواروں کی مزید ذلت کے لیے یہ حکم بھی صادر کیا گیا کہ سود خواروں کے وصیت نامے باطل سمجھے جائیں گے۔ چونکہ کلیسائی عدالتیں وصیت ناموں کا انتظام کرتی تھیں اس لیے سود خواری اچھی طرح ان کے اقتدار میں آگئی سود خواری چونکہ مذموم تھی اس لیے قرض دہندگی کا اجارہ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، غیر عیسائیوں یعنی یہودیوں کے ہاتھ میں چلا گیا[۱] عیسائیوں کے خیالات سے یہودی متاثر نہیں ہوئے۔ اگر عیسائی عدالتوں نے قرضے کی واپسی کے بارے میں یہودیوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں، تاہم یہودیوں کو انگلستان میں بادشاہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی اور یہ بات بادشاہ کے مفاد کے خلاف تھی کہ وہ انھیں لٹتا یا دھوکا کھاتا ہوا دیکھے لیکن ۱۲۹۰ء میں اڈورڈ اول کلیسائی خیالات سے نیز ان احساسات سے جو اس کی رعایا یہودیوں کے خلاف رکھتی تھی، بہت متاثر ہوا اور اس نے خود بھی سکہ سازی کی اصلاح کے بارے میں تجویزیں پیش کی تھیں جن کی راہ میں یہودیوں نے رکاوٹیں پیدا کی تھیں اس لیے اس نے بگڑ کر ان کو ملک سے نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد سے سود کے طور پر زر کا لین دین جو کچھ بھی ہوا ہوگا اس میں حصہ لینے والے عیسائی ہوسکتے تھے۔

اول اول ہم اس خیال کی جانب مائل ہو جاتے ہیں کہ اگر عیسائیوں نے ایسا کیا بھی تو انھوں نے اس زمانے کے خیالات کے متعلق غلطی کی لیکن یہ کہنا کسی قدر مبالغہ ہوگا۔ اس خیال کے بارے میں کوئی شک اور شبہ نہ تھا کہ سود خواری بری شئے تھی۔ اس لیے کہ وہ انجیل مقدس کی تعلیم کے خلاف تھی۔ اگر کوئی شخص قرض دے اور اس کو کوئی نقصان نہ ہو، اگر اس رقم کو قرض پر نہ دینے کی صورت میں اس کو کچھ نفع نہ ہوسکتا ہو، اگر اس کو قرضہ

[۱] دیکھو صفحہ ۶۹۔

معاہدے کے موافق واپس مل جائے تو ان حالتوں میں سود خواری گویا دوسرے کی ضرورتوں سے ناجائز فایدہ اُٹھانا ہے۔ جس زمانے میں یہ حالات صادق آتے تھے صرف اس وقت تک کے لیے یہ کہنا نہایت درست تھا۔ جب شغل اصل کا میدان موجود ہو یا یہ بتایا جا سکتا ہو کہ قرض دینے والے کو حقیقی نقصان اٹھانا پڑا اس وقت اس کی محنت یا خدمت کا صلہ نہ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ظاہر ہے کہ تیرھویں صدی سے شغل اصل کے ایسے میدان کار آہستہ تدریج سے کھل رہا تھا۔ تاجر پُرخطر کاروبار میں حصہ لے کر منافع حاصل کر رہے تھے اور اگر وہ زر بطور قرض لے کر بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تو ظاہر ہے کہ وہ اور زیادہ نفع کماتے تھے۔ اس طرح جب ایک مرتبہ یہ طریقہ پڑ گیا کہ زر کا معاوضہ ملنے لگا تو قرض دینے والا معقولیت کے ساتھ یہ کہہ سکتا تھا کہ قرضہ دینے سے اس کا نقصان ہوا یا کم از کم اگر اس کو فوراً رقم واپس نہیں کی گئی تو نقصان کا امکان ہو گا۔ اسی وجہ سے اسبات کو واجبی تسلیم کر لیا گیا کہ اگر قرضہ ادا کرنے کے بارے میں قرضدار وقت کی پابندی نہ کرے تو اس پر جرمانہ[1] یا جرمانہ کیا جائے۔ اس کو صرف اس صورت میں حق بجانب قرار دیا جا سکتا تھا کہ حقیقی نقصان اس کی خطا کی بنا پر ہوا ہو یا یہ کہ جس منافعے کا ملنا ضروری تھا وہ وصول نہیں ہو سکا۔ اور اگر ادائی میں بہت دیر ہو تو یہ بات نہایت مناسب تھی کہ جرمانے کی مقدار میں اضافہ ہو۔ اس قسم کے معاہدوں کو سود خواری میں داخل کر کے مذموم نہیں قرار دیا جاتا تھا[2] بشرطیکہ: (۱) قرضے کی نوعیت پہلے قرض حسنہ کی رہی ہو اور (۲) جو نقصان اُٹھایا گیا وہ حقیقی ہو نہ کہ فرضی۔ پہلے پہل اس کا ثبوت دینا پڑتا تھا لیکن بعد میں تاجروں اور ان لوگوں کی حد تک جو عام طور پر تجارتی کاروبار کیا کرتے تھے کسی ثبوت

[1] (Poena Conventionalis)

[2] چودھویں صدی کے خیالات اس بات کے مخالف تھے کہ نفع حاصل نہ کیے جانے کی صورت میں کوئی معاوضہ ادا کیا جائے۔ لیکن صرف اس بنیاد پر معاوضہ دیا جا سکتا تھا کہ منافع مشتبہ ہو۔ پندرھویں صدی تک اس کو عام طور سے حق بجانب سمجھا جانے لگا۔

کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ نقصان ہوا۔ اسی قسم کے جرمانوں سے "سود" کی ابتدا ہوئی۔ یہ لفظ دو حالتوں کے درمیانی فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تو وہ جس میں کہ قرض دینے والے کو اس کا زر پابندی کے ساتھ واپس مل جائے اور دوسری وہ جب کہ اس کی واپسی میں تاخیر ہو۔

۲۰۱

لیکن سود خواری کی ممانعت سے یہ انکار یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ کوئی شخص کسی جاگیر یا مقطعے میں کھیت پٹے پر لے سکتا تھا جس کے معاوضے میں نقد رقم اس کو پیشگی ادا کرنی پڑتی تھی[۱]۔ اس قسم کے معاہدوں کو سود خواری میں داخل نہیں کیا جاتا تھا اگر اس کا تعلق ایسی جائداد سے ہو جس سے حقیقت میں کوئی آمدنی وصول ہو سکتی ہو۔ چونکہ اس اصول کو وسیع کر دیا گیا اور زمین کے علاوہ دوکانیں، مکان اور تجارتی حقوق بھی شامل کر لیے گئے اس لیے کسی تاجر کے لیے زر بطور قرض حاصل کرنا دشوار نہ تھا۔ اس کے علاوہ شراکت قانوناً جائز تھی، خواہ ایک شریک زر مہیا کرتا اور دوسرا کام کرتا لیکن شرط یہ تھی کہ دونوں جوکھوں اٹھائیں اور جب کوئی منافع وصول نہ ہوتا تھا تو زر کے استعمال کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ جہازوں کی کفالت پر بھی قرضے دیے جاتے تھے جو بحری بیمے کی سب سے قدیم شکل تھی اور یہ بھی زر کے لین دین کی ایک صورت تھی۔ اس قسم کے قرضے دراصل جہازوں یا مال کی ضمانت پر دیے جاتے تھے جس کے معاوضے میں

۱۔ عام طور سے نقد رقم پیشگی ادا کرنی پڑتی تھی، لیکن بعض صورتوں میں کھیت کے پٹے کے لیے جنس بھی ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ پن نور میں مکان، بیرونی بیوتات اور کھیت کی منتقلی جان لیون کی جانب سے جان ہون ووڈ کے پاس اس شرط سے عمل میں آئی کہ متذکرۂ صدر ہون ووڈ مذکورہ بالا جان لیون کے لیے ہر دوسرے سال ایک نیا ادنیٰ لباس، بوٹ شوز کی ایک نئی جوڑ اور ایک جوڑ بٹے ہوئے سوت کی چادریں جان لیون کی زندگی بھر مہیا کرتا رہے گا اور ایسی صورت میں جب کہ جان لیون اپنی بیوی جون کی وفات کے بعد زندہ رہے ہون ووڈ جان لیون کے لیے اس کی زندگی بھر روٹی دے گا اور اس کے شایان شان ایک خوابگاہ مہیا کرے گا۔ دیکھو Harrow Manor Court Rolls, 7 Richard II, 1384.

بحری سفر کے ختم پر منافعہ یا سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ ابتدا میں جہاز کے
مالک ان قرضوں کو باہر کی بندرگاہوں میں بڑے وقت استعمال کرتے
تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ تجارتی شغل اصل کی مقبول عام شکل بن گئے۔ چونکہ
اصل اور سود صرف اس وقت واپس کرنا پڑتا تھا جب کہ جہاز بندرگاہ
کو بحفاظت پہنچ جائے۔ لہذا ایسے قرضوں کو سود خواری کے تحت شمار نہیں
کیا جاتا تھا، کیونکہ قرض دینے والے کے لیے یہ خطرہ تھا کہ جہاز ڈوب جائیگا
اور ایسی صورت میں اصل اور سود دونوں غائب ہو جاتے تھے۔ اس طرح
ان تمام معاہدوں میں یہ واقعہ کہ قرض دینے والے کو جوکھم برداشت
کرنا پڑتا تھا اس کو سود خواری کے الزام سے بری کرنے کے لیے کافی تھا۔
ممکن ہے کہ یہ امور بظاہر غیر اہم معلوم ہوں کیونکہ انکا تعلق وقیانوسی
تجارتی کارروائیوں سے تھا۔ اس لیے بظاہر انگریزی بنک کاری کی
سرگزشت سے ان کا کوئی قریبی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن حقیقت میں
ایسا نہیں ہے۔ ان امور سے پہلے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ربا اور غیر ربا کے
درمیان نیز زر کو منافعے کی امید میں قرض دینے اور سود کے یقینی طور سے
وصول ہونے کے درمیان ایک واضح امتیازی خط کھینچا گیا تھا۔ دوسرے
یہ کہ تمام بہاد سود خواری کی ممانعت نے شغل اصل کی راہ میں کوئی سخت رکاوٹ
نہیں پیدا کی، کیونکہ زر کو سود خواری کے بغیر مصروف کرنے کے کئی
طریقے تھے۔ اور تیسرے یہ کہ بنک آجکل جس طریقے پر زر کا لین دین کرتے
ہیں یعنی سود کا پہلے ہی سے تعین کر لیتے ہیں خواہ منافعہ وصول ہو یا نہ ہو وہ
ظاہر ہے کہ دور وسطی کے خیالات کے متعلق سود خواری کے ذیل میں آتا
تھا۔ اس لیے بنکوں کو اس قسم کا کاروبار کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔
چونکہ سود خواری کی برائی کرنا زیادہ تر مذہبی علما کا کام تھا، ۲۰۲
اس لیے فطری طور سے اس پر مذہبی اصلاح (Reformation) کا اثر
پڑا۔ کیتھولکی عقیدہ ایک زمانے تک بہت زیادہ سخت رہا اور سود کی روک تھام
کے لیے اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ دوسری طرف مصلحین کا رجحان

کسی قدر زیادہ آزادی کی موافقت میں تھا۔ اگرچہ کیلون ایسی سود خواری کو ناپسند کرتا تھا جو انسان کی ضرورتوں سے ناجائز فایدہ اُٹھاتی تھی، پھر بھی وہ سود کو بالکل مذموم قرار دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ہنری ہشتم کے خیالات نے حالات کے بارے میں زیادہ عملی تھے۔ چنانچہ اُس کے منظور کردہ قانون بابتہ سنہ ۱۵۴۵ء میں دس فی صد سود کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن لین دین کی نوعیت میں فرق اور امتیاز کرنے کی کوشش چھوڑ دی گئی تھی۔ البتہ ظلم اور جور کو روکنے کی دوڑ دھوپ کی گئی تھی۔ یہ قانون سنہ ۱۵۵۲ء میں منسوخ کیا گیا، لیکن سنہ ۱۵۷۱ء میں دوبارہ نافذ کیا گیا۔ اگرچہ انگریز کسی طرح نئے اصول کی موافقت میں ہی نہیں تھے، پھر بھی اگلی ممانعتوں اور بندشوں کو پھر کبھی نافذ نہیں کیا گیا۔ سترھویں صدی تک کیتھولکی دینی علما نے بھی قرض کے طور پر دیے ہوئے زر پر سود لینے کے جواز کو عملاً تسلیم کر لیا تھا، یہاں تک کہ اس صورت میں بھی جب کہ قرضہ دینے والے نے خطرہ برداشت کرنے میں حصہ نہ لیا ہو۔ جدید حالات نے قدیم حالات کی کایا پلٹ دی اور نئے نئے خیالات پیدا کر دیے تھے۔ اور اب زر کے ایسے لین دین کی راہ میں جیسے کہ بنک آج کل انجام دیتے ہیں جذبات یا قانونی رکاوٹیں باقی نہیں رہی تھیں۔

قانون کی اِنہی صورتِ حال سے فایدہ اُٹھانے والے سب سے آگے سنار تھے۔ چونکہ ان کا اپنا قیمتی مال ہوتا تھا جس کی وہ حفاظت کرتے تھے، لہٰذا لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ان کی حفاظت میں چھوڑا جائے گا وہ محفوظ رہے گا۔ چنانچہ سناروں کے پاس زر یا دھات امانت کے طور پر رکھنے کا طریقہ عام ہو گیا تھا اور خاص کر سنہ ۱۶۴۰ء کے بعد اس کا رواج اور بھی بڑھ گیا جب کہ چارلس اول نے تہی دستی سے تنگ آ کر ٹاور آف لندن میں خانگی تاجروں کا جو کچھ اثاثہ رقم کی شکل میں حفاظت کے خیال سے رکھا گیا تھا اسے چھین لیا۔ یہ رقم بعد میں یقیناً ادا کر دی گئی، لیکن جمع کرنے والے بادشاہ پر بھروسہ کرنے میں ہچکچانے لگے اور سناروں کو زیادہ بھروسے کے قابل سمجھنے لگے، کیونکہ سناروں کے متعلق اُس کا کم فریضہ تھا کہ سیاسی ضرورتوں کی

بنا پر ان میں یہ زر خرچ کرنے کی ترغیب ہوگی۔ جب اس طرح سناروں کو امانتیں وصول ہونے لگیں تو وہ فطری طور سے اس زر کو بطور قرض سود پر دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ کرامول نے محاصل کی ضمانت پر ان سے قرضہ حاصل کیا اور محصول وصول ہو جانے کے بعد اسے ادا کر دیا۔ چارلس دوم نے بھی اسی طریقے پر عمل کیا اور سناروں سے حاصل کردہ قرضے پر ۸ فی صد سود ادا کیا۔ چونکہ سنار خود جمع کرنے والوں کو ۶ فی صد سود ادا کرتے تھے اس لیے زیادہ نفع تو نہ ملتا تھا لیکن منتقل ضرور تھا۔ ۱۶۷۲ء میں اس نظام کو سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ نے جو اس وقت سناروں کا بمقدار ۱۳۲۸۵۲۶ پونڈ قرضدار تھا، یہ اعلان کر دیا کہ یہ رقم ادا نہیں کی جائے گی بلکہ لین داروں کو صرف سود پر اکتفا کرنی پڑے گی۔ لیکن اس وعدے کے پورا ہونے کا وقت بھی ۱۶۷۷ء سے پہلے نہیں آیا۔ چنانچہ اس سال آخر کار ۶ فی صد سود ادا کیا گیا۔ ۱۶۸۳ء میں سود کی ادائی پھر رک گئی۔ لیکن ۱۷۰۱ء میں ۳ فی صد ادا کرنے کا انتظام کر دیا گیا۔[۱] بعد میں چل کر ساوتھ سی کمپنی[۲] نے قرضے کا بار اپنے سر لے لیا اور اس انجمن کے ٹوٹنے پر قرضے کی رقم قومی قرضے میں محسوب کر لی گئی۔ چنانچہ صنعت میں قومی قرضے کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

بادشاہ کی اس دھوکا دھڑی سے سناروں کو بڑا دکھ پہنچا، لیکن اس سے ان کی بنک کاری کسی مستقل نقصان سے بچی رہی وہ جو سود ادا کرتے تھے اس کی بنا پر ان کے پاس امانتیں رکھنے کی ترغیب ہوتی تھی اور ان کی ہنڈیاں آزادی کے ساتھ دست گردان رہتی تھیں یہاں تک کہ سترھویں صدی کے ختم پر اس کا امکان معلوم ہوتا تھا کہ خانگی بنک کاری کا انتظام انگلستان کے طول و عرض میں پھیل جائے گا۔

۱۔ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے یہ شرح بہت ادنیٰ تھی۔

۲۔ South Sea Company

سیاسی پہیے کی ایک اور گردش نے ایسی تبدیلی پیدا کر دی جس سے انگلستان کی تجارتی ترقی پر بڑے بڑے اثرات پڑے۔ ۱۶۹۴ء میں ولیم ثالث کو براعظم کی جنگ کے سلسلے میں زر کی ایسی سخت ضرورت تھی کہ اس کے اوسان ٹھکانے نہ تھے۔ اس کے مشیروں نے قرضہ حاصل کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن حکومت کا اعتبار اچھا نہ تھا اور سود اعلیٰ شرح سے دیے بغیر زر مل ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اس کا حاصل کرنا ضروری تھا ورنہ انگلستانی رودبار کے لیے بحری بیڑے کا انتظام ناممکن تھا چنانچہ حکومت نے بارہ لاکھ پونڈ قرضہ طلب کیا اور شرح سود ۸ فی صد رکھی گئی۔ دوسری طرف مزید لالچ دلانے کے لیے لین داروں کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ بنک آف انگلینڈ کی شکل میں خود کو منظم کر لیں تاکہ اس صورت میں انھیں کاغذی زر کے جاری کرنے کا حق دیا جا سکے۔ یہ ترغیب کارگر ثابت ہوئی۔ گیارہ دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ قرضے کی رقم پوری جمع ہو گئی۔ ۲۰۴

بنک آف انگلینڈ پہلے پہل بہت غیر مقبول رہا۔ اس کا سارا دارومدار سرمایہ داروں پر ہونے کی وجہ سے زمیندار اس سے ڈرتے تھے اور چونکہ وھگ پارٹی[1] کے ہاتھوں اس نے جنم لیا تھا اس لیے ٹوری جتھا[2] اس بنک سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے قیام کے بارے میں قانون کا جو مسودہ پیش کیا گیا تھا وہ دارالامرا میں جا کر بڑی دقت سے منظور ہوا اور محض اس واقعے نے کہ زر کے بغیر لڑائی سے ہاتھ اٹھانا پڑا دارالامرا کو اس کی منظوری کی ترغیب دی۔ ٹوری جماعت اس کاروباری کمپنی کو جو وھگ جتھے کی بنائی ہوئی تھی بادشاہی (Monarchy) کے لیے خطرناک

[1] (Whig Party) یہ سیاسی فرقہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کا حامی تھا اور شاہی اقتدار کو پارلیمنٹ کے تحت کرنا چاہتا تھا۔ موجودہ لیبرل پارٹی اس کی قائم مقام ہے (مترجم)

[2] (Tory Party) موجودہ قدامت پسند جماعت کی پیشرو تھی (مترجم)

سمجھتی تھی۔ ان کا یہ استدلال تھا کہ بنکوں کی نوعیت جمہوری ہوا کرتی ہے چنانچہ امسٹرڈم، جینوا اور وینس میں بنک قایم تھے، لیکن بادشاہ پرست فرانس یا ہسپانیہ میں ان کا وجود نہ تھا تو انگلستان میں ایسا بنک کیوں قایم کیا جائے؟ وہگ جھتے کے جو لوگ اس تجویز کے مخالف تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ مجوزہ بنک اسٹار چیمبر[1] سے بھی زیادہ ظلم ڈھائے گا، کیونکہ یہ بادشاہ کو اس قابل بنا سکتا تھا کہ پارلیمنٹ سے بے مشورہ بیسے وہ زر حاصل کرلے۔ شور و غل اتنا بڑھا کہ ایک فقرہ بڑھانا پڑا جس کی رو سے بنک پر لازم ہوگیا کہ پارلیمنٹ کے بے مشورے کے بادشاہ کو قرضہ نہ دے۔ لیکن یہ بنک نہ صرف ان حملوں سے بچ نکلا بلکہ ان سخت حملوں سے بھی جو حریف ساروں نے اس پر کیے۔ ساروں نے اپنی کارروائی کے لیے اچھا موقع ڈھونڈ لیا۔ ۱۶۹۷ء میں جب کہ پرانے سکے رواج سے مٹا لیے گئے، نئے سکے کافی تعداد میں ٹکسال سے جاری کیے جانے سے پہلے ساروں نے خود بنک ہی کے جاری کردہ نوٹ جن کو وہ مدت سے اکھٹا کر رہے تھے بنک میں نقد روپے کے لیے اچانک پیش کردیے۔ گو سکوں کی کمی کے باعث بنک نقد ادائی نہ کرسکا، لیکن وہ نادار نہ تھا۔ وہ صرف مہلت کا طالب تھا، لہذا اس نے یہ جواب دیا کہ ان کے مطالبے بدنیتی پر مبنی تھے اور پورا نقد ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے جملہ مطالبوں کا صرف ۱۵ فی صد فوراً ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور رفتہ رفتہ بقیہ رقم بھی پوری ادا کردی۔ اس طرح یہ یورش ناکام رہی اور بنک بال بال بچ گیا۔

۲۰۵

اکثر ایسا ہوا ہے کہ عارضی تدبیروں پر کچھ عرصے تک عمل کرنے سے ان کی حیثیت رفتہ رفتہ مستقل اداروں کی ہوگئی ہے اور دور رس نتیجے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ بنک آف انگلینڈ اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ ابتدا میں ایک جماعت نے اس کو محض حکومت کی مالی امداد کی غرض سے

---

[1] Star Chamber.

قایم کیا۔ لیکن اب اس کو کسی جماعت سے سروکار نہیں ہے اور نہ قرضہ دینا اس کا کام ہے، اگرچہ اس کا تعلق حکومت سے بہت قریبی رہا ہے۔ وہ حکومت کے فاضلات کا محافظ ہے اور محض اسی چیز نے اس کو استواری بخشی ہے جو سنہ ۱۸۴۴ء میں معمولی بنک کاری سے صیغہ اجرا کو الگ کر دینے کے بعد سے بڑھ گئی ہے۔ بنک کو ایک خاص امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے کہ بنک کے کسی دوسرے مشترک سرمایے کو لندن یا اس کے آس پاس نوٹ جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ چونکہ سنہ ۱۸۴۴ء کے بعد کے قایم شدہ کسی نئے بنک کے لیے دوسرے مقاموں پر بھی نوٹ جاری کرنا قانون سے روک دیا گیا، اس لیے نوٹ جاری کرنے والے دیہاتی بنکوں کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور سنہ ۱۹۱۲ء تک وہ بے نشان ہو گئے۔ اس کے علاوہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ منشور کے لحاظ سے بنک آف انگلینڈ کو تمام دوسرے مشترک سرمایہ بنکوں کے مقابلے میں امانتوں کا کاروبار کرنے کا اجارہ بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ اجارہ صرف نوٹ جاری کرنے کے بارے میں تھا۔ لیکن اس خیال کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ لندن میں سنہ ۱۸۳۳ء تک امانت کا کاروبار کرنے والا مشترک سرمایے کا ایک ہی ادارہ یہی بنک رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۸۳۳ء میں اس غلطی کا علم ہوا اور لندن کے دوسرے مشترک سرمایہ بنکوں کی تاسیس عمل میں آئی۔

جس طرح حکومت نے بنک آف انگلینڈ کی مدد کی اسی طرح بنک نے حکومت کی مدد کی۔ حکومت کو جب کبھی زر کی ضرورت ہوئی اور کسی دوسرے طریقے سے زر نہ مل سکا تو بنک ہی نے متعدد مرتبہ قرضے اکھٹے کیے۔ لیکن قرضہ حاصل کرنے کے اس طریقے کے نتیجے دور تک پہنچے۔ ان قرضوں نے جن کو عوام نے اکھٹا کیا تھا حکومت کو اور شہر کے سرمایہ داروں کو شاہان اسٹورٹ کے خلاف متحد کر دیا۔ جس طرح خانقاہوں کی زمینوں کے عطیے نے امیروں کو اس بات کا پابند کر دیا تھا کہ وہ مذہبی اصلاح کی تائید کریں اور پاپائی حکومت کے فروغ کا مقابلہ کریں اسی طرح ان قرضوں نے جن پر قومی قرضے کی بنیاد

۲۰۶

قایم ہوں ولیم اور خاندان ہینوور کے ساتھ مالدار طبقے کی وفاداری کو خوب پختہ کر دیا۔ اگر دوبارہ خاندان اسٹورٹ کو اقتدار مل جاتا تو اس کا بہت کم امکان تھا کہ وہ اس زر پر سود ادا کرنے میں بہت سرگرم ہوتا جو اس کے خلاف استعمال کرنے کے لیے قرض کے طور پر ایسے بادشاہوں کی جانب سے حاصل کیا گیا تھا جن کو خاندان اسٹورٹ لٹیرا سمجھتا تھا۔ جس حد تک بنک اور قومی قرضے کا میلان عوام کو انقلاب کے بعد کے انتظاموں کی تائید پر جمائے رکھنے کی جانب تھا اس حد تک مابعد سالوں کا فیصلہ غیر مشروط طریقے پر ان کی موافقت میں ہے۔ لیکن ایک اور لحاظ سے شبہے کی بہت زیادہ گنجایش ہے۔ قرض حاصل کرنا مشکلوں کا مقابلہ کرنے کا بے شک ایک آسان طریقہ تھا خاص کر اس صورت میں جب کہ اس کو ادا نہ کرنا پڑتا تھا بنک کے قیام کی بدولت ولیم کی حکومت کو ۱۲ لاکھ پونڈ ملے اور صرف ایک لاکھ پونڈ اس کے سود کے طور پر ادا کیے گئے۔ لیکن اس سود کو ہر سال ادا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس کی ادائی حکومت کی آمدنی پر ایک بوجھ ہوگئی اور اس غرض کے لیے بعد میں محاصل لگانے پڑے۔ قطع نظر اس کے بنک کاری اور قومی قرضے کے نئے نظام کو ہمیشہ اچھی طرح کام میں لایا گیا یا نہیں یہ ماننا پڑے گا کہ تجارتی ترقی کے امکانات بڑھ گئے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی ملک کے اندر تجارتی وصنعتی ترقی اور ملک کے باہر قومی اقتدار کی ترقی اس کی گواہ ہے۔ تاجر، صناع اور حکومت سب کے سب برابر اپنے عمل کو بڑھانے اور پھیلانے کے قابل ہو گئے۔ صناعوں نے نئے نئے ایجادوں سے فایدہ اٹھایا اور اسی پیمانے پر عمل کیا جس کا اب تک علم نہ تھا۔ تاجروں اور جہاز کے مالکوں نے انگریزی مال کو روئے زمین پر پھیلا دیا اور حکومت نے فرانس کی نو آبادیاتی توسیع میں رکاوٹ ڈالی، امریکہ میں انگریزوں کی نسلی لسانی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور ایک ایسی بحری قوت قایم کی جس نے اپنے رقیبوں کو تباہ کر دیا اور نتیجے میں اس کا کوئی ہمسر نہیں رہا۔ یہ سب یہ کچھ زیادہ تر اعتبار کی بدولت

۲۰۷

زر پر قادر ہونے سے ہوا۔ چنانچہ حکومت اور افراد ان وسیع معاملوں اور کاروبار کو انجام دینے کے قابل محض بنکوں اور خاصکر بنک آف انگلینڈ کی بدولت بنے۔

باب ۱۴

برطانیۂ عظمیٰ کی توسیع

اٹھارھویں صدی کی تجارتی لڑائیاں

سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی نوآبادیاتی توسیع کے درمیان نمایاں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ موخرالذکر کی بعض خصوصیتوں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثلاً یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ہمارے رقیب پہلے ہسپانیہ اور پھر ہالینڈ تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں فرانس نے ان کی جگہ لے لی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگریزوں کو جو کچھ فایدہ ہوا وہ سب فرانسیسیوں کے نقصان سے نہیں ہوا اس لیے کہ انگریزوں نے ہسپانیہ اور ہالینڈ سے بھی بہت کچھ چھینا۔ ان ملکوں نے اپنی مرضی سے لڑائی نہیں مول لی بلکہ ایک کے پیچھے دوسرا فرانسیسی ایجنٹ کے الجھاؤ میں الجھ کر رہ گیا یا فرانسیسی پالیسی نے انھیں اپنے قابو میں کر لیا اور اس طرح انگلستان نے اپنے سب سے بڑے حریف یعنی فرانس سے مقابلہ کرنے کے سلسلے میں حریف کے حلیفوں کا سر کچل کر رکھ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی میں

فرانس کے ساتھ صد سالہ جنگ کا آغاز اسی طرح ہوا جس طرح کہ اڈورڈ سوم کے دور حکومت میں ہوا تھا مقاصد بہت مختلف تھے۔ چودھویں صدی میں یہ آرزو رہی کہ خود فرانس ہی کو یا بہر طور فرانسیسی علاقے کے ایک زرخیز حصے کو فتح کر لیا جائے۔ اٹھارھویں صدی میں نو آبادیات پر قابو پانے کے لیے کشمکش ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ مارل برو نے فرانس پر حملے کی اسی طرح دھمکی دی جس طرح نپولین نے انگلستان پر حملہ آور ہونے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن ان دونوں صدیوں کے درمیان فرانس اور انگلستان کے درمیان تین لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں ایک ملک کے دوسرے پر زبردست حملہ کرنے کی بہت کم نوبت آئی قدیم طریقے یعنی حملے کی بجائے جدید طریقے اختیار کیے گئے۔ ہندوستان، امریکہ اور غرب الہند کے جزیروں میں لڑائیاں ہوتی رہیں اور فرانسیسی اور انگریزی بیڑے سمندر پر قابو پانے کی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ اس کی بدولت دشمن کی نو آبادیاں فاتح کے رحم و کرم پر ہو جائیں گی۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ انگریزوں نے اٹھارھویں صدی کے فتح کیے ہوئے علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔ لیکن امریکہ کی نو آبادیاں جو سترھویں صدی کی حوصلہ مندیوں کی بڑی یادگار تھیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان اب تک ان ہی کے قبضے میں ہے ہندوستان سے انگریزی تعلقات کی ابتدا ۱۶۰۰ء سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ تعلق تجارتی تعلق تھا۔ ہندوستان میں فتح و اقتدار اور ملک گیری کا دور اس وقت تک شروع نہیں ہوا جس وقت تک اٹھارھویں صدی کا نصف حصہ ختم نہ ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی ایک فرانسیسی نے یہ ثابت کر دیا کہ دیسی فوج محض تجارتی آزادی کے علاوہ اور چیز حاصل کرنے کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور انگریز اپنے اس رقیب کی پیروی کرنے میں پیچھے نہیں رہے!

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک یادگار دریافت تھی کہ دیسی سپاہی یورپی افسروں کی نگرانی اور قیادت میں فوجی قواعد سیکھ لینے کے بعد اس

۲۰۸

قابل ہوسکتے ہیں کہ انگریز اور فرانسیسی تاجران کی مدد سے سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان میں قوت و اقتدار حاصل کرنے کی عام کشمکش میں مرہٹہ سرداروں کا کامیابی سے مقابلہ کرسکیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے اسی دریافت نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا راستہ نکالا لیکن نوآبادیات تلوار کے زور پر قایم کرنے کی پالیسی جو ہندوستان کے لیے اختیار کی گئی وہ نئی تھی۔ یہاں یہ واقعات ظاہر ہوئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تاجرانہ حیثیت کو بدل کر بادشاہوں اور فاتحوں کی حیثیت اختیار کرلی، ایک لشکر جمع کرلیا اور اس قابل ہوگئی کہ جہاں کہیں پرامن طریقوں سے کام نہ چلے وہاں تلوار سے کام نکالا جائے۔ لیکن ٹھیک اسی قسم کا تغیر دوسرے مقاموں میں انگریزی نوآبادیاتی طریقوں میں اس سے پہلے ہی رونما ہوچکا تھا۔ یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ انگریز بادشاہ امریکی نوآبادیوں کی مضبوطی میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے بجز اس کے کہ اگر کچھ آمدنی وہاں سے وصول ہوسکتی ہو تو اس میں شرکت کے متعلق معاملہ کیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی کے سیاسی مدبر برطانیہ عظمیٰ کی توسیع میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جمائیکا محض کرامول کے طفیل انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ لیکن اس کی تسخیر کسی ارادی حکمت عملی کا نتیجہ نہیں تھی۔ برخلاف اس کے وہ ایک عاجلانہ حملہ تھا جو سین ڈومنگو کے مقابلے میں کرامول کی مہم کی ناکامی سے توجہ ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا۔ کرامول کی پالیسی قدیم وضع کی تھی اور اس پالیسی کا منشا یہ تھا کہ اپنے پرانے دشمن ہسپانیہ کی مخالفت کی جائے اور وہ تقریباً کمزور ہوچکا تھا۔ یہ پالیسی ایلزبتھ کے قدیم بحری ڈاکوؤں کے طریقوں پر اختیار کی گئی اور اس میں فرانس کی مدد لی گئی جو نوآبادیاتی کشمکش میں ابھی تک انگلستان کا رقیب تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ اصل میں ایک بڑی پرانی پالیسی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جہازرانی کے قوانین کا رخ یقیناً کسی تجارتی رقیب کے خلاف تھا اور ان کا مقصد نہ صرف ولندیزوں کی نقل وحمل کی تجارت اور ماہی گیری کو تباہ کرنا تھا بلکہ ان کو ان کے اس وقت کی

۲۰۹

نوآبادیوں سے نفع بھی نہ اُٹھانے دیتا تھا۔ یہ قوانین ارادی طور پر اس غرض سے مرتب نہیں کیے گئے تھے کہ انگریزی اقتدار کو نئے علاقوں میں پھیلایا جائے۔ معاہدوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ سترھویں صدی کے آخری حصے کے سیاسی انتظامات تعداد یا پیچیدگی کے لحاظ سے ان سیاسی انتظاموں سے کچھ کم نہیں ہیں جنھوں نے ہسپانوی وراثت یا آسٹریوی وراثت کی جنگوں کا خاتمہ کیا۔ لیکن ان میں نوآبادیوں کی جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی یا بہت کم کی گئی۔ رِسوِک (Ryswick) کے بڑے معاہدے میں ان کا تذکرہ صرف اس قرارداد تک ہے کہ خلیج ہڈسن میں انگریزی و فرانسیسی علاقوں کی سرحدوں کے تصفیے کے لیے کمشنر مقرر کیے جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی نوآبادیاں اب بھی زیادہ تر خانگی حیثیت رکھتی تھیں۔ خانگی اولوالعزمی ان کے قیام کی محرک تھی اور اس تحریک کو نجی ذریعوں سے مدد پہنچی حکومت نے منشور عطا کیے اور عام حفاظت کا موہوم وعدہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ آبادکار انگریز ہی رہے اور کبھی کبھی جیسا کہ امبائنا کے قتل عام کے بعد ہوا حکومت نے اس غرض سے دخل دیا کہ اس کی رعایا کو جو نقصان اُٹھانے پڑے ان کی تلافی ہو جائے۔ لیکن ہسپانیہ یا پرتگال کی طرح انگلستان نے اپنی نوآبادیوں سے گہرا تعلق قایم نہیں کیا۔ چنانچہ وہ نہ تو ان کو کبھی قومی معاملات میں اہم درجہ دیتا تھا اور نہ اپنے بین الاقوامی معاہدوں میں ان کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرتا تھا[1]۔

۲۱۰

[1] اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا عام بیان مستثنیات کے تابع ہے۔ لیکن یہ امر کہ وہ مجموعی حیثیت سے ٹھیک ہے ان اہم انگریزی نوآبادیوں کی مندرجہ ذیل فہرست سے ثابت ہوتا ہے جو سنہ ۱۶۰۹ء تک قبضے میں آگئے تھے۔ اس فہرست میں ان کے قیام کا طریقہ بھی درج ہے۔

	نوآبادی	تاریخ	موسس
(۱)	ورجینیا	سنہ ۱۶۰۷ء	لنڈن کمپنی آف ورجینیا بموجب منظورہ عطا کردہ جیمس اول

لیکن اٹھارھویں صدی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ سنہ ۱۷۰۱ء جیسے قدیم

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔

نوآبادی	تاریخ	موسس
(۲) برموڈاس	سنہ ۱۶۱۲ء	ورجینیا کمپنی کی شاخ جو جزائر سومر کی کاشت کی کمپنی اور گورنر اینڈ کمپنی کی حیثیت سے منظم کی گئی تھی (سنہ ۱۶۱۵ء)
(۳) نواسکوشیا	سنہ ۱۶۲۱ء	سر ولیم الکزنڈر باجازت بادشاہ۔
(۴) گولڈ کوسٹ آف گیمبیا	سنہ ۱۶۱۸ء	لندن کے اولوالعزم تاجروں کی کمپنی جو افریقہ گئی تھی۔
(۵) نیو انگلینڈ	سنہ ۱۶۲۱ء	پلگرم فادرس باجازت ورجینیا کمپنی۔
(۶) میسن	سنہ ۱۶۲۲ء	جان میسن و فرڈینینڈ گارجیس باجازت بادشاہ۔
(۷) سنٹ کٹس	سنہ ۱۶۲۳ء	تامس وارنر فرستادہ رلیف بیری نیلڈ۔ دوسرے اکثر لیورڈ کے جزیرے سنٹ کٹس کے اجزا ہیں۔
(۸) باربیڈاس	سنہ ۱۶۲۴ء	سر ولیم کورٹین۔
(۹) ماساچوسٹس	سنہ ۱۶۲۹ء	ماساچوسٹس بے کمپنی باجازت بادشاہ
(۱۰) میری لینڈ	سنہ ۱۶۳۲ء	لارڈ بالٹی مور۔
(۱۱) بہاماس	سنہ ۱۶۴۶ء	ولیم سیل جس میں کیرولینا پروپرائٹرز نے سنہ ۱۶۶۶ء میں اضافہ کیا۔
(۱۲) جمائیکا	سنہ ۱۶۵۵ء	مسخر کیا گیا۔
(۱۳) کیرولینا	سنہ ۱۶۶۳ء	کیرولینا پروپرائٹرز۔
(۱۴) ہڈسن بے	سنہ ۱۶۷۰ء	ہڈسن بے کمپنی
(۱۵) پن سلوانیا	سنہ ۱۶۸۲ء	ولیم پین

اس میں وہ سب بھی شامل کرنا چاہیے جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں حاصل کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت نے جو کوشش کی تھی ان کے مقابلے میں خانگی کمپنیوں اور نجی افراد کی کوشش بہت زیادہ تھی۔ دوسری طرف سنہ ۱۶۶۶ء میں فرانس و انگلستان کی باہمی جنگ مغرب الہند کے جزیروں تک پھیل گئی چنانچہ

زمانے میں دو معاہدے طے پائے اور ان سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی مقبوضات میں نئی دلچسپی محسوس کی جاتی تھی۔ معاہدہ ۱۷۰۳ء میں جو ہسپانیہ اور پرتگال کے درمیان ہوا ہسپانیہ نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس وقت تک صلح نہ کرے گا جب تک کہ ولندیزی، کو چین اور گیناؤس کے فتح کیے ہوئے علاقے پرتگال کے حوالے نہ کر دیں اور یہ بھی اقرار کیا کہ پرتگال کے جتنے مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے ان کو پھر حاصل کر کے پرتگال کو دے گا۔ دوسری طرف اسی سال انگلستان اور ہالینڈ نے یہ معاہدہ کیا کہ ہسپانوی امریکہ میں دونوں دول جو علاقے فتح کریں وہ جنگ ختم ہونے کے بعد بدستور ان کے قبضے میں رہیں گے اور جب معاہدۂ (Utrecht) کی رو سے جنگ ختم ہوئی تو معاہدے کی اس قدر ۱۷۱۳ غلط تعبیر کی گئی کہ انگلستان کو مارل برو کی کامیابی کے بعد جتنا ملنے کی توقع تھی اس سے بہت ہی کم ملا اور ہڈسن بے کے علاقے اور نیو فاؤنڈ لینڈ پر بلا شرکت غیرے انگلستان کا قبضہ ہو گیا بجز اس کے کہ ماہی گیری کے کچھ حقوق فرانسیسیوں کے لیے محفوظ رکھے گئے۔ فرانس نوا سکوشیا اور سنٹ کٹس کے حقوق سے دست بردار ہو گیا۔ ہسپانیہ نے جبل طارق اور منورقہ کا حوالے کر دیا اور معاہدے کے تحت تیس سال کے لیے انگریزوں کو یہ حق دیدیا کہ وہ ہسپانوی امریکہ میں غلام درآمد کریں۔ یہ ایک فائدہ بخش رعایت تھی۔ اس کی بدولت انگریز بردہ فروشوں نے بڑا نفع کمایا اور چونکہ یہ کام اب تک ایک فرانسیسی کمپنی کے ہاتھ میں تھا اس لیے انگریزوں کے ہاتھوں میں اس کے منتقل ہو جانے کی وجہ سے ایک تجارتی رقیب کے مقابلے میں بہت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ وہاں کے فرانسیسی اور انگریز آباد کاروں میں بھی خونریز لڑائی ہوئی۔ معاہدۂ بریڈا (سنہ ۱۶۶۷ء) میں نو آبادیوں کے متعلق بعض قراردادیں منظور ہوئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نو آبادیوں کا جہاں تک تعلق ہے سترھویں صدی کا آخری حصے میں خانگی اولو العزمی کی جگہ حکومت کی ارادی ملک گیری کی پالیسی نے لے لی۔

بڑے فایدے حاصل ہوئے۔ اس طرح اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے اور جدید نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو معاہدہ (Utrecht) کسی حال غیر نفع بخش نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جنگ اس لیے کی گئی تھی کہ خاندان بوربون کو ہسپانیہ کے تخت سے اتار دیا جائے اور یہی مقصد پورا نہیں ہوا۔ لیکن فرانس اور ہسپانیہ کی متحدہ قوت انگلستان کے لیے اس سے کم مضرت رساں ثابت ہوئی جتنی کہ وہ سمجھی جاتی تھی۔ جس وقت تک ہسپانیہ فرانس کا حلیف رہا انگلستان کے لیے ایک ایسے ملک کو لوٹنے کا اچھا موقع تھا جو اگرچہ نوآبادیوں کی حد تک بہت سے مقبوضات کا مالک تھا لیکن ان کی مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔

اٹھارھویں صدی کی لڑائیوں اور اس کے معاہدوں پر سرسری نظر ڈالنے سے اس واقعے کی اہمیت واضح ہو گی کہ مشرق اور مغرب میں علاقے حاصل کرنے کا کام حکومت نے نجی دھن کے پکے منچلوں سے لے لیا اور یہ بھی ظاہر ہو گا کہ یہ نئی پالیسی کس قدر کامیاب رہی۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک انگلستان نے بعض نوآبادیوں کی خاطر کوئی جنگ نہیں کی۔ لیکن شاہان ہنوور کے تحت ہر ایک لڑائی کسی نہ کسی نوآبادیاتی مسئلے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتی تھی۔ ۱۷۲۷ء میں ہسپانیہ سے پہلی لڑائی چھڑی جس کا سبب ایک حد تک ہسپانیہ کا آسٹنڈ کمپنی کو مان لینا تھا جو مشرق میں انگریزوں اور ولندیزیوں کی تجارت کی خطرناک رقیب تھی۔ گو یہ جنگ اپنی حد تک نہایت مختصر اور غیر فیصلہ کن تھی مگر وہ گھمسان کی لڑائیوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ ۱۷۳۹ء میں انگریز ہسپانیہ سے پھر بھڑ گئے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ایک انگریز کپتان جنکنس نامی پر بڑے مظالم کیے گئے تھے اور ہسپانوی سمندر میں ناجائز طور سے تجارت کرنے کی سزا میں اس کے کان کاٹ لیے گئے تھے لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ ہسپانویوں نے ہسپانوی امریکہ میں انگریزی جہازوں کو تجارت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ "جنکنس کے کان کی لڑائی" تھی جو آسٹری وراثت کی جنگ میں مل گئی۔ اس

۲۱۲

جنگ میں فرانس نے اپنے حلیف ہسپانیہ کا ساتھ دیا اور جبل طارق اور منیورکا حاصل کر کے دوبارہ واپس دلائے اور جارجیا کی انگریزی نوآبادی کو تباہ کرنے کا وعدہ کیا۔ جب صلح ہوئی تو ہر ملک نے ایک دوسرے کے فتح کیے ہوئے علاقے واپس کر دیے۔ اس طرح انگلستان کو ملک گیری کی شکل میں اتنا فایدہ نہیں ہوا جتنا کہ ہسپانیہ کو نقصان پہنچا کہ اس کو کمزور بناتے ہیں۔

یہ صلح صرف آٹھ سال تک رہی اور وہ بھی صرف یورپ کی حد تک فرانسیسی اور انگریزی غرضیں ہندوستان اور امریکہ میں لگاتار ٹکراتی رہیں آخری جنگ میں لابورڈونے نے مدراس کو فتح کر لیا اور ڈوپلے نے پانڈیچری کے حملے میں انگریزوں کو پسپا کر دیا۔ اس طرح ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فرانسیسی انگریزوں کو جنوبی ہند سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان تمام کامیابیوں کا باعث فرانسیسی دیسی سپاہی تھے اور ہندوستانی سپاہیوں کے لشکر کو دونوں فریق استعمال کر سکتے تھے۔ ڈوپلے نے جو مثال قایم کی تھی اس کی پیروی کلائیو نے کی۔ چنانچہ اس نے دیسی سپاہیوں کو بھرتی کر کے اور قواعد سکھلا کر ۱۷۵۱ء میں آرکاٹ پر قبضہ کر لیا اور صلح کی شرطوں کے خلاف ڈوپلے مدارس پر حملہ آور ہونے کی جو تجویزیں کر رہا تھا ان پر پانی پھیر دیا اور اس طرح انگریزوں کی سیادت قایم کر دی جس طرح ہندوستان میں اے لاچپیل کے معاہدے کا بہت ہی کم احترام کیا گیا اسطرح شمالی امریکہ میں اس سے بھی کم لحاظ کیا گیا۔ یہاں فرانسیسی سنٹ لارنس اور جنوبی کینڈا میں بہت طاقتور تھے۔ اس کے برخلاف انگریز بحر اطلانٹک کے ساحلی علاقے پر قابض تھے جو آجکل مشرقی ریاستہائے متحدہ پر مشتمل ہے۔ ۲۱۳

سوال یہ تھا کہ دریائے مسی سپی اور اس کے معاونوں کی وسیع وادی کا مالک کون ہو۔ آیا انگریز مغرب کی طرف الی گھینی تک بڑھ جائیں یا فرانسیسی اوہیو سے نیچے اتریں اور لوئزیانا میں اپنے علاقے سے امداد لیکر انگریزوں کو ان کے ساحلی خطے تک محدود رکھیں۔ اوہیو کے دہانے پر دونوں قوموں کے آبادکاروں میں آویزش نے ایک فرانسیسی قلعے کی تعمیر

کے محرک کا کام کیا جس کا نام قلعہ ڈکیسن (Duquesne) ہے اس قلعے کو سطلے
کرنے کے لیے بریڈک کچھ باقاعدہ فوج اور آبادکاروں کے ایک
دستے کے ساتھ بھیجا گیا۔ لیکن اس پر کمین گاہ سے حملہ کیا جانے کی وجہ
سے ۱۷۵۵ء میں فوج قلعہ ڈکیسن کی سمتوں میں شکست کھا کر بھاگ نکلی
اس کے انتقام کے طور پر ہاک نے چند فرانسیسی جہاز پکڑ لیے اور سنہ ۱۷۵۶ء
میں دونوں قوموں کے درمیان پھر کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی اور دونوں نے
ہندوستان اور امریکہ میں سیادت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ واقعہ
یہ ہے کہ یہ دونوں کبھی صلح پر قایم نہیں رہے لیکن جیسا کہ ۱۷۳۹ء میں
ہوا نو آبادیاتی جنگ یورپی جنگ میں ختم ہو گئی۔ سات سالہ جنگ کی
وسعت، فریڈرک اعظم کے خلاف زبردست فوجوں کا اجتماع اور اس
ٹڈی دل سے فریڈرک کی اس سے بہت کم فوج کا مقابلہ، یہ سب چیزیں
ممکن ہے کہ انگلستان کے حق میں جنگ کی جو اہمیت تھی اس سے ہماری
توجہ کو ہٹا لیں۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ہمارے لیے اس کی کیا اہمیت
تھی کہ سیلشیا فریڈرک کے قبضے میں ہو یا ماریا تھریسا اس کو حاصل کر لے؟
واقعہ یہ ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انگلستان فرانس کے مقابلے
میں نو آبادیاتی کشمکش میں مصروف تھا۔ یورپی جنگ کا سبب زیادہ تر
فرانس تھا اور انگلستان سے اس کا تعلق برائے نام تھا۔ لیکن اگر
انگلستان، فرانس سے یورپ میں لڑتا تو یورپ سے باہر انگریزوں کا
مقابلہ کرنے میں فرانس بہت کمزور پڑ جاتا۔ چنانچہ پٹ کے اس مشہور
مقولے کا کہ "وہ امریکہ کو جرمنی میں فتح کرے گا" یہی مطلب تھا۔ فرانس
یورپ میں پوری طرح مصروف پیکار ہونے کی وجہ سے کینیڈا میں ولف کا
یا ہندوستان میں کلائیو اور آئر کوٹ کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی
فوج روانہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس جنگ میں ہسپانیہ کی شرکت کا نتیجہ
یہ نکلا کہ انگلستان نے کیوبا اور منیلا پر قبضہ کر لیا۔ جب صلح پیرس کی رو
سے جنگ ختم ہوئی تو انگلستان کو کینیڈا، کیپ بریٹن، گرینیڈا، گرینیڈینز

سنٹ ونسنٹ، ڈومینیکا، ٹوباگو، سینی گل اور فلوریڈا مل گئے اور امریکہ میں اس کا کوئی حریف نہیں رہا۔ دوسری طرف ہندوستان میں اگرچہ پانڈیچری فرانسیسیوں کو واپس کردیا گیا ان کی وقعت کمزور پڑ گئی اور نتیجے میں انگریزوں کا تسلط جزیرہ نما پر پھیلنا یقینی ہوگیا۔ ۲۱۴

یہ صلح اٹھارھویں صدی میں انگریزوں کی نوآبادیاتی قوت کے عروج کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے بعد کی جنگ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نوآبادیوں کی بڑی لڑائی تھی اور انگریزوں کی امریکی نوآبادیوں کے نقصان پر یہ ختم ہوئی۔ فرانس نے باغی آبادکاروں کی مدد کر کے انگریزوں کی سیادت پر ایک کاری ضرب لگائی اگرچہ راڈنی اور انگریزی بحری بیڑے کی بدولت انگلستان اپنے دوسرے مقبوضات پر قبضہ رکھنے کے قابل رہا۔

انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان صلح طے پانے میں (۱۷۸۳ء) ایک اہم دشواری یہ تھی کہ ولندیزی اپنے لیے اس دریا میں جس کو وہ اپنے مشرقی ہندی دریا سمجھتے تھے تجارت کرنے کا حق محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مطالبے سے انھیں ہاتھ اٹھانا پڑا۔ امریکی نوآبادیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود انگلستان تجارتی اور نوآبادیاتی فایدوں کے لیے لڑنے کے اصول پر برابر کاربند رہا۔ تین سال بعد ایک تازہ نوآبادیاتی مسئلے کے بارے میں جو شمالی امریکہ کے ساحل بحرالکاہل پر نٹکا ساونڈ کے قبضے سے متعلق تھا ہسپانیہ سے ہماری ایک اور جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہسپانیہ نے مزاحمت ترک کردی اور ۱۷۹۳ء کی انقلابی جنگ کے آغاز تک صلح قایم رہی۔ ابتدا میں یہ جنگ اگلی لڑائیوں کے مقابلے میں بظاہر نوآبادیاتی نوعیت کم رکھتی تھی۔ چنانچہ انگلستان اس لیے لڑ رہا تھا کہ فرانس نے ہالینڈ پر چڑھائی کردی تھی یا وہ (انگلستان) لوئی شانزدہم کی بدسلوکی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ لیکن نوآبادیاتی رنگ بہت جلد غالب آگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ براعظم میں انگلستان کی کارروائیاں بڑی

مدت تک بے اثر رہیں۔ اس لیے وہاں فرانسیسی چھائے ہوئے تھے۔ لیکن سمندر میں انگلستان کا تسلط تھا اور یہاں تسلط قائم ہونے کے یہ معنی تھے کہ فرانس عظمیٰ کا باقی علاقہ انگلستان کے رحم و کرم پر تھا۔ اور چونکہ فرانس نے ہالینڈ کو جذب کر کے اپنا جز بنا لیا تھا، اس لیے ولندیزی نوآبادیاں بھی فرانسیسی نوآبادیوں کی طرح انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ دوسری قوموں کی یہ حالت رہی کہ انھوں نے جنگ میں شکست کھائی، صلح کر لی اور پھر جنگ کی۔ البتہ انگلستان ہی ایسا ملک تھا جو استقلال کے ساتھ لڑتا رہا۔ نپولین اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی لڑائی کس سے تھی اور کس لیے تھی۔ مشرق میں انگریزوں کی کارروائیوں میں رخنہ ڈالنے وہ ایک مہم لے کر مصر پہنچا۔ اس نے ٹیپو سلطان کو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کھڑا کیا اور اس قوت کا گلا گھونٹنے کے لیے براہ راست حملے کی تجویز سوچی جس کے بیڑے نے اس کو دریائے نیل پر شکست دی تھی۔ لیکن وہ اپنے ہی بیڑے کی خراب کارکردگی کی وجہ سے ناکام رہا۔ اس کے بعد نپولین بالواسطہ حملے کی جانب رجوع ہوا۔ چونکہ انگلستان اپنی تجارت کی بدولت عروج پا رہا تھا اس لیے نپولین نے اس تجارت کا مقاطعہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اس نے براعظمی نظام Continental System قایم کیا اور اپنی رعایا اور اپنے حلیفوں کو انگلستان سے تجارت کرنے کی ممانعت کر دی۔ لیکن اس صورت میں بھی اس کی تجویزیں ناکام رہیں کیونکہ اس کے پاس بحری قوت نہیں تھی جو اس کو اپنے احکام کے نفاذ کے قابل بناتی۔ اس کی تباہ کن روسی مہم کا باعث ایک حد تک یہی خواہش تھی کہ روس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ انگلستان سے تجارت کرنے سے انکار کرنے میں وہ بھی نپولین کا ساتھ دے۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو انگلستان کے مقبوضات میں راس امید، ڈیمیرارا، ایسے کوئیبو، ٹرینی ڈاڈ، سنٹ لوشیا، مالٹا اور سیلون کا اضافہ ہو گیا۔ دوسری طرف ولزلی کے تحت کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے شروع

۲۱۵

کیے ہوئے کام نے ہندوستان میں اتنی ترقی کی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بجائے اس کے کہ تجارتی کمپنی رہتی، مختلف مقاموں پر تجارت کرنے اور کارخانے کھولنے کی اجازت مانگنے پر قناعت کرتی اور ہندی حکمرانوں کی ناخوشی سے سہمی ہوئی رہتی، خود ہی حکمران بن گئی اور رقیبوں سے زیادہ طاقتور ہو گئی۔ اس کی آمدنی ان کی طرح خوب بڑھی اس کے زیر نگیں ان سے زیادہ نہایت وسیع علاقے آ گئے اور اس کی فوج بھی سب سے بڑھ کر طاقتور ہو گئی

اسباب کے ان ذریعوں پر تفصیلی بحث کرنا غیر ضروری ہے جن سے یہ عالمی قوت بنی۔ دوسری یورپی دولتوں سے جن کے پاس نوآبادیاں تھیں جنگ کرنے کی وجہ سے انگلستان کو ان نوآبادیوں کے جذب کرلینے کا موقع ملا۔ اس کام میں سب سے کارگر ہتھیار بحری قوت ثابت ہوئی۔ صرف ایک جنگ جس میں ہماری بحری قوت نے کوتاہی کی امریکہ کی جنگ آزادی تھی جو مجموعی حیثیت سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ آبادکاروں کے خلاف بحری قوت بیکار ثابت ہوئی اور ایک زمانے تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرانسیسی بیڑہ انگریزی بیڑے سے کسی طرح کم تر نہ تھا۔ شرق الہند کے جزیروں میں ہو جس سفرن پر قابو نہ پا سکا۔ ڈی گراس کارنوالس کی راہ میں رکاوٹ بن کر یارک ٹاؤن کی تسخیر کا باعث بنا۔ صرف غرب الہند کے جزیروں میں کچھ انگریزی جزیروں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن ۱۲ اپریل ۱۷۸۲ء کو جب کہ راڈنی نے گراس کی قلعہ بندی توڑ ڈالی انگریزی سیادت دوبارہ قائم ہو گئی اور یہی وہ جنگ ہے جس کی بدولت معاہدہ ورسائی انگلستان کے حق میں اس درجہ غیر مفید ثابت نہیں ہوا جتنا کہ ابتداً میں خیال تھا۔ ۲۱۶

جس طرح اس صدی میں انگلستان نے بیدار ہو کر یہ محسوس کیا کہ اس کے لیے بحری قوت کی بہت اہمیت تھی اسی طرح اس کے حریفوں کو بھی یہ بات محسوس ہوئی۔ ۱۷۸۰ء اور ۱۸۰۰ء کے مسلح غیر جانبداری کے

معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ سمندر میں اپنی موثر طاقت کو وسیع کرنے اور جہاں
کہیں دشمنوں کا مال ملے اس کو چھین لینے کے بارے میں انگلستان کے
حق اور مطالبے کی منفاومت کی جائے۔ جب مسلح غیر جانب دار دولتوں
نے یہ مطالبہ کیا کہ دشمنوں کا مال غیر جانب دار جہازوں میں ہو تو اس کو
دست برد سے بچایا جائے، داخلے سے ممنوع اشیا کی فہرست کی حد بندی
کی جائے، غیر جانبدار قافلوں کو تلاشی کے بغیر آمد و رفت کی اجازت
دی جائے، ناکہ بندی کی پابندی صرف اس وقت ہونی چاہیے جب کہ
مستحکم طریقے پر وہ نافذ کی گئی ہو، تو وہ انگریزی بیڑے کے اقتدار کو جو وہ
اپنے دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کر رہا تھا کم کرنے کی کوشش کر رہے
تھے اور غیر جانبداروں کو جنگجو دولتوں کے نقصان سے اپنی تجارت کو
وسیع کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ گو انگلستان نے ان قاعدوں میں سے
چند کو کچھ مدت کے لیے مان لیا، لیکن آخر میں انھیں رد کر دیا گیا اور نہ
صرف نقل و حمل کی تجارت بلکہ نو آبادیاں بھی فاتح بحر کا انعام بن گئیں۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں انگلستان ایک نو آبادیاتی قوت
بن گیا۔ لیکن انگلستان کے علاوہ دوسری قوتیں بھی موجود تھیں۔ ہسپانیہ،
پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کے باشندے بھی بیرونی اور نو آبادیاتی مقبوضات
حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ بعض سونے اور چاندی اور بعض
تجارت کی تلاش میں تھے اور بعض مذہبی ظلم و تعدی سے بیزار ہو کر نئے
وطن ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت تک انگریزوں نے جو کچھ حاصل کیا
تھا وہ مقصد اور طریق دونوں اعتباروں سے زیادہ تر افراد کا کام تھا
نہ کہ سلطنت کا۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں اس میں تغیر ہوا۔ ہسپانیہ
اور پرتگال، انگلستان کے خلاف ابتدا ہی سے اپنی نو آبادیوں کو سرکاری
معاملات میں سے ایک معاملہ سمجھتے تھے۔ جب فرانس نے بھی اسی طریقے
پر عمل شروع کیا تو اس حریف نو آبادیاتی دولت کے مقابلے کے لیے
افراد کی کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لیے قوم کی اجتماعی قوت سے کام

۲۱۷

لینا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ یہ کام اس قدر موثر طریقے سے انجام پایا کہ سنہ ۱۸۱۵ء تک برطانیہ عظمیٰ نہ صرف اپنے طور پر مستحکم ہو گیا بلکہ عظیم تر فرانس اور عظیم تر ہالینڈ کے بڑے حصے پر بھی اس نے قبضہ جما لیا۔ دوسری طرف ہسپانوی امریکی نوآبادیوں کی بغاوت کی وجہ سے عظیم تر ہسپانیہ کا بڑا حصہ ختم ہوگیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انگلستان نے نوآبادیاتی علاقہ حاصل کرنے والے متعدد حریفوں کا مقابلہ کیا اور ترقی کر کے دنیا کی سب سے بڑی نوآبادیاتی قوت بن گیا۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ واقعہ کس طرح ظہور میں آیا؟ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ وہ کیوں عمل میں آیا؟ اس کا جواب قدیم نوآبادیاتی نظریے میں مل جاتا ہے۔ آج کل ہمارے نزدیک نوآبادیوں کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ لیکن اکثر کا اس پر اتفاق ہے کہ نوآبادیاں اس لحاظ سے مفید ہیں کہ ان میں ہماری زاید آبادی کی کھپت ہو جاتی ہے لیکن قدیم نوآبادیاتی نظریے میں اس خیال کو کوئی جگہ نہیں دی جاتی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں زاید آبادی ہی نہ تھی؛ اس کے برخلاف اہل ملک کو یہ شکایت تھی کہ نوآبادیاں مادر وطن کو کمزور کر رہی تھیں اس لیے کہ ایسے لوگ وہاں سے کھنچ کر چلے جاتے تھے جن کے جانے سے ملک کا بڑا نقصان ہوتا تھا۔ نوآبادیوں کی قدر ایک بالکل مختلف سبب سے بھی کی جاتی تھی یہ یہ تھا کہ وہ تجارت کے مواقع بہم پہنچاتی تھیں۔ اس پر بظاہر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر یہی سبب تھا تو ہم ایسی نوآبادیوں کے حصول کے لیے جنگ کیوں کرتے تھے جن سے تجارت کی جا سکتی تھی؟ کیا دوسروں کی نوآبادیوں سے تجارت کرنا ممکن نہ تھا؟ جواب یہ ہے کہ کوئی ملک اس کو روا نہ رکھتا تھا کہ اس کی نوآبادیوں سے تجارت کی جائے۔ چنانچہ اس بنیاد پر سنہ ۱۷۳۹ء میں ہسپانیہ ہم سے لڑا۔ اگرچہ ہم ہسپانیہ یا ہالینڈ کے اس خود غرضانہ عمل کے خلاف غصے اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن ولندیزیوں کو ہماری نوآبادیاتی تجارت میں دخل دینے سے روکنے کی

۲۱۸

ہم نے انتہائی کوشش کی تھی۔ مزید براں جب فرانس محض اس وجہ سے کہ جنگ کے زمانے میں سمندر میں انگریزوں کا تسلط تھا، اس قابل نہ رہا تھا کہ اپنی نوآبادیوں سے آمد و رفت قایم رکھ سکے یا تجارت جاری رکھ سکے جو وہ عام طور سے اپنی رعایا کے لیے خاص طور سے محفوظ رکھتا تھا اور اسی لیے آخری چارۂ کار کے طور پر اس نے غیر جانبداروں کے لیے اس امید میں تجارت کا راستہ کھول دیا کہ اس کی نوآبادیاں، بہر طور غیر جانبدار جھنڈے کی تامین کی بدولت فایدہ اُٹھائیں گی تو انگلستان نے یہ اعلان کر دیا کہ جملہ غیر جانبدار ممالک جو فرانس کی نوآبادیاتی تجارت میں حصہ لیں گے ان کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ دشمن کی مدد کر رہے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے جہاز گرفتار کیے جا سکیں گے[1]۔ واقعہ یہ ہے کہ عام خیال یہ تھا کہ نوآبادیات محض مادر وطن سے اپنی تجارت جاری رکھیں، اس لیے کہ اسی کی بدولت مادر وطن کے ان مصارف اور زحمتوں کی تلافی ہو جاتی تھی جو نوآبادیوں کی وجہ سے اسے اُٹھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح فطری طور سے انگریز مدبران سیاست نے نوآبادیاتی تجارت کو اس طرح منظم کرنے کی کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ فایدہ انگلستان کو ہو۔ تجارتی خیالات سے ہمیں جو کچھ معلوم ہوا اس کے لحاظ سے یہ بتا دینا آسان ہے کہ کیا طریقۂ عمل رہا ہوگا۔ نوآبادیوں کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ مادر وطن کو پیداوار خام مثلاً شکر، تمباکو، روئی، نیل اور رنگ روانہ کریں جو انگلستان میں پیدا نہیں کیے جا سکتے تھے۔ چونکہ نوآبادیوں کو مادر وطن کے فایدے کی غرض سے استعمال کرنا مقصود تھا، لہذا یہ فایدہ اسی وقت زیادہ سے زیادہ ہو سکتا تھا جب کہ یہ اشیا ارزاں اور کثیر مقدار میں دستیاب ہوں۔ چنانچہ ان اشیا کو مخصوص کر لیا گیا تھا اور بجز انگریزی بندرگاہوں کے دوسری بندرگاہوں کو انھیں

۱۔ ۱۷۵۶ء کے جنگی قاعدے کے مطابق۔

روانہ کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ دوسری جانب نوآبادیوں سے اپنے مصنوعات کی برآمد جو وطن میں بھی تیار کیے جا سکتے تھے مذموم قرار دی گئی اور ایسے مصنوعات کی تیاری جن سے خود نوآبادیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں روک دی گئی۔ چنانچہ امریکی آباد کاروں کو اس کی اجازت نہ تھی کہ سنجاب کی ٹوپیاں بنائیں اگر وہ درآمد کردہ ٹوپیوں کے مقابلے میں ایک تہائی مصارف سے کچھ زیادہ سے انھیں تیار کر سکتے تھے اس لیے کہ ایسا کرنے میں اس کا اندیشہ تھا کہ انگریزی مال کی نکاسی نہ ہو سکے گی۔ اس طرح آبادکاروں کو اس کی اجازت تھی کہ وہ سلاخ کا لوہا ایک مدت کے لیے انگلستان روانہ کریں، اس لیے کہ انگریزی لوہے کی صنعت کوئلے کی کمی کی وجہ سے بے جان ہو رہی تھی اور اس کو فروغ دینے کے معنی یہ تھے کہ جنگلوں کی مزید تباہی کرنی پڑتی۔ پھر بھی وہ نہ تو لوہے کی کیلیں بنا سکتے تھے اور نہ کوئی ایسی چیز ڈھال سکتے تھے جو انگریزی برآمد میں رکاوٹ ہو۔ کون کون اشیا برآمد کریں، کہاں روانہ کریں، اس بارے میں بندشیں عاید کیے جانے کی وجہ سے نیز بہترین بازار میں اشیا فروخت کرنے کی مزاحمت کے باعث اور محض مادر وطن کو فایدہ پہنچانے کی خاطر ایسے گراں اشیا خریدنے کی مجبوری کی وجہ سے جن کو ان میں سے اکثروں نے دیکھا بھی نہ تھا امریکی آباد کاروں کی وفاداری پر ناواجب بھیس لگی۔ یہ مناسب اور حق بجانب ہے کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔ لیکن دوسرے پہلو کے بعض ملحوظات کو بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ انگلستان کو اپنے نوآبادیوں کی خاطر زیادہ مصارف اٹھانے پڑے اور بجز اس کے کہ ان سے تجارت کے ذریعے سے بالواسطہ نفع پہنچا انگلستان کو کوئی آمدنی وصول نہیں ہوئی۔ انگلستان نے ان کی جو حفاظت کی اگر اس کی انھوں نے قدر کی (اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس کی حفاظت کے بغیر وہ فرانس کا شکار بن جاتے) تو اس کی قیمت انھیں ادا کرنی پڑی اس کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ

۲۱۶

نہیں اس مسئلے کو آزاد تجارت کے لحاظ سے نہ دیکھنا چاہیے۔ مادر وطن اور نو آبادیاں دونوں تجارتی خیالوں سے واقف تھے۔ یہ خیالات عام تھے اور محض امریکی نو آبادیوں ہی پر تجویزوں کے اس طریقے کا اثر نہیں پڑ رہا تھا بلکہ جزائر غرب الہند کے نو آبادیوں سے بھی اس قسم کا سلوک کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ وفادار رہیں۔ اس کے علاوہ مادر وطن کے لیے اپنے نو آبادیوں سے اچھے تعلقات رکھنا ایسی حالت میں بھی ممکن ہے جب کہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی اپنی صنعتوں کی تامین پر تلے ہوئے ہوں۔ چنانچہ اب ہمارے خلاف ہماری نو آبادیاں بعینہ یہی کر رہی ہیں۔ امریکی آباد کاروں کے پاس شکایتوں کی معقول وجہ تھی اور ان شکایتوں کو باہمی صلح سے دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ممکن ہے کہ آباد کاروں کا عمل جتنا ناشکر گزارانہ تھا اتنا ہی ہمارا عمل غیر دانشمندانہ رہا ہو۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ محض حقوق پر بہت زیادہ زور دینا اچھا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ زیر بحث زمانہ ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن محض حقوق کی حد تک انگلستان کسی طرح آباد کاروں سے کم حق بجانب نہ تھا۔

بدنصیبی سے کسی ایک فریق نے ضرور حقوق کے مقابلے میں احساسات کو ترجیح دی۔ پھر بھی آباد کاروں نے اپنے آپ کو کتنا ہی مظلوم نہ خیال کیا ہو، بغاوت کا اس وقت تک کوئی حقیقی خطرہ نہ تھا جس وقت تک کہ فرانس کے قبضے میں کنیڈا تھا اس لیے کہ انگلستان سے قطع تعلق کرنے کے معنی فرانس کے پنجے میں پھنس جانے کے تھے۔ لیکن جب کنیڈا فتح کر لیا گیا اور براعظم سے فرانسیسی بالکل ہٹا دیے گئے تو انگریزی قوانین کے متعلق یہ خیال کیا جانے لگا کہ وہ بہت زیادہ سخت اور غیر معقول تھے۔ اب تک آباد کاروں نے محض اس لیے ان کی مخالفت نہیں کی کہ مادر وطن جنگ کے زمانے میں ان کی حفاظت کرتی تھی لیکن جب حفاظت کی ضرورت نمایاں ہوتی گئی تو احسان شناسی میں کمی ہونے لگی اور لوگ یہ

۲۲۰

سوال کرنے لگے کہ انگلستان ان سے جو فایدے حاصل کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں انھیں کیا فایدے حاصل ہوئے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ وہ انگلستان کو سستے خام اشیا مہیا کر رہے تھے اور اس کے مصنوعات خرید رہے تھے۔ اس کا معاوضہ انھیں یہ دیا جا رہا تھا کہ ان کی اولوالعزمیوں اور حوصلہ مندیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جا رہی تھی' ان کے مصنوعات پر بندشیں عاید کی گئی تھیں اور انھیں پسماندہ حالت میں رکھا گیا تھا۔ اس لیے ان کا خیال یہ تھا کہ اگر انھیں ترقی کرنے کا موقع دیا گیا تو وہ انگلستان کی اعانت کے بغیر ترقی کرنے لگیں گے۔ نوآبادیوں اور مادر وطن دونوں کے سامنے اپنی اپنی ذاتی غرضیں تھیں اور اس سے آگے وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انگریزوں کی نظروں میں نوآبادیاں ناشکرگزار اولاد تھی جو اگلی عنایتوں کو و احسانوں کو بھول رہی تھی اس کے برخلاف نوآبادیوں کے نزدیک انگلستان سوتیلی ماں تھی جو اپنے بچوں سے اسی طرح برتاؤ کرتی تھی کہ گویا وہ اس کے نوکر تھے۔ اس اساسی واقع کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا کہ ان میں آپس میں ماں اور بچوں کا سا تعلق تھا۔ اسی وجہ سے جب انگلستان نے آگے قدم بڑھایا اور امریکی نوآبادیوں سے براہ راست آمدنی وصول کرنے کی کوشش کی تو ہیجان بڑھ کر بہت جلد نفرت کی حد تک پہنچ گیا اور اس کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں نکلا اس کا الزام سراسر گرین ول، ٹاونشنڈ اور نارتھ کے سر نہ تھوپنا چاہیے جنھوں نے اسٹامپ کا قانون اور درآمد کا محصول لگایا تھا۔ گو ان کا عمل بہت خطرناک طریقے پر تھا۔ وہ زخم پر بجائے تیل ڈالنے کے سرکہ چھڑک رہے تھے۔ لیکن زخم انھی کے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ کام قدیم نوآبادیاتی نظام کا تھا اور یہ زخم اس تجارتی خیال کا نتیجہ تھے کہ انگلستان کو وطن ہی میں مضبوط بنانے کے لیے ہر شئے کو قربان کر دینا چاہیے۔

قدیم نوآبادیاتی نظام ہی کی وجہ سے انگلستان کی نوآبادیاں ہاتھ سے نکل گئیں۔ لیکن بہت کچھ باقی رہ گیا اور اس سے زیادہ کا

۲۲۱

بہت جلد اضافہ عمل میں آیا۔ ٹاؤنشنڈ کی امریکہ پر محصول لگانے کی احمقانہ پالیسی کے ایک سال بعد یعنی ۱۷۶۸ء میں کُک نے اپنے ان بحری سفروں کے بڑے سلسلے کا آغاز کیا جس سے انگریزی مقبوضات میں زبردست اضافہ ہونے والا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں لارڈ نارتھ نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لی اور ان ہی کے دور حکومت میں امریکی نوآبادیوں نے آزادی حاصل کر لی۔ اسی سال کُک آسٹریلیا کے ساحل پر پہنچا اور بحق شاہ جارج اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی قدر و منزلت کا احساس بہت زمانے کے بعد ہوا۔ ہندوستان میں ہماری سیادت کی توسیع، کینڈا میں ہمارا ترقی پذیر تسلط اور ولندیزی قبضے سے کیپ آف گڈ ہوپ کی تسخیر نسبتاً زیادہ مفید معلوم ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دوسری توسیع کے پورا ہونے تک تجارتی خیالات میں گھٹاؤ پیدا ہو گیا تھا اور ان کے خاتمے کے ساتھ قدیم نوآبادیاتی نظام بھی ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ ایک نئی پالیسی نے لے لی جو حب وطن اور جذبات پر زیادہ اور مالی نفع نقصان کے مادی ملحوظات پر کم مبنی تھی۔ نوآبادیوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے خیالات کے مطابق اپنی حکومت کا آپ انتظام کریں بجائے اس کے کہ نوآبادیوں کا انتظام اس طرح کیا جاتا کہ گویا وہ ایک بڑی تجارتی کمپنی کی قائم کردہ شاخیں تھیں۔ اسی نئی پالیسی کے متعلق ہم کسی باب میں زیادہ تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں یہ بتا دینا کافی ہے کہ اس کو بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی یہاں تک کہ ہمیں ابتدائی نوآبادیوں کے چلے جانے کا افسوس باقی نہیں رہا۔ ہمیں یہ غیر معمولی سماں دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے جزیرے کے قبضے میں اتنی زیادہ نوآبادیاں ہیں جو پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں اور ہم شکر گزاری کی جانب مائل ہوتے ہیں کہ ہم اس بڑی سلطنت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے جس نے امریکہ میں ہمارے ہاتھوں سے مضبوط ہو کر اس درجہ ترقی کر لی ہے۔ یہ خیال معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی

ایک خیال ہو سکتا ہے کہ آزادی ناگزیر ہو چکی تھی گو اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری بات نہ تھی کہ نوآبادیاں جو انگلستان کے ۲۲۴ بچے تھے اسی کے دشمن بن جاتے۔ ناانصافی کا احساس تجارتی فایدے حاصل کرنے سے محرومی کا نتیجہ تھا اور اس احساس میں محصول عاید کرنے کی مہمل کوششوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ شدت پیدا ہوگئی تھی اور آخر اس نے آبادکاروں کو بغاوت، علیحدگی اور آزادی کی طرف مائل کیا۔ لیکن معاملے یہیں ختم نہیں ہوئے، قومی دشمنی باقی رہی جس کو ۱۸۱۲ء کی جنگ نے خوب بڑھا دیا جو جنگ علیحدگی کے زمانے میں اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ دنیا کی انگریزی بولنے والی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کو عام طور سے حسد اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتی تھیں اور یہ طرز عمل بڑی حد تک انگلستان کی اٹھارھویں صدی کی تجارتی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ حالیہ واقعات نے دونوں ملکوں کے درمیان زیادہ دوستانہ احساسات پیدا کر دیے ہیں۔ لیکن یہاں اس بحث میں پڑنا بیکار ہے کہ آیا ان کے مستقل صورت اختیار کرنے کا امکان ہے یا نہیں۔

باب ۱۵

مشینری اور قوت محرکہ

پچھلے باب میں ہم برطانیہ عظمیٰ کی وسعت اور ترقی کا حال بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح ایک بڑی شاندار سلطنت کی بنیاد قایم ہوئی۔ چنانچہ اس کے پھیلاؤ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ایک قومی ضرب المثل ہوگئی ہے کہ اس پر سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ لیکن جتنی وسیع سلطنت برطانیہ ہے اس سے زیادہ وسیع برطانوی تجارت ہے۔ ابتدا میں انگریزی نوآبادیات کی قدر و وقعت اس وجہ سے کی جاتی تھی کہ ان کی بدولت انگلستان کو ایک وسیع بازار ملتا تھا۔ یورپی ممالک یا ان کے نوآبادیوں سے تجارت کرنے میں اس کا امکان تھا کہ ہم پر حد بندیاں اور بندشیں عاید کی جائیں لیکن اپنی نوآبادیوں کی حد تک ہم من مانے ڈھب سے عمل کر سکتے تھے۔ اگر ہم اس پالیسی پر قایم رہتے اور اس سے آگے نہ بڑھتے یعنی اگر ہم نوآبادیوں کی شکل میں ایک بڑی شاندار ایسی سلطنت قایم کر لیتے جو کسی دوسری قوم کے کام کو ماند کر دیتی اور زیادہ تر اسی سلطنت کے دایرے کے اندر ہی اپنی تجارت کو محدود رکھتے تو انگلستان اس وقت بھی

۲۲۴ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی ملک رہا اور کسی اور ملک کے مقابلے میں اس کے جہاز، اس کی مشینیں اور اس کی تجارت زیادہ ہوئی۔ لیکن انگلستان کا کارنامہ اس سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ وہ اپنے وسیع نوآبادیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر اس نے اس دائرے سے آگے بھی قدم بڑھایا اور عالمی تجارت کے میدان پر بھی دھاوا کر دیا۔ وہ بڑی حد تک دنیا کا کارخانہ، دنیا کے زر کا بازار اور دنیا کا حمال بن گیا ہے۔ یہ نہیں کہ دوسری قومیں خاموش بیٹھی دیکھتی رہی ہوں کہ برطانوی مشینیں ان کی اپنی صنعتوں کی جگہ لیں اور ان کی احتیاجوں کی کفیل بنتیں۔ بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے برطانوی مصنوعات کے داخلے کی مخالفت کی اور تائینی نظام کے ذریعے سے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ ایک زمانے تک بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں فطری طور سے تجارتی سہولتیں حاصل تھیں جن کی بنا پر ہمیں دنیا کی تجارت کے عظیم ترین شعبوں کا اجارہ حاصل تھا اور برطانوی چیزیں اس قدر سستی تھیں کہ براعظم کے صناع تائین کی مدد کے باوجود ہمارا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صورتوں میں آج کل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان فائدوں اور سہولتوں میں کمی ہو رہی ہے اور ہمارے میں رخنے پڑ رہے ہیں۔ لیکن اگر انگلستان دنیا کا واحد کارخانہ نہ بھی رہا ہو۔ تب بھی وہ بہت بڑا کارخانہ ضرور شمار ہو سکتا ہے۔ اور یہ ایک قومی خصوصیت ہے جو ہماری روئے زمین پر پھیلی ہوئی نوآبادیاتی سلطنت سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کی ترقی دوش بدوش ہوئی اور ہر دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انگلستان مصنوعات میں تسلط اور فوقیت حاصل کیے بغیر ایک عظیم الشان نوآبادیاتی قوت بن جاتا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں ہسپانیہ کی بعینہٖ یہی

حالت ہوئی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انگلستان کسی بڑے نوآبادیاتی علاقے کو زیرنگیں لائے بغیر اپنی تجارت اور صنعتوں کے ذریعے سے مالدار بن جاتا۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں بلجیم کی یہی حالت ہے۔ لیکن انگلستان نے دونوں اعتباروں سے بڑی ترقی کی ہے۔ وہ نہ صرف ایک بڑی نوآبادیاتی قوت ہے بلکہ ایک بڑی صنعتی قوت بھی ہے اور کامیابی کے لیے جو قدرتی حالات اور سہولتیں ضروری ہیں وہ سب خوش نصیبی سے اس کو حاصل ہیں۔

۲۲۴

واقعہ یہ ہے کہ سمندر پر تسلط اور تجارت و صنعت کی ترقی کا انحصار قدرتی حالات پر ہے۔ موجودہ زمانے میں صنعتیں کوئلے کی کانوں کی سمتوں میں ہوتی ہیں جہاں دخانی قوت سستی مل سکتی ہے۔ بحری تجارت کے لیے عمدہ بندرگاہوں کا ہونا ضروری ہے۔ جس ملک میں چوڑے پاٹ کے آہستہ بہنے والے دریا قدرتی نہروں کا کام دیتے ہیں وہاں اندرونی آمدورفت کی سہولتیں ان ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ہوں گی جو کوہستانی سلسلے سے پٹے پڑے ہیں۔ اگر تفصیلی اور گہری نظر ڈالی جائے تو یہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ لنکاشائر کی مرطوب آب و ہوا سوتی مصنوعات کے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اس صنعت کے متعلقہ کاموں کے لیے ہوا میں رطوبت ضروری ہے۔ یارک شائر کے خشک چونے کے کنکروں کے پہاڑی سلسلے رمنے کی بہترین گھاس مہیا کرتے ہیں اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اونی صنعتیں ان پہاڑیوں کے دامن میں اکٹھی ہیں اسٹافورڈشائر میں خام لوہا نکالا جاتا ہے۔ لیکن سسکس کے خام لوہے کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں کوئلے کی کانیں بہت ہی ملی ہوئی اور دوسری صورت میں بہت دور ہیں[1]۔ قدرتی سہولتوں کی اہمیت جتانے کے لیے

---

[1] مثلاً اگر کینٹ کی کوئلے کی کانیں کامیاب ہوئیں تو جنوبی ضلعوں کا خام لوہا اگر نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے کافی اچھا ہو تو دوبارہ قابل قدر ہو جائے گا۔

مثالوں کی بھر مار کر دینا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ہر شخص ان کی اہمیت مانتا ہے۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ انگلستان کا دامن ان سہولتوں سے مالا مال ہے، اس کی کوئلے اور لوہے کی کانیں ایک دوسرے سے قریب ہیں، اس کی بھیڑوں سے بہترین اون حاصل ہوتی ہے، اس میں بندرگاہیں بہت ہیں، دریاؤں کے معاملے میں بھی وہ گھاٹے میں نہیں ہے اور ملک کا کوئی حصہ سمندر سے ستر میل سے زاید فاصلے پر نہیں ہے، تب بھی تفصیلوں کی فہرست پوری نہیں ہوتی۔ یہ امر ذکر کے قابل ہے کہ اگرچہ انگلستان کو ہمیشہ سے قدرتی سہولتیں حاصل رہی ہیں، پھر بھی ان کو استعمال کرنے کا وہ ہمیشہ سے خوگر نہیں رہا ہے۔ اٹھارھویں صدی کی صنعتی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قوم کو اپنے مادی ذریعوں اور خاصکر اپنے کوئلے کی کانوں کی قدر و منزلت کا کس طرح علم ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ بولٹن نامی ایک شخص جو جیمس واٹ کا شریک کار تھا جارج سوم سے یہ عرض کرنے لگا:۔ "جناب عالی! میں وہ شے فروخت کرتا ہوں جو تمام دنیا کو مطلوب ہے، یعنی قوت محرکہ" اور یہ بیان بالکل درست تھا۔ اس لیے کہ اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصے اور انیسویں صدی کی ابتدا میں انگلستان نے یہ دریافت کر کے دنیا پر ظاہر کر دیا کہ قوت محرکہ کے ذریعے سے مشینری کو حرکت دے کر کیا کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان اس دوڑ میں سب سے بازی لے گیا اور اس کے قدرتی ذریعوں سے اولیت کا سہرا اسی کے سر رہا۔ اب حریف قومیں بھی ترقی کی ان ہی شاہراہوں پر چل کر اپنی پسماندہ حالت کو ٹھیک کرنے کے جتن کر رہی ہیں۔

۲۲۵

اٹھارھویں صدی میں انگلستان کی حیرت انگیز صنعتی ترقی کی سرگزشت زیادہ تر میکانکی ایجادوں کی سرگزشت ہے۔ پہلا قدم خاص انگریزی صنعت یعنی پارچہ بافی کے سلسلے میں اٹھایا گیا۔ اونی تجارت کے اہم حالات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ گھریلو صنعت تھی۔ جلاہا

اپنے راچھ پر اپنے ہی جھونپڑے میں کام کرتا تھا اور کبھی کپڑے والے کے لیے کام کرتا تھا جو اس کو سوت مہیا کر دیتا تھا اور بنا ہوا کپڑا اس سے لے لیتا تھا۔ کبھی وہ اپنے طور پر بھی کپڑا تیار کرتا تھا۔ اس صورت میں اس کو سوت اپنے طور پر مہیا کرنا پڑتا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایک جلاہے کو کام پر لگائے رکھنے اور کافی سوت مہیا کرنے کے لیے چھ سوت کاتنے والوں کی ضرورت تھی۔ لیکن سوت کی اتنی کمی نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ سوت کی کتائی ایک وسیع ذیلی صنعت تھی جس میں عورتیں اور لڑکیاں تمام فرصت کے اوقات میں کام کرتی تھیں دیہات میں گھرانے کے گھرانے لمبے جاڑے کی شام میں سوت کاتنے میں لگے رہتے تھے اور اس طرح سوت کی رسد ان تھک کوشش سے طلب کا ساتھ دیتی رہی۔ لیکن ہمارے موجودہ اغراض کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ میکانکی حیثیت سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے کاروبار نے بہت کم ترقی کی تھی۔ تیار کیے ہوئے کپڑے کی قسموں کی اصلاح کی گئی اور انھیں ترقی دی گئی تھی۔ لیکن جو کلیں استعمال میں تھیں یعنی چرخہ اور راچھ وہ اس قسم کے تھے جو پرانے زمانے سے چلے آرہے تھے۔

۱۷۳۳ء میں ایجادوں کے وسیع میدان میں پہلا قدم بڑھایا گیا جب کہ بیری کے باشندے "کے" نے متحرک نال کا حق ایجاد اپنے لیے محفوظ کرا لیا۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ جلاہے کو تانے کے تاروں میں سے بانے اور نال کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لینا پڑتا تھا جو فطری طور سے بہت ہی سست عمل تھا۔ اس کے علاوہ اس عمل کے کپڑے کا عرض بھی چھوٹا رہتا تھا کیونکہ ایک آدمی کے دونوں ہاتھ اپنے سامنے کی جتنی جگہ گھیر سکتے تھے صرف اس حد تک وہ کپڑا بنا جا سکتا تھا۔ چوڑے عرض کا کپڑا[1]

[1] عام طور سے کپڑے کی چوڑائی $\frac{3}{4}$ گز ہوتی تھی۔ یہ واقعہ کہ اب بھی اکثر کپڑوں کا عرض عام طور سے

بننے کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی جن میں سے ہر ایک دوسرے کو نال منتقل کرتا تھا۔ کمے کی ایجاد سے نال کو میکانکی طور سے ایک طرف سے دوسری طرف حرکت دی جاسکتی تھی جس کی وجہ سے جلاہا زیادہ عرض کے کپڑے کو اتنی ہی سہولت سے بننے کے قابل ہوگیا جتنی آسانی سے وہ کم عرض کا کپڑا پہلے بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اب کام کی رفتار بھی دگنی ہوگئی۔

دستی راچھ کی اصل اصلاح و ترقی نے سوت کاتنے والوں اور جلاہوں کے باہمی تعلقات پورے طور پر درہم برہم کردیے اسوقت تک سوت کاتنے والوں کے لیے پھرتی سے کام کرنا اور جلاہوں کا ساتھ دینا دشوار تھا۔ لیکن اب ناممکن ہوگیا۔ کتے ہوئے سوت کی رسد اتنی کم ہوتی تھی کہ اپنے دن کے کام کا آغاز کرنے سے پہلے تین چار میل کا دورہ کرنا پڑتا تھا اور دن بھر کے کام کے لیے کتا ہوا سوت اکٹھا کرنے کے واسطے کئی لوگوں کے پاس چکر لگانے پڑتے تھے۔ اس پریشانی کی وجہ سے سوت کاتنے والے میکانکی اصلاح و ترقی کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انھیں کامیابی حاصل کرنے میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ سنہ ۱۷۶۴ء میں دستی راچھ پر کام کرنے والے جلاہے جیمس ہارگریوز (بلیک برن کے باشندے) کا سوت کاتنے کا چرخہ جب زمین پر الٹ کر گرا تو چرخا تو گھومتا رہا لیکن دھاگہ اسی کے ہاتھ میں رہا جس سے اسے کتائی کی کل کا دھیان آیا۔ اس طرح پہلی دفعہ جو مشین تیار ہوئی وہ ایک چکر میں آٹھ ریشوں کو بٹ سکتی تھی۔ لیکن بہت جلد یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ اس سے بھی زیادہ کام کرسکتی تھی اور چونکہ بچے بھی اس پر کام کرسکتے تھے اس لیے کاتنے والوں کی پیداوری بہت بڑھ گئی۔ ہارگریوز کے بعد رچرڈ آرکرائٹ نے ایک اور کل ایجاد کی۔ چنانچہ بیلنوں کے ذریعے سے سوت کی کتائی کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہی ہوتا ہے، متحرک نال کے استعمال سے پہلے کے زمانے کی یادگار ہے۔

کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا۔ بیلنوں کی رفتار چونکہ کم و زیادہ کی جا سکتی تھی اس لیے ضرورت کے موافق دھاگے کو باریک بنایا جا سکتا تھا۔ آرک رائٹ کی کل پانی سے چلتی تھی اور اسی لیے اس کے کتے ہوئے سوت کا نام "آبی سوت"[1] پڑ گیا۔ اس کی مدد سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور مضبوط دھاگا تیار ہوتا تھا۔ آخر میں کرامپٹن ہارگریوز کے چرخے اور آرک رائٹ کے آبی کل کے اصول کو ملا کر اپنا ایک خاص ململ بننے کا چرخہ تیار کیا جو بعد "میول"[2] کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی مدد سے اور بھی زیادہ دھاگا کاتا جانے لگا جو انگلستان میں کبھی نہیں ملتا تھا۔ ۲۲۷

ان تینوں ایجادوں کے نتیجے نہایت اہم ہوئے۔ ابتدا میں اگرچہ ان سب کو کپاس کے سوت کی کتائی کے لیے استعمال کیا گیا۔ پھر بھی بعد ہی یا دیر سے ان سے دوسری پارچہ بافی کی صنعتوں میں بھی کام لیا جانے لگا۔ اس طرح جلا ہے کو سوت کی کتائی کرنے والے کے مقابلے میں جو سہولت تھی وہ باقی نہیں رہی۔ یہ صورت حال سب سے اول سوت میں، اس کے بعد کتان میں اور سب سے آخر میں اون کو پارچہ بافی کی صنعت میں پیدا ہوئی۔ اس صدی کے ختم تک ہاتھ سے سوت کاتنے کا طریقہ موقوف ہو گیا اور ان کا سوت کاتنے کی زیادہ وسیع صنعت میں بھی کلوں کے مقابلے کے مضر اثرات روز افزوں محسوس کیے جانے لگے۔ جملہ موجدوں کو ایک ہی طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اور سب کے سب عوام کی سختیوں سے دوچار ہوئے۔ لیکن ہر ایجاد کے نتیجے جدا گانہ تھے۔ ہارگریوز نے سوت کاتنے والوں کو اس قابل بنا دیا کہ متحرک نال سے جو کام کیا جائے وہ اس کا ساتھ دے سکیں۔ آرک رائٹ کے "آبی سوت" نے انگلستان میں اصلی سوتی اشیا کی تیاری کو پہلی دفعہ ممکن ثابت کر دکھایا۔

[1] Water Twist
[2] Mule

اب تک کوئی بھی ایسا سوت کاتنے کے قابل نہ ہوا تھا جو کافی مضبوط ہو اور تانے کے طور پر استعمال ہو سکے اور کتان کے تار اس غرض کے لیے استعمال کرنے پڑتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ جو سوتی کپڑے تیار ہوتے تھے وہ نصف سوت اور نصف کتان کا مرکب ہوتے تھے۔ لیکن آبی سوت یا آبی کل کا کتا ہوا دھاگا اتنا کافی مضبوط ہوتا تھا کہ کتان کی بجائے استعمال کیا جانے لگا[۱]۔ جس طرح خالص سوتی کپڑے کی تیاری کو آرک رائٹ نے ممکن بنا دیا اسی طرح کرامپٹن کے مہین سوت نے انگلستان میں ململ کی تیاری کا آغاز کر دیا۔

راچھ، آبی کل اور چرخے میں قوت محرکہ کے ذریعے سے کام کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور پہلی قوت جو استعمال کی گئی وہ پانی تھا۔ چنانچہ اس کی بدولت لنکا شائر اور یارک شائر میں دریاؤں کے ساحل پر بکثرت کرنیاں قائم ہو گئیں جن کا ذکر کسی دوسرے باب میں مناسب ہو گا۔ لیکن اس اثنا میں دستی راچھ انسانی قوت کا محتاج رہا۔ جب ایک پادری ایڈمنڈ کارٹ رائٹ نامی نے آرک رائٹ کی کرنی کا معائنہ کیا تو اسے یہ دھیان آیا کہ ایک کل کپڑا بننے کے لیے بھی بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن جب لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تو اس نے اپنے خیال کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کوشش شروع کی جس کا نتیجہ قوت سے چلنے والا پہلا راچھ تھا۔ یہ کل نہایت بھدی تھی۔ لیکن تجربے کے ساتھ ساتھ موجد نے اس میں اصلاحیں کیں۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء میں مانچسٹر کی ایک فرم نے ۴۰۰ کلوں کے خریدنے کا ٹھیکا لیا۔ اس کی پہلی کل بیلوں سے چلائی گئی۔

۲۲۸

[۱] یہ عجب بات ہے کہ آرک رائٹ کے سوتی کپڑے پارلیمنٹ کے ۱۷۳۶ء کے ایک قانون سے تجاوز کر جاتے تھے۔ کیونکہ اس قانون کی رو سے خالص سوتی کپڑے بنانے کی ممانعت اس مفروضے کی بنیاد پر تھی کہ ممکن ہے کہ یہ انگریزی ساخت کے نہ ہوں اور مشرق میں تیار کیے گئے ہوں۔ یہ قانون ۱۷۷۴ء میں منسوخ ہو گیا۔

لیکن ۱۷۸۹ء میں اس کے ڈسکا مسٹر کے کارخانے میں دخانی انجن نصب کیا گیا۔ اس نے اون کو صاف کرنے کے لیے بھی ایک کل ایجاد کی۔ اس عمل کو پہلے ہاتھ سے انجام دیا جاتا تھا اور اس قدر سست رفتار کے ساتھ کہ اون کو صاف کرانے کی وقت کاتنے والوں کی راہ میں بڑی روک تھی۔ اور اس طرح صاف اون کی رسد میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ اور لوگوں نے کارٹ رائٹ کے کام کو جاری رکھا۔ ایڈ کلف اور ہارکس نے خاص طور سے قوت سے چلنے والے راچھ میں اصلاح کی۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء تک اس کل کا بخوبی رواج ہو گیا! اور اس کی بدولت جلاہے اپنی جگہ کاتنے والوں کا ساتھ دینے کے قابل ہو گئے۔ اس قسم کے دوسرے کاموں میں بھی جلد جلد ایجادیں ہوتی رہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندے بل نے اسطوانے کے ذریعے سے کپڑے کے چھاپے کا ایجاد کیا جس سے دس انچ طول اور پانچ پانچ انچ عرض والے دستی بلاک کی چھپائی کا پرانا طریقہ متروک ہو گیا۔ اس کی بدولت ایک آدمی کل کے ذریعے سے اتنا کام کر سکتا تھا جتنا سو آدمی پرانے طریقے کے تحت کر سکتے تھے۔ ہیث کوٹ کی گوٹا کناری بنانے کی کل اپنی ترکیب نزاکت اور کامیابی کے اعتبار سے عجوبہ روزگار بنی ہوئی تھی۔ مرے کی سن صاف کرنے اور کاتنے کی کلوں نے کتان سازی کے تمام شعبوں میں کلوں کے استعمال کا راستہ صاف کیا۔ بنجمن گوٹ نے ان کلوں کو مناسب ترمیم کے بعد اونی صنعت میں استعمال کیا جو پہلے سوتی پارچہ بافی میں استعمال ہوتی تھیں[1]۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام پارچہ بافی کی صنعتوں میں مشینری سے وہ سب کام لیا جانے لگا جو پہلے ہاتھ سے انجام دیا جاتا تھا۔ کلوں سے بڑی تعداد میں کپڑے تیار ہونے لگے اور اسی کے مطابق قیمتوں میں

[1] سوتی کپڑوں کو مشینری کو مناسب ترمیم کے بعد اونی اور کتان کے کاموں میں استعمال کرنا اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے سے شروع ہوا۔

بھی تخفیف ہو گئی۔ ایک یا دو عددی مثالیں لو تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۱۲ء میں دو ہزار تین سو اور ۱۸۳۳ء میں ایک ۔۔۔ لاکھ قوت سے چلنے والے رانچھ استعمال میں تھے۔ ۱۷۴۰ء میں ڈیڑھ ملین پونڈ روئی اور ۱۸۱۵ء میں تقریباً ایک سو ملین پاونڈ روئی برآمد ہوئی۔ ۱۷۴۲ء میں کپڑے کے ایک لاکھ تھان یارک شائر کی گرنیوں میں تیار ہوئے۔ لیکن ۱۸۱۵ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۵ لاکھ ہو گئی اور ہر تھان کا طول سابق کے مقابلے میں دگنا تھا۔

اس غیر معمولی ترقی کا جو اثر کام کرنے والے طبقے پر پڑا اس کی بحث کسی باب کے لیے ملتوی کر دینا ضروری ہے۔ موجودہ حالت میں ذکر کے قابل یہ واقعہ ہے کہ پہلے جو کام ہاتھوں سے انجام پاتے تھے انھیں پیچھے بعد دیگر مشینری کے ذریعے سے انجام دیا جانے لگا۔ لیکن ان تمام مشینوں کو چلانے کے لیے قوت کی ضرورت تھی۔ ہوا کا رُخ بدلتا رہتا تھا اس لیے اس سے ہر وقت کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ آبی قوت صرف اس مقام کے لیے مناسب تھی جہاں وہ میسر آ سکتی تھی۔ لیکن ہر جگہ اس کا میسر آنا ناممکن تھا۔ چنانچہ مسطح مشرقی ضلعے اس اعتبار سے بہت ہی گھاٹے میں تھے۔ لیکن انگلستان کی کوئلے کی کانوں میں قوت کے پوشیدہ خزانے موجود تھے جن سے بالکل کام نہیں لیا گیا تھا۔ جیمس واٹ وہ پہلا شخص تھا جس نے اس سے موثر طور پر کام لینے کا طریقہ بتلایا۔ گو واٹ کی ایجادیں نہایت اہم اور نتیجہ خیز تھیں لیکن اس کے متعلق یہ کہنا غلطی ہے کہ وہ دخانی انجن کا موجد تھا۔ دخانی انجن میں متعدد ایجادیں شامل ہیں اور ۱۷۶۳ء میں جب واٹ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کی نوعیت کھلونے کی سی نہیں رہی۔ جوں ہی نیو کامن[۱] نے اسطوانے اور فشارے کے استعمال کو متعارف کیا دخانی انجن یا نام نہاد "آگ انجن" پانی کو نیچی سطح سے اوپر

[۱] تقریباً اٹھارھویں صدی کے آغاز میں۔

کھینچنے کے کام میں لایا جانے لگا۔ سنہ ۱۷۷۵ء میں اسمی ٹن نے ایک بڑا انجن بنایا جس میں ۶ فٹ قطر کے اسطوانے اور ۹½ فٹ کے ضرب تھے۔ لیکن یہ دیو پیکر انجن سالانہ کم از کم تین ہزار پاونڈ قیمت کا کوئلہ ہضم کر جاتا تھا۔ ان تمام نقائص کے باوجود "آگ انجن" کانوں میں بکثرت استعمال کیے جاتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۷۶۷ء میں نیوکیسل کے اردگرد ۷۵ انجن کام کر رہے تھے اور بروبیک نے بمقام کیرن اپنی بھٹیوں کے لیے بھی ایک انجن نصب کیا تھا اگرچہ یہاں جو قوت حاصل کی جاتی تھی وہ بالواسطہ تھی۔ پن چاک کو گھمانے کے لیے انجن پانی کھینچتے تھے اور پن چاک سے دھونکنی حرکت کرتی تھی۔ فشارے کے ڈنڈے کی طولی حرکت کو پہیے کی گردشی حرکت میں تبدیل کرنے کی تجویز ابھی تک اختیار نہیں کی گئی تھی۔[1]

۲۳۰

انجن دو وجہوں سے بیش خرچ تھے۔ ایک تو وہ ساخت میں ناقص تھے اور دوسرے ان کا اصول بھی ناقص تھا۔ بھاپ، فشارے کے نیچے کے اسطوانے کو بھرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور وہاں کثیف ہو جانے کی وجہ سے فشارے کے نیچے ایک خلا قائم ہو جاتا تھا اور کرہ ہوا کا دباؤ اس کو نیچے کی جانب ڈھکیل دیتا تھا۔ انجن بھاپ کی قوت سے کام نہیں کرتا تھا۔ اسطوانے میں بھاپ کو کثیف کرنے کی یہ روش بہت ہی غیر کفایت شعارانہ تھی، اس لیے کہ ہر ضرب کے بعد اسطوانے کو ٹھنڈا کیا جاتا تھا اور اس کے بعد دوبارہ گرم کرنا پڑتا تھا۔ واٹ کا پہلا بڑا ایجاد جداگانہ مکثف تھا جس کی بدولت اسطوانے کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس نے پھر دوہرا عمل کرنے والے انجن بنائے۔ یعنی بھاپ کے دباؤ سے فشارے کو اوپر اٹھانے اور بھاپ کو اوپر داخل کر کے فشارے کو پھر نیچے کی طرف لے جانے کا کام لیا۔ اس طرح انجن کو ہوا کے دباؤ سے بالکل آزاد اور بے نیاز کر دیا۔ نیز

---

[1] لیکن یہ معلوم تھا کہ دھری Crank کا استعمال اس سے بہت زمانہ قبل سے ہو رہا تھا۔

اسی نے سب سے اول بھاپ کو پھیلا کر استعمال کیا' اپنے گیئر اور دیت یوں کے لیے لوہے سے کام لیا اور اسی کے مثل متعدد تر کیبیں استعمال کر کے دخانی انجن کو موثر اور کم خرچ بناڈالا۔ گو وہ نہایت ذہین اور طبیعت دار موجد تھا' تاہم اس کی کامیابی کو کسی حد تک اس کے رفیق کار بولٹن کی طرف بھی منسوب کرنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ بولٹن اعلیٰ درجے کی کاروباری قابلیت رکھنے کے علاوہ جو واٹ میں نہ تھی واٹ کے لیے بہترین کار یگر ثابت ہوا۔ جب واٹ بمقام کن نیل اپنا ایک انجن (جس کا اس نے "ابلیس" Beelsebub نام رکھا تھا) بنا رہا تھا تو اس کو کامیابی نہ ہو سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ کیرن کے مزدوروں نے اس کے اسطوانوں کا قطر ٹھیک ۱۸ انچ کا نہیں بنایا تھا بلکہ کچھ بڑا رکھا تھا۔ لیکن بولٹن اور ولکنسن (برمنگھم کے باشندے) نے صفائی سے اس کام کی تکمیل کر دی۔ اس نئی قوت نے بہت جلد عوام کی توجہ کو اپنی جانب کر لیا۔ ۱۷۸۱ء میں بولٹن نے واٹ کو لکھا کہ مانچسٹر میں سب لوگ اپنی گرنیوں میں دخانی انجن استعمال کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ چنانچہ بیس سال کے اندر اندر واٹ کے انجن انگلستان کے طول و عرض میں کئی کارخانوں میں نصب ہو گئے۔ بھاپ کی قوت نے پانی کی قوت کی بہت جلد جگہ لے لی اور گرنیاں اور کارخانے جواب تک دریاؤں کے کنارے قائم کیے جاتے تھے اب ان شہروں میں جگہ لینے لگے جہاں کوئلہ سستا تھا۔ اس ہمارے کوئلے کی کانوں کی قدر و اہمیت مسلمہ بن گئی۔ دوسری معدنی دولت کو چھوڑ کر محض کوئلہ ہی انگلستان کو ان ممالک کا رہنما بنا سکتا تھا جہاں کوئلہ اس سے کم مقدار میں دستیاب ہوتا تھا۔

لیکن قوت محرکہ کی فراہمی میں کوئلے کی افادیت ہی وہ پہلی اور اہم دریافت نہ تھی جو کوئلے کے متعلق اٹھارھویں صدی میں کی گئی تھی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سترھویں صدی ہی میں ڈھلے لوہے کو کوئلے کے ذریعے سے گلانے کے بارے میں تجربہ کر رہا تھا۔ اس کی کامیابی کا

پیمانہ خواہ کچھ ہی رہا ہو، ظاہر ہے کہ اس نے اپنے پیچھے کوئی مستقل یادگار
نہیں چھوڑی۔ اگر اس کا کوئی گر تھا تو اس کو وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن
اٹھارھویں صدی میں فن آہنگری کے متعدد استادوں مثلاً ابراہیم ڈاربیز
نے بمقام کول بروک ڈیل اور رویک نے بمقام کیرن یکے بعد دیگرے پہلے
تو یہ ثابت کر دکھایا کہ کوک لوہا پگھلانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے
اور اس کے بعد خام کوئلے کو بھی گلانے کے کام کے لیے موزوں بنایا۔ اصلی
اصلاح اور ترقی زیادہ تر بہتر قسم کی بھٹی کے استعمال میں چھپی ہوئی تھی اور
اس بھٹی کے لیے نئے بھاپ کے انجن کی مانگ آہنگری کے سب کارخانوں
میں زیادہ ہوگئی۔ محض اس تبدیلی نے بہت اہم نتیجے پیدا کیے۔ اس صدی
کے وسط تک انگلستان میں بیٹر کی سالانہ درآمد کی مقدار بڑھتی رہی کیونکہ
آہنگروں کو اپنی بھٹیوں کے لیے کافی کوئلہ مل سکتا تھا اور ایک اوسط درجے
کی کوئلے کی بھٹی کی پیداوار کچھ کم ۳۰۰ ٹن سالانہ ہوتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ
انگلستان اپنی ضرورتوں کو خود ہی پورا کرلے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن کوک
اور کوئلے کا استعمال عام ہو جانے کے بعد ہر بھٹی کی پیداوار فوراً بڑھ کر
۱۵۰۰ ٹن سالانہ ہوگئی اور سنہ ۱۸۱۵ء تک لوہے کی سالانہ برآمد ۹۰۰۰۰ ٹن
ہوگئی تھی۔ اس سے بھی نہایت اہم نتیجے کورٹ[1] کے ایک نئی ترکیب دریافت
کرنے سے رونما ہوئے۔ کورٹ کی ترکیب کی رو سے لکڑی کے کوئلے
کی بجائے معدنی کوئلے سے کام لے کر ریت اور مٹی کے گارے کا طریق
استعمال کر کے لوہے کو تشکیل پذیر بنایا جاسکتا تھا۔ کورٹ نے اس نئے طریق
کے ساتھ ساتھ میل کچیل نکالنے کے لیے ہتھوڑے کی بجائے بیلن استعمال
کرنے کا طریق ایجاد کیا جس کو اس نے پیٹنٹ کرالیا۔ مجموعی حیثیت سے
ان دونوں طریقوں نے تشکیل پذیر لوہے کی تجارت میں ویسا ہی بڑا انقلاب
پیدا کر دیا جیسا کہ لکڑی کے کوئلے کی بجائے کوئلہ استعمال کرنے کے طریق نے

[1] Cort.

[2] سنہ ۱۷۸۳ء میں۔

۲۳۲

بڑی تجارت ہیں۔ خود کورٹ کو اپنے دوسرے بہت سے ہم پیشوں کی طرح
اس ایجاد کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ لیکن اس نے اپنے بعد دوسروں کے لیے
بہت بڑے منافعے کی بنیاد قایم کردی۔ اس صدی کے ختم پر لوہے
کے بڑے بڑے کارخانے ملک کے طول و عرض میں قایم ہو گئے۔
سنہ ۱۷۸۰ء میں کول بروک ڈیل میں سولہ دخانی انجن آٹھ پون بھٹیاں
اور نو گھڑت بھٹیاں تھیں۔ سنہ ۱۷۶۵ء میں انطونی بیکن نے مرتھر ٹڈول[1] کے
اردگرد ایک چالیس مربع میل زمین کے قطعے پر ۲۰۰ پونڈ سالانہ معاوضے پر
۹۹ سال کے لیے معدنی حقوق کا پٹہ حاصل کیا تھا۔ لیکن ۲۰ سال سے
کم مدت میں وہ معقول منافعہ حاصل کر کے کام سے دست بردار ہو گیا
اور اپنے حقوق فروخت کر کے اس نے سائی فارتھفا، ڈولای اور پینی ڈلرن
میں بڑے بڑے کارخانوں کی بنیاد ڈالی۔ سائی فارتھفا کے ایک باشندے
کراشے نے سنہ ۱۷۸۷ء میں ایک مہینے کے اندر ۴۰ ٹن تشکیل پذیر لوہا تیار
کیا اور سنہ ۱۸۱۲ء تک اس کی بیس گونہ مقدار تیار کرنے لگا۔

اس طرح اب کوئلے کی کانوں کا جو دوسرا فایدہ تھا وہ پہلے فایدے
کے مقابلے میں کچھ کم اہم نہ تھا۔ ان سے مشینری کو چلانے کی قوت حاصل
ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ لوہا سستا اور افراط سے فراہم ہوتا تھا جس سے
مشینیں بنائی جاسکتی تھیں۔ جب ولکنس (باشندۂ برشہم) نے دور اندیشی
سے لوہے کے نہایت شاندار مستقبل کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا تو اس کا
مذاق اڑایا گیا۔ جب اس نے آہنی پلوں، آہنی جہازوں اور آہنی مکانوں
کا ذکر کیا تو اس کو "لوہے کے شیدائی" سے موسوم کیا گیا۔ لیکن اس کو
اپنی زندگی ہی میں اپنے خیال کو حق بجانب اور اپنا مذاق اڑانے والوں
کو بے وقوف ثابت کر دکھانے کا موقع مل گیا۔ وہ اس طرح کہ اس نے
پہلے آہنی پل[2] کی تعمیر اور پہلے آہنی جہاز[3] کو بنا کر سمندر میں تیرانے میں بڑی

[1] Merthyr-tydvill
[2] جو سنہ ۱۷۷۹ء میں دریائے سیورن پر بنایا گیا۔
[3] سنہ ۱۷۹۰ء میں۔

مدد کی۔ اس نے مشینری کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں جو کام کیا اس کو
بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی میدان میں دوسرے لوگوں نے بھی اس کے بعد
کوششیں جاری رکھیں۔ خاصکر ماڈسلے نے کام کی صحت کو ترقی کے
ایسے معیار تک پہنچا دیا جو اب تک ناپید تھا اور اس طرح نہ صرف بہتر
مشینیں بنائیں بلکہ ان کو بھروسے کے ساتھ استعمال کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔
اس لیے کہ ایک پرزے کے ٹوٹ جانے کی صورت میں اسی نمونے کا
دوسرا پرزہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس بات کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں کہ پیچیدہ
مشینوں کو ایسے زمانے میں استعمال کرنے سے لوگ گھبراتے تھے جب کہ کسی
پیچ کے ٹوٹ جانے کی صورت میں موجودہ ڈھبری میں کوئی پیچ بٹھانے
کی بجائے اسی ڈھبری میں تازہ چوڑی برمے کے ذریعے سے بنانا زیادہ
مناسب سمجھا جاتا تھا۔ ماڈسلے اور اس کے پیرووں، کلیمنٹ، مرے،
دھٹ ورتھ اور نامسمتھ جیسے اشخاص کی محنت کی بدولت باقاعدہ اور
معیاری پرزوں نے اگلی بدنظمی و بے ترتیبی کی جگہ لے لی۔

اب تک زیادہ تر ان صنعتوں کی توسیع کی بحث کی جاتی رہی جو
مشینری اور قوت محرکہ استعمال یا فراہم کرتی تھیں، اس لیے کہ اٹھارہویں صدی
کے ختم پر صنعتی تاریخ کی یہی امتیازی خصوصیت تھی۔ لیکن ترقی ان ہی
صنعتوں تک محدود نہیں رہی۔ یہ فرض کر لینے کے باوجود کہ بعض صنعتوں نے
قوت محرکہ یا مشینوں کو استعمال نہیں کیا یہ ایک فطری امر تھا کہ نئے حالین
کی بدولت ایک شعبے میں جو سرگرمی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر دوسرے
شعبوں تک بھی پھیلتا۔ اور اس قسم کی صنعتوں میں بہت گرماگرمی رہی اور
نئے انکشافات کی بدولت انھوں نے خاصی ترقی کی۔ اس صدی کا آخری
حصہ ایجادوں کا دور تھا۔ مثلاً اگر ہم چینی اور مٹی کے برتنوں کے کاروبار
کو لیں تو معلوم ہوگا کہ جلد اور چمکنے کے لیے ایسٹ بری کا ایجاد یعنی چقماق
کا استعمال روز افزوں بڑھ رہا تھا۔ اسی طرح گلک ورتھی کی دریافت[1] نے بھی

[1] اس کے پیٹنٹ کی تاریخ سنہ ۱۷۶۲ء ہے۔

نمایدہ اُٹھایا جا رہا تھا کہ کارنوال سے چینی مٹی بہت کافی مل سکتی تھی۔ جس کی مدد سے سخت بھی کے ظروف چینی ملکی مسالے سے تیار کرنے کی ابتدا ہوئی۔ چینی اور مٹی کے برتنوں پر چربے کی چھپائی کا کام اس صدی کے وسط میں شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ سفالیات میں سب سے مشہور نام جوشیاو یجوڈ کا ہے جو اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ویجوڈ نے بہت کم چیزیں پیٹنٹ کرائیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ دوسروں کی رقابت اور مسابقت سے بچنے کی بہتر ین صورت یہ تھی کہ ایسی اشیا تیار کی جائیں جو رقیب کو عاجز کر دیں۔ اس نے اپنے کام کے سلسلے میں غیر معمولی محنت اور انتہائی مشقت سے کام کیا اور اوزاروں، مسالہ اور ترکیبوں کی اصلاح میں برابر لگا رہا یہاں تک کہ اس کو نہایت معقول صلہ ملا، کیونکہ اس نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے کارخانۂ واقع اٹ اور یا سے قسم قسم کی اشیا تیار ہو کر آتی تھیں اور دوسروں کے لیے پیروی کا نمونہ اور معیار پیش کرتی تھیں۔ لیکن وہ رقیبوں سے بچا ہوا نہیں رہا۔ اس لیے کہ ڈربی، کول پورٹ، ورسسٹر، لیورپول، برسٹل اور دوسرے مقاموں پر سرگرمی سے کام کرنے والے کارخانے موجود تھے۔

اس کتاب کی محدود گنجایش دیکھتے ہوئے اس دور کی امتیازی خصوصیت یعنی ان تمام نئے عملوں اور محنت بچانے والے ایجادوں پر سرسری نگاہ ڈالنا یا ان کے پیدا کیے ہوئے نتیجوں کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ دیکھتا ہے کہ کلورین گیس اور اس کے مرکبات کی دریافت کی بدولت رنگ صاف کرنے کے عمل کی مدت چھ مہینے سے گھٹ کر چند دن ہو گئی تھی تو اصلاح و ترقی کی وسعت کی اہمیت آرکرائٹ یا واٹ کی زیادہ نمایاں کامیابیوں کے مقابلے میں بہ مشکل محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی اس نوعیت کا ایجاد بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا، کیونکہ جس طرح زنجیر کی مضبوطی کا انحصار اس کی سب سے کمزور کڑی پر ہے

۲۳۴

اسی طرح کسی پیچیدہ صنعت مثلاً کتان یا سوت کی صنعت کی پیداوار کے لیے اس کے سب سے کم ترقی یافتہ شعبے کی تیز رفتاریاں یا سست رفتاری ہی حد کا کام دیتی ہے۔ رنگ صاف کرنے کے جدید طریقوں کو گلاسگو کے ایک باشندے ٹیناٹ نے مکمل کیا تھا۔ لیکن اس بات کی بھی ایک مثال نہیں ہے جس میں اسکاٹ لینڈ نے انگریز صناعوں کی رہنمائی کی۔ واٹ کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اسی کے ایک اور ہموطن میورہ نے پہلا انجن بنایا جس سے گلاسگو میں مشینری کے چلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ اسی شہر کے ایک باشندے ٹلر نے قوت سے چلنے والا ایک کرگھا کارٹ رائٹ کے کچھ ہی بعد پیٹنٹ کرایا۔ لیکن ٹناش نے بن راک طریقے سے کام لینا شروع کیا جس کی بنا پر اس کا نام بہت مشہور ہوگیا۔ گہرے سرخ رنگ کے مسالے کی تیاری بھی اسکاٹ لینڈ ہی میں ایک فرانسیسی مہاجر کی مدد سے شروع کی گئی اور تمام شعبوں میں رنگائی کے کام کو ترقی ہوئی۔ سنہ ۱۷۸۵ء اور سنہ ۱۸۱۸ء کے درمیان گلاسگو کی آبادی دگنی سے زیادہ ہوگئی اور سنہ ۱۸۱۸ء یہاں کے ۵۲ سوتی کارخانے پوری طرح کام کررہے تھے۔

ملک کی قدرتی سہولتوں کے تذکرے کے سلسلے میں آمد و رفت کی
۲۳۵
سہولت کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ اگرچہ انگلستان ایک چھوٹا ملک ہے اور اسی وجہ سے اس کے مختلف مرکزوں کے درمیان فاصلے بھی زیادہ نہیں ہیں، پھر بھی اٹھارھویں صدی کے زیادہ حصے میں آمد و رفت کے ذریعے ناقص رہے۔ اکثر بڑی شاہراہوں کو بھی مناسب طور سے تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں بڑی مسافت طے کرنے میں چھکڑوں کی رفتار چھ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اکثر اہم راستوں پر محصول وصول کرنے کے لیے کوئی پھاٹک گاڑی روکنے والا نہ تھا۔ سڑک تنگ قسم کی ہوتی تھی جس کی دونوں طرف نرم کچا راستہ ہوتا تھا۔ آرتھر ینگ جس کو اپنے دوروں کے زمانے میں انگلستان کی خراب سڑکوں سے واقف ہونے کا کافی موقع ملا تھا

لکھتا ہے کہ پریسٹن اور وائی گن کے درمیان جو محصول وصول کرنے کا
ناکہ تھا اس کے قریب راستوں پر چار چار فٹ کے گڑھے تھے، ایسیکس
کی دلدلوں میں چھکڑے پھنس جایا کرتے تھے اور تیس یا چالیس گھوڑوں کے بل
کھینچے ہوئے وہ اوپر نہ آسکتے تھے۔ ان حالات میں سامان کو بجز اس کے کہ
لدو گھوڑوں پر روانہ کیا جاتا اور کوئی طریقہ نہ تھا اور نقل وحرکت کے
مصارف بھی بہت ہوتے تھے۔ سرما میں کوئلہ گھوڑوں کی پیٹھ پر ٹوکروں
میں بھر کر ورسلے سے مانچسٹر روانہ کیا جاتا تھا اور ایک ایک گھوڑے پر
۲۴۰ پونڈ وزن لادا جاتا تھا۔ لیورپول سے مانچسٹر تک سڑک پر نقل وحمل
کے مصارف ۴۰ شلنگ فی ٹن ہوتے تھے۔ برسلم سے برج نارتھ تک
سامان چھکڑوں میں تین پاؤنڈ فی ٹن کے حساب سے جاتا تھا۔ اصلاح
بہت آہستہ آہستہ ہوئی۔ اسمی ٹن اور رینی نے خطرناک پایابوں کی بجائے
پل تعمیر کیے اور ٹیل فورڈ نے تقریبًا ایک ہزار میل کی اچھی سڑکیں
اسکاٹ لینڈ میں بنائیں۔ لیکن اصل ترقی ۱۸۱۵ء سے شروع ہوتی ہے
جب کہ مکاڈم نے یہ بتایا کہ سڑکوں کی بہترین مرمت پتھر کے نوکدار
ٹکڑوں اور روڑوں سے ہوسکتی ہے اور چقماق کے پتھروں اور سنگریزوں
سے نہیں ہوسکتی جو اس موہوم امید کے ساتھ سڑکوں پر بچھا دیے جاتے
تھے کہ جوڑے پہیے کے چھکڑوں سے دب دبا کر ان کی تسطح کسی نہ کسی طرح
ہموار ہو جائے گی۔

لیکن عمدہ سڑکیں بھی ان اشیا کی نقل وحمل کے لیے کافی نہ ہوسکتی
تھیں جن کی روز افزوں مقدار ملک میں ادھر سے ادھر بھیجی جاتی تھی اور
سڑک تعمیر کرنے والوں کو اس بات کا احساس ہونے سے بہت پہلے کہ
کیا کرنا ضروری تھا بھاری چیزوں کی ڈھلوائی ایک اور نقل وحمل کے ۲۳۶
وسیلے کے ذریعے انجام پانے لگی تھی۔ ڈیوک آف برج واٹر کی ملکی کوئلے
کی کانیں مانچسٹر سے پند میل کے فاصلے پر بمقام ورسلے موجود تھیں۔ تاہم
مانچسٹر تک کوئلہ روانہ کرنے کے مصارف اس کی قیمت کے دگنے تھے۔ اس

بنا پر اس نے دونوں مقاموں کے درمیان نہر تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس غرض کے لئے اپنی گرانی کے ایک کاریگر جیمس برنڈلے کو انجینیر مقرر کیا۔ برنڈلے جھلا اور تقریباً بے پڑھا لکھا تھا۔ لیکن اس کی فطری ہوشیاری کی وجہ سے اس کے سب کام باقاعدگی سے انجام پاتے تھے۔ اگرچہ نہروں سے فرانس اور ہالینڈ میں بڑی حد تک کام لیا جا رہا تھا، تاہم وہ انگلستان میں تقریباً ناپید تھیں یہاں جو کچھ کیا گیا تھا وہ صرف موجودہ دریاؤں کی تہوں کی گہری کھدائی تھی۔ یہ بجائے خود ایک اچھا کام تھا۔ لیکن برنڈلے نے دریاؤں سے بالکل الگ نہریں نکالنا زیادہ مناسب سمجھا۔ کیونکہ دریاؤں میں سیلاب کا اندیشہ تھا اور سیلاب کے مقابلے کے لیے جن مختلف پیچیدہ حفاظتی تدبیروں کی ضرورت ہوسکتی ہے ان سب کو سیلاب کی قوت ڈبو سکتی تھی۔ برنڈلے کا مقصد یہ تھا کہ پانی کے لمبے سطح خطے بنائے جائیں جو سیلاب سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ اسی اصول پر اس نے ورسلے سے مانچسٹر تک پہلی نہر تعمیر کی اور اس کی ایک شاخ کو رن کارن[ا] تک لے گیا۔ ڈیوک آف برج واٹر کو ان نہروں کے اخراجات کے پورا کرنے کے لیے سرمایہ کی فراہمی میں بہت بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب وہ کھولدی گئیں تو ان پر جو مصارف ہوئے تھے وہ سب جلد وصول ہو گئے۔ اس سے محض اس کو فایدہ نہیں ہوا کیونکہ مانچسٹر میں نقل و حمل کے نئے ذریعے سے کوئلے کی قیمت میں ٹھیک نصف کمی ہو گئی۔

اس کے بعد اس سے زیادہ اہم گرانڈ ٹرنک کینال کے تعمیری کام کی ابتدا کی گئی۔ یہ نہر مکمل ہونے پر رن کارن سے شروع ہو کر نمک اور ظروف سازی کے ضلعوں میں سے گزرتی ہوئی مقام ولڈن فیری دریائے ٹرنٹ سے مل جاتی تھی اور اس کا طول سب شاخوں کو ملا کر

ا۔ Run Corn

۱۳۹ میل ہوتا تھا۔ ویجوڈ اس اسکیم کے اصل حامیوں میں سے ایک تھا اور اسی نے پہلا پھاوڑا زمین پر چلایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا بھروسا ٹھیک ثابت ہوا کیونکہ ظروف سازی سے زیادہ کسی صنعت کو نہروں سے فایدہ نہیں پہنچا۔ ان ظروف سازوں کو نہ صرف مٹی، چونا اور کوئلہ استعمال کرنا پڑتا تھا جن کو کچھ فاصلے سے لایا جاتا تھا بلکہ ان کی تیار کی ہوئی وزنی اور جلد ٹوٹ پھوٹ جانے والی اشیا بری راستے سے بہت مشکل سے لے جائی جا سکتی تھیں۔ گرانڈ ٹرنک کینال کی وجہ سے برانی شرحیں گھٹ کر سابقہ مقدار کی ایک چوتھائی ہوگئیں۔ چنانچہ اٹ روریا سے لیورپول تک ایک ٹن سامان ۵۰ شلنگ کی بجائے ۱۳ شلنگ میں

۲۳۷

میں جانے لگا اور ایک کواٹر گیہوں کی ڈھلوائی جو پہلے فیصد میل ۲۰ شلنگ ہوتی تھی اب گھٹ کر ۵ شلنگ ہوگئی۔ ابتدائی نہروں میں جو کامیابی ہوئی اس کی وجہ سے نہروں کی طرف پوری قوم اسی طرح جھک پڑی جس طرح چالیس سال بعد ریلوں کی طرف سنہ ۱۷۹۰ء اور سنہ ۱۷۹۴ء کے درمیان اکاسی نہروں کے لیے قوانین منظور کیے گئے۔ اگرچہ بعض نہریں بعد میں غیر ضروری ثابت ہوئیں پھر بھی یہ مجموعی طور پر ملکی تجارت کو نئے اور سستے آمد و رفت کے ذریعوں سے بہت فایدہ پہنچا۔ براہ راست جو فایدہ پہنچا وہی واحد فایدہ نہ تھا۔ نہر سازی کے انجنیروں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ قدرتی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا تھا۔ برنڈلے کی بمقام ہیرکیسل تیار کردہ نہر جو ۲۸۸۰ گز لانبی تھی، بارٹن بند سے نکلی ہوئی نہر جو اُرویل سے ہو کر جاتی تھی، اسٹریٹ فورڈ کا بند، یہ سب ریلوے انجنیروں کے لیے پیروی کے نمونے بن گئے۔ دوسری جانب جفاکش ملاح، انگریزی جہازی خلاصیوں کے اس طبقے میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی تندہی، برداشت کی قوت اور مہارت کے نہ صرف انگلستان بلکہ تمام کرہ ارض کے انجنیر اور ٹھیکہ دار قائل ہیں۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت آبادی کا اضافہ ذکر کے قابل ہے۔

اٹھارھویں صدی کے نصف اول حصے میں تقریباً ۱۸ فی صد اور آخر نصف حصے میں کچھ کم ۵۰ فی صد اضافہ ہوا جو زیادہ تر نئے صنعتی ضلعوں کے شہروں میں رونما ہوا۔ گو ۱۷۰۰ء میں لنکاشائر اور ویسٹ رائڈنگ آبادی کی گنجانی کے اعتبار سے چوٹی کے بارہ ضلعوں میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ راجدھانی کے ضلعوں کے بعد تین شہر گلاوسٹر، نارتھمپٹن اور سمرسٹ اہمیت رکھتے تھے۔ ۱۷۵۰ء میں لنکاشائر گیارھویں نمبر پر اور ویسٹ رائڈنگ گیارھویں نمبر پر تھا۔ اس صدی کے ختم پر ان دونوں شہروں کی آبادی اور بڑھ گئی۔ یہی حال ڈرہم اسٹافورڈ اور ناٹنگھم کا ہوا۔ گو نارویچ، یارک اور اکزیٹر ایک ہی حالت پر قایم رہے، پھر بھی جدید بڑے بڑے صنعتی مرکز یعنی لیورپول، مانچسٹر، برمنگھم، گلاسگو، لیڈز، شفیلڈ اور نیوکاسل اپنے پرانے رقیبوں سے بڑی تیزی کے ساتھ سبقت لے جا رہے تھے۔[1] ۱۸۰۱ء سے ۱۸۳۱ء تک کی بیس سالہ مدت میں لیورپول، مانچسٹر، گلاسگو اور بریڈفورڈ کی آبادی میں ۷۵ فی صد اضافہ ہوا اور شمالی انگلستان کے صنعتی و معدنی ضلعوں کی ترقی اس سے بھی زیادہ نمایاں تھی۔ آبادی کی اس بڑی ترقی کے ساتھ ساتھ آبادی کی ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقلی نے ان واقعات کی رفتار پر بہت اہم اثر ڈالا جن پر آیندہ باب میں نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

۲۳۸

---

[1] سنہ ۱۶۸۵ء اور سنہ ۱۷۶۰ء کے درمیان لیورپول کی آبادی دس گونہ، مانچسٹر کی آبادی پانچ گونہ، برمنگھم کی آبادی سات گونہ اور شفیلڈ کی آبادی سات گونہ بڑھ گئی۔

باب ۱۶

زرعی انقلاب

اٹھارھویں صدی کے جو کچھ حالات بیان کیے گئے اگر ان سے زراعت کے متعلق انخراجی طور پر نتیجے اخذ کیے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ زراعت کی حد تک خوشحالی اور ترقی کا دور دورہ رہا۔ فطری طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۷۵۰ء سے آبادی کے سریع اضافے نے زرعی پیداوار کی مانگ بڑھادی۔ اس کے علاوہ چونکہ آبادی کے اضافے کا تعلق زیادہ تر دستکاروں سے تھا جو شہروں میں آبسے تھے اس لیے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ نئی طلب بہت زیادہ تھی اور اسی کے لحاظ سے قیمتوں اور منافعے میں بھی اضافہ ہوا۔ مسلسل جنگوں اور طویل کشمکش نے جو انقلاب پسند فرانس کے ساتھ اور بعد میں نپولین کے ساتھ ہوتی رہی، ملکی پیداوار کی مانگ کو بڑھانے میں حصہ لیا، کیونکہ قحط کے زمانے میں بیرونی ممالک سے بڑی مقدار میں غلہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قیمت کے اضافے کے ساتھ لگان میں بھی فوراً اضافہ ۲۳۹
ہو گیا ہوگا جس کی وجہ سے گو آخر میں نئے حالات کے باعث زمینداروں کو

سب سے زیادہ فایدہ ہوا ہوگا، تاہم کسانوں کو بھی فایدہ ہوا خاصکر ایسے کسان کے متعلق جو اپنی ذاتی زمین پر خود ہی کاشت کرتا ہو معمول کے خلاف خوشحالی قیاس سے دور نہیں، کیونکہ اس کو نہ صرف زمیندار بلکہ کسان کی حیثیت سے بھی فایدہ ہوا ہوگا۔

اس قسم کے قیاسات یوں تو نہایت معقول معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ہم اٹھارھویں صدی میں زراعت کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دوبارہ معلوم ہوتا ہے کہ انتخراجی طور پر اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا کتنا خطرناک ہے۔ اس لیے کہ قیاسات جو بظاہر صحیح معلوم ہوتے ہیں بڑی حد تک نادرست ہوتے ہیں اور وہ اس وجہ سے درست نہیں ہوتے کہ جن واقعات پر وہ مبنی ہیں وہ غیر صحیح ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دوسرے واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ قیمتوں اور خوشحالی کا دور دورہ رہا لیکن صرف چند کسان ہی اس سے فایدہ اٹھا سکے نئے حالات نے اکثریت کو تکلیف و مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ بعض کسان ان سہولتوں سے فایدہ اٹھانے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے تھے اور باقی کاشتکار جو زیادہ تر چھوٹے زمیندار تھے اور جن کے متعلق ہم نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ اسامیوں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ خوشحال تھے کہ ان کا نفع لگان کے اضافے میں جذب نہیں ہو سکتا تھا نئے حالات سے اس قدر بری طرح متاثر ہوئے کہ جماعت کی حیثیت سے ان کا وجود باقی نہیں رہا جو باقی بچے وہ ادھر ادھر پھیل پھیلا گئے اور اب ان کی حالت ویسی نہیں رہی جیسی کہ اس صدی کی ابتدا میں تھی کہ انگلستان کی زرعی آبادی بیشتر ان ہی پر مشتمل تھی۔ ان کسانوں کی تباہی کس طرح ہوئی[1]، چھوٹے زمینداروں کی زمین ہاتھ سے کس طرح نکل گئی، اور بڑے کسانوں نے ان کی جگہ کس طرح

---

[1] Decay of the Yeomanry یعنی کسانوں کا زوال [illegible] آر۔ ناٹن بی کے اپنی ایک کتاب "صنعتی انقلاب" میں ایک باب کا قائم کیا ہے۔

لے لی، یہ انگلستان کی زراعتی تاریخ کی سب سے دلچسپ خصوصیتوں میں سے ایک ہے۔

اس سے پہلے کے کسی باب[ا] میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ "کالی وبا" احاطہ بندیوں کی تحریک کا باعث تھی۔ مزدور حاصل کرنے کی دقت نے زمینداروں کے لیے اسبات کو زیادہ مفید ثابت کیا کہ وہ اپنی زمین بجائے زرعی غلاموں کی مدد سے یا عوض خدمت کے طور پر وصول شدہ آمدنی سے مزدوروں کو اجرت پر حاصل کر کے کاشت کرنے کی بجائے بھیڑیں پالیں۔ لیکن اس تحریک کی وجہ سے احاطہ بندیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے پارلیمنٹ کو پریشان کر دیا اور نہ صرف احاطہ بندیوں کو روکنے بلکہ زراعتی زمینوں کی کاشت کو ترقی دینے کی غرض سے قوانین منظور کیے گئے۔ اس قانون سازی کی وجہ سے احاطہ بندی کی تحریک کمزور ہو گئی۔ اس تحریک کی رفتار اس وجہ سے بھی سست پڑ گئی کہ جہاں بھیڑوں کے نئے احاطوں کو اون کی موجودہ مانگ جلد پوری کرنی تھی وہاں زراعت کے لیے مزدور بھی آسانی سے ملنے لگے تھے۔ اگرچہ سترھویں صدی میں بھی یہ تحریک نہ رکی، تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑی اراضی کی احاطہ بندی ہو جانے پر بھی ایسے باڑ کی کافی افتادہ زمین باقی تھی۔ اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کی مزروعہ زمین کے $\frac{3}{5}$ حصے پر اسی طریقے سے کاشت ہوتی تھی۔

۴۴۔ نارمن فتح کے بعد سے زراعت کا جو طریقہ اپنی اصلی حالت میں بدستور قایم تھا اس کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس میں حقیقی فایدے موجود ہونے کی وجہ سے لوگ اس پر اتنے طولانی زمانے تک جمے رہے لیکن یہ فایدے ماضی سے تعلق رکھتے تھے نہ کہ حال سے۔ مل جل کر ہل جوتنے میں اس وقت تک فایدہ تھا جب تک کہ ہر کسان غریب ہونے کے باعث

[ا] باب ہشتم۔

اپنے لیے الگ بیل اور ہل نہیں خرید سکتا تھا۔ دوری فصلوں کا سیدھا سادا اور غیر تغیر پذیر طریقہ ذہانت پر کوئی بار نہ ڈالتا تھا۔ ممکن تھا کہ پیداوار کی مقدار کم ہو، لیکن اتنی ہی مقدار ہر شخص کے گزارے کے لیے کافی ہوتی تھی اور وہ زیادہ تر اتنی ہی ہوتی تھی جس کی وہ توقع کرتا تھا لیکن ان اساسی فائدوں کے قطع نظر جس چیز نے اس نظام کو بڑی مدت تک قائم رکھا وہ یہ تھی کہ اس میں تبدیلی پیدا کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ اس طرح مل جل کر کام کرنے والے مزدوروں میں بے شبہ بعض ایسے تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ اگر تبدیلی کی جائے گی تو اس سے بہتر ہوگی۔ لیکن ان سے زیادہ کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے کاہلی یا دماغی سستی کی وجہ سے یا تغیر سے جبلی نفرت کے باعث کسی قسم کے تجربے کو عمل میں لانے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں کھلے کھیتوں کی کاشت کی اصلاح بحث سے خارج تھی

پھر بھی تبدیلی ضروری تھی اور یہ چیز واضح طور سے اس ترقی سے اور بھی زیادہ واضح ہو گئی جو ان لوگوں نے کی جو پرانے طریق سے وابستہ نہ تھے۔ سترھویں صدی میں لوگ تپتیا گھاس اور تو سرن (پودا) سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ اس کا علم ابتداً انہیں تھا کہ ان پودوں میں زمین کو نرم کرنے اور اس کی زرخیزی کو بڑھانے کی قابل قدر خوبیاں بھی موجود تھیں۔ لیکن اس کے بعد کی صدی میں ان سے نئی اور بہتر قسم کی فصلیں باری باری سے بونے کے سلسلے میں کام لیا جانے لگا جس سے وہ پورا سال ضایع جانے سے بچ جاتا تھا جس میں سابقہ طریقوں کے تحت کھیت غیر مزروعہ حالت میں پڑے رہتے تھے۔ سترھویں صدی سے شلجم کی کاشت بھی عام ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی کاشت کے صحیح اصول سے بے پروائی برتی جاتی تھی، کیونکہ تخم ریزی بہت گنجان ہوتی تھی اور زمین کی کافی گھدائی اور نلائی نہیں کی جاتی تھی جیتھرو ٹل[1] نے پہلی دفعہ

۱۷۴۱

[1] جیتھرو ٹل Jethro Tull کی ایک کتاب (Horse Hoeing Husbandry) سنہ ۱۷۳۳ء میں شایع ہوئی۔

ایک بہتر طریقہ سکھایا۔ اس نے بہترین زمین کے بارے میں اور مناسب گہرائی اور تخم ریزی کے بہترین طریقے کے متعلق احتیاط کے ساتھ تجربے کیے۔ اس نے تخم ریزی کی ایک نال Drill بھی ایجاد کی جس کی مدد سے جتی ہوئی زمین میں بیج بوئے جا سکتے تھے اور پرانے طریقے سے بیج ہاتھ سے بکھرنے کی زحمت سے نجات مل گئی۔ اس کے علاوہ اس نے اس بات کا بھی پتہ چلایا کہ اگر زمین کو اچھی طرح کھود کر نرم کر دیا جائے تو فصلیں اچھی ہوتی تھیں۔ ٹل کا شلجم بونے اور گھوڑوں سے ہل چلانے کا ترقی یافتہ طریق کئی زمینداروں نے اختیار کیا اور ان ہی میں سے ایک لارڈ ٹاونشنڈ تھے جن کا شلجم سے انس اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ ان کا نام "شلجم" ٹاونشنڈ پڑ گیا۔[۲] انھوں نے نارفوک کے طریقے پر عمل کیا جس میں چار فصلیں باری باری سے ہوئی جاتی تھیں اور اناج کی کاشت کے درمیان تیتیا گھاس اور شلجم کی کاشت کی جاتی تھی اس کی وجہ سے غلے کی دو فصلیں یکے بعد دیگر حاصل کرنے کے اس تباہ کن طریقے سے نجات مل گئی جس میں تین کھیتی والے طریق سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیمیائی کھاد دریافت ہونے سے پہلے تک اس طریقے پر عمل کرنے سے زمین کا کمزور ہو جانا یقینی تھا۔ اس کے علاوہ کاشت کار بھی اپنی زمین غلے کی ہر فصل کے بعد بیکار رکھنے کی بجائے جیسا کہ دو کھیتی طریق کے تحت مجبوراً رکھنا پڑتا تھا استعمال کر سکتا تھا۔ ایک اور شخص جو زراعتی طریق کی اصلاح و ترقی میں نمایاں حصہ لے رہا تھا ڈشلے کا باشندہ بیک ویل تھا جس نے پر منفعت طریقے پر بھیڑوں کی پرورش کر کے خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔[۳] اس کے زمانے سے پہلے تک بھیڑوں کی قدر زیادہ تر اون کی خاطر کی جاتی تھی اور

۲۴۲

[۱] ٹاونشنڈ نے این ہم میں ۱۷۳۰ء سے کاشت شروع کی۔

[۲] Turnip Townshend

[۳] یہ ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۵ء میں فوت ہوا۔

ذبح کی ہوئی بھیڑوں کے گوشت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن جب بڑے شہروں میں جہاں نئی مشینری استعمال کی جارہی تھی گوشت کی مانگ بڑھی تو اون کے مقابلے میں گوشت زیادہ قابل توجہ بن گیا۔ چنانچہ بیک ویل نے دور بینی اور احتیاط سے کام لے کر اگلے مینڈھوں سے بہت اچھے مینڈھوں کی پرورش شروع کی پہلے کے مینڈھوں کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی جاتی تھی :- ان کا ڈھانچہ بڑا اور بے ڈول ان کی ہڈیاں بھاری اور ان کے پاؤں لانبے اور چوڑے ہوتے تھے۔ اسی طرح پٹھے کا بھی یہی حال تھا جس کی ہڈیاں کلہاڑی کی طرح نکیلی ہوتی تھیں۔ ان کی کھال اور ہڈیوں کی رگڑ سے اچھی خاصی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ بیک ویل کی پیسٹر کی نئی بھیڑوں سے جو چھوٹے پاؤں والی اور فربہ تھیں نہ صرف ان کی نگہداشت کے مصارف کے مقابلے میں اچھا خاصا نفع ہوتا تھا بلکہ دوسرے گلہ بانوں کو بھی پیروی کا موقع ملتا تھا۔ بھیڑوں سے شروع ہو کر یہ شوق مویشیوں تک بڑھا۔ بھیڑوں کی طرح ان کے پاؤں بھی لانبے اور جسم دبلا پتلا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ وہ معمولی جانور تھے جو ہل چلانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ لانبے پاؤں اور چوڑی ہڈی کے جانور سخت زمین کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے یا دلدل بھرے راستوں پر گاڑی کھینچنے اور چارے کی تلاش میں افتادہ زمین پر گھومنے کے لیے موزوں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جڑ والے پودوں کے متعلق بہتر معلومات حاصل ہونے سے پہلے تک بجز موسم گرما کے اختتامی زمانے کے مویشی کبھی اعتدال سے زیادہ موٹے ہی نہ ہوتے تھے اور سرما کے زمانے میں انھیں نیم فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن شلجم کی[1]

[1] دیکھو مارشل کی کتاب Rural Economy

کاشت ان کی سرمائی غذا بہم پہنچاتی تھی ۔ دوسری جانب مویشیوں کے نخاس پر یا کھیت کے قریب بند ھے رہنے کی وجہ سے کھاد وسیع رقبے پر بکھرا رہنے اور ضایع جانے کی بجائے جمع اور استعمال کیا جاسکتا تھا ۔ سرما میں جڑیلے پودوں سے چارہ ملنے کی سہولت کے باعث نیز بھیڑوں کے بارے میں بیک ویل کی قایم کردہ مثال کو پیش نظر رکھ کر مویشی پالنے والوں نے بھی جلد ترقی کا قدم بڑھایا اور اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں مویشیوں کی پرورش نہ صرف مقبول عام بلکہ نفع بخش ہوگئی ۔ کولنگ کے ڈرہم والے چھوٹے سینگوں کے مویشیوں، ٹامکنس کے ہیرفورڈ کے مویشیوں اور لارڈ لیسٹر کے ڈیون کے مویشیوں نے قدیم انگلستان کے بھونے گوشت کو خاص شہرت دیدی تھی ۔ جو کچھ ترقی ہوئی تھی اس کا اندازہ ان بھیڑوں اور مویشیوں کے اوسط وزن کے اضافے سے ہوسکتا ہے جو اسمتھ فیلڈ میں ۱۷۱۰ء اور ۱۷۹۵ء کے درمیان بیچے گئے تھے۔ وزن میں گائیں ۳۷۰ پاونڈ سے بڑھ کر ۸۰۰ پاونڈ ہوگئیں، بچھڑے ۵۰ پاونڈ سے بڑھ کر ۱۴۸ پاونڈ ہوگئے، بھیڑیں ۲۸ پاونڈ سے ۸۰ پاونڈ ہوگئیں ۔ بھیڑ کے بچے ۱۸ پاونڈ سے ۵۰ پونڈ ہوگئے۔

جب ہم ان ترقیوں پر نظر کرتے ہیں تو یہ معلوم کرنے میں دشواری نہ ہوگی کہ اس نئی طلب سے جو روز افزوں آبادی کی وجہ سے پیدا ہورہی تھی کس قسم کے کاشتکار فائدہ اٹھارہے تھے ۔ یہ وہی کاشتکار تھے جو نئے طریقوں کو کام میں لاسکتے تھے اور لارہے تھے ۔ ٹاونشنڈ کی نارفوک کی جاگیروں کی ہلکی ریتلی زمین میں جہاں اب تک گھاس کی ہریتی کے لیے دو خرگوشوں میں لڑائی ہوا کرتی تھی نئی خوشحالی رونما ہوئی ۔ ایک کھیت جس کا لگان ۱۸۰ پونڈ تھا تیس سال بعد اس سے ۸۰۰ پونڈ ہونے لگے ۔ ایک اور کھیت کا لگان ۱۸ پونڈ سے بڑھ کر ۲۴۰ پونڈ ہوگیا ۔ آرتھر ینگ کے

۳۴۴

بیان کی بموجب نارو یچ کے قریب آمدنی دس گونہ بڑھ گئی۔ ایک شخص پندرہ ایکڑ زمین پر کاشت کرتا تھا جس سے اس کو اتنا کافی نفع ہوا کہ اس نے ۱۸۰۰۰ پونڈ سالانہ آمدنی کی ایک جاگیر خرید لی۔ ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات میں کیوں اراضی کی خریداری شغل اصل کی بہترین شکل خیال کی جاتی تھی بلکہ اراضی بیچنے والوں پر ہمارا تعجب ظاہر کرنا بجا ہو سکتا ہے۔

یہ بحث ہم کو دوسرے پہلو پر نظر ڈالنے کے قابل بناتی ہے۔ یہاں تک تو ہمیں خوشحالی کا حال معلوم ہوا۔ لیکن انگلستان کے سب کسانوں کو خوشحالی نصیب نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے بعض علاقوں میں افلاس پھیلا ہوا تھا جس کا برداشت کرنا خاصکر ان جدید طرز کے کسانوں کی کامیابی کے شاندار امکانوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مشکل تھا جو نئے طریقوں اور بہتر جانوروں سے کام لے کر اور عمدہ فصلیں تیار کر کے خوب نفع کما رہے تھے۔ کھلی کھیتی کے کسان کے لیے جو سمجھ رکھتا تھا اس سے زیادہ کوئی اور سماں دکھ دینے والا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دوسروں کو ان موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیکھے جنھیں وہ ہاتھ سے کھو بیٹھنے پر مجبور تھا۔ تپتیا گھاس اور شلجم کی کاشت، جانوروں کی سرمائی غذا اور بہتر دوری فصلوں کے خیالی منصوبے باندھنا بے سود تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی ایک تہائی زمین بے کاشت اور خالی نہ پڑی رہتی۔ اگر وہ تپتیا گھاس یا جڑیلے پودے اگانے کی کوشش کرتا بھی تو انھیں اس کے ہمسایے کے مویشی جبکہ فصل کے ختم پر شاملاتی زمین پر چرنے کے لیے چھوڑا جاتا تھا، چر جاتے تھے۔ اس کی زمین اور دوسروں کی زمینوں کے درمیان کوئی باڑ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ دوسروں کی طرح سلوک ہونا ضروری تھا مثلاً اگر اس میں وہ بدرر و بنانا چاہتا تو اس کا بہت امکان تھا کہ جس

۲۴۴

پڑوسی کی زمین سے یہ پانی گزرنے والا ہوتا اعتراض کرے اور
اس کے بدرروں کا راستہ روک دے۔ اگر معمولی بے سلیقہ پن سے
گھاس پھوس کھود کر الگ کرنے اور ترانے سے وہ مطمئن نہ ہوتا
تو اپنے کھیتوں کو بہتر بن خطۂ زمین کا نمونہ نہ بنا سکتا تھا۔ لیکن ایک
ایسے کاہل ہمسائے کے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے
لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا جو جنگلی کانٹے دار پودوں اور جھاڑیوں کو
چھانٹ کر الگ نہیں کرتا تھا بلکہ بڑھنے اور پھیلنے دیتا تھا۔ اس
طریقے پر آجکل کسی شخص کا بہت کچھ نقصان ہو سکتا ہے۔ لیکن اس
زمانے میں حالت بہت بدتر تھی، کیونکہ ہر شخص کا کھیت ایک ہی
جگہ نہ ہوتا تھا بلکہ اس کے ہمسایوں کی زمینوں میں پھیلا ہوا ہوتا
تھا اور ان کھیتوں کی تفریق کے لیے باڑ کی بجائے پگڈنڈی یا بن جتی
زمین کا ٹکڑا ہوتا تھا۔ اور جس طریقے پر سب کھیت ملے جلے
تھے اور جس طریقے پر ان کی حد بندی کی گئی تھی اس کے دوسرے
نتیجے بھی رونما ہوئے۔ ہر سمت میں متعدد راستے ہونے کی وجہ سے
بہت سی زمین بیکار ہو جاتی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر خرابی یہ تھی کہ ہمسایوں
کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کوئی دھاندلی سے ہل چلا کر اس کو اپنی
بنالے یا رات کے وقت اپنی مینڈھ آگے بڑھالے۔ آخر میں یہ کہ
ہر شخص کو ایک کھیت سے دوسرے میں آنے جانے کے لیے وقت
کا بہت بڑا حصہ صرف کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح
کسان ان مشکلوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا جو
کھیتی باڑی میں اس کی راہ میں رکاوٹ ہوتے تھے اور مویشیوں
کی پرورش سے وہ نفع کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ سرمائی غذا کافی
مقدار میں حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ جس وقت تک گاؤں کی
افتادہ زمین پر گاؤں کے مویشی مجموعی حیثیت سے چرنے کے
لیے چھوڑ دیے جاتے اس وقت تک یہ یقینی تھا کہ ان کی حالت

سال کے بڑے حصے میں ابتر رہتی۔ اس کے بر خلاف اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کو دوسروں کے جانوروں سے الگ کر لینا چاہتا اور یہ کوشش کرتا کہ بیک ویل اور کولنگ جیسے اشخاص کی طرح جانوروں کی پرورش کی جانب توجہ کر کے عمدہ مویشی تیار کرے تو اس کی راہ میں اس وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسی چراگاہ ہی نہ ہوتی تھی جس کو وہ اپنی ملک کہہ سکتا تھا۔ اگر وہ بہتر قسم کے جانور بھی پالتا تب بھی ان کا دوسروں کے ساتھ مل جل کر چرنا ضروری تھا اور اس صورت میں اچھے جانوروں کی نسل بگڑ جاتی اور طرح طرح کے امراض مثلاً خارش اور پاؤں سڑنے کی بیماریاں جو بے احتیاطی سے پلے ہوئے دیہی گلوں میں ہمیشہ ہوتی ہیں رونما ہوتیں۔

اس طرح یہ ضروری تھا کہ کھلے کھیتوں کے کسانوں میں مجموعی حیثیت سے اصلاح ہو یا کوئی اصلاح عمل میں نہ لائی جائے۔ اگر کوئی اصلاح عمل میں نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کی تلقین نہیں کی گئی۔ اس زمانے کے کسانوں کو ایسے مصلح کی سہولت حاصل تھی جس میں معلومات کے ساتھ ساتھ، ہمت، اولوالعزمی اور جوش و خروش موجود تھا اور کیا کرنا چاہیے اس بات کو نہایت واضح طور سے سمجھانے کی صلاحیت تھی۔ آرتھر ینگ نے زرعی ترقی کے پرچار کا بیڑا اٹھایا اور ایسے شد و مد کے ساتھ یہ کام شروع کیا جس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ اگرچہ عملی کسان کی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ لیکن یہ ناکامی اس کی اپنے پیشے سے عدم دلچسپی کا نتیجہ نہ تھی۔ اس کی سیاحت کا دائرہ صرف برطانیہ عظمی تک محدود نہ تھا بلکہ فرانس، اطالیہ اور ہسپانیہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کاشتکاری طریق کا باریک بینی سے مطالعہ کیا، جو کچھ خرابیاں تھیں ان کو ذہن نشین کیا اور بہتری کے لیے مشورے دیے۔ اس کی کتاب سیاحت نامہ Tours نامی میں اس کے مشاہدوں کے نتیجے درج ہیں۔ اس نے جتنا زیادہ

معائنہ کیا اتنا ہی زیادہ اس کو اس بات کا یقین ہوتا گیا کہ انگلستان کی زرعی ترقی کے لیے قدیم طریقوں کی بجائے نئے طریقوں کی پابندی ضروری ہے ۔ وہ جہاں کہیں گیا اس نے کھلے کھیتوں کے کاشتکاروں پر پرانے طریقوں کو چھوڑنے اور نئے خیالات کے مطابق عمل کرنے کی قطعی ضرورت واضح کی ۔

لیکن جیسا کہ آرتھر ینگ کو جلد معلوم ہو گیا کھلے کھیتوں کے کسانوں میں اصلاح کی توقع تقریباً عبث تھی۔ اس کے نصب العین سے ان کا مطمح نظر مختلف تھا ۔ وہ اپنے کھیتوں سے قدیم طریقے پر کاشت کر کے گزارے کے لیے پیداوار حاصل کرنے پر قانع تھے۔ آرتھر ینگ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نئی شہری آبادی کے لیے کھیتوں سے غلہ اور گوشت کثرت سے ملے ۔ جس وقت تک چند ضدی اور کاہل لوگوں کو یہ اختیار رہا کہ وہ خود ایک ہی حالت پر رہیں اور اپنے متعلقین کو بھی اسی حالت میں رکھیں اسی وقت تک ترقی ناممکن رہی ۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلاح سے یہ خرابی دور نہیں ہو سکتی تھی ۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ کھلے کھیتوں کا ان کی احاطہ بندی کے ذریعے سے کرایا جائے ۔

احاطہ بندی دو طریقوں سے ہو سکتی تھی ۔ ایک تو آپس کی رضامندی سے ۔ دوسرے پارلیمنٹ سے نجی طور سے ایک قانون کی منظوری حاصل کر کے ۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے طریقے میں امید سے بہت زیادہ ایکے کی ضرورت تھی ۔ پھر بھی یہ ایکا بعض صورتوں میں حاصل ہوا ۔ آرتھر ینگ نے نارفوک کی زرعی خوشحالی سے جو اسباب منسوب کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ پارلیمنٹ کی مدد کے بغیر احاطہ بندی کی گئی تھی ۔ نجی طور سے قانون کی منظوری حاصل کرنے کے لیے جاگیرداروں[1] اور رعایا کے ⅘ حصے کی

۳۴۴

[1] Title owners

رضامندی ضروری تھی۔ جوں جوں صدی گزرتی گئی یہ بخی قوانین زیادہ عام ہوتے گئے۔ چنانچہ ملکہ این کے بارہ سالہ دور حکومت میں ایسے تین قوانین اور جارج اول کے تیرہ سالہ عہد حکومت میں سولہ قوانین منظور ہوئے۔ یہاں تک ترقی کی رفتار سست رہی۔ لیکن جارج دوم کے ۳۳ سالہ عہد حکومت میں ۲۲۶ قوانین منظور ہوئے۔ تاہم جارج سوم کی تخت نشینی کے وقت انگلستان کے پیرشوں میں سے نصف میں کھلے کھیتوں کا طریق موجود تھا۔ مختلف ضلعوں میں تعداد مختلف تھی۔ بعض کھیتوں کی احاطہ بندی سولھویں صدی میں ہوئی تھی۔ اٹھارھویں صدی کی احاطہ بندیوں میں نارتھمپٹن اور لیسٹر کا نمبر سب سے اول تھا۔ تقریباً نصف برکس شائر میں کھلے کھیت موجود تھے۔ کیمبرج شائر میں کل رقبے کا $\frac{9}{10}$ حصہ کھلی کھیتی پر مشتمل تھا۔ لیکن ۱۷۶۰ء میں احاطہ بندیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ جارج سوم کے عہد حکومت کے ابتدائی ۳۷ سالوں میں بخی قوانین کی تعداد بڑھ کر ۱۴۸۲ ہوگئی اور ۱۷۹۷ء تا ۱۸۲۰ء میں ایسے قوانین کی تعداد ۱۷۲۷ تھی۔ ۱۸۰۱ء میں ایک عام احاطہ بندی کا قانون منظور ہوا۔ اس تمام میلان کو استعارے کے طور پر بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی کے ابتدائی چوتھائی حصے میں اس کی حیثیت معمولی چشمے کی سی تھی، صدی کے وسط تک اس میں روانی پیدا ہوگئی اور آخر میں اس نے ایک ہمہ گیر سیلاب کی صورت اختیار کر لی۔

۲۴۷ پندرھویں اور سولھویں صدیوں کی احاطہ بندیاں زیادہ تر بھیڑوں کی پرورش کے سلسلے میں قائم کی ہوئی باڑیں تھیں۔ ان کے برعکس مذکورالصدر احاطہ بندیاں کھیتی باڑی کے طریق کو زیادہ بہتر بنانے کے لیے کی گئی تھیں۔ لیکن جس طرح ابتدائی دور میں احاطہ کی ہوئی زمین سب کی سب ایک قسم کی نہ تھی اسی طرح اس دور میں

بھی یہی صورت حال رہی۔ صرف کھلے کھیتوں کی احاطہ بندی نہیں
کی گئی بلکہ اس کے ساتھ ان افتادہ اور شاملاتی زمینوں کی بھی
احاطہ بندی کی گئی جو کھلے کھیتوں پر کاشت کرنے والے کاشتکاروں
کی ملک تھیں۔ اس کے علاوہ ایسی وادیوں کے بڑے حصے کی
بھی احاطہ بندی کی گئی جو کھلے کھیتوں پر کاشت کرنے والوں کی ملک نہ تھیں۔ موخر الذکر
کی کاشت کا باعث غلہ کی روز افزوں طلب تھی جس کی وجہ سے
ایسی زمین پر غلہ اگانا نفع بخش ثابت ہوا جس پر سابق میں کاشت
کرنے سے مصارف بھی وصول نہ ہو سکتے تھے[1]۔ ظاہر ہے کہ قیمتوں
کے گرنے کی صورت میں ایسی زمین پھر کاشت سے محروم ہو جاتی۔
چنانچہ جب غلے کی آزاد تجارت شروع ہوئی تو بعینہ یہی ہوا۔

احاطہ بندی خواہ کسی طریقے سے کی گئی ہو کچھ نہ کچھ مصارف
کا ہونا لازمی تھا۔ قدیم منتشر کھیتوں کو نئی ترتیب کے ساتھ ایک
دوسرے سے قریب تر کرنے کے لیے احتیاط کے ساتھ پیمائش
کرنی پڑی۔ جب کبھی قانون سے مدد لی گئی وکیلوں کو محنتانہ ادا
کرنا پڑا اور گو وکیلوں کے مطالبے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ پھر بھی عام
خیال یہی تھا کہ وہ زیادہ ہیں۔ چنانچہ آرتھر ینگ نے بھی جو احاطہ بندی
کی تحریک کا بڑا حامی تھا اس خیال کا اظہار کیا اور "کمشنروں اور
عدالت کے مختاروں کی بدمعاشی" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ
باڑ اور جھاڑیوں کے مصارف کسانوں کو ادا کرنے پڑے اور
کھیتوں کی نئے سرے سے تقسیم میں زراعت بھی کسی حد تک درہم برہم
ہو گئی۔ جب گاؤں کی افتادہ زمینوں کی احاطہ بندی کی گئی تو
گاؤں والے گھاس کاٹنے اور ایندھن کے لیے لکڑی اکٹھی کرنے کے

[1] معاشیات کی اصطلاحی زبان میں ایسی زمین اب تک مختتم کاشت کی حد سے آگے
تھی لیکن طلب کی زیادتی اور قیمتوں کے اضافے کے باعث وہ اس حد کے اندر آگئی۔

پرانے حقوق سے محروم ہو گئے اس طرح گو مستقبل کے شاندار
اور درخشاں ہونے کی توقع تھی، لیکن فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ٹٹ پونجیے
کاشتکار مالی مشکلوں میں گھر گئے۔

ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ چھوٹے کاشتکار اپنی حیثیت
کو برقرار رکھنے کے لیے کشمکش میں مبتلا تھے ایک ایسا تغیر ہوا جس
کی انھیں پورے طور پر توقع نہیں تھی اور اس کی وجہ سے ان کی
حالت اور بھی زیادہ ابتر ہو گئی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہارگریوز،
آرک رائٹ اور کرامپٹن کی ایجادوں نے سوت کاتنے کی صنعت
میں کیسا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی دو صورتیں تھیں
ایک تو یہ کہ سوت جو اب کم مل رہا تھا اس کی رسد بہت بڑھ گئی
دوسرے یہ کہ ہاتھ سے سوت کاتنے والوں کے مقابلے میں زیادہ
عمدہ قسم کا سوت جو باریک اور زیادہ مضبوط ہوتا تھا تیار کیا
جانے لگا۔ یہ سچ ہے کہ ان سب ایجادوں کا تعلق سوتی صنعت سے تھا
جس کی وجہ سے ابتداءً صرف سوت کاتنے والے اور وہ بھی لنکا
شائر کے لوگ ان سے متاثر ہوئے۔ لیکن جیسا کہ بعد میں ہوا جب
ان ایجادوں سے اونی صنعت میں بھی کام لیا جانے لگا تو ان کی
مسابقت کا اثر ملک کے طول و عرض میں محسوس کیا جانے لگا۔
گھریلو صنعتوں کی تباہی ضروری تھی۔ چنانچہ پانی یا بھاپ کے ذریعے
سے چلنے والی کلوں کے مقابلے میں وہ مٹ مٹا گئیں۔ اپنے
گھروں میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے والی دیہاتی آبادی پر اس
کا کیا اثر پڑا اس کا اندازہ قدیم حالات کے تحت کام کرنے والے
لنکا شائر کے ایک گاؤں میلر کی حالت کا نقشہ کھینچنے سے ہو سکتا ہے۔
یہاں پچاس یا ساٹھ کسان تھے جن کے منجملہ چھ یا سات کسانوں سے
زیادہ ایسے نہ تھے جو زمین سے براہ راست اپنا لگان وصول کرتے
تھے وہ باقی سب کی آمدنی کا ذریعہ تجارت کا کوئی نہ کوئی شعبہ مثلاً

کتان، سوت یا اون کا تنا یا اس کا کپڑا بننا تھا۔ بزرگ خاندان اپنے راچھ پر کام کر کے فی ہفتہ آٹھ شلنگ سے نصف گنی تک کماتا تھا اور اگر اس کے بیٹے ہوتے اور وہ اس کے ساتھ کام کرتے تو فی ہفتہ ۸ شلنگ اور مل جاتے تھے۔ لیکن تمام گھریلو صنعتوں اور چھوٹے کھیتوں کا سب سے بڑا سہارا اور آسرا وہ محنت تھی جو دستی چرخے پر لگائی جاتی تھی۔ اور جب اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ ایک جلاہے کی ضرورت کے مطابق سوت کاتنے اور تیار کرنے کے واسطے چھ یا آٹھ نفوس درکار ہوتے تھے تو یہ بات واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ سات سال سے لے کر ۸۰ سال کی عمر والوں تک کے لیے جن کی بصارت باقی تھی اور جو اپنے ہاتھوں کو ہلا جلا سکتے تھے اپنی روزی کمانے کے واسطے محنت کرنے کا بڑا وسیع ذریعہ موجود تھا اور اس کی اجرت انھیں بیرش جانے پر مجبور کیے بغیر ایک تا تین شلنگ فی ہفتہ مل جاتی تھی۔" یہ مثال ۱۷۷۰ء کی ہی ہے اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لنکا شائر سے لی گئی ہے جہاں ذیلی صنعتوں کا سب سے زیادہ اجتماع تھا۔ لنکا شائر میں نئی مشینری کا رواج ہاتھ سے سوت کاتنے والوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ وہ دور دور تک نہیں پھیلے۔ لنکا شائر اور چیشائر میں ان کی کثرت تھی۔ گو اون کاتنے والے ابتداً بچے رہے، لیکن ان کی تباہی کا دن دور نہیں تھا۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر عشرے میں اس شعبے میں بھی مشینری کے رواج سے چھوٹے کسانوں کو دوہرا نقصان پہنچا، کیونکہ اون کاتنے کی صنعت تمام زرعی ضلعوں میں تقریباً ایک ہمہ گیر ذیلی صنعت تھی جس سے ہر ہفتہ قلیل لیکن باقاعدہ اور مستقل آمدنی زمین کے لگان یا اجرت کے علاوہ کاشتکار کو وصول ہوتی تھی۔ کلوں کا رواج پہلے لنکا شائر اور یارک شائر میں شروع ہو کر رفتہ رفتہ اسکاٹ لینڈ، یارک شائر، مشرقی انگلیا، وسطی علاقوں یعنی مڈ لینڈز اور

۲۴۹

مغربی انگلستان میں بھی ہو گیا۔ دستی کتائی کرنے والوں کو کتائی کی رفتار سوت کی خوبی ہر اعتبار سے زک اٹھانی پڑی اور ایک مدت تک انتہائی مسابقت کرنے کے بعد اس کو اپنے کام سے ہاتھ اٹھا لینا پڑا۔ جب اس کا آخری سہارا بھی جاتا رہا تو گھریلو صنعت کو تباہی نے گھیر لیا اور جو لوگ اس سے متاثر ہوئے ان کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ رہا کہ یا اپنے پیشے کو چھوڑیں اور یا مشینوں سے کتائی کرنے والوں میں جاکر پناہ لیں۔

مشینری اور قوت کے نئے طریق کے رواج کے اہم معاشری نتیجوں میں سے ایک صنعت کی بجائے زراعت سے متعلق باب میں یہاں قبل از قبل ذکر کر دینا اس وجہ سے ضروری ہو گیا کہ اس تغیر نے اپنی نوعیت کے اعتبار سے صنعتی ہونے کے باوجود زیادہ تر زرعی و دیہی آبادی پر اثر ڈالا۔ گھریلو صنعتوں کو تباہی نے چھوٹے کسان کے لیے حسب سابق زندگی بسر کرنے کی راہ میں اور بھی زیادہ مشکلیں پیدا کر دیں۔ خواہ اس کی اراضی کھلے کھیت کی شکل میں رہی ہوں یا ان پر احاطہ بندی شروع ہو گئی ہو بہر صورت اس نے نقصان محسوس کیا۔ پہلی صورت میں روزی کمانا اور لگان ادا کرنا اس کے لیے اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ دوسری صورت میں وہ زائد آمدنی سے ٹھیک اس زمانے میں محروم ہو گیا جب کہ اس کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ۲۵۰

احاطہ بندی کے مصارف اور گھریلو صنعت کے نقصان کا مجموعی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر چھوٹے کسانوں کا دوالا نکل گیا۔ اس طرح اٹھارویں صدی کی احاطہ بندیوں سے اکثر صورتوں میں وہی نتیجے رونما ہوئے جو ابتدائی احاطہ بندیوں سے ہوئے تھے یعنی چھوٹے کسانوں کی بہت بڑی تعداد کی بیدخلی عمل میں آئی۔ ان میں سے بعض کاشتکار نئے صنعتی شہروں میں رہنے سہنے لگے اور دستکار بن گئے۔

لیکن بڑی تعداد زرعی مزدور بن گئی اور ان جدید بڑے کسانوں کے تحت کام کرنے لگی جن کے پاس احاطہ کردہ اراضی منتقل ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان کا مستقبل بڑے کسان کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ کیونکہ بڑا کسان زیادہ ذہانت، اختراعی قوت اور پیش بینی کا مالک تھا اور اس کے پاس اصل بھی زیادہ تھا۔ وہ ان غیر یقینی حالات کے تحت کامیابی حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ موزوں تھا جو اس وجہ سے پیدا ہو رہے تھے کہ اضافۂ آبادی کے باعث انگلستان نے غلے کی برآمد ترک کردی تھی اور اپنی رسد کے ایک جزو کے لیے بیرونی ذریعوں پر انحصار کرنے لگا تھا۔ زمین سے اچھی اور زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے اس زمین میں زیادہ محنت و اصل کی کھیت کی ضرورت تھی اور چھوٹے کاشتکار میں اتنی سکت نہ تھی کہ اپنی زمین میں فی ایکڑ ۱۰۰ ٹن کے حساب سے کھاد دے سکتا یا ۲ پونڈ یا ۳ پونڈ فی ایکڑ بدررو بنانے میں یا ۵ پونڈ فی ایکڑ اپنے کھیت کی آب پاشی میں خرچ کر سکتا۔ وہ دور کے شہروں سے اپنے کھیت تک کھاد کی ڈھلوائی کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح وہ نہ تو اپنے مویشی کی اصلاح کی غرض سے قیمتی مینڈھے اور بیل خرید سکتا تھا اور نہ ماہر مزدور یا بیش خرچ کھیتی باڑی کے آلات درآمد کر سکتا تھا۔ جس شخص پاس اصل ہو وہ یہ سب کام کر سکتا اور اور ان سے فایدہ حاصل کر سکتا ہے لیکن چھوٹا کسان نئے طریقوں سے فایدہ حاصل کرنے کی قابلیت در اصل اس وجہ سے نہ رکھتا تھا کہ وہ بیش خرچ ہوتے تھے۔ آرتھر ینگ چھوٹے کھیتوں کی کاشتکاری کا اس وجہ سے پرزور مخالف تھا کہ وہ اس کو غیر ترقی پذیر طریق کاشت خیال کرتا تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ چھوٹے کھیتوں کی کاشت کے نقائص کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان کے لگان میں اضافہ کیا جائے اس کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ

۲۵۱

انھیں یا تو بہتر طریقے پر کاشت کرنا سیکھنا چاہیے تاکہ بڑے بڑے
لگان کو ادا کر سکیں یا بہتر لوگوں کو اپنی جگہ دیدینی چاہیے۔ بڑے بڑے
لگان سے جس کا وہ حامی ہے زرعی مصیبتوں میں کمی نہیں ہوتی تھی
بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ لگان کی زیادتی محض ایک مقصد کی طرف
رہنمائی کرتی تھی اور وہ بہتر طریقوں کا اختیار کرنا تھا۔ اگر لگان زیادہ
ہو تو ظاہر ہے کہ کاشت بھی ترقی یافتہ حالت میں ہوگی۔ کاشت کا
اچھا طریقہ اختیار نہ کرنے کی صورت میں زیادہ لگان کی ادائی ناممکن تھی۔

احاطہ بندی کے مصارف، گھریلو صنعت کی تباہی، بڑے
کھیتوں کی مسابقت، غرض ان سب چیزوں نے چھوٹے کھیتوں کی
تباہی میں اور چھوٹے کسان کو مزدور بنانے میں اہم حصہ لیا۔ اس
کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا اور اس نے نہ صرف ان چھوٹے
کسانوں پر اثر ڈالا جو اپنے کھیتوں کا لگان ادا کر رہے تھے بلکہ
ان کسانوں یا زمینداروں پر بھی جو اپنے کھیتوں کے خود مالک تھے۔
مالدار طبقے کی عام خواہش یہ تھی کہ زمین خریدے۔ کیونکہ یہ صرف
شغل اصل ہی کا اچھا ذریعہ نہیں تھا، اس لیے کہ اس سے زیادہ نفع
ہوتا تھا جتنا کہ زر کو دوسرے کام میں لگانے سے بلکہ زمین کی ملکیت
سے ایک خاص معاشری رتبہ بھی حاصل ہوتا تھا جس سے بے زمین
طبقہ محروم تھا۔ قدیم گھرانے زمینوں کے مالک تھے اور ان کے
پاس دیہاتی مکان، خوشنما باغیچے اور وسیع جائداد تھی۔ نئے خاندان
بھی اس قسم کی چیزوں کے خواہاں تھے اور اپنے ذوق کو پورا کرنے
کی خاص سکت رکھتے تھے۔ کیونکہ اکثر نئے خاندانوں نے تجارت
اور کاروبار میں کافی دولت پیدا کر لی تھی۔ وہ اپنے آپ سے یہ
سوال کرتے تھے کہ اس دولت کو مشغول کرنے کی بہترین صورت
زمین کے سوا کیا ہو سکتی تھی کیونکہ اس سے ان کو نہ صرف معقول آمدنی
ہوتی تھی بلکہ معاشرے میں وہ عزت اور رتبہ بھی حاصل ہوتا تھا جس کے

وہ آرزومند تھے۔ اس اعتبار سے جو غیر معین لیکن حقیقی فائدہ کسی شخص
کو بڑی جاگیر کی ملکیت سے حاصل ہو سکتا تھا اس کے سوا دوسرے
اور بھی فایدے تھے۔ اگر ہم بیت العوام اور حق رائے دہی کی
مثال لیں تو فوراً یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمین کی ملکیت کے ساتھ
کتنی اہمیت منسوب کی جاتی تھی۔ ملکۂ این کے زمانے سے کوئی شخص
بیت العوام کا رکن اس وقت تک نہیں بن سکتا تھا جب تک کہ وہ ۲۵۲
کچھ نہ کچھ زمین کا مالک نہ ہو۔ ہنری ششم کے زمانے سے ضلعوں میں
رائے دہی ایسے زمینداروں تک محدود تھی جن میں سالانہ ۴۰ شلنگ
آمدنی وصول ہوتی تھی اور اگرچہ کامن ویلتھ[1] کے تحت ۲۰۰ پونڈ سرمایہ
رکھنے والوں کو رائے دہی کے قابل اشخاص کی فہرست میں شامل کرلیا
گیا تھا، تاہم ان قوانین کا اساسی منشا یہ تھا کہ ایسا شخص پارلیمنٹ
میں جگہ نہیں پاسکتا تھا جس کے پاس زمین نہ تھی اور جب تک یہ کچھ
آمدنی نہ رکھتا ہو وہ دیہات میں کبھی رائے نہیں دے سکتا تھا۔ اسطرح
اگر کسی صناع کو اپنی شہری زندگی کی مصروفیتوں کو چھوڑنے اور دیہات
کی مسرت بھری زندگی سے لطف اُٹھانے یا اپنا عزو وقار بڑھانے
کی فطری خواہش ہوتی تو اس کا پہلا قدم زمین کی خریدی کی جانب
اٹھتا تھا۔ یہی نہیں کہ ایسے کئی نئے لوگ اپنے آپ کو دیہاتی شریفوں
میں شمار کرانے کی کوشش کر رہے تھے بلکہ پرانے گھرانوں نے بھی
مالدار تاجروں اور صناعوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قایم
کرکے دولت مہیا کرلی تھی اور اپنی جایداد کو بڑھا کر اپنے اثر کو وسیع
کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ نئی بڑی جائدادوں میں سے
اکثر جائدادیں اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے خطے خرید کر قائم کی گئی تھیں جو
کھلے کھیتوں میں سے علحدہ کیے گئے تھے۔ صرف ایسے چھوٹے کسانوں نے

[1] Common wealth

اپنے کھیتوں کو علیحدہ نہیں کیا جو لگان ادا کرنے کی شرط سے زمین پر قابض تھے۔ بلکہ کسانوں اور چھوٹے معافی داروں کو بھی اس میں زیادہ سہولت تھی کہ اپنی زمینوں پر خود منافعہ کے ساتھ کام کرنے کی بجائے ان کو ایسی بڑی قیمتوں پر بیچیں جو جنگ نپولین کے زمانے میں رائج تھیں۔ چونکہ خریدار بڑی جائداد قائم کرنے اور اس پرنئے طرز پر کاشت کرنے کا خواہاں ہوتا تھا اس لیے وہ اعلیٰ قیمت ادا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا، کیونکہ معاشری فائدوں کے قطع نظر اس کو یہ توقع بھی ہوتی تھی کہ چھوٹے کاشتکاروں کے مقابلے میں وہ زیادہ نفع کمائے گا۔ اسی وجہ سے بڑی جائدادوں میں چھوٹی جائدادوں کے ضم ہوجانے اور ان میں روزافزوں وسعت پیدا ہونے کا میلان رونما ہوا اور کسان اور چھوٹے مالکان زمین ختم ہوگئے اٹھارویں صدی کے آغاز میں بادشاہ نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ انگلستان میں ایک لاکھ ۸۰ ہزار معافی دار کسان موجود تھے۔ برخلاف اس کے آرتھر ینگ جنگ نپولین کے بعد لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ چھوٹے زمیندار تقریباً ناپید ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ ان میں سے اکثروں کے اختیار کردہ کاشت کے پرانے طریقے کو بہت ناپسند کرتا تھا، تاہم اس نے ان کے متعلق افسوس کا اظہار کیا، کیونکہ بقول اس کے وہ اصل ان ہی سے قوم کی آزادی برقرار تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہی لوگوں نے شاہان اسٹورٹ کی مطلق العنانی کی کامیابی کے ساتھ مقاومت کی تھی۔ لیکن آیندہ صدی کی کشمکش میں جو تلوار اور بندوق کی کشمکش کی بجائے دماغ اور زر کی آویزش تھی، وہ اپنی اس فائق حیثیت کو برقرار نہ رکھ سکے جو انھیں سلطنت میں حاصل تھی اور بہ لحاظ تعداد وسیاسی اہمیت تنزل پذیر ہوتے گئے یہاں تک کہ بڑے زمینداروں نے ان کی زمین خرید لی اور ۱۸۳۲ء میں مسودۂ اصلاح کے منظور ہونے تک پارلیمنٹ میں اساسی قوت واقتدار ان ہی بڑے زمینداروں کے ہاتھ میں آگیا۔

۲۵۳

یہ زراعتی انقلاب، جس کی سرگزشت ہم نے بیان کی اپنے نتیجوں کے اعتبار سے دوسرے انقلابوں کی طرح نہ تو پورے طور پر اچھا تھا اور نہ پوری طرح برا۔ فائدوں اور خرابیوں کا موازنہ کرنا ضروری ہے۔ ایک طرف کاشت کے طریقے کی اصلاح سے فصلوں میں ترقی ہوئی، زیر کاشت رقبہ وسیع ہو گیا اور غلہ اور گوشت افراط سے ملنے لگا جس سے بڑھتی ہوئی شہری آبادی کی روزافزوں ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں تو دوسری طرف سب عارضی مشکلیں رونما ہوئیں جو کسی بڑی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی لوگ اپنے آبائی ٹھکانوں اور قدیم پیشوں سے ہٹ گئے تھے اور نئے ٹھکانوں اور نئے پیشوں کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے۔ چھوٹے کسانوں کی جماعت جو اپنی زمینوں پر خود کام کرتی تھی بے نشان ہو گئی۔ یہی وہ جماعت تھی جو سابق میں انگلستان کی پشت وپناہ مانی جاتی تھی، جس کا تحفظ قدیم زمانے میں وضع آئین وقوانین کے ذریعے سے اس غرض سے کیا گیا تھا کہ وہ انگریزی سپاہیوں کی بھرتی کے لیے مواد فراہم کرتی تھی اور جو عام طور پر جنگ میں یہ ثبوت بہم پہنچا چکی تھی کہ ان کی بہادری، شجاعت اور تحمل کے بارے میں قوم نے جو خیال قائم کیا تھا وہ بیجا نہ تھا۔ ان کی بجائے اس زمانے میں زمیندار، کسان اور مزدور تین علیحدہ گروہوں میں تقسیم ہیں اور اس میں بھی پہلا طبقہ عام طور سے کھیتوں پر موجود نہیں ہوتا اور جہاں موجود ہوتا ہے وہاں بعض اوقات مقامی حالات کی لاعلمی کے باعث اس کی موجودگی عدم موجودگی کے برابر ہوتی ہے۔ رہا تیسرا طبقہ جو سخت قسم کی دستی محنت کرتا ہے تو وہ زمین سے متناسب پیداوار حاصل نہیں کرتا اور خواہ اس کا ۲۵۴ کام پورا ہو یا ادھورا اس کو اجرت ادا کرنی ضروری ہوتی ہے۔ زمیندار اور کسان کے درمیان قدیم شخصی دوستانہ تعلقات کی بجائے رشتۂ زر قائم ہو گیا۔ جب چھوٹا معافی دار کسان نیست ونابود ہوا تو اس کے

ساتھ ہی دوڑ دھوپ اور کوشش کا وہ محرک بھی جاتا رہا جو ملکیت زمین سے اور اس احساس سے پیدا ہوتا تھا کہ زمین اس کی ذاتی ملک تھی اور اس کی کی ہوئی اصلاح و ترقی کا حصہ ملنا یقینی تھا۔ زراعت میں جو تبدیلی ہوئی وہ صنعت کی تبدیلی کے مثل تھی قدیم حالات کی جگہ نئے حالات نے لے لی جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ جس طرح گھریلو صنعت بڑے کارخانوں اور فیکٹریوں کی ترقی کی وجہ سے برباد ہوگئی اس طرح چھوٹے کسان بھی سرمایہ وار کسان کے مقابلے میں دب گئے لیکن انجام کار نتیجے ایک سے نہ تھے۔ زراعت و صنعت دونوں کی تابین ایک زمانہ دراز تک کی گئی، اگرچہ اس سے اول الذکر نے موخر الذکر کے مقابلے میں بہت زیادہ فائدہ حاصل کیا۔ جب تابین موقوف ہوئی اور آزاد تجارت نے اس کی جگہ لے لی تو صناعوں نے اپنے آپ کو بندشوں سے آزاد پایا اور عالمی تجارت کے لیے اور بھی زیادہ موافق شرطوں پر مسابقت کرنے کے قابل ہوگئے حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانے تک ان کا کوئی سخت حریف نہ تھا۔ لیکن زمینداروں کی حالت اس سے مختلف تھی۔ ان میں اس نجو بز سے تجارتی خیالات کا نتیجہ تھی کہ انگلستان کو غلہ برآمد کرنے والا ملک بنایا جائے بہت مدد پہنچی۔ جب انگلستان سے غلے کی برآمد تک گئی اور اعلیٰ محصول کے تحت محدود درآمد کی اجازت دی گئی تب بھی زمینداروں نے اس مصنوعی فائدے کو کافی سمجھا جو درآمدی محصول کی وجہ سے انگریزی بازاروں میں انھیں حاصل تھا۔ زمینداروں کے مصنوعی فائدے کی طرح ان کی خوشحالی بھی مصنوعی ثابت ہوئی۔

اصول عدم مداخلت اور سرکاری خیرات

۲۵۵

دور ایجاد یعنی وہ زمانہ جب کہ صنعت و حرفت کے اہم کاموں میں مشینری نے انسانی محنت و مہارت کی جگہ لینا شروع کر دی تھی بعض اوقات "صنعتی انقلاب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے اس اصطلاح کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مشینری اور قوت کی ترقی اس انقلاب کا صرف ایک جزو ہے۔ اس سے زیادہ اہم اور اس سے کہیں زیادہ دور رس نئے حالات کے معاشری اثرات اور نتیجے تھے۔ محض یہی نہیں ہوا کہ سوت کاتنے والے کی پیداوار میں سو گنا اضافہ ہو گیا یا یہ کہ ایک گز کپڑا جتنے وقت کے اندر اتنا بنا جا سکتا تھا اس میں اب کئی گنا بنے جا سکتے تھے۔ بلکہ ایک سال لوہے کے کارخانے کی جتنی پیداوار ہوتی تھی اتنی ہی ایک ماہ کے اندر ہونے لگی۔ تجارت کی تعداد میں تبدیلی خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہوئی ہو "انقلاب" کے لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس لفظ میں مقدار کا

کا تغیر ہی پنہاں نہیں بلکہ تجارت اور اس کے طریقے کی تبدیلی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس وقت تک موجدوں کے حالات کا خاکہ کھینچا گیا اور ان کی ایجادوں کے جو نتیجے براہ راست اشیا اور صناعی کے عملوں پر ظاہر ہوئے ان کو بیان کیا گیا۔ لیکن اب گہری نظر ڈالنا اور ان نتیجوں کا اندازہ کرنا نامناسب نہ ہوگا جو بالواسطہ لیکن نمایاں طریقے پر دستکاروں پر اثر انداز ہوئے۔ ان نتیجوں کو ایک سیدھے سادے بیان کے ذریعے سے ظاہر کرنا غیر ممکن ہے۔ معاشی تاریخ کی فطری پیچیدگی کچھ ایسی ہے کہ ہمہ گیر تمثیلوں پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ایک کے پیچھے دوسرے آنے والے دور میں ان تبدیلیوں کو تفصیل سے بیان کرنا جو ایجادوں کے نتیجے کے طور پر رونما ہوئیں موجودہ کتاب کی حدود سے باہر ہے۔ ہمیں ان اساسی نتیجوں کے ظاہر کرنے پر قناعت کرنی چاہیے جو بڑی بڑی صنعتوں میں رونما ہوئے اور اس کے بعد احتیاط کے ساتھ ان سے عام نتیجے اخذ کرنے چاہئیں۔ صنعتی انقلاب کا دور خاص کر اس کا آخری حصہ جو اس صدی کے ابتدائی تیس سال پر مشتمل ہے، بے اطمینانی اور مصیبت کا تھا۔ اس کی ہمیں ان گنت مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ ان کے منجملہ لڈائٹ کے بلوے سب سے مشہور ہیں جن میں مشینری برباد کر دی گئی۔ کارخانے جلا دیے گئے، صناعوں کو دھمکیاں دی گئیں اور بعض صورتوں میں انھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے تشدد آمیز اور ظالمانہ کام کیے گئے جن کی بنا پر حکومت کو روک تھام کی سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ مصائب سے پُر تھا لیکن قصوروار پورے طور پر صنعتی انقلاب کو قرار دینا چاہیے۔ دوسرے فصل پیدا کرنے والے اسباب کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

پہلے یہ کہ اس زمانے میں انگلستان جنگ میں مصروف رہا اور اس کی وجہ سے غیر معمولی بھاری محصولوں کا بار اس کو اٹھانا پڑا۔

۲۵۶

علاوہ کسان کی تباہی کے اصول کے باعث غذا کی عام طور سے کمی رونما ہوئی اور غلے کی قیمتیں عام طور سے اتنی چڑھ گئیں کہ فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ سنہ ۱۸۰۰ء اور سنہ ۱۸۰۱ء میں ایک کوارٹر وزن کی قیمت ۱۱۶ شلنگ ۸ پنس تھی اور اگرچہ سنہ ۱۸۰۲ء سے سنہ ۱۸۰۸ء تک اوسط ۷۳ شلنگ ۸ پنس رہا، لیکن سنہ ۱۸۱۲ء میں قیمت بڑھ کر ۱۰۰ شلنگ ہوگئی۔ صرف یہی نہیں کہ یہ بہت ہی گراں قیمتیں ان غریبوں کے لیے جن کی غذا میں روٹی بہت بڑا درجہ رکھتی تھی بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوئیں، بلکہ قیمتوں کے شدید تغیرات نے جملہ حسابات میں خلل پیدا کر دیا اور مزدور کے ذریعہ معاش میں عدم تیقن کا عنصر داخل کر دیا حالت یہ تھی کہ جو اجرت اس کے خاندان کے لیے ایک سال کافی ہو چھے ماہ بعد پورے طور پر ناکافی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے یہ خیال تسکین دہ نہیں بن سکتا تھا کہ اس قسم کے حالات عارضی ثابت ہوں گے۔ اور یہ کہ اگر وہ کسی نہ کسی طرح برے وقت کا مقابلہ کر لے تو پھر اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہوگی۔ جو لوگ معاش کی انتہائی حد پر بسر کر رہے ہوں ان کو موجودہ خرابیاں اس قدر گراں گزرتی ہیں کہ آیندہ کی امیدیں ان کے لیے کوئی روشن مستقبل نہیں رکھتیں۔ بہتر زمانے کی آمد سے قبل مزدور یا دستکار کو امدادی خیرات کو وسیلہ معاش بنانے پر مجبور ہونا پڑتا۔ اس طریقے کی کوتاہیوں پر پھر بحث کرنی پڑے گی۔ لیکن یہ واضح ہے کہ نئی ایجادوں کے سر اس کی ذمہ داری عاید نہیں کی جا سکتی۔

۲۵۷ اسی زمانے میں سیاسی اور معاشری بے اطمینانی بھی پھیلی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ انقلاب فرانس کی موجیں گو ساحل انگلستان سے زیادہ زور سے نہیں ٹکرائیں، لیکن وہ ہمارے سمندر میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں اور خاص کر اس وجہ سے بھی زیادہ کہ مزدوروں کا طبقہ جس کو نئے خیالات نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا اپنی آواز

گوش گزار کرنے اور اپنی قوت محسوس کرانے کا کوئی موقع نظم اور امن کی تخریب کے سوا نہ رکھتا تھا۔ دلوں کے اندر دبی ہوئی بے اطمینانی کھلی شکایت کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کسی کو اس بات کا ٹھیک اندازہ ہی نہیں ہونے پاتا کہ ایسی بے اطمینانی کی ترقی کی رفتار کیا ہے اور وہ کہاں خوفناک قوتوں کو نشو و نما دے گی اور پھوٹ پڑے گی۔ اسی وجہ سے چند ہیجان پیدا کرنے والوں کے خیالات کو جو "حقوق انسانی" کی چیخ پکار مچا رہے تھے اور انقلاب اور امرا کے قتل کی خفیہ سازش کر رہے تھے، مزدوروں نے سر آنکھوں پر جگہ دی، کیونکہ وہ پہلے ہی سے غلے کی چڑھی ہوئی قیمتوں اور مشینری کے رواج کے خلاف غصے میں بھرے ہوئے تھے جو ان کی رہی سہی معمولی اجرتوں کو بھی ان سے چھین لینے کی دھمکی دے رہے تھے۔

جنگ، تامینی پالیسی جس نے غلے کو گراں کر دیا، مذموم قانون مفلسی سیاسی بے اطمینانی کا دور، یہ سب چیزیں نہ تو صنعتی انقلاب کے نتیجے اور نہ اس کے لوازم۔ لیکن ان سے بھی اس انقلاب کے مثل نتیجے رونما ہوئے۔ یعنی صنعتی حالات میں عدم تیقن اور اس کے نتیجے کے طور پر مصیبت رونما ہوئی۔ اس طرح اس زمانے کے صنعتی طبقوں میں جو مصیبتیں اور تکلیفیں تھیں ان میں کی بعض ضرور ایسے اسباب سے منسوب کی جا سکتی ہیں جو اتفاقی تھے اور جن کے خراب اثرات لازمی طور سے رونما ہوتے خواہ ایجادیں ہوتیں یا نہ ہوتیں۔ لیکن اتنی گنجائش ملحوظ رکھنے کے بعد بھی باقی مشکلیں جو نئے نظام سے براہ راست رونما ہوئیں بہت ہی زیادہ ہیں۔

صنعت میں اچانک اور تیز تبدیلی کا زمانہ ہمیشہ مشکلوں کا زمانہ ہوتا ہے خواہ وہ دیرپا ہوں یا عارضی، لیکن ان کا پیش آنا یقینی ہے۔ صنعتی تاریخ کے اس دور کی ممتاز خصوصیت جو کم و بیش

۲۵۸ جارج سوم کے عہد حکومت پر مشتمل ہے اچانک اور غیر متوقعہ تبدیلی ہے۔ لوہے کی صنعت نے سرے، سکس اور ہمپشائر کے جنگلاتی ضلعوں کو چھوڑ کر مڈلینڈز، یارک شائر اور ساوتھ ویلز میں اپنا نیا مسکن قائم کر لیا جہاں کوئلہ اور چونا بافراط اور ارزاں تھا۔ مشرقی ضلعوں کی اونی صنعتیں تباہ ہو گئیں اور وہاں کی بجائے شمالی ضلعوں میں قائم ہو گئیں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی گھریلو صنعتیں جو اس دور کے آغاز میں زرعی ضلعوں میں تقریباً عام تھیں۔ آخر میں تقریباً ناپید ہو گئیں۔ صنعتی شہروں کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا اور شمال کے نوخیز دیہات بھی ان جنوبی شہروں کے مقابلے میں جو اپنی گزشتہ صد سالہ تاریخ پر ناز کر سکتے تھے بہت جلد زیادہ آباد ہو گئے۔ انگلستان کی کل آبادی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہی تھی۔ شمالی علاقہ جو پہلے مفلس، کم آباد، جاہل اور رجعت پسند تھا، سنہ ۱۸۲۰ء تک متمول اور گنجان ہونا شروع ہو گیا، وہاں کے باشندوں میں وسعت خیال، کاروباری اولو العزمی اور سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔

یہی تبدیلی کا روشن پہلو ہے۔ تاہم تاریک پہلو بھی موجود تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنوب میں بھٹیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں، مشرقی انگلیا کے سوت کاتنے والوں کو سنہ ۱۷۶۰ء میں جہاں ۸ پنس روزانہ مل رہے تھے، ۴۰ سال بعد وہ صرف ۴½ پنس یومیہ کما رہے تھے۔ انگلستان بھر میں گھریلو دستی چرخوں اور کرگھوں کی تعداد گھٹ رہی تھی اور وہ کم نفع بخش ثابت ہو رہے تھے۔ ان سب نتیجوں کو ایجادوں کے اثر کی جانب براہ راست منسوب نہ کرنا چاہیے ایسٹ انگلیا کی صنعت میں اس زمانے سے پہلے ہی زوال کے آثار ظاہر ہو چکے تھے جبکہ کلوں کے رواج نے اس کو مایوسانہ طریقے سے ایسی کشمکش میں پیچھے ہٹا دیا جس میں آبی قوت اور بھاپ کی قوت کو جیت ہوئی۔ اون کاتنے اور بننے کی گھریلو صنعتیں سنہ ۱۸۰۰ء تک مقابلتہً غیر متاثر رہیں۔

اس لیے کہ نئے ایجادوں کا استعمال ابتدائی سوت میں ہوا نہ کہ اون میں۔ لیکن دستی کام کے مقابلے میں کلوں کی مسابقت نے جلدی یا دیر سے اپنے آپ کو محسوس کرایا اور دستی کام کرنے والے کی جانب سے جو مایوسانہ کشمکش ہوئی وہ بدتر ہوتی گئی اگرچہ بڑے زمانے تک جاری رہی۔

۲۵۹

انسان کی نقل سب سامانوں کی نقل سے زیادہ مشکل ہے۔ معاشیین اور خاصکر ابتدائی معاشیین کا اس واقعے سے غافل رہنا اغلب تھا۔ انسان کی تعریف "محنت" کی جاتی ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ جہاں کہیں محنت کی طلب ہوتی ہے وہاں مزدور بھی پہنچ جاتا ہے۔ آجکل بھی جب کہ ریلوں نے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک آمد و رفت کو آسان اور ارزاں بنا دیا ہے اور جب کہ اخبار اس امر کے متعلق بکثرت معلومات بہم پہنچاتے ہیں کہ کہاں کہاں محنت کی طلب ہے، محنت کسقدر مشکل، آہستگی اور تامل کے ساتھ نقل پذیر ہوتی ہے! اس کی نقل پذیری کو پانی کے تیز بہاؤ کے بجائے پگھلتے ہوئے لاوا کی سست اور ہولناک حرکت سے تشبیہ دینا زیادہ موزوں ہوگا "محنت" مزدوروں کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اکثر صورتوں میں مزدور اکیلا نہیں ہوتا۔ وہ شادی شدہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کے لڑکے اور لڑکیاں جوان ہوں تو وہ ایسے پیشوں سے لگے ہوئے ہوں گے جن کو وہ محض اس وجہ سے چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے کہ گھرانے کا بڑا بوڑھا گھر بار سے قریب کام پانے میں مشکل محسوس کرتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ دور جا کر وہ اپنی حالت کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اگر وہ چلا جائے تو گھر بار سے الگ ہونا پڑے گا، اپنے بچوں کے پیشوں کا نقصان کرنا پڑے گا۔ دوست، احباب، تعلقات اور وطن چھوڑنے سے جبلی نفرت، جو بڑھاپے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے،

یہ سب چیزیں مل کر محنت کی نقل پذیری کو آسان بنانے کی بجائے سست کر دیتی ہیں۔

جب خود ہمارے زمانے میں یہ حالت ہے تو گزشتہ صدی میں حالت کیسی ابتر نہ ہوگی جبکہ ریلیں نہ تھیں اور مزدوروں کے طبقے کے لیے سفر کا ایک امکانی طریقہ پیدل چلنا تھا جب کہ کوئی شخص گاؤں یا دیہات سے ۲۰ میل کے فاصلے پر بھی یہ مشکل جاتا تھا، کام کی تلاش میں گھر بار کے چھوڑنے کے خیال کو پھیلانے والے مشکل سے چند گھومنے والے تھے اور وطن سے دور چلے جانے کے بعد مشکل سے کوئی خبر ملتی تھی[1]۔ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ اس بیان میں کہ مزدور کے لیے جب ایک علاقے میں کوئی کام اور پیشہ باقی نہیں رہتا تھا تو وہ فطری طور سے دوسرے علاقے میں جا کے بس جاتا تھا اور دوسری جانب ان بظاہر مایوسانہ حوصلہ شکنوں اور مشکلوں میں جو دستکار کو اپنی ناپید ہونے والی دستی صنعت میں سرگرمی دکھانے کی کوشش میں پیش آئیں قابل لحاظ فرق ہے۔ ممکن تھا کہ وہ خوش نصیبی سے ان سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ مشینری کی مسابقت کے تحت اس کی صنعت پورے طور پر ناپید ہو جاتی اور کسی دوسرے معاشی ذریعے کو آزمانے کی کوشش میں وہ خود کہیں کا نہ رہتا۔

کاموں اور پیشوں کی اس تبدیلی کی وجہ سے جو مصیبتیں رونما ہوئیں ان کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ان لوگوں کے لیے جن کی صنعت گھٹتی جا رہی تھی دوسرے پیشوں میں جانے کے کیا موقعے تھے۔ مزدور اکثر محنت بچانے والی مشین کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر کوئی کل ایک آدمی کو تین آدمیوں کا

۲۶۰

---

[1] ڈاک کی اعلیٰ شرحوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جو مزدور طبقے کی دسترس سے تقریباً باہر تھیں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ لکھنے پڑھنے کا فن عام طور سے ناپید تھا۔

کام کرنے کے قابل بنائے تو اس سے فوری نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ
دو آدمیوں سے کام چھن گیا اور وہ بیکار ہو گئے۔ یہ نتیجہ لازمی طور سے
صحیح نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ نئی مشینری کے رواج اور اس کے نتیجے کے
طور پر ارزانی کے باعث تجارت میں اتنی توسیع ہو کہ سب پرانے
مزدوروں اور غالباً دوسروں کی بھی کھپت ہو سکے۔ محنت بچانے والی
مشین ممکن ہے کہ دستکار کو ایسی صنعتوں میں نقصان پہنچائیں جن میں
زیادہ توسیع کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن ایسی صنعتوں میں جو آسانی
کے ساتھ ترقی کر سکتی ہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مجموعی حیثیت سے
جو صنعتیں نئی ایجادوں سے متاثر ہوئیں وہ دوسری قسم کی تھیں یعنی ان
میں بڑی توسیع کی جگہ موجود تھی۔ روئی کی درآمد میں سات گنا اضافہ
یارک شائر کی پارچہ کی تجارت میں دس گنا اضافہ، بٹر کی پیداوار
میں گنا اضافہ، درآمد کی مجموعی مقدار میں سات گنا اضافہ اور ۱۸۴۷ء
سے ۱۸۱۵ء تک درآمد کی مقدار میں پانچ گنا اضافہ، ان سب کو اس واقعے کے
پہلو بہ پہلو رکھنا ضروری ہے کہ آبادی بڑھ کر بمشکل دگنی ہوئی تھی
اور یہ ظاہر ہے کہ نئی ایجادوں نے تجارت میں اتنی وسعت پیدا
کی کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے میں بظاہر حق بجانب نہیں ہوں گے کہ مزدور
کے لیے خاص طلب موجود تھی اور ان لوگوں کے لیے جو مجبوراً ایک
پیشے کو ترک کر کے دوسرے پیشے میں داخل ہو رہے تھے بہت سے موقعے تھے۔
لیکن یہ نتیجہ دو اہم وجہوں سے مشروط ہے پہلے یہ کہ مزدوروں
کی طلب گو زیادہ تھی۔ مگر اس کا زیادہ حصہ عورتوں اور بچوں کی محنت
پر مشتمل تھا۔ اس معاملے پر ہمیں دوبارہ بحث کرنی پڑے گی۔ دوسرے
یہ کہ طلب ابتدا میں زیادہ تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج
گھٹتی گئی۔ جب تک نئی کلوں کی نوعیت ایسی رہی کہ ہر مزدور کی قوت
میں بڑا اضافہ کرنے پر بھی ان کو دستی محنت سے چلانے کی ضرورت
باقی رہی کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا۔ یہ سوتی تجارت کا "سنہری دور" تھا

۲۶۱

جس کی طرف ریڈ کلف نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اس میں صنعت کے سب شعبے سرگرمی سے ترقی کے ساتھ کام کر رہے تھے واقعہ یہ ہے کہ سوتی تجارت میں مزدوروں کی روز افزوں بڑی تعداد سے کام لینے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۷۸۸ء میں جہاں پچاس ہزار مزدور کام کر رہے تھے سنہ ۱۸۳۲ء تک ان کی تعداد بڑھ کر پندرہ لاکھ ہوگئی تھی۔
لیکن جب بھاپ کے انجن نے دستی قوت کی جگہ لے لی اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی مدد سے کئی چرخوں کو ملا کر چلایا جا سکتا ہے تو مزدوروں اور خاصکر بالغوں کے لیے کام ملنا دشوار ہو گیا۔ اس دشواری میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب کہ قوت سے چلنے والے کرگھے ایک موثر آلہ بن گئے۔ ان کرگھوں کے ایجاد کے بعد کارکردگی کی اس حالت تک پہنچنے میں کئی سال گزر گئے تاہم جب کارکردگی اس حالت پر پہنچی تو جس تیزی سے کرگھوں کا رواج بڑھا اور اس کی وجہ سے جو تغیرات ہوئے وہ حیرت افزا تھے۔ سنہ ۱۸۱۳ء میں ۲۴۰۰ قوت سے چلنے والے کرگھے استعمال میں تھے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں ان کی تعداد ۱۴۱۵۰ تک بڑھ گئی اور چونکہ ان کلوں میں مقابلتہً کم نگرانی اور توجہ کی ضرورت تھی یعنی ۱۵ سال کی عمر کا ایک لڑکا یا لڑکی چار کرگھوں کی نگرانی کر سکتے تھے اور اس کام سے نوگنا زیادہ کام انجام دیتے تھے جو ایک ماہر جلاہا دستی کرگھے پر انجام دے سکتا تھا۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ قوت سے چلنے والے کرگھے اپنے جتنے مزدوروں کی جگہ لی اس زمانے کے کسی دوسرے ایجاد نے نہیں لی۔ لیکن بھیڑوں کی اون کترنے کے جو کھٹوں کی بھی کچھ کم مخالفت نہیں ہوئی واقعہ یہ ہے کہ اون صنعتوں کے مناسب حال کوئی کل ایسی استعمال نہیں کی گئی جس کے خلاف غم و غصے کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ سوتی صنعت نے کلوں کے ساتھ ترقی کی تھی اس لیے اس میں کام کرنے والے مزدوروں کے پیش نظر کسی ایسی قدیم صنعت کا

تصور نہیں ہوسکتا تھا جس کی سادگی، موجد کے بے جا دخل دینے سے
ختم ہوگئی۔ حقیقت میں یہ صنعت گھریلو صنعت کے رتبے کو پہنچی ہی نہیں
تھی۔ بلکہ بالکل نوخیز اور لچکدار تھی۔ لیکن انگریزی صنعتوں میں اونی
کاروبار کی حالت اپنے ابتدائی زمانے میں بگڑے ہوئے بچے
کی سی تھی جو اب بڑا ہو چکا تھا اور جس کی عادتیں پختہ ہو چکی تھیں،
تبدیلی کا مخالف تھا اور جدت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ اس کا کاروبار بہت پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ جہاں
سوتی صنعت میں صرف ایک ضلع ایجادوں سے متاثر ہوا وہاں اونی
صنعت میں تغیر و تبدل واقع ہونے کی وجہ سے کل انگلستان میں
ہیجان پیدا ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ
تھا اس کا دائرہ کافی وسیع تھا اور اجرت پانے والے مزدوروں کی
جتنی تعداد بیکار ہو گئی تھی وہ بھی بہت زیادہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ
صنعتی انقلاب نے اس صنعت پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ پھر
بھی، مزدوروں کی علیحدگی کی وجہ سے نیز کلوں سے مقابلہ کرنے میں دستی
کام کرنے والے مزدوروں کی بیکار کوشش کی وجہ سے جو حقیقی اور
عام مشکلیں رونما ہوئی تھیں وہ اس دور کی بدترین خصوصیتیں نہ تھیں اس
قسم کی چیزیں پہلے بھی ظاہر ہوئی تھیں اور ترقی کرنے والے ہر معاشرے
میں ان کا رونما ہونا ضروری ہے۔ مثلاً جنگ، قحط اور سیاسی
بے اطمینانی کے زمانے میں مصیبتوں کا ان کے نتیجوں کے طور پر
رونما ہونا ضروری ہے اور جب ایسی تبدیلیاں پوری ہو جاتی ہیں،
امن و افراط پلٹ آتے ہیں اور سیاسی مطلع صاف ہو جاتا ہے تو
گزشتہ خرابیوں کو موجودہ خوشحالی کے زمانے میں بھلا دیا جاتا ہے
اور ملک مجموعی حیثیت سے از سرِ نو فارغ ہو جاتا ہے۔
لیکن صنعتی انقلاب کی سب سے بڑی خرابیاں جن کے مستقل
اثرات مختلف جماعتوں کے باہمی تعلقات میں کشیدگی، آقاؤں اور

مزدوروں میں بے اعتمادی و بدگمانی اور قانون و معاشری نظم و ترتیب کے خلاف بے اطمینانی کی شکل میں آج تک چلے آرہے ہیں کہ صنعت میں ظلم و جور اور ناقص قوانین کا براہ راست نتیجہ تھیں۔ ایک بہت بڑی ناانصافی کی گئی تھی جس کا باعث کچھ تو لالچ تھا اور کچھ جہالت۔ اس ناانصافی کا اثر اس قدر شدت سے محسوس کیا گیا اور اُن کے خلاف اس قدر زبردست غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ وہ عام خوشحالی جس سے انگلستان گزشتہ ساٹھ سال سے فائدہ اُٹھا رہا ہے اور وہ تمام رعائتیں جو قانون نے دے رکھی ہیں اور آجروں نے مصالحت کی خاطر اعطا کی ہیں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان کوئی اچھا سمجھوتہ نہ کرا سکے اور نہ غریب آدمی کے اس راسخ عقیدے میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے کہ اسکو امیر آدمی کے فائدے کی خاطر لوٹا جارہا ہے صناع معاشیات والوں اور رائے عامہ کی بے حسی یہ سب اپنی اپنی جگہ ایک حد تک اس ظلم کے ذمہ دار ہیں۔ اب رہے ناقص قوانین تو وہ نتیجے تھے اس غیر دانشمندانہ لیکن دیانتدارانہ کوشش کا جو مزدور کے کندھوں سے مصائب کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

ظلم اور جور کی ابتدا کارخانے کے دروازے سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کارخانے کے اندر دستکاروں کے جمع ہو جانے کے بعد کسی کے لیے اس بات کا موقع نہ رہتا تھا کہ من مانے ڈھب سے کام کرے یا ترک کرے۔ اور بچوں یا کمزوروں کے لیے رعایتوں کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ گرنی میں سب کو سادا اور ایک سا کام کرنا پڑتا تھا۔ انسانی ہاتھوں کو بھی کلوں کی رفتار کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اگر کام کے گھنٹے بہت زیادہ لمبے ہوں تو انسانی ہاتھ کلوں سے بڑھ جاتے ہیں پیچھے رہ سکتے ہیں۔ لیکن کلوں پر کام کے گھنٹوں کے طویل ہونے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ کارخانہ دار کو اس بات کی ترغیب و تحریص ہوتی تھی کہ اس نہ تھکنے والے

۲۶۳

دیو کو تا امکان بہت زیادہ وقت تک کام میں مصروف رکھے۔
یہی وہ خرابی تھی جو مشینری اور قوت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ
چیزیں اپنی ذات سے اس خرابی کی ذمہ دار نہ تھیں۔ لیکن جس
چیز کو انھوں نے ممکن بنا دیا تھا وہ اس کی ذمہ دار تھی۔ قوت اور
کلوں کو استعمال کرنے کے لیے دستکار کارخانوں میں جمع ہوتے تھے
اور یہ کارخانے ناقابل بیان طور پر ظلم و ستم کر سکتے تھے۔ کارخانے
حقیقی قیدخانے ہو سکتے تھے جہاں بچے اور بالغ طویل گھنٹوں تک
کام کرتے تھے اور خراب اور گندہ ہوا میں تھوڑی دیر سو بھی جایا کرتے
تھے اور اس وقت تک کام کرتے تھے جب تک کہ ختم نہ ہونے والے
کام کی وجہ سے مرضوں اور دوسری شکایتوں کا شکار نہ ہو جائیں۔
منافع کا لالچ صناع کو کام جلدی شروع کرنے اور دیر سے ختم
کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اگر کوئی دستکار کام کرنے سے انکار کرتا
تو اس کی جگہ آسانی سے دوسرا آدمی ملجاتا تھا۔ بیکار رہنے کے
معنی فاقہ کشی تھے۔ ایک گرنی سے دوسری گرنی میں منتقل ہونے
کے معنی یہ تھے کہ دوسرے آجر کے تحت کام کیا جا رہا ہے۔ لیکن
اس سے دستکار کے حالات کی تبدیلی لازم نہیں آتی تھی۔ ایسی حالت میں
مزدوروں سے زیادہ کام لینا آسان اور ترغیب دہ تھا اور ایک
روک جو موثر ہو سکتی تھی یعنی رائے عامہ اور قانون تو ان کی جانب
سے مداخلت کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں یہ
چیزیں بھی کمزور کے خلاف قوی کی حمایت کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے، ۲۶۴
جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، وہ خرابیاں جن میں ہم نے صرف ممکن
خیال کیا حقیقت بن گئیں اور حقیقت بعض اعتباروں سے تصور سے
بھی آگے بڑھ گئی۔

ہم اس پیچیدگی اور بدنظمی کو بھی بیان کر چکے ہیں جن پر تجارتیں
کی تاہینی پالسی ختم ہوئی اور کس طرح ابتدائی خیالات ترک کر دیے گئے

اور ان کی جگہ طرح طرح کے محاصل امداد ضابطے اور قاعدے اور بندشوں نے لے لی۔ اس پیچیدہ صورت حال پر جس شخص نے کاری ضرب لگائی وہ آدم اسمتھ تھا۔ یہ سچ ہے کہ نزع کا عالم مدت تک رہا۔ تاہم سخت جان تھی اور بڑی دقت سے اس کا خاتمہ ہوا۔ لیکن ۱۷۷۶ء میں "دولت اقوام" کی طباعت کے بعد وہ بالکل مردہ ہوگئی۔ یوں تو کتاب محولہ پر آگے چل کر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی، لیکن اس وقت اس قدر کافی ہے کہ اس اصول پر غور کیا جائے جس کی بنیاد پر آدم اسمتھ نے تجارتیئیں کے استدلال کو رد کیا تجارتیئین نے مختلف تجارتوں اور پیشوں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر مختلف بندشوں کے قائم کرنے کے لیے شور مچایا تھا۔ لیکن آدم اسمتھ نے اس خیال کو پیش کیا کہ تجارت کو آزادی دینی چاہیئے کہ وہ جہاں اور جس طرح چاہے ترقی کرے۔ اس طرح وہ خود اپنے لیے بہترین راستہ نکال لے گی اور راستہ تلاش کر لینے کے بعد اسی پر چلے گی۔ تقسیم عمل کے اصول پر ہر شخص کو اسی کام پر لگایا جائے گا جس کو وہ بہترین طریق پر انجام دے سکتا ہو اور اس کا ذاتی مفاد اس کام کو انجام دینے کی طرف اس کی رہبری کرے گا اور اس لحاظ سے پوری بندشیں جو تجارت کی آزادی میں رکاوٹ تھیں نہ صرف بیکار بلکہ ضرر رساں تھیں۔ خلاصہ یہ کہ آدم اسمتھ نے یہ استدلال کیا کہ اگر ایک فرد کو اس کے ذاتی اغراض پورے کرنے کی آزادی دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قومی مفاد کو بھی ترقی دے گا اور انسان میں ذاتی منفعت کا جذبہ خدا کی امانت ہے[۱]۔ تجارتیئین کی پالیسی پر آدم اسمتھ کی فتح فوری نہیں ہوئی۔ لیکن اس نے ان لوگوں کے دلوں پر جو معاشی مسائل کے بارے میں سوچتے

[۱] اے ٹائنبی نے اپنی کتاب صنعتی انقلاب کے صفحہ ۱۱ پر اس فقرے کو مختصر طور پر اس اصول کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا ہے جو آدم اسمتھ کے پیروؤں نے مدون کیا تھا۔ فقرہ یہ ہے۔ ''Man's Self—love is God's Providence''.

اور لکھتے تھے اور جو اب معاشئین کہلاتے ہیں، کامل اور عاجلانہ فتح حاصل کی۔

آدم اسمتھ کی کتاب کی جاذبیت اور معاشیات کو سیاسیات سے الگ کرنے اور مسئلہ دولت کو دوسرے معاملوں سے جو اس سے خلط ملط کر دیے گئے تھے الگ کرنے کے بارے میں اس کی تجویز سے جو سلاست وصفائی رونما ہوئی اس نے معاشیات کو تحقیق کے لیے بہت بڑے محرک کا کام کیا۔ لیکن معاشئین نے سلاست وسادگی کے اس نئے طرز کو اختیار کرکے حد سے زیادہ اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔ مثلاً اگر اس سوال کو کہ صنعتی خوشحالی کیسے بڑھائی جائے اور دولت میں کیونکر اضافہ کیا جائے اس سادہ تجویز کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے ہر شخص کو من مانے طور پر آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ہر قسم کی دخل اندازی غلط تھی۔ اسی وجہ سے "عدم مداخلت" کا اصول رونما ہوا۔ یعنی یہ کہ لوگوں کو من مانے ڈھب پر کام کرنے دیا جائے اور معاشئین نے اس اصول کو اپنا آلۂ کار بناتے ہوئے صنعتی کاروبار میں حکومتی دخل دہی کی تجویزوں کی مخالفت کی اور ان کو غلط ٹھہرایا۔ کیونکہ ہر ایک فرد عملی آزادی حاصل ہونے کی صورت ہی میں اپنے ذاتی اغراض کو ترقی دے کر اس کے نتیجے کے طور پر سب کی خوشحالی کو ترقی دے سکتا ہے۔ چنانچہ مالتھس لکھتا ہے کہ "ذاتی نفع کے جذبے کو دوسروں کی بہی خواہی کے جذبے سے قوی تر بنانے ہی سے ناواقف لوگوں کی رہبری عام خوشحالی حاصل کرنے کی جانب ہوگی اور اگر ان کے عمل کا اساسی اصول دوسروں کی بہی خواہی قرار دیا جائے تو اصل مقصد یعنی عام خوشحالی حاصل کرنے میں وہ ناکام رہیں گے"۔ یہ خیال کرنا مشکل نہیں کہ دوسروں کی معمولی بہی خواہی کرنے والا بھی کارخانے میں بچوں کو روزانہ بارہ یا تیرہ گھنٹے سخت محنت کرتے دیکھ کر

یہ خیال کرنے لگا ہو کہ معاشیات جس کا بنیادی اصول "منفعت ذات" تھا نہایت سنگدل اور بے رحم علم ہوگا اور اس علم سے حاصل کیے ہوئے نتیجوں میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ غلط فہمی دونوں جانب سے ہوئی۔ آدم اسمتھ اور اور اس کے پیروں نے تجار ٹیئن کی عائد کردہ بندشوں اور رکاوٹوں سے بیزار ہو کر آزادی اور آزادانہ مسابقت کے لیے شور مچایا تھا اور اسی کو خرابی دور کرنے کی تدبیر بتایا تھا۔ لیکن آزادی اور آزادانہ مسابقت جو صنعتی انقلاب کے نتیجے کے طور پر رونما ہوئی اور جس کا معاشیئین نے خیر مقدم کیا ایک حد تک دھوکے کی ٹٹی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ آقا اور ملازم کے باہمی معاملوں کی حد تک "آزادی" موجود تھی لیکن اس آزادی کا مقصد یہ تھا کہ قوی، کمزور سے بے روک ٹوک مقابلہ کریں۔ گویا عدم مداخلت کی چیخ و پکار محض ظلم کرنے کی آزادی میں دخل دینے کے خلاف احتجاج تھا۔ اس غلط فہمی کا الزام طرفین پر آتا ہے۔ معاشیئین خاصکر ریکارڈو نے ایک انتہائی تجریدی علم کو ترقی دی جو ایسے مفروضات پر مبنی تھا جو ان کے اغراض کے لیے مناسب تھے لیکن صحیح اور حقیقت پر مبنی نہ تھے۔ مفروضات یہ تھے کہ مسابقت مساوی حالات کے تحت ہوتی ہے، انسان "معاشی انسان" ہے اور ایسی مخلوق جو دولت کمانے میں محض اپنے ذاتی نفع کو پیش نظر رکھتا ہے اور ایسا کرنے کی ہمیشہ صلاحیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ان مفروضات کی کوئی تشریح نہیں کی۔ جن لوگوں نے معاشیئین کے اقوال کو مانا بطور حوالہ نقل کیا اور دہرایا انھوں نے بھی اس چیز کا خیال نہیں رکھا کہ یہ اصول تجریدات پر مبنی تھے اور حقیقی حالات زندگی سے ان کا مطابق ہونا ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے استادوں سے بھی آگے بڑھ گئے اور علم جدید نے جن نام نہاد قوانین کو پیش کیا تھا ان کی تقدیس اور

۲۲۶

قطعیت تسلیم کی۔ جو مزدور اپنی اجرتوں میں اضافے کے لیے متحد ہو رہے تھے ان کو نومشق معاشیین نے باتیں سنائیں کہ گویا وہ "احکام عشرہ" کو توڑ رہے تھے۔ یوں تو ویسے ہی ریکارڈو اور اس کے دبستان کی تجریدی معاشیات مزدور اور ہمدرد نوع انسان کو سخت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جس بڑبولے پن سے اس کا اطلاق صنعتی مسائل پر کیا گیا اس کی بنا پر وہ اور بھی زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی یہ امر قابل تعجب نہیں کہ اس علم کو کارخانہ دار کے ہتھیار گھر کا ایک نیا ہتھیار سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے اس سے نفرت کی جاتی تھی اور اس نفرت کی علامتیں اب بھی اس بدگمانی اور ناپسندیدگی کی شکل میں موجود ہیں جو معاشیات کے نتیجوں کے بارے میں اکثر تعلیم یافتہ دستکاروں کی جانب سے ابھی تک ظاہر کی جاتی ہے۔

دخل نہ دینے کے اس تصور نے کہ ہر چیز عمدگی کے ساتھ انجام پا رہی تھی باوجود اس کے کہ معاملہ برعکس تھا، ایک زمانے تک اس بے اطمینانی کو دبائے رکھا جو کارخانوں میں کام کرنے والوں کی حالت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن حقیقی واقعات کو چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے جو بے حسی اور اطمینان تھا اس کی جگہ رفتہ رفتہ فکر و تشویش نے لے لی۔ ۱۸۰۲ء میں کارخانوں کی اندرونی حالت پر ایک نظر ڈالی گئی تھی جب کہ سر رابرٹ پیل نے سوتی گرنیوں میں کام کرنے والے کار آموزوں کی قابل افسوس اور ابتر حالت کی جانب پارلیمنٹ کی توجہ پھیری۔ بظاہر پیرش کے حکام اپنے حلقے کے محصول ادا کرنے والوں کو مفلس بچوں کی نگرانی کے فرض سے سبکدوش کرنے کی خاطر ان بدقسمت بچوں کو گرنیوں میں کار آموزی کے لیے روانہ کر دینے کے خوگر ہو گئے تھے۔ اور ایک مرتبہ گرنی میں جانے کے بعد ان سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا تھا اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا بھی کوئی اچھا انتظام

۲۶۷

نہ تھا۔ کیونکہ غلام ہر حالت میں ایک جائداد ہے اور گو اس کے مرنے سے نقصان ہوتا تھا لیکن خالی جگہوں کو بھرنے کے لیے دوسرے کار آموز آسانی سے مل سکتے تھے۔ قانون پیل نے کار آموزوں کے لیے کام کا وقت بارہ گھنٹے روزانہ مقرر کیا جس میں کھانے کا وقت شامل نہ تھا اور تعلیم کے متعلق چند قاعدے اور ضابطے بنائے۔ اس کے بعد پھر خاموشی طاری رہی اور کوئی نئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ۱۸۳۲ء میں کارخانوں کے قانونی مسودے کے بارے میں کمشنروں کی رپورٹ پیش ہونے تک ملک کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ واقعات کیا تھے۔ رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ بدقسمت ہستیوں کی تقریباً دو نسلیں اس اثنا میں گرنیوں میں پس چکی تھیں اور ان سے اکثروں کی زندگی مایوسانہ طریقے پر سخت مشقت کرتے گزری تھی اور ان کو مصیبتیں بہت جھیلنی پڑیں۔

اس رپورٹ سے خاصکر بچوں کی حد تک بے اعتنائی، کام کی زیادتی، وحشیانہ برتاؤ کے درد بھرے قصے نقل کرنا آسان ہوگا۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہے کہ عام طور پر ایسی حالت تھی۔ مائیکل سیڈلر جو اس کمیٹی کے صدر تھے دستکاروں کی حمایت میں مجنونانہ غصے سے لڑ رہے تھے اور جو شہادت انھوں نے پیش کی اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تاریک اور ناقص ترین تھی۔ اس کا کچھ حصہ جرح میں غلط ثابت ہوا اور بیشتر حصہ پرانا یعنی تیس چالیس پیشتر کے واقعات کے متعلق تھا۔ چھوٹی گرنیوں میں خاصکر پانی سے چلنے والی ان گرنیوں میں جن میں قوت کی رو مسلسل نہ ہونے کی وجہ سے کام کے گھنٹے بہت زیادہ لمبے تھے جو مثالیں ملیں ان کو اس طرح پیش کیا گیا کہ گویا سب گرنیوں میں یہی حالت پائی جاتی تھی۔ کارخانہ داروں کو تردیدی شہادت پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اگر ان تمام امور کو ملحوظ رکھا جائے اور صرف ان سنجیدہ

۳۶۸

شہادتوں اور رپورٹوں پر بھروسا کیا جائے جو ۱۸۳۳ء میں دورہ کرنے والے کمشنروں نے فراہم کی تھیں تو بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ صورت حال کافی نازک تھی۔ اسکاٹ لینڈ اور شمالی انگلستان میں عام طور سے کام کے بارہ گھنٹے رکھے گئے تھے جس میں کھانے کا وقت شامل نہ تھا۔ ایسے بھی بہت سے کارخانے تھے جہاں تیرہ یا چودہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا، جب گرنیوں کو ضایع شدہ وقت کی کمی پوری کرنی پڑتی تھی تو اس سے بھی زیادہ دیر تک کام لیا جاسکتا تھا۔ ایک گواہ نے کہا کہ گزشتہ گرمی کے موسم میں اس کو صبح کے چھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک کام کرنا پڑتا تھا اور جب اس نے محاسب سے شکایت کے طور پر کہا کہ میں اتنی دیر تک کام کرنا پسند نہیں کرتا تو محاسب نے جواب دیا کہ تم تختہ پہ جنگی کر رہے ہو۔ کھانے کے لیے کوئی مناسب وقت نہیں دیا جاتا تھا۔ کھانے کا وقفہ عام طور سے ۴۰ منٹ ہوتا تھا اور اس میں بھی کلوں کی صفائی کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ناشتے یا چائے کے لیے کوئی وقت نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک آدھ لقمہ کھا کر کام کرنے کے لیے بھاگنا پڑتا تھا اور بعض اوقات کھانے پر اس قدر گرد و غبار جم جاتا تھا کہ اس کو جھاڑ کر کھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ مزدوروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کافی سخت تھا۔ لیکن تنہا بالغ مزدوروں ہی کو یہ مصیبت برداشت نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ عورتوں اور بچوں سے بھی یہی برتاؤ کیا جاتا تھا اور بچوں میں سے بعض تو زمانۂ رضاعت سے بہ مشکل باہر ہوتے تھے۔ گو گرنیوں میں عام طور سے ۹ سال یا کچھ زیادہ عمر کے بچے کام کرتے تھے لیکن چھ سال کی عمر کے بچوں کا پایا جانا بھی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اکثر تو سات سال سے کم عمر کے ہوتے تھے اور آٹھ سال کی عمر والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ لمبے گھنٹوں کی محنت کو برداشت کرنے کے لیے ان بچوں کا مجبور کیا جانا انسانیت

کے خلاف تھا۔ پھر بھی انھیں برداشت ہی کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی چودہ سال کی عمر کا بچہ ۱۶½ گھنٹوں میں سے ۸ گھنٹے کام کرکے ٹھہرنا چاہتا تھا تو اس کو کام جاری رکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور ہر طرف کی دھمکی دی جاتی تھی۔ ایک گواہ نے کہا کہ "میں نے دیکھا کہ بچے تھک کر سو رہے ہیں اور مشینری کے رک جانے پر بھی سوتے ہیں ان کے ہاتھ بدستور چل رہے ہیں۔ میں ٹھہر گیا اور ان کی طرف دو منٹ تک دیکھتا رہا۔ گہری نیند میں بھی ان کے ہاتھ چلتے تھے"۔ بچوں کو جاگتا رکھنے کے لیے سزا بھی دی جاتی تھی، مثلاً تسمے مارے جاتے تھے پانی میں ڈبویا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ طریقہ ویسا عام نہ تھا جیسا کہ پہلے تھا۔ اس طریقے کے بارے میں سیڈلر نے جب سے احتجاج کیا آجر اپنے فورمینوں کو پہلے کی طرح سزا دینے پر مجبور نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ عام طور سے فورمین یا نگراں کار مارپیٹ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سوت کاتنے والے اور اون کی کتائی سے پہلے صفائی کرنے والے مارا پیٹا کرتے تھے جن کے تحت بچوں کو کام پر لگایا جاتا تھا۔ مگر آجروں کو پورے طور پر معاف نہیں کیا جاسکتا محض اس وجہ سے کہ ان کی لاعلمی یا بے احتیاطی سے ایسا طریقہ روا رکھا جاتا رہو۔ اس کے علاوہ اگرچہ لمبے گھنٹوں سے ہمیشہ جسمانی ضرر پہنچا تاہم کمزوری اور جسمانی خرابی عام طور سے پائی گئی جس کا باعث محض یہ تھا کہ نابالغ بچوں سے یکساں، مسلسل اور تھکا دینے والے کام لمبے گھنٹوں تک لیے جاتے تھے۔ کے لی کے ایک گواہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ "تم نے یہ بیان کیا کہ تیس لڑکوں کے منجملہ جنھوں نے تمھارے ساتھ اس کارخانے میں کام کیا ہے آٹھ لڑکوں کا جسمانی نشو و نما متاثر ہوا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ دوسرے کارخانوں میں کام کرنے والے اور لڑکوں کا بھی یہی حشر ہوا؟" تو اس نے یہ جواب دیا کہ "ہاں کے لی میں آپ کو اس کی

۲۶۹

سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں[1]، اور طبی شہادت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ بے باکانہ بیان پورے طور پر بے بنیاد نہ تھا۔ سنہ ۱۸۳۳ء کے کمشنر اس نتیجے پر پہنچے کہ سب کارخانوں کی حالت خراب نہیں تھی اور خرابیاں زیادہ تر قدیم کارخانوں میں پائی جاتی تھیں خاصکر ان میں جو آجروں کے تحت تھے اور جن میں آبی قوت استعمال کی جا رہی تھی۔ نیز اکثر نئے کارخانے۔ جو بڑے سرمایہ داروں کی ملک تھے بخوبی چل رہے تھے اور ان میں مزدور قانع تھے۔ تاہم یہ ثابت کر کے کہ سب آجر بالغوں اور بچوں سے برا سلوک نہیں کرتے تھے موجودہ صورت حال کو حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہ امر کہ ایسا برتاؤ ممکن تھا اور بعض صورتوں میں واقعہ تھا پارلیمنٹ کے دخل دینے کے لیے کافی تھا سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان الزام کو تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ واقعہ کہ سب سے زیادہ مظالم چھوٹے کارخانوں میں ہوتے تھے جہاں اُستاد پیشہ کو بھی عام طور پر کام کرنا پڑتا تھا اور اس لحاظ سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے بھی ہمدردی رکھتا ہوگا اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے جو بعد میں تجربوں کی بنا پر دوبارہ ثابت ہو گیا۔ یعنی یہ کہ گھریلو صنعتوں[2] میں اس کا امکان تھا کہ زیادہ سے زیادہ خرابیاں موجود ہوں، مثلاً طولانی کام کے گھنٹے، غیر صحت بخش حالات اور کم سے کم اجرت وغیرہ۔ لیکن اس حقیقت کی بنا پر ہمیں بڑے سرمایہ دار کو صنعت کا آمر مطلق خیال کرنے سے احتیاط کرنی چاہیے مزدوروں

---

[1] - یہ اقتباس سنہ ۱۸۳۲ء کی کمیٹی کی روئداد سے ماخوذ ہے۔ دوسرے حوالے سنہ ۱۸۳۲ء کی رپورٹ سے نقل کیے گئے ہیں۔

[2] - مثلاً کمبلیں بنانے، ارزاں خیاطی اور لباس سازی کے پیشوں میں۔

۲۷۰

کو بھی الزام سے پوری طرح بری نہیں کیا جا سکتا۔ چند مثالیں ایسے شخص کی بھی ملتی تھیں جو اپنے بچوں کو اس طرح کی مصیبتیں اٹھانے سے روکتا تھا جو خود اس نے اٹھائی تھیں۔ باقی اکثر لوگوں کو اپنے بچوں کی کمائی سے حاصل ہونے والی زائد آمدنی کے لالچ میں ان مصیبتوں کا کوئی خیال نہیں تھا جو انھیں اجرت پر کام کرنے میں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس طرح ان کے بچے اسی راستے پر لگا دیے گئے جس پر ان کے ماں باپ اس سے پہلے چلے تھے اور دس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ کارخانوں میں کام کرنے لگتے تھے۔

یہ ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ کہا جا چکا ہے کہ اصول عدم مداخلت کے تحت غریبوں اور کمزوروں کو کارخانوں کے مالکوں سے معاملہ طے کرنے کی جو آزادی دی گئی تھی اس کا اکثر صورتوں میں یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو غلام کے مثل بیچ ڈالتے تھے۔ اخلاقی حیثیت سے ان پر الزام آتا ہے۔ لیکن اس کے سوا وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ وہ خود چونکہ قطعی محتاجی کی حالت میں تھے اس لیے ممکن ہے کہ مالکان گرنی سے کشمکش کرنا ان کو بظاہر مایوس کن معلوم ہوا ہو۔ رائجہ خیالات جن کا اظہار علمائے معاشیات نے کیا ان کی ذرا بھی تسلی کا باعث نہ تھے۔ قانون ان کی مدد کرنے کی بجائے ان کی راہ میں حائل تھا۔ اس لیے کہ ۱۸۲۵ء میں قوانین اتحاد کی تنسیخ تک مزدوروں کے لیے اجرت بڑھانے کی غرض سے متحد ہونا جرم تھا جس کی سخت سزائیں تھیں اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ والدین کا بچپن چونکہ کارخانوں میں کام کرتے گزرا تھا اس لیے بڑے ہو کر وہ غیر تعلیم یافتہ اور بے پروا رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سارے نظام کی بدترین خصوصیت یہ تھی کہ اس کی خرابیاں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی اور بڑھتی گئیں۔ جاہل اور سنگدل ماں باپ کے بچے بھی فطری طور سے ان ہی کے سے تھے۔

اور مصیبتوں کے متعلق وہ بھی یہ خیال کرتے تھے کہ ان کو دور کرنے کی بجائے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ حالات تیزی سے بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دستکاروں کا سارا طبقہ ذلت اور تباہی کے گڑھے میں گر رہا تھا۔

بدقسمتی سے بعض آجروں کی سختی اور بے پروائی ہی ایک خرابی نہیں تھی جس نے صنعتی انقلاب کے آخری زمانے کو اس قدر نقصان رساں بنا دیا تھا۔ تقریباً اتنی ہی بڑی مصیبت اس خیرانہ پالیسی سے بھی رونما ہوئی جو عجلت سے اور پوری طرح غور کیے بغیر اختیار کی گئی۔

انگریزی "قانون مفلسی" ۱۶۰۱ء میں نافذ ہوا اور اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مفلسوں کی امداد کا بار قوم کو اٹھانا چاہیے۔ اس قانون میں ان بوڑھوں اور معذور مفلسوں کو جو اپنے طور پر روزی کمانے کے قابل نہ تھے اور اس لحاظ سے خیراتی امداد کے مستحق تھے ان مسٹنڈے مفلسوں سے الگ کیا گیا جو کام کی صلاحیت رکھتے تھے اور دوسروں کی طرح امداد کے لایق نہ تھے۔ ان کی کاہلی کے دو اسباب تھے۔ یا تو یہ کہ وہ فطری طور پر سست تھے یا یہ کہ واقعی انھیں کوئی کام کرنے کے لیے نہ مل سکتا تھا۔ کاہلوں کے لیے ملکہ ایلزبتھ کے مجوزہ قانون نے سزا یا کم از کم ایسی تکلیف تجویز کی تھی جو ان کو کاہلی سے روک سکے۔ بیکاروں کے لیے کام پیدا کرنے کی سفارش کی گئی تھی، لیکن یہ کوئی سخت کام ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم ان "کارخانوں" سے بخوبی واقف ہیں جہاں اس قسم کا کام مہیا کیا جاتا تھا۔ لیکن اس اصطلاح کا مفہوم خود بدل گیا ہے۔ اب اس سے مراد ایسا کارخانہ ہے جس میں ناگوار کام کی کچھ مقدار بیکاری سے باز رکھنے کے لیے دی جاتی ہے۔

۱۶۰۱ء کے قانون مفلسی اور ۱۷۸۲ء کے قانون گلبرٹ کے درمیان جو ۱۸۰ سال کا زمانہ گزرا اس کے دوران میں قوانین نافذ ہوئے

جو قابل غور ہیں۔ ۱۶۶۲ء کے قانون بندوبست کی رو سے یہ قرار
دیا گیا تھا کہ پیرشوں سے جو لوگ آئیں خواہ وہ اس پیرش سے
خیرات یا امداد طلب نہ کریں جس میں وہ وارد ہوئے تھے انھیں
ان کے وطن لوٹا دیا جائے تاکہ ان کا بار نئے پیرش پر نہ پڑنے
پائے۔ اس طرح اس قانون نے مزدوروں کے طبقے کو خدمتگاری
یا غلامی کے درجے تک گھٹا دیا تھا۔ اس نے مزدور کے لیے اسبات
کو تقریباً ناممکن بنا دیا کہ وہ وطن سے دور جاکر کام یا زیادہ اجرت
حاصل کرنے کے موقع سے فائدہ اٹھائے۔ اس نے مزدور کے بلحاظ طلب
نقل مقام کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی اور اگرچہ بعد میں جو
قوانین نافذ ہوئے ان کی رو سے اس میں ترمیم ہوگئی پھر بھی اس کا
عمل سخت رہا۔ ۱۶۹۱ء کے ایک قانون کی بموجب یہ لازم قرار دیا گیا
کہ مفلسوں کی تعداد اور ان کو دی ہوئی امداد کی تفصیلات کا ایک
رجسٹر رکھا جائے اور بجز کسی منصف یا عدالت کے حکم یا اجازت کے
کسی دوسری خیرات کو ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ قانون اس وجہ سے قابل ذکر
ہے کہ اگرچہ اس کا مقصد خیرات دینے کے طریقے کو باقاعدہ بنانا
تھا، لیکن اس کی وجہ سے بعد میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوئیں
کیونکہ پہلے نگرانکاروں کے جو اختیارات تھے وہ اس قانون کی
رو سے میران عدل کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ تیسرے قانون نے جو
۱۷۲۲ء میں نافذ ہوا پیرشوں کو اجازت دی کہ مفلسوں کو رکھنے کے
لیے مکان تعمیر کرنے کی انجمنیں بنائے اور یہ حکم دیا کہ کوئی مفلس جو
ایسے مکانوں میں رہنے سہنے سے انکار کرے وہ پیرش کی امداد
کا نہ تو مستحق ہوگا اور نہ اس کو طلب کر سکے گا۔ اس "آزمائشی محتاج خانے"
نے امداد کو اس شکل تک محدود رکھا جس کو گھر کی خیرات یا امداد
کہا جاتا ہے اور اس کے نتیجے نہ صرف محصول کو گھٹانے کی شکل میں
بلکہ درخواست گزاروں کی تعداد میں کمی کرنے کی صورت میں

اطمینان بخش تھے ۔ کاہل اشخاص محتاج خانے میں داخل ہونے کی بجائے اپنا نقاب اتار پھینکتے اور اپنی کفالت آپ کرنے پر قانع ہو گئے۔ اضافۂ آبادی کے باوجود ۱۶۹۸ء میں امدادی محاصل کی جو مقدار تھی اس کے مقابلے میں ۱۷۵۰ء میں بہت کم ہو گئی [۱]

حالانکہ یہ بھی ایک حد تک قانون بندوبست سے سختی سے عمل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی بھیک منگوں کو کارآموزی کا پابند بنا لینے اور جھونپڑوں کو ڈھانے کی وجہ سے اور مزدوروں کے لیے اعلیٰ اجرت کی تلاش میں اپنا گھر بار چھوڑنا مشکل بنانے کے باعث واقع ہوئی تھی ۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے معاملے بخوبی انجام پا رہے تھے اور یہ سب کچھ کسی قدر پیچیدہ طریقوں اور یکسانی اور اجتماعی تشکل کے باوجود ہو رہا تھا ۔ لیکن اکثر بنیادی اصول صحیح تھے ۔ یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ معذور اور محتاج امداد کے مستحق ہیں امداد فراہم کرنے کا فرض قوم پر عاید ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر محلے کو اپنے حلقے کے مفلسوں کا ذمہ دار ہونا چاہیے علاوہ ازیں امداد پانے والوں کی حالت اس آدمی کے مقابلے میں جو اپنی آپ کفالت کرتا تھا کم آرام دہ اور کم خوشگوار رکھی گئی ۔ لیکن بدنصیبی سے یہ صورت حال دیرپا ثابت نہیں ہوئی ۔

۲۷۳

آیندہ جو کچھ ہونے والا تھا اس کی ایک نامبارک علامت امدادی محصولوں کی زیادتی تھی ۔ اٹھارویں صدی کے ابتدائی ۵۰ سال تک محاصل تقریباً ایک حالت پر قایم رہے ۔ ۱۷۵۰ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان ان کی مقدار بڑھ کر تگنی ہو گئی ۔ آبادی کے اضافے کا لحاظ رکھنے کے باوجود محاصل کا اضافہ چھ گنا تھا ۔ ہم ان اسباب میں سے چند کو بیان کر چکے ہیں جو لوگوں کو عارضی یا مستقل طور سے بیکار

[۱] ۱۶۹۸ء کے ۸۱۹,۰۰۰ پاؤنڈ کے مقابلے میں ۱۷۵۰ء میں ۶۸۹,۰۰۰ پاؤنڈ تھے ۔

بنا رہے تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ موثر سبب اجرت کے مقابلے میں قیمتوں کا اضافہ تھا۔ غلہ گوشت مکھن اور جملہ زرعی پیداوار کی قیمت بڑھ گئی تھی اور ان میں بیشی کا سلسلہ جاری تھا۔ جنگی اغراض کے لیے جو محصول وصول کیے جا رہے تھے ان کی وجہ سے دوسری ضروری اشیا کی قیمتیں بھی بڑھ گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے شہروں کے آس پاس مزدوروں کی حالت اتنی خراب نہ تھی۔ لیکن دور افتادہ ضلعوں میں ان کی حالت ابتر اور قابل رحم تھی۔ آرتھر ینگ نے یہ معلوم کیا کہ اجرت کی شرح لندن سے بیس میل کے فاصلے کے اندر ۱۰ شلنگ ۹ پنس فی ہفتہ تھی لیکن لنکاشائر میں اجرت کی شرحیں کم یعنی ۶ شلنگ ۳ پنس، ۵ شلنگ ۲$\frac{1}{2}$ پنس بلکہ ۴ شلنگ ۶ پنس تھیں۔ گو موجودہ زمانے میں ایک کوارٹر گیہوں کی قیمت گلاوسٹر شائر کے مزدور کی دو یا تین ہفتوں کی اجرت کے برابر ہوتی ہے، لیکن ۱۷۶۲ء میں وہ سات ہفتوں کی محنت کی اجرت کے برابر تھی۔ اور گو کہ گیہوں کی روٹی آجکل کے مقابلے میں اُس زمانے میں ملک کی اتنی زیادہ عام غذا نہ تھی، تاہم امئی اور جو کی روٹی کو عوام ناپسند کرتے اور کم استعمال کرتے تھے۔ اِس مسئلے پر کسی پہلو سے بھی نظر ڈالی جائے وہ بالکل صاف تھا۔ اجرتیں اکثر صورتوں میں مزدور کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھیں۔

۲۷۴

اس مشکل کو ملکہ ایلزبتھ کے نظام نے قانون کار آموزی کے ذریعے سے حل کیا تھا۔ چنانچہ اس کی بموجب میران عدل کو اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اشیائے خوردنی کی قیمت کو ملحوظ رکھ کر اپنے اپنے علاقے میں معقول و مناسب اجرت معین کریں۔ اگر اٹھارویں صدی کے ختم پر اس قانون پر عملدر آمد ہوتا تو ظاہر ہے کہ میران عدل غلے کی قیمت کے اضافے کے تناسب سے اجرتوں میں بھی اضافہ کر دیتے۔ لیکن یہ قانون مدت ہوئی

حرف غلط بن چکا تھا۔[1] خود ہمارے زمانے میں اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ہمیں اتحاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ اس زمانے کے لحاظ سے اتنا ہی وقت سے پہلے تھا جتنا کہ میزان عدل کے محاصل لگانے کا طریقہ پرانا ہو چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مزدور سبھاؤں کی شکل میں اتحاد کا آغاز ہو رہا تھا۔ درزیوں، اون صاف کرنے اور بننے والوں، چھری کانٹے بنانے والوں، ریشم بافوں اور دوسرے کئی پیشے والوں کی سبھائیں سنہ ۱۷۵۰ء جیسے زمانے میں بھی موجود تھیں۔ لیکن ان کی اجرت بڑھانے کی کوششیں قانوناً ممنوع تھیں۔ اس لیے وہ صرف پوشیدہ طور سے اور احتیاط کے ساتھ ان کو جاری رکھ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ اجرت میں ضرورت کے موافق اضافہ کرنے کی قابلیت نہ تو پرانے نظام میں تھی اور نہ نئے نظام میں۔ اور اس اثنا میں جذبات سے متاثر ہونے والے عوام کے خیالات میں ان مصیبتوں نے ہیجان پیدا کیا جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ جو کچھ انھیں دیا گیا وہ دوسرے عاجلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ نیک کاموں کی طرح بدترین چیز ثابت ہوا۔ اس لیے کہ وہ بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ اجرتوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کچھ امداد یا "بھتہ" دیا جائے۔ عام طور سے یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ قانون سازی فایدہ پہنچانے میں تو اکثر بے اثر رہتی ہے لیکن نقصان پہنچانے میں اس کی قوت غیر محدود ہوتی ہے۔ اس کی بھتے کے

---

[1] یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنی مدت سے۔ ۱۷۲۵ء میں لنکاشائر میں اجرتوں کا جو تعین کیا گیا تھا وہ ۱۷۹۵ء میں ایک تاریخی ندرت کے طور پر شایع کیا گیا۔ ۱۷۳۹ء میں شراپ شائر میں تعین کیا گیا۔ دوسری طرف اکثر لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگرچہ اجرتوں کا تعین گاہ گاہ کیا جاتا تھا پھر بھی ان کا رواج کبھی عام نہیں ہوا یا ابتدا ہی سے ان پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

۲۷۵ طریق سے بہتر کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔
اس طریق کا آغاز دو نمایاں واقعات سے ہوتا ہے۔ پہلا واقعہ ۱۷۸۲ء کا گلبرٹ کا قانون ہے جس میں کچھ اچھے قاعدوں کے ساتھ چند نا قابل تعین بڑے ضابطے بھی شریک تھے۔ مثلاً مسٹنڈے غریبوں کو محتاج خانوں میں داخل کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ قرار دیا گیا تھا کہ غریبوں کے لیے ان کے گھر بار سے متصل کام نکالا جائے امدادی محصولوں کی آمدنی سے رقم لے کر اجرتوں میں اضافہ کیا جائے اور عطائے امداد کے بارے میں میران عدل کے اختیارات مداخلت کو بڑھایا جائے۔ دوسرا واقعہ، پہلے واقعے کا براہ راست نتیجہ تھا۔ ۱۷۹۵ء میں برک شائر کے میران عدل سہ ماہی اجلاس میں بمقام اسپین ہیم لینڈ جمع ہوئے اور انھوں نے یہ اعلان کیا کہ غریبوں کی حالت پہلے[۱] کے مقابلے میں زیادہ امداد کی طالب ہے اور چونکہ قیمتوں کے شدید تغیرات کے باعث اجرتوں کا تعین بے سود ہو گیا تھا اس لیے یہ تجویز پیش کی کہ ہر خاندان کو اس کے افراد کی تعداد کے تناسب سے امداد مقرر کی جائے جو روٹی کی قیمت پر مبنی ہو۔ اس پالیسی کو جس مستعدی

---

[۱] ۔ یہ تاریخ قابل ذکر ہے، کیونکہ ٹھیک اسی زمانے میں ان ایجادوں کی سابقت جو اونی صنعتوں میں استعمال کی جا رہی تھیں، زرعی علاقوں میں محسوس کی جانے لگی جہاں پارچہ بافی اور سوت کی کتائی نے ناکافی زرعی اجرتوں کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے زائد اجرت کے مواقع فراہم کیے تھے۔ جب ان ذیلی صنعتوں کا زوال شروع ہوا تو میران عدل کا یہ خیال بالکل حق بجانب تھا کہ اس ذریعہ آمدنی کی کمی کے معاوضے کے طور پر کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔ اس سے میران عدل کے طرز عمل کی تاویل تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ ان کی اختیار کردہ روش دانشمندانہ تھی۔

سے تمام ملک میں اختیار کیا گیا اس کی بنا پر یہ اعلان "اسپین ہیم لینڈ قانون پارلیمان" کے نام سے موسوم ہوا۔

اس سے پہلے کہ اس تباہ کن تجویز کے نتیجوں پر غور کیا جائے یہ اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا مفہوم کیا تھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اس تجویز میں مفلسوں کو بھکاری پن سے روکنے کا خیال ہی سرے سے ترک کر دیا گیا تھا۔ محتاج خانوں میں کام لینے کی آزمایش ترک کر دی گئی۔ بھکاری کو ویسی راحت پہنچانے کا سامان کیا گیا جیسی کہ محنت کرنے والوں کو حاصل ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب اجرتوں کی کمی پورا کرنے کے لیے معاوضہ دیا جانے لگا تو جو شخص کاہل تھا اور سب سے کم کماتا تھا اس کو سب سے زیادہ معاوضہ مل سکتا تھا۔ وہ جتنا زیادہ کاہل، فضول خرچ اور غیر کفایت شعار ہو اتنا ہی زیادہ پاتا تھا۔ اگر وہ بال بچوں کی پرورش کا خیال اور انتظام کیے بغیر شادی کر لیتا اور اس کا گھرانا بڑا ہو جاتا تو اس کے لیے یہ کوئی بوجھ نہ تھا کیونکہ ہر بچے کے لیے الاونس مقرر تھا۔ خلاصہ یہ کہ اس کی مشکلیں اس فکر کے بغیر کہ آیا ان کا باعث وہ خود تھا یا نہیں دور ہو جاتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ محنتی اور دیانت دار مزدور کو سزا ملتی تھی۔ اگر کوئی شخص سخت مشقت، دور اندیشی اور کفایت شعاری کے ذریعے سے اپنے کو امداد سے بے نیاز بنا لیتا تھا تو اس کو نہ صرف یہ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوتی تھی کہ اس کے کاہل ساتھی کاہلی کے باوجود اتنے ہی مزے میں ہیں جتنا کہ وہ بلکہ اس وجہ سے بھی کہ خود اس کو اس امدادی فنڈ میں شرکت کرنی پڑتی تھی جس سے ان کی امداد ہوتی تھی گویا وہ اس کی محنت کے صدقے میں کاہلی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ محنت کرنے کے لیے کوئی محرک باقی نہیں رہا۔ اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ "آخر میں ان کے لیے کیوں محنت کروں"

۲۷۶

اگر میں بھی کاہل بن جاؤں تو امدادی فنڈ میری کفالت کرے گا۔"
اس طرح انگلستان بھر میں مزدور بھکاری پن پر اتر آئے۔ یہی نہیں
ہوا کہ محنت کرنے والوں کے نقصان سے کاہلوں اور بدکاروں
کی حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ آنے والی نسل کے مزدوروں کی پرورش
بھی بے کاری اور بھکاری پن سے شروع ہوئی۔ خوددار مزدور
جو امدادی فنڈ سے کچھ لینا اپنی نشان سے گری ہوئی چیز سمجھتا تھا
عام طور سے شادی بیاہ کرنے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ صرف بیکار
بھیک منگے بیاہ کرسکتے اور بچوں کو آرام سے پال سکتے تھے۔ اگر ہم
اس طبعی اور اخلاقی تنزل و انحطاط کو بھی شامل کریں جس کے متعلق
یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ کارخانوں میں شروع ہوگیا تھا تو ہماری
سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ اس نظریے میں کچھ نہ کچھ معقولیت
ہے کہ انگریز مزدوروں کی حالت ویسی نہیں ہے جیسی کہ اٹھارویں
صدی میں تھی۔ کیونکہ انیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال میں
آئین سازی اور صنعتی حالات کا بڑا رجحان یہ تھا کہ اچھوں پر بار
ڈال کر بروں کی ہمت افزائی کی جائے اور اس طرح مزدوروں کی حالت
کو جو شروع ہی سے بری تھی آئندہ اور بدتر بنادیا جائے۔

مزدور کے حق میں الاونس کا طریق اخلاق بگاڑنے والا اور
تباہ کن تھا۔ لیکن برے اثرات یہیں ختم نہیں ہوگئے۔ جس وقت
اجرتوں کی کمی کو امدادی فنڈ کے ذریعے سے پورا کرنے کا اصول
تسلیم کرلیا گیا تو آجر اپنے مزدوروں کو مناسب اجرت دینے کے فرض
سے سبکدوش ہوگئے۔ اشیاء خوردنی اور دوسری ضرورتوں کی قیمتیں
تو بڑھ گئی تھیں لیکن اجرتوں کا اضافہ ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ زراعت
اور صنعت کے کاروبار میں مجموعی حیثیت سے مزدور کی کمائی اتنی
نہ ہوئی تھی جو اس کو اور اس کے خاندان کو خوشحال رکھنے کے لیے
کافی ہو۔ اس خرابی کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ اجرتوں میں

۲۷۷

اضافہ کیا جاتا۔ لیکن ایک دفعہ امدادی فنڈ سے الاونس جاری کیے جانے کے بعد اجرت کے اضافہ کی ضرورت کو موثر طور پر آجروں کے ذہن نشین کرنا ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آجروں پر جو فرض عائد ہونا چاہیے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو گئے اور قوم پر مجموعی حیثیت سے اس کا بار پڑا۔ مثلاً ہر قسم کے جائداد کے مالکوں کو بار اٹھانا پڑا جن میں سے اکثر مزدوروں سے کوئی کام ہی نہ لیتے تھے اور اس لیے بے جا طور پر زیر بار تھے۔

غریبوں کی امداد کے انتظام کی تبدیلی جس کو قانون گلبرٹ اور برک شائر کے میران عدل نے شروع کیا تھا ہر لحاظ سے بری تھی وہ مزدور اور آجر دونوں کے لیے اخلاق خراب کرنے والی اور خطرناک طور پر بیش خرچ تھی۔ امدادی محصولوں میں نئے دن اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۱۷ء میں جب کہ آبادی کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ تھی ان محصولوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۷۸ لاکھ ۷ ہزار ۸ سو ایک پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔ محاصل اس قدر ناقابل برداشت ہو گئے کہ زمین بے جتی پڑی رہنے لگی۔ بکنگھم شائر میں بمقام چولسبری ۱۸۰۱ء میں محصولوں کی تعداد ۱۰ پاؤنڈ اشلنگ تھی۔ لیکن ۱۸۳۲ء میں وہ ۳۶۷ پاؤنڈ ہو گئی۔ اس لئے بہت پوری زمین سب غریبوں کو پیش کی گئی۔ لیکن انھوں نے اس پیش کش کو رد کر دیا اور اس بات کو ترجیح دی کہ ان کے فائدے کے لیے زمین سے قدیم طریقے پر ہی کام لیا جائے۔ یہ ایک استثنائی صورت تھی۔ لیکن اگر مفلسوں کو امداد دینے کا سلسلہ اسی طریقے سے جاری رہتا تو انگلستان بھر میں عام ہو جاتا۔ اور اس اثناء میں ان کثیر اخراجات کے باوجود کوئی بھی مطمئن یا قانع نہ تھا۔ یہاں تک کہ بھکاری بھی اس سے نہ بچ سکتے تھے چنانچہ کاہلی اور سرزوری نے بہت جلد تشدد کی شکل

اختیار کرلی ۔ بمقام بن کلف بھیک منگوں نے ایک نگران کار کو ڈبونے کی دھمکی دے کر لوٹ جانے پر مجبور کیا۔ اس طریق عمل کی مثال دوسرے مقاموں پر ناپید نہیں تھی۔ ذاتی مدافعت میں زمینداروں نے جھونپڑے نکلوا دیے جو بھکاریوں کی پناہ گاہ بن سکتے تھے۔ بلکہ اپنے ہی مزدوروں کو کسی جگہ بس جانے سے روکنے کے لیے ہر قسم کے مکر و فریب سے کام لینا شروع کیا۔ لیکن سخت ترین مشکلوں کا سامنا کرنا دیانت دار اور خود کفیل مزدور کی قسمت میں لکھا تھا جس کا بھکاریوں کے لیے جگہ نکالنے کے لیے اکثر اخراج کیا جاتا تھا۔ کیونکہ بھیک منگوں کو خیرات دینے کی بجائے ان سے اجرت پر کام لینا زیادہ ارزاں تھا۔ ۲۷۸

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کی تصویر نہایت تاریک ہے۔ نپولین کے خلاف کشمکش میں انگلستان کو جو نصرت و عظمت حاصل ہو رہی تھی اس کا مقابلہ ملک کی اندرونی تباہی اور پریشانی سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مزدوروں کی بڑی جماعت کو غذا بمکان، اجرت اور تعلیم ضرورت سے کم ملتی تھی، آیندہ خوشحالی کی کوئی توقع نہ تھی، بچپن ہی سے سخت قسم کی محنت دیر تک کرنی پڑتی تھی، اور خیرات ملنے کی وجہ سے ان کی اخلاقی حالت بھی بگڑ چکی تھی۔ ان حالات میں یہ امر تعجب خیز نہیں کہ بے اطمینانی انتہائی صورت میں رونما ہوئی، عوام میں انقلاب کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں، ملک کے طول و عرض میں غلہ کے گودام جلا ڈالے گئے، شہروں میں کلیں اور مشینری توڑ پھوڑ ڈالی گئی، کارخانہ داروں پر حملے کیے گئے بعض صورتوں میں انھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، قیام نظم و امن کے لیے فوجیں طلب کی گئیں اور بلوائیوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ یہ صورت حال تو نازک تھی ہی لیکن خرابیوں کا باعث زیادہ تر قوم اور ان لوگوں کی بیوقوفی یا غفلت تھی جو قومی پالیسی

کی تشکیل کے ذمہ دار تھے۔ آخر جب زیادہ دانشمندانہ طریقوں پر عمل کیا گیا تو وہ سب خرابیاں جنھوں نے بدترین شکل اختیار کر لی تھی دور ہو گئیں لیکن جتنا نقصان پہنچا اس کا زیادہ حصہ دیرپا تھا۔ چنانچہ موجودہ صنعتی مشکلوں میں ان کے گہرے اثرات اب تک نمایاں ہیں۔

قانون سازی کے ذریعے اصلاح کی کوشش

۲۷۹

جس طرح کسی اچانک اور بڑی تبدیلی سے ہمیشہ مصیبتیں ظاہر ہوا کرتی ہیں اسی طرح صنعتی انقلاب کی وجہ سے بھی لازمی طور سے رونما ہوئی تھیں اور پالیسی کی غلطیوں نے ان مصیبتوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن یہ غلطیاں نوعیت کے لحاظ سے بہت مختلف تھیں۔ چنانچہ کارخانے کے طریق میں خرابیوں کا سلسلہ بے روک ٹوک بڑی مدت تک جاری رکھنے میں جو بے پروائی برتی گئی وہ انوکھی تھی اور آزادی و حریت کے نئے خیالات اور معاشیئین کے اصول کا نتیجہ تھی۔ دوسری طرف بیرونی غلے پر محصول لگا کے اور روٹی کو گراں فروخت ہونے دینے میں جس نادانی کا اظہار کیا گیا تھا وہ پرانی بات تھی اور قدیم تجارتی خیالات کی پیروی کا نتیجہ تھی۔ الاؤنس یا مالی امداد کا جو اخلاق بگاڑنے والا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اس کی بنیاد نیکی رحمدلی اور بے جا فیاضی خیرات کے خیالات پر قائم تھی اور گو کہ اس طریق کو بے جا استعمال کیا گیا تھا پھر بھی وہ صداقت پر

مبنی تھا۔ یہ معلوم کرنا نہ صرف دلچسپ بلکہ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہوگا کہ اصلاح و ترقی کی امنگ، ماضی کے دانشمندانہ خیالات اور ہمدردانہ و فخرانہ جذبات سب ایک دوسرے سے اس بارے میں بازی لے جانے کی طرف مائل تھے کہ قوم کو زیادہ سے زیادہ نقصان کون پہنچا سکتا ہے اور اس لیے یہ شکل کچھ ہی کم دلچسپ اس بات کا سراغ لگانا ہے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں۔

ان تین اصلاحوں کے منجملہ دو، ایک تدبیری سلسلے کا نتیجہ تھے اور کسی قدر تفصیلی بحث کی طالب ہیں۔ لیکن تیسری اصلاح یعنی قانون مفلسی کی اصلاح کا مختصر تذکرہ کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصلاح طلب خرابی کیا تھی۔ نقصان نہ صرف الاؤنس سے پہنچا تھا بلکہ اس قدیم اور زیادہ دانشمندانہ تجویز سے انحراف سے بھی، جس میں بیرونی امداد پر او معذوروں کی امداد میں جذباتی فیاضی سے کام لینے پر روک قائم کی گئی تھی۔ قانون مفلسی کی اس وقت کی حالت کی تحقیق کے بعد کمشنروں نے جو رپورٹ پیش کی[۱] اس میں یہ بیان کیا گیا کہ امدادی فنڈ ایسے اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو قانون سے لفظ اور معنی، دونوں لحاظ سے تضاد رکھتے تھے اور معذوروں کی اخلاقی حالت اور عام خوشحالی کے لیے تباہ کن تھے۔ یہ رپورٹ بدنظمی و پیچیدگی، نیز بے جا کرم نمائی اور خرابی انتظام کی اس قدر پورے طور پر آئینہ دار تھی کہ فوری اصلاح کے لیے کوئی تامل نہیں کیا گیا۔ کمشنروں نے یہ سفارش کی کہ آئندہ سے سٹنڈوں کو محتاج خانون کے سوا کہیں اور امداد نہ دینی چاہیے۔ ۱۸۳۴ء کے قانون نے اس پالیسی پر عمل کرنے کے لیے ایک تجویز کی۔ پیرشوں کو مختلف سبھاؤں میں تقسیم کیا گیا اور یکساں اور کفایت شعارانہ برتاؤ کو یقینی بنانے کے انتظامات کیے گئے۔ بندوبست کے قانون کی نظر ثانی کی گئی لیکن اس وقت اس کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ اور سارے

۲۸۰

---

[۱] سنہ ۱۸۳۴ء میں شائع ہوئی۔

معاملات کی نگرانی قانون مفلسی کے کمشنروں کی ایک مجلس پر عائد کی گئی جو ضابطے اور قاعدے جاری کر سکتی تھی، حسابات کی تنقیح کر سکتی تھی اور اپنے ناظروں کے ذریعے سے مقامی حکام سے جو محافظ تھے ربط قائم رکھ سکتی تھی۔ اس نئی تجویز سے جو نتیجے نکلے وہ فوری اور اطمینان بخش تھے۔ امدادی محاصل یا ابواب میں فوراً ایک چوتھائی کمی ہوگئی اور آبادی کی تعداد کے تناسب سے وہ ۱۸۳۴ء کے اعداد کے لگ بھگ پھر کبھی نہیں ہوئے۔ مفلسوں کی امداد کے مصارف پوری آبادی کے لحاظ سے ۱۸۱۱ء میں ۱۳ شلنگ ۱ پنس، ۱۸۳۱ء میں ۹ شلنگ ۹ پنس تھے اور ۱۸۳۵ء میں وہ گھٹ کر ۷ شلنگ ۶ پنس ہوگئے۔ اس صدی کے بقیہ حصے میں ان کا اوسط اس عدد سے بھی کم رہا۔ اس صدی کے دوسرے نصف حصے میں کل آبادی کے مقابلے میں بھکاریوں کی تعداد کا فی صد ۶ $\frac{1}{4}$ سے گھٹ کر ۲ $\frac{1}{2}$ ہوگیا اور یہ تخفیف زیادہ تر بیرونی امداد میں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس نظام کے خلاف شکایتیں تھیں۔ ۱۸۳۹ء میں قانون مفلسی کے کمشنروں کے خلاف احساسات اس قدر بھڑک اٹھے تھے کہ اس کا امکان معلوم ہورہا تھا کہ پارلیمنٹ کمشنروں کی مجلس کو توڑ دے لیکن ٹھنڈے دل سے سوچنے پر یہ مان لیا گیا کہ جو کام انجام دیا گیا تھا وہ اطمینان بخش تھا اور مجلس ۱۸۷۱ء تک قائم رہی جب کہ وہ مقامی حکومت کی مجلس میں ضم کرلی گئی[1] جو کچھ بھی کیا گیا اس کے باوجود قانون مفلسی کے انجام دادہ اور غیر انجام دادہ دونوں کاموں میں تناقض اور بے اصولی پن پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بیرونی امداد ابھی تک ایسے مسٹنڈے مفلسوں کو بیماری یا عارضی معذوری کی حالت میں دی جاتی ہے یہاں تک کہ محتاج خانوں میں مسٹنڈے بھیک منگے کم ہیں۔ اکثر رہنے والے بوڑھے یا ایسے لوگ ہیں جو کسی دوسرے طریقے سے کام کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس طرح محتاج خانوں کی

۲۸۱

---

[1] ۱۹۱۹ء میں وزارت حفظ صحت نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تکلیف کا اثر سب سے زیادہ اس جماعت پر پڑتا ہے جس کو تکلیف دینا
مقصود ہی نہیں تھا۔ آوارہ پھرنے والوں کے متعلق جو کبھی کبھی آتے تھے
قاعدے بنائے گئے تھے، لیکن ان کی تعداد کم کرنے کی حد تک وہ موثر
ثابت نہیں ہوئے۔ آخری امر یہ کہ مفلسی کے نئے قانون نے اس اہم مسئلے کے
اس جزو کو حل کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جس کا تعلق ان لوگوں سے ہے
جو کام کرنے کے لیے آمادہ تو ہیں لیکن جنھیں کام نہیں ملتا۔ اس قانون نے
اس بارے میں کوئی امتیاز نہیں قائم کیا کہ آیا کسی شخص کی احتیاج اس کی
غلطی ہے یا بدقسمتی۔ لیکن تمام حد بندیوں کے باوجود قانون مفلسی کا ترمیم یافتہ
قانون ایک مفید اور موثر آئینی اصلاح کی نمایاں مثال ہے۔

آزاد تجارت کی تحریک کی سرگزشت کبھی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ
گویا وہ سب اس کشمکش کا جزو ہے جو ۱۸۴۶ء میں غلے کے قوانین کی تنسیخ
پر ختم ہوئی۔ یہ ایک لحاظ سے صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوانین غلہ تامین کا
آخری سہارا اور مورچہ تھے اور کابڈن کی نکتہ چینی اور پیل کی ہار کے واقعات
اس قدر عجیب و غریب تھے کہ ان کے سامنے دوسرے تمام واقعات کا
رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لیکن غلے کے قوانین کی تنسیخ ایک طویل جنگ کا انتہائی
نقطہ تھی جو قدیم و جدید خیالات کے درمیان جاری رہی۔ انجمن مخالفت
قانون غلہ[1] کی فتح نے محض اس کام کو ختم کیا جو آدم اسمتھ نے شروع کیا تھا۔

تامین کی حمایت مختلف دلیلوں کی بنا پر کی گئی ہے۔ چنانچہ تجارتی
نظام کی اہمیت جس شد و مد کے ساتھ جتائی گئی اس کو بیان کیا جا چکا ہے۔
مثلاً جنگ کی صورت میں ملک میں کثیر مقدار میں زر، آدمی، اسلحہ اور کافی
غلہ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ لیکن جب مصنوعی سہاروں کو الگ کر دینا
ضروری تھا تو اس کی تنسیخ کے وقت پر حقیقی مخالفت خود غرضانہ محرکات کی
بنا پر ایسے لوگوں کی جانب سے کی گئی جو کافی مدت سے تامین سے

[1] The Anti-Corn Law League

فائدہ اٹھا رہے تھے اور اب ڈر رہے تھے کہ کہیں وہ بیرونی مسابقت کی وجہ سے تباہ نہ ہو جائیں۔ آزاد تجارت کا طریق کسی ملک میں جاری کرنے سے پہلے صناعوں اور زمینداروں میں سے ہر ایک کو اس بات کا یقین دلایا جانا ضروری ہے کہ انجمن کو آئندہ چل کر تجارت کی توسیع و ترقی اور اشیا کی ارزانی سے اس سے زیادہ نفع ہوگا جتنا کہ تامینی محصولوں کی موجودگی سے ہو سکتا ہے۔ ہر فریق اپنی بلا دوسرے پر ٹالنا چاہتا ہے اور اپنی تامین کو ہٹانے سے جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان سے زیادہ دوسرے کی تجارت کی تامین کرنے والے محصولوں کی تنسیخ سے حاصل ہونے والے فائدوں پر زور دینے کا اس میں میلان پایا جاتا ہے۔ اس لیے متقاومت پر پوری طرح قابو حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ انگلستان میں یہی ہوا۔ صناعوں کی تامین سب سے اول دور ہوئی اور آخر کار صناعوں ہی نے کاشتکاروں پر آزاد تجارت کے فائدے کی اہمیت جتانے میں پیشقدمی کی۔

"دولت اقوام" نے قدیم تجارتی مسالک کے حامیوں کو بہت جلد خاموش کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سارا انتظام ایسی خوفناک پیچیدگی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ زیادہ سادہ نظام کا حامی کسی سمجھ بوجھ رکھنے والے کو بآسانی قائل کر سکتا تھا کہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضروری تھی۔ اس وقت کی حالت یہی نہیں تھی کہ ان گنت محصولوں نے تجارت میں ہر سمت سے رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی۔ بلکہ صنعتیں بھی آپس میں لڑ رہی تھیں یعنی چند اعلیٰ محصولوں کا مطالبہ کر رہی تھیں اور کچھ ان ہی مقررہ اشیا پر تمام محصول معاف کرانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ سوت کاتنے والے بیرونی اشیا پر بندش عائد کرنے کے لیے اور کپڑا بننے والے ان کی آزادانہ درآمد کے لیے متفکر اور کوشاں تھے۔ جہاز بنانے والے بیرونی ممالک سے سستی خام اشیا حاصل کرنا چاہتے تھے اور مالکان چوبینہ ان کی درآمد کے سخت مخالف تھے۔ محاصل اتنے ان گنت تھے کہ ان کو پورے طور سے سمجھنے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ کیونکہ محصول کی ۶۸ قسمیں تھیں اور بعض اشیا پر متعدد اور مختلف

محصول لگائے جاتے تھے۔ لیکن اس نظام کی سب خرابیاں صرف اسی پر ختم نہیں ہوتی تھیں۔ محاصل جمع کرنے میں جتنے مصارف اٹھانے پڑتے تھے ان کے مقابلے میں آمدنی کم وصول ہوتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے تجارتی رسالوں میں بحث کا عام موضوع یہ ہوتا تھا کہ اون کے بعد کونسی انگریزی صنعت دوسرے درجے پر تھی۔ سوت، لوہے، ریشم اور فیتہ سازی کی صنعتوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے حقوق کو آگے بڑھاتی تھی۔ لیکن بہ لحاظ نوعیت اس سے کم درجے کے ایک دھندے کو کم از کم اس رتبے پر پہنچنے کا حق تھا اور یہ دھندا چور تجارت تھا۔ یہ منظر بھی عجیب و غریب تھا کہ ملک کے طول و عرض میں سمندر اور زمین پر بیس ہزار اشخاص ملک کے قوانین کی زد سے خود کو باقاعدہ طور پر بچا کر کاروبار میں مصروف تھے۔ چنانچہ پٹ دوم کے زمانے میں بیت العوام کی ایک کمیٹی نے بھی مجموعی تعداد کا اتنا ہی اندازہ لگایا تھا۔

یہی نہیں کہ پٹ نے "دولت اقوام" کا مطالعہ کیا اور اس کو پسند کیا بلکہ محصولاتی نظام کو سادہ بنانا شروع کیا۔ محصولوں میں امکانی حد تک کمی کر دی، ان کی تبویب کی اور ایک دوسرے میں ضم کر دیا۔ فرانس کے ساتھ اس نے جو تجارتی معاہدہ کیا وہ ایک دانشمندانہ اور مدبرانہ کارروائی تھی۔ اس معاہدے کی رو سے مخصوص اشیا کے سوا تمام اشیا کے بارے میں تجارت اور جہاز رانی کی آزادی تسلیم کر لی گئی اور متعدد اشیا پر محاصل گھٹا دیے گئے۔ معاہدے نے یہ خیال دور کر دیا کہ فرانس، انگلستان کا فطری دشمن تھا اور انگریز تاجروں کے لیے قریب ہی میں ایک وسیع بازار مہیا کر دیا۔ چنانچہ انگلستان مصنوعات کی برآمد کرتا تھا اور ان کے مبادلے میں اس کو شراب، تیل، برانڈی، سرکہ وغیرہ اشیا ہاتھ آنے لگیں جو انگلستان میں تیار ہی نہیں ہوتی تھیں اور جن کی سستی

ف۔ ایک ایک جز پر نو محصول ادا کیے جاتے تھے۔ بعض صورتوں میں یہ تعداد بڑھ کر چودہ تک پہنچ جاتی تھی۔

در آمد خاص طور سے سود مند تھی۔ اگرچہ معاہدے کے مخالفین کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی، پھر بھی یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مخالفین کے سرگروہ یعنی فاکس نے اس قدیم تجارتی خیال کو رد کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا کہ "اشیا کی برآمد ملک کے لیے مفید اور درآمد نقصان رساں تھی"۔

تامین کی پالیسی میں ایک دفعہ رخنہ پڑ جانے کے بعد اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ قدیم محاصل ایک ایک کرکے سب اٹھا لیے گئے۔ نئی صنعتی کوشش جو اٹھارویں صدی کی ایجادوں کی بدولت رونما ہوی اس نے صناعوں پر یہ بات واضح کردی کہ انھیں بیرونی مسابقت کرنے والوں سے ذرا بھی نہ ڈرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس اُن کے لیے حقیقی خطرہ اس میں چھپا ہوا تھا کہ اشیائے خام یا بازاروں کے فقدان کی وجہ سے وہ اپنی اشیا بیچ نہ سکیں گے اور انھیں فاقہ کرنا پڑے گا۔ بیرونی ممالک کے رہنے والے انگریزی سامان کی کوئی مقدار اس وقت تک نہیں خرید سکتے تھے جب تک کہ انگریزی اشیا مبادلے میں حاصل نہ کی جائیں تامینی محصول بھاری ہونے کی صورت میں یہ مبادلہ ناممکن تھا اور ساری قومی تجارت میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس طرح صناعوں کی بڑی جماعت بتدریج آزاد تجارت کے نظریے کی قائل ہوگئی۔ چنانچہ چھوٹے تامینی محصول کسی سخت مخالفت کے بغیر ہٹا لیے گئے۔ لیکن جن صورتوں میں تجارت یا صنعت بڑی بھی سخت احتجاج کیا گیا۔ تجارتی نظام کی سب سے نمایاں خصوصیتوں میں سے ایک قوانین جہازرانی تھے جو برطانوی جہازرانی کی تامین، اور برطانوی جہاز سازوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان قوانین نے اپنا کام نہایت خوبی سے انجام دیا تھا، لیکن یہ کام اب ختم ہو چکا تھا اور اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اغیار کے دل حسد سے جلنے لگے۔ جنگ کے زمانے میں سمندری جہاز تقریباً سب کے سب انگلستان ہی کے تھے۔[1]

۲۸۴

---

[1] فرانس اور ہالینڈ کی تجارت نقل و حمل جنگ کی وجہ سے تقریباً برباد ہوگئی، ڈنمارک بھی

لیکن صلح ہوتے ہی انگلستان کا یہ عملی اجارہ ختم ہو گیا اور دوسری قوموں نے بھی ویسی ہی بندشیں عائد کر کے انتقامی کارروائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی جہازوں کو تجارتی مال نہیں مل سکتا تھا اور وطن سے غیر ممالک تک یا غیر ممالک سے وطن تک کا خالی بھرت لاد کر ایک چکر کاٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ امریکہ نے پہلی دفعہ ۱۸۱۴ء میں انگریزی قوانین کو اپنی حد تک نرم بنا لینے میں کامیابی حاصل کی۔ آٹھ سال بعد ان قوانین میں اور ترمیم کر دی اور ۱۸۲۳ء میں ہسکسن (Huskisson) صدر محکمۂ تجارت کیننگ نے باہمی رعایتوں کا قانونی مسودہ پیش کر کے منظور کرا لیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو اجازت دی گئی کہ وہ دوسری حکومتوں سے معاہدے کرے جن کی بموجب ہر ایک دوسری کے مقابلے میں ان ہی شرطوں کے تحت جہازوں کے داخلے پر رضامند ہو جو اپنے لیے دوسری سے منوانا چاہتی ہو۔ اس طرح اس نظام کا خاتمہ ہو گیا جو رچرڈ دوم کے عہد سے شروع ہوا تھا اور صدیوں تک ہمارے آئین و قوانین کی رہنمائی کرنے والے اصول کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاز بنانے والوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ اس نئے طریق سے تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن جیسا کہ جلد ثابت ہو گیا وہ غلطی پر تھے۔ کیونکہ قدیم طریق کے تحت انیس سالہ دور میں برطانوی جہازوں میں جہاں اوسط اضافہ ۱۰ فیصد ہوا تھا وہاں جدید طریق کے تحت اسی کے اکیس سال بعد ۵۴ فیصد اضافہ ہوا۔

۲۸۵

دوسری صنعتوں کے بارے میں بھی اسی طریقے پر عمل کیا گیا۔ ریشم باف، خام ریشم اور ارگن زین (Arganzine) کے محصولوں میں کمی کے خواہاں تھے۔ ریشم کے کارخانوں کے مالک مقدم الذکر کی حد تک پوری طرح موید لیکن، موخر الذکر پر نکتہ چین تھے۔ اسپٹل فیلڈز کے جلاہے تبدیلی ہی کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بری طرح زد میں آیا اور مشکلوں میں پھنس گیا۔ سویڈن اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

مخالف تھے۔ ہس کس سن نے ان سب کی خواہشوں کے خلاف بیرونی خام ریشم کے ۵ شلنگ ۱/۲ ۷ پنس اور بنگالی خام ریشم کے ۴ شلنگ محصول کو گھٹا کر ۳ پنس کر دیا، آرگن زین کا محصول نصف تک گھٹا دیا اور یہ طے کیا کہ بیرونی ریشم کا داخلہ پورے طور پر ممنوع قرار دینے کے بجائے دو سال کے بعد ۳۰ فیصد قیمت واری محصول لگا کر اس کی درآمد کی جائے۔ بہرطور یہ سب تجویزیں بہت ہی معتدل قسم کی آزاد تجارت کے لیے تھیں جن سے ریشم بافی کی صنعت میں خوف اور ہراس پیدا ہو گیا۔ اکثر صناعوں کے لیے یہ خیال تسکین کا سبب تھا کہ دو سال کے وقفے میں انھیں بیرونی مسابقت کی زد سے خود کو بچانے کی مہلت مل جائے گی۔ لیکن اس صورت میں بھی خرابی کی پیش گوئی کرنے والے جھوٹے ثابت ہوئے، کیونکہ دس سال بعد ہمارے صناع جو فرانس کی مسابقت کے تصور سے لرزتے تھے، ہر سال ۶۰ ہزار پونڈ قیمت کا سامان فرانس بھیجنے لگے۔ بعینہٖ اسی قسم کی ترقی اونی صنعت میں بھی رونما ہوئی جب کہ ہس کس سن نے اون کے درآمدی محصول کو ۶ پنس سے گھٹا کر ۱ پنس فی پونڈ کر دیا اور اسی شرح سے اون برآمد کرنے کی اجازت دیدی۔ اس بارے میں دونوں فریقوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ صناع ممالک غیر سے سستی اون کی درآمد کو پسند کرتے تھے، لیکن انھیں یہ خوف تھا کہ برطانوی اون بیرون ملک چلی جائے گی۔ گو برطانوی اون سازوں کو اس کی خوشی تھی کہ ملک میں قیمتیں کم ہو جائیں گی تو وہ مال برآمد کر سکیں گے۔ لیکن انھیں بیرونی اون کی مسابقت کا بھی خوف تھا۔ باوجود اس کے ہس کس سن چند سال بعد یہ ثابت کرنے کے قابل ہو گیا کہ درآمد و برآمد دونوں میں محصول کی کمی کے محرک کے تحت کافی اضافہ ہو گیا۔ ۲۸۶

جب جہاز سازی، ریشم، اون وغیرہ جیسی اہم صنعتیں اس تامین کو برقرار رکھنے کے قابل نہ تھیں جس سے وہ بڑی مدت سے فائدہ اٹھا رہی تھیں تو یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ معمولی صنعتیں کامیاب ہو سکیں گی۔ پیل نے ہس کس سن کے کام کو جاری رکھتے ہوئے سینکڑوں محصولوں کو یکقلم موقوف کر دیا۔

۱۸۴۲ء میں ۱۲۰۰ اشیاء کے منجملہ جو محصول کے تابع تھیں ۷۵۰ اشیاء پر محصول کم کر دیا گیا۔ صنعتوں میں استعمال ہونے والی خام اشیاء کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ ان کا محصول ۵ فیصد سے زائد نہ ہو۔ البتہ ادھوری مصنوعات پر ۱۲ فیصد محصول سے زائد نہ لیا جائے اور پوری مصنوعات پر محصول کی مقدار ۲۰ فیصد سے زائد نہ ہونے پائے۔ اس طرح محصولوں کی تخفیف اور تنسیخ کے بعد سرکاری محصولوں میں محض ۲ لاکھ ۷۰ ہزار پونڈ کی حقیر رقم کی کمی واقع ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں تمام برآمدی محصولوں اور خام اشیاء کے ۸۱۳ محصولوں کے منجملہ ۴۲۰ محصول معاف کر دیے گئے۔ اس طرح بھنگ، سن، ریشم، فرنیچر کی لکڑی، تاگے، کھاد، خام دھاتیں، جڑی بوٹی، دوائیں، رنگ سازی کے سامان اور سوتی اون وغیرہ محصول سے آزاد ہو گئے۔ شیشے کی صنعت کا محصول منسوخ کر دیا گیا اور ۱۸۴۵ء میں مزید اشیاء کے محصولوں میں تخفیف ہوئی اسطرح وہ بنیاد بھی ترک کر دی گئی جس کی بنا پر محصولوں کو حق بجانب قرار دیا جاتا تھا۔ اور کوئی صنعت تامین کی امید اس وقت تک نہ کر سکتی تھی جب تک وہ اپنے اس دعوے کو ثابت نہ کرے کہ وہ عام قاعدے سے مستثنیٰ کیے جانے کی مستحق تھی۔

کیا کوئی شئے اس قسم کے دعوے کو ثابت کر سکتی تھی؟ ۱۸۴۵ء سے بہت پہلے اس سوال پر خوب بحث ہوتی رہی۔ کیونکہ اس کے جواب پر تامین کے آخری مورچے یعنی ''قوانین غلہ'' کے وجود کا انحصار تھا۔ یہ قوانین بھی قومی اقتدار کے اس قدیم نظریے کا جزو تھے جس کا اظہار تامینی نظام سے ہوتا تھا اور اس زمانے کے لیے ناموزوں نہ تھے۔ لیکن ایک سے زیادہ مرتبہ اس کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ کسی پالیسی پر اس کی افادیت کا زمانہ گزرنے کے بعد عمل پیرا ہونے سے اس کے کتنے برے نتیجے رونما ہوتے ہیں۔ زیر بحث پالیسی پر جتنی زیادہ مدت تک کامیابی سے عمل ہوتا رہا اور اس کی جڑیں جتنی زیادہ گہری ہوتی گئیں اتنا ہی زیادہ تباہی کا دور بھی لمبا ہوتا گیا اور اس کی تباہی کے مہلک اثرات زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ ابتدا میں اس پالیسی پر عمل

کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زراعت کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ دیہاتی آبادی جوش اور سرگرمی کے ساتھ کام کرے اور ملک کے رہنے والوں کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ملک میں کافی غلہ مہیا ہو سکے۔ اس بات کا اطمینان کرنے کے لیے کہ قلت اور قحط کے زمانے میں بھی غلے کی کمی نہ ہو، اراضی کے بڑے رقبے کو زیر کاشت رکھنا ضروری تھا اور معمولی حالات میں جو زیادہ پیداوار ہو گی اور ملک کی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد بچ رہے گی اس کے لیے بازار مہیا کرنے کی غرض سے برآمد کرنے کے لیے مالی امداد مقرر کی گئی۔ یہ پالیسی بڑی مدت تک نمایاں طور سے کامیاب رہی۔ انگلستان کی غلے کی کاشت نفع بخش تھی اور اس کی قیمت کافی مستحکم رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس میں نہ تو اتنی کمی ہوتی تھی کہ کسان مشکلوں میں گھر جائیں اور نہ اتنی زیادتی کہ خریدار کو دشواری پیش آئے۔ قیمتوں کے اس استحکام کو اس مالی امداد سے منسوب کیا گیا اور بجا طور پر منسوب کیا گیا جو برآمد کے لیے غلے کی کاشت کی ہمت افزائی کی غرض سے دی جاتی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے آخری چوتھائی حصے میں ملکی رسد ناکافی ہو گئی اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس کی اصل وجہ آبادی کا اضافہ تھا[1]۔ غلے کی یہ قلت، فصلوں کی لگاتار خرابیوں کے باعث اور بھی بڑھ گئی تھی لیکن موخر الذکر سبب زیادہ نمایاں ہونے کی وجہ سے مقدم الذکر سبب اس کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔ گو یہ تبدیلی نمایاں نہ تھی پھر بھی ایک امر واقعہ تھا۔ سنہ ۱۷۶۶ء سے سنہ ۱۷۷۰ء تک جو غلہ درآمد کیا گیا اس کی مقدار برآمد کی مقدار کے برابر تھی۔ گویا انگلستان کی غلے کی پیداوار ملک کے رہنے والوں کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی اور اس کے بعد کے بیس سال تک یہی حالت برقرار رہی۔ لیکن سنہ ۱۷۹۲ء کے بعد سے انگلستان قطعی طور سے غلہ درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ وہ صرف اچھی فصلوں کے زمانے میں اپنی ضرورتیں

[1] ۔ دیکھو باب ۱۵۔

پوری کر سکتا تھا۔ اوسط درجے کی فصلیں اس کی وسیع آبادی کی غذائی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ہوتی تھیں، اور فصلوں کی خرابی کی صورت میں مقدار بالکل ناکافی ہو جاتی تھی۔ موخر الذکر صورت میں قیمتوں میں جلد جلد تغیر ہونے لگا اور وہ قحط کے زمانے کی سطح پر آگئیں جن میں جنگ کی وجہ سے رسد کی درآمد پر خطر بن جانے کی وجہ سے مزید اضافہ ہوا۔

قیمتوں کے بڑھ جانے سے لگان میں اضافہ ہوتا تھا اور قیمتوں کے گر جانے پر لگان ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جنگ کے ختم پر وہ چیز عام ہو گئی جو پہلے کبھی ظہور میں آتی تھی۔ یعنی اچھی فصل کے معنی کسان کے فائدے کے بجائے اس کے نقصان کے تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء میں ایک قانون کے بموجب ۸۰ شلنگ فی کوارٹر سے کم نرخ پر درآمد کی ممانعت کردی گئی۔ ۱۸۲۲ء میں ایک ترمیم کی گئی جس کے بموجب بیرونی غلہ اس وقت درآمد کیا جا سکتا تھا جب کہ اس کی قیمت ملک میں ۷۰ شلنگ ہو۔ اس صورت میں محصول ۱۲ شلنگ لگایا جاتا تھا لیکن قیمت ۸۰ شلنگ ہو جانے کی صورت میں محصول ۵ شلنگ لگایا جاتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں تیسرے قانون کے بموجب ایک تدریجی شرح مقرر کی گئی جس کی رو سے ملکی غلے کی قیمت ۵ شلنگ تا ۷۳ شلنگ رہنے کی صورت میں محصول کی شرح تدریجی طور سے ۳۶ شلنگ ۸ پنس تا ۱ شلنگ ہو سکتی تھی لیکن ان قوانین کا مقصد خواہ ان کا طریق کچھ ہی رہا ہو غلے کی قیمت کو اس سطح پر رکھنا تھا جو کسان کے لیے فائدہ مند ہو۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ تعجب خیز معلوم ہو لیکن مبالغہ نہیں کہ غلے کے قوانین قوم کو زرعی پیداوار کی کمی کے برے اثرات سے بچانے کے بجائے اس سے کم مفید کام یعنی زرعی خوشحالی کی تباہ کاریوں سے کسان کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیے گئے۔

۲۸۸

یہ کارروائی بے مخالفت انجام نہیں دی گئی۔ اس سے پہلے اکثر

لوگوں نے اس اصول کو قطعی طور پر مذمت کے لائق ثابت کیا تھا۔ غلے کی بڑھی چڑھی قیمتیں غریبوں پر سب سے زیادہ بار ڈال رہی تھیں اور حکومت نے اس طرح قوانین بنا کے غریبوں کی حالت کو بہت زیادہ ابتر بنا دیا جس کے باعث پیش نظر مقصد یعنی کسان کی فلاح اور سلطنت میں غلے کی اتنی وافر پیداوار کہ وہ غیر ممالک کا محتاج نہ رہے، پورا نہیں ہوا۔ کسان غلے کی ادنیٰ قیمت سے خوف زدہ تھا کہ اگر غلہ زیادہ پیدا ہو تو اس کی قیمت کا کم ہونا لازمی تھا۔ اور اس طرح اس کے لیے زیادہ غلہ پیدا کرنے میں کوئی ترغیب نہ تھی۔ لیکن دوسری طرف اس پورے دور میں زمیندار اعلیٰ لگان سے اپنی جیبیں بھر رہے تھے اور عوام بے وجہ روٹی گراں خرید کر زمینداروں کو جو پہلے سے مالدار تھے اور زیادہ مالدار بنا رہے تھے۔

اصل واقعہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا۔ غریب دستکار اس کو اتنا ہی صاف طور سے دیکھ سکتے تھے جتنا کہ معاشیات داں۔ اس صدی کی ابتدا میں جتنے بلوے ہوئے ان کی بنیاد عام طور پر غذا کی گرانی پائی گئی۔ "روٹی یا خون" کی جو تحریر برینڈن کے بلوائیوں نے پرچم پر چھپوائی تھی۔ اس سے عوام کے رجحانات کا پتا چلتا تھا۔ گو کہ مسئلہ سیدھا سادہ تھا، لیکن اس کا حل آسان نہ تھا۔ یوں تو کسی نظام کو بھی جو بڑی مدت سے قائم ہو توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس نظام کی حد تک یہ عمل خاص طور سے مشکل تھا، کیونکہ پارلیمنٹ میں زمینداروں کی نمائندگی بہت قوی تھی اور زمینداروں اور کسانوں، دونوں، کو ابتدا میں اس کا یقین تھا کہ غلے کی آزاد تجارت کے معنی ان کی تباہی کے تھے۔ وہ زمانہ اب حقیقت میں باقی نہیں رہا تھا جس کے متعلق آدم اسمتھ نے لکھا تھا کہ "دیہاتی شرفا اور کسان ہی تمام باشندوں میں اتنے باوقار تھے کہ اجارے کے برے جذبے سے سب سے کم متاثر تھے۔" صناع اب اس "مذموم جذبے" سے آزاد ہو گئے تھے جو آدم اسمتھ نے ان میں نمایاں اور قوی پایا تھا۔ لیکن صناعوں کو چھوڑ کر اس جذبے نے زمینداروں میں اپنا گھر بنا لیا۔

۲۸۹

پارلیمنٹ میں کئی سال تک قوانین غلہ کو منسوخ کرنے کے لیے تجویزیں پیش کی جاتی رہیں۔ لیکن انھیں ہمیشہ رد کردیا اور بعض اوقات تو نہایت حقارت سے مسترد کیا گیا۔ ۱۸۳۸ء میں رچرڈ کابڈن کی سرگرمی میں غلے کے قوانین کی مخالفتی انجمن کی تاسیس تک اس مسئلے نے نازک صورت اختیار نہیں کی۔ کابڈن نے دہرا کام کیا۔ پہلے یہ کہ انجمن کے ارکان کی تعداد موثر طور پر بڑھا کر اور اس کے مقصدوں کی اچھی طرح اشاعت کرکے پارلیمنٹ میں قوانین غلہ کے مخالفوں کی ایک جماعت بنانے کے لیے انجمن کے وسیع ذریعوں سے کام لیا۔ دوسرے یہ کہ ملک کے طول و عرض میں تقریریں کرکے اس نے اپنے سامعین کو مطمئن کردیا کہ غلے کے قوانین سے کسانوں کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ ان تقریروں کا اثر صرف عوام پر ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقے پر بھی پڑا۔ اس نے یہ بتایا کہ زرعی مزدوروں کی زندگی کس قدر تباہ حال تھی، ان کو اجرت کتنی کم دی جاتی تھی اور کتنے خراب جھونپڑوں میں انھیں رکھا جاتا تھا۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ غلے کے قوانین سے محض زمیندار فائدہ اٹھارہے تھے۔ محصول سے قیمتوں میں استحکام نہیں پیدا ہورہا تھا بلکہ اس کے خلاف تیزی سے تغیرات ہورہے تھے۔ اس نے ان تمام مغالطوں پر سے پردہ اٹھادیا جس کی آڑ میں زمیندار پناہ لینے کی کوشش کررہے تھے۔ انجمن مخالفت قوانین غلہ میں جو دلچسپی لی گئی اس کا سب سے نمایاں ثبوت یہ ہے کہ اس کو دل کھول کر چندہ دیا گیا۔ کابڈن کہا کرتا تھا کہ مخالفوں کا اس انجمن کو جنونی اور انقلابی جماعت کے نام سے موسوم کرنا خاصکر اس حالت میں بے سود تھا جب کہ انگلستان کے رہنے والوں نے اس کو ایک سال میں ۵۰ ہزار پونڈ چندہ دیا تھا۔ کابڈن کی انتہائی محنت اور آزاد تجارت کے حامیوں کی سرگرم تائید کے باوجود پارلیمنٹ پر بہت کم اثر پڑا۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں غلے کے بارے میں آزاد تجارت کی

۲۹۰

تحریک ۱۲۲ آرا کے مقابلے میں ۲۵۴ آرا سے رد ہو گئی لیکن اس سال کابڈن کو امید کے خلاف ایک زبردست حلیف کی مدد مل گئی بقول برائٹ "وہ قحط، جس کے مقابلے کے لیے ہم نے جنگ کی تھی، ہمارا معاون ثابت ہوا" آئرلینڈ میں آلو سڑنے لگے۔ پیل نے دیکھا کہ بندرگاہوں پر سے بندش اُٹھا لینے اور غلے کی آزادانہ درآمد کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ انجمن کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ محصول ایک دفعہ اُٹھا لینے کے بعد اس کو دوبارہ لگانا ناممکن ہو گا۔ لیکن پیل کے شرکائے کار اس کے اس خیال سے متفق نہ تھے، اس لیے وہ مستعفی ہو گیا۔ لیکن دوسرا فریق حکومت ترتیب نہ دے سکا اس لیے پیل کو پھر اقتدار نصیب ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں اس کی تجویزیں عمل میں لائی گئیں۔ چنانچہ اور تین سال کے لیے غلے کی قیمت ۴۸ شلنگ سے کم ہونے کی صورت میں محصول کی شرح ۱۰ شلنگ مقرر کی گئی اور قیمت ۵۳ شلنگ ہو جانے کی صورت میں محصول کم کر کے ۴ شلنگ مقرر کیا گیا۔ اس مدت کے ختم پر ہر قسم کے غلے کی درآمد پر صرف ایک شلنگ محصول لگایا گیا[1]۔ اس طرح انجمن کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی، یعنی غریبوں کی غذا پر سے بندش اُٹھالی گئی، تامین کی آخری بڑی رکاوٹ دور ہو گئی اور قدیم تجارتی طریق کا آخری نشان مٹ گیا۔

آزاد تجارت کے حامیوں کی فتح جس کا ذکر ہم کرتے آئے ہیں، نئے خیالات کی فتح تھی ایک ایسی پالیسی پر جو بڑی مدت تک دانشمندانہ خیال کی جاتی تھی لیکن جس کے فائدے کی مدت ختم ہو چکی تھی اور جو انگلستان کی صنعتی خوش حالی میں رکاوٹ تھی۔ کارخانوں کے قوانین مختلف نوعیت کے تھے، کیونکہ وہ ایسی خرابی کو دور کرنے کے لیے بنائے گئے تھے جو جدید حالات کے رونما ہونے کی وجہ سے اور قدیم

۲۹۱

[1] ایک شلنگ کی شرح محصول ۱۸۶۹ء میں منسوخ کی گئی۔

حالات کے ہٹائے جانے کے بعد رونما ہوئی تھی غلے کی آزاد تجارت کا اجرا آخری قدم تھا جو ایک طویل تحریک میں آگے بڑھایا گیا تھا۔ کارخانوں کے قوانین کا نفاذ ایسا قدم تھا جو ایک ایسی تحریک میں پیچھے کی طرف ہٹایا گیا تھا جو بہت زیادہ تیزی کے ساتھ اختیار کی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدا میں اکثر کا یہ خیال تھا کہ یہ رجعی قدم تھے اور آزادی کی جانب پیش قدمی نہ تھی بلکہ بندشوں کی جانب واپسی تھی اور بظاہر یہ خیال معقول تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جدید نظریے اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی معاملوں میں "آزادی" کو جو شکل اختیار کرنی چاہیے اس کے بارے میں ہمارے خیالات بدل گئے ہیں۔ کارخانوں کے قوانین کی تہ میں یہ اصول مضمر ہے کہ حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ صنعتی کاروبار میں مزدور سے کام لیے جانے کی حد تک کمزور فریق اور خاصکر عورتوں اور بچوں کی حفاظت ایسے طریقے سے کرے کہ طاقتور فریق اپنی قوت کو ظالمانہ طریقے پر استعمال نہ کر سکے نیز حکومت کا یہ فرض بھی ہونا چاہیے کہ ایک جانب غفلت اور بے پروائی کو روکے تو دوسری جانب ایسی بے احتیاطی کی روک تھام کرے جو مزدور کو غیر ضروری خطروں میں ڈال دے اور فرصت و آرام، تعلیم اور حفظ صحت کے بارے میں بھی زور دے۔ لیکن یہ ایک نیا اصول تھا۔ اس کے علاوہ اس لئے یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس میں کافی توسیع کی صلاحیت ہے۔ ہم اس وقت تک اس کی انتہا تک نہیں پہنچے ہیں کیونکہ ہڑتالوں میں سرکاری دخل دہی تجارتی جھگڑوں میں سرکاری یا نیم سرکاری ثالثی اور آٹھ گھنٹے یومیہ کی آئینی تجویزوں کی شکل میں ان اصولوں کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

صنعتی انقلاب کے آخری زمانے میں دستکاروں کو جو مشکلیں برداشت کرنی پڑیں انھیں بیان کیا جا چکا ہے۔ مختصر طور پر ان کا باعث ذیل کے امور کو قرار دیا جا سکتا ہے:۔ (۱) کلوں کا استعمال جس کی وجہ سے کام اور پیشوں کے حالات میں تغیر پیدا ہوا، (۲) اجرت کی

ناکافی شرح (۳) کام کے گھنٹوں کی زیادتی اور (۴) غیر صحت بخش حالات جو کارخانوں میں لازمی طور پر پائے جاتے تھے۔ ان میں سے اول الذکر ناگزیر تھا کیونکہ جب ایک دفعہ یہ تغیر موقوف ہوا تو دستکاروں نے خود کو نئے حالات کے مطابق بنا لیا۔ دوسری چیز کی اصلاح مزدوروں میں اجرت کے اضافہ کے خیال سے اتحاد قائم ہو جانے سے ایک حد تک ہو گئی۔ چنانچہ ایسے اتحاد ۱۸۲۵ء میں اتحاد کے قوانین کی تنسیخ کے بعد قانوناً جائز ہو گئے۔ اس کی اصلاح اس سے بھی زیادہ اس ارزانی کی وجہ سے ہوئی جو آزاد تجارت اور غلے کے قوانین کی تنسیخ سے رونما ہوئی۔ تیسری چیز کی اصلاح کارخانوں کے قوانین سے ہو گئی۔

چنانچہ ان کے منجملہ پہلا قانون ۱۸۰۲ء کا قانون پیل ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کا اطلاق بہت ہی چھوٹے طبقے پر ہوتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو وہ صرف پیرش کے ان کارآموزوں سے متعلق تھا جن سے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے پیرش کے حاکموں نے شرطیں اور حد بندیاں کر رکھی تھیں۔ اس قانون کا تعلق بچوں سے نہ تھا جو اپنے ماں باپ کے ساتھ کارخانوں میں کام کرنے کے لیے صبح چھ بجے سے جاتے اور رات کے سات آٹھ یا نو بجے تک لگاتار کام کرتے رہتے تھے اور پھر بھی کھانے کے لیے ان کو کوئی معین وقفہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا اور سونے کے لیے ناکافی وقت تھا جس کی وجہ سے ان کی نشو و نما متاثر ہوئی۔ خراب ماحول میں لمبے گھنٹوں تک محنت کرنے کی وجہ سے ان کی شکل اور جسمانی حالت بگڑ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ پیل[1] نے ایک اور کوشش کی۔ اس نے ۱۸۱۵ء میں تحقیقات کا مطالبہ کیا جس پر ۱۸۱۹ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے کارخانے میں داخل ہونے کی عمر کم از کم ۹ سال قرار دی گئی اور

[1] یعنی سر رابرٹ پیل بیرونٹ اول جو وزیر اعظم پیل کے والد تھے۔

۲۹۲

کھانے کے وقفے کو شامل نہ کرکے ۹ اور ۱۶ سال کے درمیان کی
عمر والوں کے لیے کام کے بارہ گھنٹے مقرر کیے گئے اور رات کے
کام کو ممنوع کردیا گیا۔ چھ سال بعد ہاب ہاؤز کے "قانون" نے ۱۸۱۹ء
کے قانون کا اعادہ کیا جس میں قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں
زائد سزائیں تجویز کی گئی تھیں اور ہفتے کے دن کام کے گھنٹوں میں
کمی کردی گئی۔

ان قوانین کا اثر بہت معمولی ہوا۔ ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۵ء کے
قوانین کا تعلق محض سوتی کپڑے کی ملز سے تھا۔ ۱۸۰۲ء کا قانون، پیرش کے
کارآموزوں سے متعلق تھا جن سے اس وقت کوئی کام نہیں لیا جارہا تھا
جب سے کہ بھاپ کی قوت نے کارخانوں کو دریائی ساحل سے ہٹا کر
شہروں میں منتقل کردیا تھا جہاں بہت سے بچے کام کے لیے
مل سکتے تھے۔ اور جہاں کہیں بھی ان قوانین کا اطلاق کیا گیا وہاں ان کو
قوت کے ساتھ یا مستحکم طور پر نافذ نہیں کیا گیا معائنے کی غرض سے دورہ
کرنے میں غفلت کی گئی، یا نو واردوں کو داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی
تھی۔ ان مقدموں کی سماعت جو میران عدل کرتے تھے وہ عام طور سے
کارخانوں کے مالک ہوتے تھے اور یہ خاطیوں سے ہمدردی رکھتے تھے
جس کی وجہ سے سزائیں موثر نہ ہوتی تھیں۔ لیکن اب ایک نئے دور کا آغاز
ہو رہا تھا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مزدوروں کو پہلے کے مقابلے میں اب
زیادہ موثر طریقے پر اصلاح یافتہ پارلیمنٹ میں اپنی آواز پہنچانے کا موقع
تھا، کیونکہ پارلیمنٹ میں مسودۂ قانون اصلاح کی منظوری کے بعد سرمایہ دار
جماعت اور صناعوں کی قوت میں اضافہ ہوگیا اس لحاظ سے یہ دور نیا تھا
کہ زمینداروں اور قدامت پسند (ٹوری) جماعت نے مزدوروں کی حمایت
شروع کردی جس کی وجہ بڑی حد تک یہ تھی کہ وہ اپنی اس شکست کا انتقام
لینا چاہتے تھے جو انھیں مسودۂ قانون اصلاح کے بارے میں اٹھانی پڑی
تھی۔ اگر صناعوں نے ان کی اصلاح کی تھی تو وہ اس کا بدلہ یوں لینا

۲۹۳

چاہتے تھے کہ صناعوں کو خود اپنی حالت منظم کرنے کی جانب متوجہ کریں۔ اور جوں جوں صناعوں نے اصلاح کرنے یعنی غلے کی آزاد تجارت پر زور دینا شروع کیا جس سے ٹوری جماعت بہت ڈرتی تھی، بدلہ لینے کا یہ جذبہ اور بھی زیادہ قوی ہو گیا۔ جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ چنانچہ غلے کے قوانین کی تنسیخ کے بعد ہی کارخانوں کے قوانین میں سے ایک بہت ہی اہم قانون نافذ ہو گیا۔

دستکاروں کو صرف حلیف و مددگار ہی نہیں ملے بلکہ قائد و رہنما بھی مل گئے۔ چنانچہ رچرڈ اوسٹلر نے جس کو "شاہ کارخانہ" کا لقب دیا گیا تھا، مزدوروں کے ساتھ کیے ہوئے ظالمانہ برتاؤ کو اپنی اثر آفریں تقریروں کا موضوع بنا کر یارک شائر کے بڑے بڑے مجمعوں میں کافی برہمی پیدا کی۔ مائیکل سیڈلر نے پارلیمنٹ میں مزدوروں کی حمایت کی۔ اگرچہ اس کا پیش کردہ مسودہ قانون منظور نہ ہو سکا۔ لیکن اس نے ایک کمیٹی کے قیام کو منظور کرا لیا جس کی رپورٹ سے مخالفوں پر بھی واضح ہو گیا کہ خرابیاں فرضی نہیں بلکہ تباہ کن تھیں اور ان کو دور کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اوسٹلر یا سیڈلر سے زیادہ قابلِ قدر قائد لارڈ ایشلےؔ[1] تھا جس نے اصلاح یافتہ پارلیمنٹ میں سیڈلر کے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد مزدوروں کی حمایت کی۔ اس کی ہمدردی، فصاحت و بلاغت، ستائے ہوئے افراد کی پر خلوص خدمت اور امداد، اور صناعوں کی مخالفت اور اپنی جماعت کے اعتراضوں کا دلیری اور استقلال کے ساتھ مقابلہ ــــ ان چیزوں نے یہ بات انگلستان والوں کے اچھی طرح ذہن نشین کر دی کہ کارخانوں میں جو حالات پائے جاتے تھے وہ اس ملک کے لیے نہایت شرمناک تھے اور صورت حال کو کامیاب انجام تک پہنچانے میں اس کی کوششیں بار آور ہوئیں۔

۲۹۴

[1] یہ بعد میں ساتواں ارل آف شافٹسبری ہو گیا۔

گو اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی مصلحین کی جلو میں تھی، پھر بھی ایشلے اور اس کے رفقائے کار کو لازمی طور پر بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ چنانچہ اس کی جانب ان کی پیش قدمی کی رفتار بے انتہا سست تھی۔ ہاب ہاؤز کے ایک اور قانون بابت ۱۸۳۱ء نے اٹھارہ سال سے کم عمر والوں کے لیے کام کو فی ہفتہ ۲ گھنٹوں سے کم کر کے ۶۹ گھنٹے مقرر کیا اور رات کے وقت کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ لیکن یہ اصلاح سوتی گرنیوں تک محدود رہی حالانکہ دوسرے پیشوں خاصکر یارک شائر کی اونی صنعتوں میں بھی جہاں بے چینی شدت سے پھیلی ہوئی تھی، خرابیاں موجود تھیں، ایشلے کا پیش کردہ دس ساعتی مسودۂ قانون بابت ۱۸۳۳ء رد ہو گیا اور اس کی بجائے حکومت کا پیش کردہ التجراب قانون[لـه] بھی غیر اطمینانی پایا گیا کیونکہ اسے کافی عرصہ نہیں ہوا اور اس کی دفعوں کو اچھی طرح نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں اس کے ایک جزو کو منسوخ کرانے کے بارے میں صناعوں کی کوشش ناکام رہی۔ اور ۱۸۴۲ء میں ایشلے نے کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کے حالات کے تحقیقاتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے صنعتی کارخانوں سے کہیں زیادہ خراب صورت حال پائی تو ۱۸۴۲ء میں اس کو ایک مسودۂ قانون منظور کرانے میں کامیابی ہوئی جس کی رو سے عورتوں اور دس سال سے کم عمر والے بچوں سے کانوں میں کام لینا ممنوع قرار پایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ستنے لدو

لـه۔ اس قانون کا اطلاق سوتی، اونی اور سن کی مصنوعات کے کارخانوں پر ہوتا تھا اور اس نے اٹھارہ سال سے کم عمر والوں سے رات کے وقت کام لینے کی ممانعت کے علاوہ نو اور تیرہ سال کی درمیانی عمر والوں کے لیے ۴۸ گھنٹے اور تیرہ اور اٹھارہ سال کی درمیانی عمر والوں کے لیے ۶۹ گھنٹے فی ہفتہ مقرر کیے۔ مکتب میں روزانہ دو گھنٹے حاضری لازمی قرار دی گئی اور سال میں پورے دو دن اور آٹھ نصف یوم کی چھٹی دی گئی تھی۔

جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تھا اور کوئلے سے بھرے ہوئے چھکڑے ایسے پست اور تنگ راستوں سے کھینچنے پڑتے تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا قد والا بھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کام جس طرح انجام پا تا رہا اس کو اب چونکہ دوسرے طریقے سے انجام دینا ضروری تھا اس لیے کان کنوں نے اپنے لیے ایسی سہولتیں مہیا کرلیں جو اپنی عورتوں اور بچوں کے لیے بھی نہیں کی تھیں یعنی تنگ راستوں کو کافی کشادہ کر دیا۔ اس قانون کے بموجب شراب خانوں میں اجرت کی تقسیم روک دی گئی اور نگرانی کے لیے ناظر مقرر کیے گئے۔ گو یہ قانون جامع نہیں تھا اور بعد میں اس کو وسعت دی گئی، پھر بھی اس نے عورتوں بچوں کو کانوں سے ہٹا کر بہت بڑی خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں دس گھنٹے کے دن کی تحریک بھی ترقی پر تھی۔ یوں تو ۱۸۴۴ء میں پیل یہ دھمکی دیکر کہ اگر اس حدبندی کی تائید میں ایشلے کی ترمیم منظور کی جائے تو وہ استعفا دیدے گا اس ترمیم کو رد کرانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن اس سال جو قانون منظور ہوا اس کے بموجب تیرہ سال سے کم عمر والے بچوں کے کام کے گھنٹوں میں اور کمی ہوگئی اور تامین یافتہ لوگوں میں عورتیں بھی شامل کر لی گئیں۔ کھانے کے وقفے بہت باقاعدگی سے مقرر کیے گئے اور سنیچر کے دن ساڑھے چار بجے کے بعد کام لینے کی ممانعت کی گئی۔ جرمانے کی شرحیں بڑھا دی گئیں اور عمر کے جعلی صداقت ناموں کے خلاف زیادہ حفاظتی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ سب سے بڑی رعایت ۱۸۴۷ء میں کی گئی جب کہ فیلڈن کی تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ یعنی یہ قرار دیا گیا کہ یکم مئی ۱۸۴۸ء سے تیرہ اور اٹھارہ سال کی درمیانی عمر والے سب نوجوانوں کو روزانہ دس گھنٹے کام کرنا پڑے گا۔ چونکہ کارخانہ دار اپنے کارخانے اس سے زیادہ مدت تک کھلے رکھتے تھے اور مختلف تامین یافتہ افراد کو مختلف اوقات میں کام کے لیے ٹھیرایا کرتے اور قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے پیچیدہ قسم کا نظام الاوقات مقرر کرتے تھے، اس لیے

۲۹۵

سنہ ۱۸۵۰ء میں ایک اور قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے سب نوجوانوں اور عورتوں کے لیے کام کے اوقات گرمی کے موسم میں ۶ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک اور سردی کے موسم میں ایک ایک گھنٹہ تاخیر سے مقرر کیے گئے اور ہفتے کے دن کسی نابین یا فتنہ کو دو بجے کے بعد کام کے لیے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں اس قاعدے کا اطلاق بچوں پر بھی کیا گیا۔

گو سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۵۳ء کے ان قوانین کا اطلاق صرف کپڑے کی صنعتوں، اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں اور عورتوں پر ہوتا تھا لیکن دراصل ان قوانین نے انگلستان میں مزدوروں کے ایام کارگزاری کی شرطوں اور حالات کا تعین کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بعد بھی کارخانوں کے بہت سے قوانین نافذ ہوئے لیکن وہ ایک ہی مقررہ اصولوں کے فروعات اور تفصیلات تھے۔ جب کپڑے کی صنعتوں نے کام کے لیے دن کا وقت مناسب سمجھا تو دوسری صنعتوں نے بھی اس کو بے ہچکچائے مان لیا۔ جہاں کہیں مستثنیات کا مطالبہ کیا گیا اسے منظور کر لیا گیا۔ لیکن ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ ان قوانین نے بالغ اشخاص کے بارے میں کوئی بندش عائد نہیں کی۔ اور گو کہ کارخانوں کے اگلے قوانین کے تحت مزدور عورتوں اور بچوں کی تعداد کم ہو گئی تھی اور پہلے ان سے جو کام لیے جاتے تھے ان کا خاصا حصہ

۲۹۶

لے۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں کپڑے کی صنعتوں میں تیرہ سال سے کم عمر کے ۵۱۷،۲۷ لڑکے اور ۸۷۳،۲۸ لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ لیکن سنہ ۱۸۵۰ء میں ان کی تعداد گھٹ گئی چنانچہ ۱۳۷،۲۱ لڑکے اور ۸۳۸۶،۱۹ لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ (چنانچہ دیکھو فان پلینر کی کتاب انگریزی کارخانوں کی قانون سازی (English Factory Legislation) کپڑے کی صنعتوں میں اس کمی کے مقابلے میں تجارت میں جو اضافہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح نابالغوں سے صنعتوں میں کم سے کم کام لیا جا رہا تھا۔

کلوں اور مشینوں کے ذریعے انجام دیا جارہا تھا" تاہم اس کام میں ان نابالغ مزدوروں کا بھی کافی حصہ تھا۔ چنانچہ کم از کم کپڑے کی صنعتوں میں ان کے بغیر کارخانے چل نہیں سکتے تھے۔ اس طرح جب نابالغ یافتہ اشخاص صبح کے ۶ بجے سے شام کے ۶ بجے تک کام کرتے تھے تو مرد بھی ان ہی اوقات کے پابند رہے۔ البتہ بعد میں اس سے کم گھنٹے کام کرنے کا قطعی رجحان ظاہر ہوا۔ لیکن اس کی وجہ مختلف تھی اور محض از ائد کام کا عذر پیش نہیں کیا گیا۔

کارخانوں کے قوانین کے فائدوں کی تفصیل چنداں ضروری نہیں۔ ان قوانین نے کارخانے کے لڑکیوں اور لڑکوں کو اُن کی صحت اور قوت کو ترقی دینے کا موقع دیا اور تعلیم پانے اور آرام لینے کا بھی کچھ وقفہ دیا۔ اس طرح بچوں کو ناخوشگوار حالات میں اور زیادہ دیر تک کام نہیں کرنا پڑتا تھا جس کی بدولت وہ ایسے زمانے میں مضمحل اور ناکارہ ہوجانے سے محفوظ رہے جب کہ ان کی جسمانی قوتیں عروج پر ہونی چاہئیں وہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے تشریح کی حاجت نہیں لیکن یہ بیان کرنا کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ "عدم مداخلت" کا غلط تصور کس قدر سختی کے ساتھ جاگزیں ہوگیا تھا اور اس کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا کس قدر دشوار تھا۔ اشیا کی آزاد تجارت خاصکر جب کہ وہ قانین کے پیچیدہ اور بوجھل نظام کو ہٹا کر اختیار کی گئی تھی، اتنی سہل، سادہ اور بہتر معلوم ہورہی تھی کہ لوگ یہ استدلال کرنے لگے کہ آجر اور مزدور کے درمیان محنت کی آزاد تجارت بھی لازمی طور سے ویسی ہی فائدہ مند ہوگی اور کارخانوں کے قوانین اسی قسم کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کررہے تھے۔ ایشلے کی مخالفت بیل، کابڈن، سرجیمس گرہیم، روبک اور گلیڈسٹن کے سے آزاد خیال، قوم کے ہمدرد، سلطنت کے مدبروں نے کی، گو ان میں سے اکثر نے بعد میں یہ اعتراف کیا کہ وہ غلطی پر تھے۔ بات یہ ہے کہ اشیا اور محنت کے بارے میں ایک سا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

۲۹۷

اشیا میں یہ احساس نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہیں، اس کے علاوہ ان میں سے اکثر کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے جس سے ان کی قیمت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن ان کے مقابلے میں محنت بہت کم سیال یا کم نقل پذیر ہے۔ وہ مزدور اور اس کے مکان سے وابستہ ہوتی ہے اور اجرت کے معمولی اضافے کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقلی کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اس کا ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک دن محنت نہ کی جائے تو اس دن کا کام انجام نہیں پاتا اور اجرت کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اشیا کے مقابلے میں محنت زیادہ فنا پذیر ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ محنت مزدور سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ اگر کسی کارخانہ دار کے پاس ایسے اشیا کا ذخیرہ ہو جو فروخت کے قابل نہیں رہے ہیں تو بھی ان کی نکاسی ضروری ہے اور اگر کسی قیمت پر بھی ان کا خریدار نہ ملے تو صناع ان کو ذخیرے سے الگ کر دے گا۔ لیکن اس قسم کا برتاؤ کرنے کا مشورہ ایسے بیکار اور بیروزگار مزدور کو نہیں دیا جا سکتا جس کی محنت کی مانگ نہ ہو، اسی وجہ سے جدید پالیسی میں فرق اور امتیاز کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک طرف اشیا کے مبادلے میں آزادی دی گئی ہے تو دوسری طرف محنت کے مبادلے میں انصاف اور واجبیت کا یقین مقصود اصلی ہے۔

میکانی نقل وحمل کا دور

۱۷۸۴ء میں جب بولٹن اینڈ واٹ کے کارخانے کے ہوشیار فورمین ولیم مرڈاک کے بنائے ہوئے انجن کے ایک ڈھانچے کو پادریوں کے خیابانوں میں سے دھواں نکالتا ہوا جاتا دیکھ کر ریڈرتھ کا مقامی پادری ایسا ڈرا کہ اس کے ہوش وحواس ٹھکانے نہ رہے تو واٹ نے بولٹن کو لکھا کہ مرڈاک کو اس سمت میں تجربے کرنے سے روکنے کے لیے نرمی سے سمجھا دینا چاہیے۔ چنانچہ مرڈاک نے کارخانے سے اپنی وفاداری کے لحاظ سے اس مشورے کو مان لیا۔ لیکن بھاپ کے انجن کا مسئلہ اس کے اکثر شاگردوں کے لیے توجہ کا مرکز بن چکا تھا اور واٹ یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہا کہ اس نے جس تجویز کی حوصلہ شکنی کی تھی اس کے ابتدائی عملی نتیجے نہایت کامیاب رہے۔ ٹھیک تیس سال بعد جارج اسٹیفنسن کا پہلا انجن "بلچر" (Blucher) کیلنگ ورتھ کی کانوں میں کام کرنے لگا۔ اور ۱۸۱۹ء میں جو واٹ کی وفات کا سال تھا، پارلیمنٹ میں اسٹاک ٹن اور ڈارلنگ ٹن ریلوے کی تجویزیں منظوری کے لیے پیش

۲۹۸

کردی گئیں۔[1]

جارج اسٹیفنسن سنہ ۱۷۸۱ء میں نیوکیسل کے قریب بمقام وائلم پیدا ہوا۔ جیسا کہ ایک بوڑھے کان کن کا کہنا تھا "اسٹیفنسن ایک شریف اور دیانتدار خاندان سے تھا گو کہ اس کے باپ کا کوئی نمایاں کارنامہ نہ تھا۔" جارج نے بچپن ہی سے بھاپ کے انجنوں کی فضاء میں پرورش پائی اور اس کی انتہائی مسرت کا وہ دن تھا جب وہ چودہ سال کی عمر میں اپنے باپ کا مددگار فائرمن بنایا گیا۔ اس انجن کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی جو پمپ کے ذریعے سے گڑھوں سے پانی کھینچتا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کا عہدہ بہت معمولی اور وہ خود معمولی لکھنے پڑھنے کی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا، بہت جلد اپنی محنت، فرض شناسی اور استقلال کی وجہ سے وہ ضلع کا سب سے ہوشیار میکانک تسلیم کرلیا گیا۔ وہ پہلے "انجن کے ڈاکٹر" کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ وہ ہر بگڑی ہوئی مشین کو درست کرسکتا تھا۔ لیکن اس کی محنت اور ذہانت اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ وہ جب کبھی کسی بگڑے ہوئے انجن کو ٹھیک کرتا تو یہی سوچتا رہتا تھا کہ اس کو کس طرح پہلے سے بہتر اور زیادہ کارآمد بنا کر اس کی کارکردگی بڑھائے۔ کیلنگ ورتھ میں میکانک کی حیثیت سے اس نے کوئلے کی دریائی نقل و حمل میں بھاپ کے استعمال کے مسئلے پر خاص توجہ کی اور یہ ایسا مسئلہ تھا جو اس کی مخصوص ذہانت سے مناسبت رکھتا تھا۔ کسی پیچیدہ مشین کی ایجاد کے لیے طولانی اور تدریجی عمل ضروری ہوتا ہے۔ جس میں مختلف قسم کے سنئے آدمی باری باری سے کام کرتے، ابتدائی شکلوں پر قابو پاتے اور مسئلے کی پیچیدگیوں کو کم کرکے ایک شکل میں پیش کرتے ہیں جس پر موجد اپنا دماغ کھپا سکتا ہے۔ اس کے بعد سبھوں کے تجربوں اور تحقیقوں کے نتیجوں کو یکجا کرنا اور ان کو موثر طور پر عملی جامہ پہنانا ضروری ہوتا ہے۔ آخر میں

---

[1] ابتدائی تجویزیں گھوڑوں کی ٹریم کے متعلق تھیں۔ لیکن پھر یہ خیال ترک کردیا گیا۔

۲۹۹

کامیابی حاصل کرنے والے کو کسی خاص الہام کی ضرورت نہیں بلکہ کسی ناقص نمونے کی تکمیل میں باریک بینی اور ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ جارج اسٹیفنسن میں یہی سب خوبیاں اکٹھی تھیں اور متحرک انجن ان سے کام لیے جانے کا منتظر تھا۔

یوں تو تقریباً دو سو سال سے ریلیں استعمال کی جارہی تھیں، لیکن سب کی سب لکڑی کی بنی ہوئی چھکڑوں کی طرح گھوڑے جوت کر کھینچی جاتی تھیں۔ سنہ ۱۷۶۳ء سے جب کہ ایک فرانسیسی نے ایک انوکھا نمونہ بنایا تھا، بھاپ سے چلنے والی گاڑیوں کے بارے میں تجربے کیے جارہے تھے لیکن ان گاڑیوں کی ساخت ایسی تھی کہ وہ معمولی سڑکوں ہی پر چلائی جاسکتی تھیں۔ ان دونوں خصوصیتوں کو یکجا کرنے کا خیال ٹریوتھک کے دل میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۰۴ء میں اس نے ایسا انجن بنا ڈالا جو آہنی پٹریوں پر دس ٹن بوجھ لے کر ۵ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا تھا۔ اس انجن میں نہایت اہم ترکیبیں رکھی گئی تھیں جن سے بعد میں اسٹیفنسن نے کام لیا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ انجن پٹری سے اتر کر ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے ٹریوتھک کا دل بیٹھ گیا۔ پھر بھی تجربے جاری رہے اور جلد ہی وائلم میں ریل جاری ہوگئی۔ اور اسی دیہی مکان کے سامنے سے اس کا راستہ تھا جہاں اسٹیفنسن پیدا ہوا تھا۔ بلینکیٹ نامی کوئلے کی ایک کان کے مالک کی فرمائش پر یہ ریل بنائی گئی تھی جو کئی مرتبہ کی ناکامی کے بعد ایک ایسا انجن بنانے میں کامیاب ہوا جو اس کے کوئلے کو کان سے چار میل کے فاصلے پر دریائے ٹائن کی کشتیوں تک پہنچا سکتا تھا۔ اس نے اپنے اس عمل سے اس نظریے کو کہ چکنی پٹریوں پر چلنے پہیوں کی گرفت ہی نہیں ہوسکتی غلط ثابت کر دکھایا جسے اس زمانے کے اکثر انجینیر صحیح سمجھتے تھے۔ اس لیے انجن کے پہیے اور پٹریاں دندانہ دار ہونی چاہئیں۔ لیکن اس قسم کے انجن بھدے، بوجھل اور اعتماد کے ناقابل ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی انتہائی رفتار تین یا چار میل فی گھنٹہ تھی اور ان کو تیار کرنے اور چلانے کے مصارف بہ مشکل وصول

ہوسکتے تھے۔

یہ تھی وہ صورت حال جس میں کہ جارج اسٹیفنسن نے بھاپ سے کھنچائی کے کام کا تجربہ شروع کیا۔ اس کے سامنے دو بڑی مشکلیں تھیں۔ پہلی یہ کہ بھاپ کے دباؤ کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ دوسری یہ کہ فشارے کی حرکت کو پہیوں تک کس طرح منتقل کیا جائے کہ انجن ہچکولے کھا کر ٹوٹے بغیر تیز چلایا جاسکے۔ ان مسائل کو اسٹیفنسن نے آخر حل کر ہی لیا۔ اس نے کیلنگ ورتھ ریلوے کے لیے جو پہلا انجن بنایا وہ اگلے انجنوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ایسی بڑی آواز سے استوانوں سے بھاپ نکلتی تھی کہ کھیتوں میں سے انجن گزرتے وقت اس پاس چرنے والے مویشی ڈر کر دور بھاگ جایا کرتے تھے اسٹیفنسن نے اپنے دوسرے انجن میں ایک بہت ہی اہم ترمیم کی۔ اس نے اس خیال کو اختیار کرلیا جسے ٹریوتھِک نے عملی جامہ نہیں پہنایا تھا اور ضائع ہونے والی بھاپ کو دود کش یا قیف میں سے گزارا جس کی وجہ سے ایسی طاقتور رو پیدا ہوگئی جس نے سلگتی ہوئی بھٹی کی گرمی بڑھانے میں محرک کا کام کیا اور اس طرح بھاپ زیادہ دستیاب ہونے لگی۔ اس اصلاح وترقی نے انجن کی کارکردگی دگنی سے بھی زیادہ کردی۔ اس کے بعد موجد نے پرانے انجنوں کی دوسری خرابیوں کی طرف پوری توجہ کی اور بہت جلد بوجھل دندانہ دار پہیوں کی کمانیوں کو جو اب تک استعمال ہورہی تھیں براہ راست سلاخوں کے عمل سے بدل دیا جو متحرک جوڑوں میں کام کرتی تھیں۔ یہ دعویٰ کسی نے بھی نہیں کیا کہ نئے طرز کا انجن مکمل تھا اور خود موجد کو بھی اس کا ادعا نہ تھا۔ انجن اور پٹریوں کی اصلاح وترقی کا سلسلہ جاری رہا جس میں جارج اور اس کے بیٹے کی کوشش بہت نمایاں رہی لیکن ۱۸۱۵ء کا انجن اس قطعی پیش قدمی کو ظاہر کرتا ہے جس کی وجہ سے بعد کی تدریجی ترقی ممکن ہوی۔ اور اس کا سہرا نہ صرف انجینیروں بلکہ ان حوصلہ مند صنعتی قائدوں کے سر ہے جنھوں نے خسارے،

ناکامیوں اور اپنے معاصروں کے طنز کے باوجود مستقل مزاجی سے ان تجربوں کے لیے ہمت افزائی اور مالی مدد کی جن کے نتیجے میں کامیابی نصیب ہوئی۔

وائلم اور کیلنگ ورتھ کی ریلیں نجی لائنیں تھیں جن میں کوئلے کی کانوں کے مالکوں نے کانوں سے جہازوں تک کوئلے کی ڈھلوائی کی غرض سے بنوایا تھا تاکہ کوئلہ لندن یا کسی دوسرے بازار کو جہازوں سے بھیجا جا سکے۔ پہلی عام لائن، جو انگلستان میں بنی "اسٹاکٹن اینڈ ڈارلنگٹن ریلوے" تھی، لیکن ابتدا میں اس کا مقصد بھی کوئلے کی ڈھلوائی رہا۔ اس لائن کے مجوز اڈورڈ پیز کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ سو سال آگے کی چیزوں پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن اس کی بنائی ہوئی ریل صرف گھوڑے جوت کر چلائی جا سکتی تھی۔ جارج اسٹیفنسن نے اپنی وضعداری کے خلاف پیز سے خواہش کی کہ وہ کھینچنے کے لیے متحرک انجن اور چوبی پٹریوں کی بجائے آہنی پٹریاں استعمال کرے۔ اس مشورے کو کمپنی قبول کرے گی یا نہیں اس میں آخر وقت تک شبہہ رہا۔ لیکن ۱۸۲۵ء میں جب ریل چلی تو پہلا سفر متحرک انجن کے ذریعے سے طے ہوا جس کا چلانے والا خود اسٹیفنسن تھا۔ یہ انجن اتنا طاقتور تھا کہ بعض مقاموں پر اس کی رفتار فی گھنٹہ ۱۲ میل ہو تی تھی۔ کوئلے کی ڈھلوائی کی حد تک اس ریل کی کامیابی یقینی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ابتدا ہی سے مسافروں کو ادھر سے ادھر لانے لے جانے کا کام بھی کرتی رہی۔ گو کہ اس قیام کے وقت یہ بات کسی کے دھیان میں بھی نہ تھی۔ چونکہ کسی کو بھاپ کے انجن پر بھروسہ نہ تھا، اس لیے سب مسافر گاڑیاں گھوڑوں کے ذریعے سے کھینچی جاتی تھیں اور ان کا انتظام خانگی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ راستہ ایک ہی ریل گاڑی کے چلنے کے لیے بنایا گیا تھا اور ہر میل کی لمبائی میں چار مقاموں پر پٹری بدلنے کا انتظام تھا۔ نہ تو کوئی وقت نامہ تھا اور نہ راستے کے عبور و مرور کے متعلق قاعدے۔ اسی لیے ابتدا میں یہ عام طور پر دکھائی دیتا تھا کہ

۳۰۱

دو انجن یا چھکڑا چلانے والوں کی آپس میں اس بات پر بڑی تو تو میں میں ہوتی تھی کہ دونوں میں سے کون پیچھے ہٹ کر دوسرے کو راستہ دے۔ لیکن بہت جلد مسافر گاڑیاں مناسب طریق پر چلائی جانے لگیں اور کمپنی نے لائن پر تمام آمدورفت کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس ریلوے کی کامیابی نے لیورپول سے مانچسٹر تک ایک لائن بنانے کی تجویز کی رہنمائی کی اور بڑی تاخیر کے بعد پارلیمنٹ سے اس کی قانونی منظوری حاصل ہوئی۔ کمپنی اپنے ڈبوں کو کھینچنے کے لیے امکانی طور پر بہترین انجن حاصل کرنے کی فکر میں تھی۔ اس لیے اس نے ایک مسابقتی امتحان کا انتظام کیا تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے گا کہ کس فرم کو فرمائش دی جائے۔ یہ آزمائش ایک انوکھا لطیفہ تھی، کیونکہ تقریبًا سب انجن یا تو ٹوٹ گئے یا چلائے نہ جاسکے۔ لیکن نتیجہ شبہے سے بالاتر تھا۔ مقابلے میں رابرٹ اسٹیفنسن کے انجن "راکٹ" کی جیت ہوئی کیونکہ اس کی رفتار حیرت انگیز طور پر ۲۹ میل فی گھنٹہ رہی۔ ۱۵؍ستمبر ۱۸۳۰ء کو لائن کی افتتاحی رسم بڑے اہتمام سے ڈیوک آف ویلنگٹن، سر رابرٹ پیل، ہس کس سن اور دوسرے مشہور لوگوں کی موجودگی میں انجام پائی۔ لیکن اس دن ایک حادثے نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ وزیر اعظم اور دوسرے بڑے سیاست داں جس گاڑی میں سوار تھے اس سے آگے آٹھ انجن اپنی اپنی گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ ہس کس سن اپنے ڈبے سے اتر کر لائن پر چلنے لگا۔ لیکن بدقسمتی سے "راکٹ" سے ٹکرا کر گر پڑا اور ایسی سخت چوٹ آئی کہ جانبر نہ ہوسکا۔ یہ دیکھا گیا کہ زخمی آدمی کو طبی امداد دینے کے لیے جو انجن لے جا رہا تھا اس نے پندرہ میل کی مسافت ۲۵ منٹ میں طے کی، یعنی اس کی رفتار کا اوسط ۳۶ میل فی گھنٹہ رہا!

لیکن ریلوے کے مجوزوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ سب سے پہلے زمین خریدنی پڑتی تھی جو عام طور پر ایسے لوگوں کی تھی

۳۰۲

جو پارلیمنٹ میں قانونی منظوری کو اس وقت تک اپنے اثر سے رکو اسکتے تھے جب تک کہ انھیں منہ مانگی قیمت نہ ملے۔ چنانچہ دستاویزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ ہزار پونڈ فی میل کے حساب سے بھی زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ ایسی حالت میں یہ کچھ تعجب نہیں کہ انگلستان کے ریلوے نظام کی تعمیر میں دوسرے ملکوں سے زیادہ مصارف ہوئے۔ نہر کی کمپنیوں کو ان نئے اور خطرناک حریفوں (یعنی ریلوے کمپنیوں) سے جان توڑ کر مقابلہ کرنا پڑا۔ لیورپول اور مانچسٹر ریلوے اس وجہ سے بنائی گئی کہ ان دو شہروں کی درمیانی نہر میں چلنے والی کشتیوں کے مصارف زیادہ اور کام غیر اطمینانی تھا۔ لندن سے برسٹل جانے والی لائن جو گریٹ ویسٹرن ریلوے کی ملک تھی آبی نقل وحمل سے راست مسابقت کرنے لگی۔ دوسروں نے بھی محض انقلاب کے خوف سے ریلوے کی مقاومت کی مثال کے طور پر یہ کہ چھکڑے بنانے والے اور گھوڑوں کے سوداگر تباہ ہو جائیں گے۔ جب گھوڑے ہی استعمال نہ کیے جائیں گے تو کسان اپنی جئی نہ بیچ سکے گا۔ انجن کی چنگاریاں اڑ اڑ کر کارخانوں کو جلا ڈالیں گی۔ اس کے دھوئیں سے اوپر اڑنے والے پرندے مرجائیں گے۔ سرنگ اڑانے سے زمین جھلس کر رہ جائے گی اور گائیں دودھ دینا چھوڑ دیں گی۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ریلوے کی نزدیکی زمین کی قیمتوں میں کمی کردے گی۔ چنانچہ نارتھمپٹن اور میڈاسٹون کے شہریوں نے لگاتار سخت احتجاج کرکے ریلوے کو اپنی نظر اور سماعت کی حدود میں سے گزرنے سے روکدینے میں کامیابی حاصل کی۔ کچھ لوگوں نے جن کی روش زیادہ معقول تھی ریلوں کی تعمیر میں اپنا روپیہ لگانے سے اس لیے تامل کیا کہ شاید آئندہ چند سال میں نقل وحمل کا کوئی اور نیا ذریعہ نکل آئے۔ ۳۰۲

لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود ملک کے طول وعرض میں ریلوں کا جال سا بچھ گیا اور زیادہ مدت گزرنے نہ پائی کہ انگلستان میں

ہر طرف ریلوں کی شاخیں پھیل گئیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی تین دہوں میں تعمیر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۱۸۳۷ء کی مالی ابتری نے اس میں رخنہ ڈال دیا۔ لیکن بہت جلد اگلی سرگرمی پلٹ آئی اور چوتھے دہے کے وسط میں تعمیر کا سودا دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ ۱۸۴۴ء تک جب کہ بریڈشا کا "ریلوے کمپنی نین" شائع ہوا۔ کئی ایک لائنیں خواہ وہ زیر تعمیر ہوں یا تکمیل، نہ صرف لنکاشائر کے مختلف علاقوں کو آپس میں ملاتی تھیں بلکہ لیڈز اور یارک سے بھی ان کا اتصال قائم کرتی تھیں اور اس طرح نیوکیسل اور کارلائل بھی ان سے مل گئے۔ یہ سارا انتظام وسطی ملک کے نظام سے بمقام برمنگھم جا کر ملتا تھا جہاں سے ایک شاخ ربی ہو کر لندن جاتی تھی۔ اسی زمانے میں برسٹل اکزیٹر ساوتھمپٹن، برائیٹن اور ناروچ سے بھی لندن کا تعلق قائم ہو گیا۔ اس طرح انگلستان میں کل ۲۴۴۶ میل لمبی ریلوے لائن موجود تھی۔ لیکن اس کو "ریلوے نظام" سے تعبیر کرنا جلد بازی ہوگی۔ کیونکہ لائنوں کے چھوٹے چھوٹے حصے زیادہ تر کئی مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے اور سرکاری وقت ناموں کی ترتیب اور خانگی ٹرینوں کا لائنوں سے اخراج تو ابھی حال کی بات ہے۔ اس کے باوجود بعض لائنوں پر کمپنیوں کی خدمات اور کارگزاری بہت ہی قابل تعریف رہی اور کرایہ بھی بہت زیادہ نہ تھا۔ لندن سے برمنگھم تک بہترین گاڑیوں کے دوڑنے میں ۴½ گھنٹے صرف ہوتے تھے اور اس سفر کے دوسرے درجے کا کرایہ ایک پونڈ تھا۔ لیکن دوسری کمپنیاں ایسی باقاعدہ نہیں تھیں کہ ریل کے ابتدائی مقام سے روانگی کے وقت کے سوا کسی اور بات کی عوام کو ضمانت دیتیں۔ باقی وقت نامہ خالی رہتا تھا جس کی خانہ پری اپنے تجربے کے لحاظ سے مسافر کر لیا کرتے تھے۔

راست اور مسلسل سفر کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ نہ گاڑیوں کی آمد کا کوئی وقت معین تھا اور نہ مختلف کمپنیوں میں باہمی تعاون تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سائز کی دو پٹریاں بچھی ہوئی تھیں:

اسٹیفنسن نے ۴ فٹ ۸ ½ انچ فصل کی پٹریاں استعمال کیں کیونکہ پر انے جھکڑوں کے راستوں کا یہی عرض تھا اور اکثر کمپنیوں نے اس کی پیروی کی لیکن برونل جس نے گریٹ ویسٹرن ریلوے بنائی، وہ ۷ فیٹ کی چوڑی پٹری استعمال کرتا تھا۔ کچھ عرصے تک ان دونوں قسموں کی پٹریوں کی انفرادی خوبیوں کے بارے میں بڑا مباحثہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۶ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے چوڑی پٹری کی نئی لائن بنانے کی ممانعت کردی گئی۔ اس زمانے میں چوڑی پٹری کی لائن کا طول ۲۷۴ میل تھا اور ۱۸۹۲ء تک اس کو بدلا نہیں گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریلوں کی کامیابی مسلم ہوجانے کے باوجود ملک کے لیے کوئی عام نظام مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور مستقبل کی معاشی زندگی میں ریلیں جو حصہ لینے والی تھیں ان کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا۔ جارج اسٹیفنسن ہی کو اس حقیقت کا کچھ دھندلا سا تصور تھا۔ چنانچہ جب اسٹاک ٹن اور ڈارلنگ ٹن ریلوے بن رہی تھی تو اس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ "میں تمھیں یہ باور کرانے کی جسارت کرتا ہوں کہ تم وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہو گے جب کہ ریلیں اس ملک میں نقل و حمل کے تمام ذریعوں پر چھا جائیں گی، ڈاک گاڑیاں ریل ہی پر چلیں گی اور راعی اور رعایا دونوں کے لیے ریلوں کے راستے شاہراہ ہوں گے۔" اسٹیفنسن نے کنٹربری کے قریب ایک لائن بنانے والوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اسی قسم کی پٹری استعمال کریں جو اس نے شمال میں اپنی لائنوں پر استعمال کی تھی۔ "کیونکہ گو اس وقت ان کے آپس میں کافی فصل ہے، لیکن یقین ہے کہ کسی نہ کسی دن انھیں ملا دیا جائے گا۔" اس کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۹ء میں روبرٹ اسٹیفنسن مرا تو سلطنت متحدہ میں ۱۰ ہزار میل لمبی لائن پر آمد و رفت جاری تھی اور ۱۹۰۰ء تک یہ لمبائی دونی ہوگئی۔ اس صدی کے دوسرے نصف حصے میں مسافروں کی تعداد بھی سولہ گنا بڑھ گئی۔

۴۰۴

گو اٹھارویں صدی کی جنگوں میں برطانیہ کو سمندر پر اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن جہاز سازی کی صنعت میں اس کی قائدانہ حیثیت کسی طرح محفوظ نہ تھی۔ انگلستان کی دیسی لکڑی کا ذخیرہ جو جہاز سازی میں خام مال کے طور پر صرف کیا جا رہا تھا گھٹتا جا رہا تھا۔ برخلاف اس کے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بے انتہا رسد موجود تھی اور وہ تیزی سے بیڑا تیار کر رہی تھیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۰ء تک امریکہ کے پاس دو ملین ٹن کے جہاز اس کی ساحلی اور خارجی تجارت میں لگے ہوئے تھے اور برطانوی نقطۂ نظر سے صورت حال خطرناک تھی۔ لیکن اس زمانے میں اس صنعت میں ایک بڑا انقلاب ہو رہا تھا۔ جہاز سازی کے خام مال کے طور پر لکڑی کی جگہ لوہے نے اور پھر فولاد نے لے لی اور محرکہ قوت کے طور پر بادبانوں کی بجائے بھاپ استعمال کی جانے لگی۔ اب ہرے بھرے جنگلوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ سب سے زیادہ فائدہ لوہے کی کانوں اور بھٹیوں کے مالک کو حاصل ہونے لگا اور ماہر انجینیروں کی درسگاہوں اور بھاپ بائلرز میں استعمال کرنے کے لیے بہت اچھے کوئلے کی زیادہ رسد کی افادیت اور اہمیت بہت بڑھ گئی۔ ان سب اعتباروں سے انگلستان کے وسیلے دنیا کے کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں زیادہ وافر نہیں تو کم از کم زیادہ ترقی یافتہ ضرور تھے اور ان کا انتظام بھی بہتر تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر سنہ ۱۹۱۴ء میں دنیا میں جتنے دخانی جہاز موجود تھے ان کی نصف سے کچھ ہی کم تعداد برطانیہ کے قبضے میں تھی؛

گو سنہ ۱۸۰۲ء ہی سے جہازوں میں بھاپ کی قوت سے کام لیا جا رہا تھا اور سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک سفری دخانی جہاز "کومٹ" (Comet) دریائے کلائیڈ میں تیرایا گیا، پھر بھی سنہ ۱۸۷۰ء تک دخانی جہازوں کا رواج بادبانی جہازوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں بڑھا۔ اسی طرح گو کہ سنہ ۱۸۷۸ء میں ایک آہنی جہاز بنایا گیا اور سنہ ۱۸۲۰ء میں ایک

آہنی دخانی جہاز بھی تیار ہوا پھر بھی ۱۸۶۵ء تک آہنی جہاز پر شبہے کی نظریں ڈالی جاتی تھیں اور ۱۸۸۵ء سے قبل تک فولادی جہاز کسی شمار میں نہیں تھے ۔ ان کے عام رواج میں تاخیر کی وجہ بیان کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے ۔ پہلی بات یہ کہ بادبانی جہاز میں استواری پائی جاتی ہے ۔ اس کو بھدا یا غیر کار کردہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس نے صدیوں کے سوچ بچار کے بعد موجودہ صورت اختیار کی اور بجائے خود اتنا ہی مکمل ہے جتنی کہ انسان کی کوئی دستکاری ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اس کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے ۔ اسی نے دنیا کے گرد چکر لگا کر شاہراہ دریافت کی تھی ۔ وہی انگلستان کے مشہور سورماؤں کا مسکن رہا اور انگلستان کے سبب سے قومی دشمنوں کی تباہی کا باعث ثابت ہوا ۔ ایسی حالت میں یہ کس طرح گوارا کیا جا سکتا تھا کہ اس کو ایک ایسی ناقص قسم کی بھاپ نکالنے والی کیتلی کے مقابلے میں کوڑا کرکٹ سمجھ کر پھینک دیا جائے جو اپنے جوڑوں کو توڑے بغیر ایک میل بھی بہ مشکل چل سکتی اور گندہ کوئلے کو ڈھوتی پھرتی تھی جس کے بغیر اس کا حرکت کرنا ہی ناممکن تھا ۔ بادبانی جہاز اپنی جگہ بجز ایسی چیز کے کسی اور کو دے ہی نہیں سکتا تھا جس کی افادیت مسلمہ اور کارکردگی یقینی ہو کیونکہ ابتدائی زمانے کے دخانی جہاز کسی حال میں بھی بھروسے کے قابل نہیں تھے ۔ چنانچہ کوئی شخص محض بھاپ پر بھروسہ کر کے ساحل سے دور جانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا ۔ ابتدائی یادداشتوں سے جن بحری سفروں کا پتہ چلتا ہے ان میں بادبانوں کے معاون کے طور پر بھاپ سے کام لیا جاتا تھا ۔ ۱۸۳۸ء تک بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) کو خالص بھاپ کی قوت سے کسی دوسرے کی مدد کے بغیر عبور ہی نہیں کیا گیا ۔

اگرچہ بہت زمانہ گزرنے نہ پایا کہ یہ بحری انجن کافی بھروسے کے قابل بنا دیے گئے پھر بھی کوئلے کے استعمال میں بہت اخراجات ہوتے تھے ۔ اگر دخانی جہازوں کو دور افتادہ بندرگاہوں سے

۳۰۶

تجارت میں استعمال کیا جاتا تو ان میں یا تو تجارتی مال رکھنے کی جگہ کا بڑا حصہ کوئلے سے بھرا جاتا یا ان کے لیے راستے میں جا بجا کوئلے کے اسٹیشن قائم کرنے ضروری تھے لیکن موخرالذکر سہولت بہم پہنچانے میں کافی زمانہ گزرا۔ جس کی وجہ سے ابتدا میں دخانی جہازوں کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ دریاؤں یا ساحل کے قریب راستوں پر آمدورفت رکھیں۔ یا بادبانی جہازوں کو مخالف سمت میں ہوا چلنے کی صورت میں گودی سے باہر کھینچ لے جائیں اور بندرگاہوں کی اندرونی حدوں میں دوسرے چھوٹے موٹے کام کریں۔ اس کے علاوہ دخانی جہاز کے لیے بحری نقل وحمل کا کامیاب ذریعہ بننے کی اس وقت تک بہت کم امید تھی جب تک کہ پچپہیوں (Paddle Wheels) سے اس کو چلایا جاتا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں جیمس واٹ سے اس کے ایک دوست نے کہا کہ نہر میں چلنے والی کشتیوں کے لیے انجن بنانے کی تجویز اس کے زیر غور تھی۔ واٹ نے جواب میں کہا کہ "کیا تم نے اس کام کے لیے پیچدار چپو (Spiral Oar) پر بھی غور کیا ہے یا صرف دو پہیے چاہتے ہو؟" اور اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ایک بھدا سا خاکہ کھینچ کر بنایا جو در اصل پیچ سے کھینے کا نقشہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۰ء سے پہلے پیچ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس سال جب اس کو استعمال کیا گیا تو بحری انجینیری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ ایک اور آخری دور کا واقعہ یہ تھا کہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کھل گئی جس کی وجہ سے انگلستان سے ہندوستان اور مشرق بعید کا فاصلہ تین سے چار ہزار میل تک گھٹ گیا۔ نہر سویز اور بحیرۂ احمر کو بادبانی جہاز عبور نہیں کر سکتے تھے ۱۸۸۰ء سے بحری جہاز کے انجن میں جو بڑی اصلاح اور ترقی ہوئی وہ دوررس اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے مرکب اور تہرے پھیلاؤ (Triple Expansion) انجن بنائے گئے جن کی وجہ سے بھاپ کے استعمال میں کفایت ہوئی، اس کا دباؤ بڑھ گیا اور تقریباً ۷۰ فیصد کوئلے کی بچت ہو گئی۔ اس کے بعد نویں دہے میں

بجر خاب (Turbine) ایک پادہوا جو بھاپ کے دباؤ سے پھلوں (Blades) کو چلانے سے حرکت کرتا ہے۔ یہ پھل ان برقی پنکھوں کے پھلوں کی طرح تھے جو دھرے کو پھراتے اور گھماتے ہیں۔ یہ نئی قسم کے انجن کم وزن تھے لیکن زیادہ گھوڑوں کی قوت پیدا کرتے تھے اور ان میں ایندھن کا صرف اور بھی زیادہ کفایت سے ہوتا تھا۔ وہ مسافر والے جہازوں کو تیز رفتار کے ساتھ لانے لے جانے کے لیے خاص طور پر موزوں تھے لیکن ان کو تجارتی جہازوں میں بھی ذرا سی تبدیلی سے لگایا جاسکتا تھا۔ سب سے آخر میں تیل کا استعمال شروع ہوا جسے آسانی سے لادا اور ذخیرہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن تیل اتنا قیمتی تھا کہ جنگی جہازوں کے سوا کسی اور میں بمشکل استعمال کیا جاسکتا تھا۔ تیل کو بھاپ کے جوشاہ (Boiler) کے نیچے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ آجکل بھی دنیا کے جملہ جہازوں میں سے ۲۰ فیصد اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یا تیل کو بالکل مختلف طریق پر ڈیزل کی وضع کے اندرونی احتراقی انجن میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جو پٹرول سے چلنے والے موٹر کے انجن کے اصول پر کام کرتا ہے۔ چنانچہ موٹر والے جہازوں کی تعداد جن میں سے بعض بڑے سائز کے ہیں اس زمانے کے جہازی بیڑے میں بہت کافی ہے۔

ان ترقیوں کے مقابلے میں بادبانی جہاز کو شکست کھانی پڑی۔ نئے جہاز بڑے، زیادہ تیز رفتار، پائیدار اور مسافروں کے لیے بہت زیادہ آرام دہ تھے۔ پہلے وہ بادبانی جہازوں کے مقابلے میں بھروسے کے قابل نہ تھے۔ لیکن اب یہ صورت باقی نہیں رہی تھی اور ہوا یا موسم سے متاثر ہوئے بغیر وہ کسی مقررہ وقت نامے کی اچھی طرح پابندی کر سکتے تھے۔ موجودہ دور کے جہازوں کو دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک تو لائنر ہے جو مسافروں یا تجارتی مال یا دونوں کی نقل و حمل کا کام انجام دیتا ہے اور مقررہ بندرگاہوں کے درمیان مقررہ تاریخوں میں

باقاعدہ چلتا رہتا ہے۔ دوسری قسم ٹریمپ (amp...) لگانے والے جہازوں کی ہے جو ایک ملک سے دو... ضرورتوں کے مطابق چلائے جاتے ہیں اور تقریباً... ڈھوتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تمام دنیا کے تجار... ۶۰ فیصد ٹریمپ جہازوں پر مشتمل تھا اور ان میں سے دو تہائی... جہاز تھے۔

یہ نئے انجن چوبی جہازوں میں استعمال نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ان کی تھرتھراہٹ کو سنبھالنے کے لیے زیادہ مضبوط شے کی ضرورت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انجن زیادہ طاقت دار ہونے کی صورت میں اس بات کی کفایت ہوتی تھی کہ جہاز بڑا بنایا جائے تاکہ انجن سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چوبی جہاز کو ۳۰۰ فٹ سے زیادہ لانبا اس ڈر سے نہیں بنایا جا سکتا تھا کہ خراب موسم میں ہچکولوں کی وجہ سے کہیں اس کی کمر نہ ٹوٹ جائے۔ لوہے کو لکڑی پر کئی حیثیتوں سے فوقیت حاصل ہے۔ لکڑی کی طرح موٹا لوہا استعمال نہیں کیا جاتا اس لیے لوہا نہ صرف ہلکا بلکہ مضبوط بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کو شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لوہے کو تیرانا فطرت کے قوانین سے لڑنے کے مثل سمجھا جا رہا تھا۔ فطرت نے بھی اس کا انتقام یوں لیا کہ لوہے کے استعمال سے قطب نما غلط سمتوں میں راستہ دکھلانے لگا اور اس طرح کئی جہاز تباہ ہو گئے۔ بہرحال انیسویں صدی کے وسط میں آہنی جہاز کافی تعداد میں بنائے گئے یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء تک دنیا کے جملہ جہازوں کا بہت بڑا حصہ آہنی جہازوں پر مشتمل ہو گیا۔ لیکن جدید جہاز بنانے کی صنعت کی ابتدا فولاد کے استعمال سے ہوتی ہے۔ فولاد لوہے کے مقابلے میں زیادہ ہلکا، مضبوط، دیرپا اور لچکدار ہوتا ہے۔ اس میں ہر طرح کا فائدہ اور لوہے کے مقابلے میں اسے فوقیت حاصل ہے۔ شروع سے اس کو کیوں استعمال نہیں کیا گیا اس کی یہی وجہ تھی کہ وہ کافی مقدار میں تیار نہیں

۳۰۸

ہو سکتا تھا۔

انیسویں صدی کے وسط میں فولاد کی تیاری کے طریقے بڑے کٹھن اور اُلجھے ہوئے بہت وقت لیتے تھے۔ چنانچہ لوہے کو ناند میں کوئلے کے برادے کے ساتھ رکھ کر کئی دن تک گرم کیا جاتا تھا اور اوپر سے بھیگی ہوئی ریت پھیلا دی جاتی تھی۔ اس طریقے سے لوہا اور کوئلہ یہ دونوں مل ملا کر ایک مضبوط سلاخ کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اس کے بعد اس دھات کو چکنی مٹی اور کوک (Coke) کے برادے کی بنی ہوئی کٹھالیوں میں رکھ کر پگھلایا جاتا اور ڈھلے ہوئے فولاد کے ڈبے بنائے جاتے تھے۔ یہ فولاد اچھا ہوتا تھا۔ چنانچہ کٹھالی کا طریق فولاد کی بعض قسموں مثلاً استرے بنانے کے لیے اب بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس زمانے میں اس طریقے میں بہت رقم خرچ ہوتی تھی۔ لگاتار ایجادوں نے اس صنعت کی کایا پلٹ دی۔ ۱۸۵۶ء میں سب سے پہلے بیسی مر (Bessemer) نے یہ دریافت کیا کہ اگر پگھلے ہوئے لوہے میں سے بھتے کے ذریعے رو گزاری جائے تو اس کی وجہ سے شدید احتراق پیدا ہوتا ہے جس کا عمل گھنگھولنے کے خود کار طریق کے مثل ہوتا ہے اور دھات کا تمام میل صاف ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں صرف بیس منٹ لگتے تھے، ایندھن بھی کم صرف ہوتا تھا اور اس کے نتیجے کے طور پر یا تو خالص لوچدار لوہا یا اگر فیرو منگنیز ملایا جائے تو عمدہ ملائم فولاد تیار ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد سیمنس نے نئی دھات کی تیاری کے لیے "کھلے چولھے" کا طریق ایجاد کیا۔ جس کا عمل اگرچہ پہلے کی طرح تھا لیکن پانچ سے آٹھ گھنٹے تک وقت لیتا تھا اور تیار ہونے والی دھات کی نوعیت اور اچھائی کی زیادہ صحت کے ساتھ نگرانی کی جا سکتی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں ٹامس اور گلکرسٹ نے ایک اور اہم قدم آگے بڑھایا۔ بیسی مر کا طریق ایسی کچی دھاتوں کے لیے جن میں فاسفورس کی مقدار زیادہ ہوتی تھی مثلاً اکثر برطانوی اور جرمانی کچی دھاتوں کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان دونوں نے اس

۳۰۹

مشکل کے حل کرنے کا ایک عمل دریافت کیا جس کو "اساسی طریق" کہتے ہیں اور وہ یہ تھا کہ کٹھالی کے اندر ایک ایسے کیمیائی مسالے کی استر کاری کی جاتی جو فاسفورس سے مل کر اس کو نکال لیتا تھا۔ اس زمانے میں کیمیا کا عمل دخل انجینیرنگ میں بہت بڑھ گیا ہے۔ گرم اور ٹھنڈا کرنے کے عملوں اور دوسرے مسالوں کی ملاوٹ سے فولاد تیار کیا جا سکتا ہے جس کی سختی، مضبوطی اور لچک کے مدارج ضرورت کے لحاظ سے مختلف رکھے جا سکتے ہیں۔ ان ایجادوں کا فوری اثر ظاہر ہوا۔ جہاز سازی اور انجینیری کے لیے فولاد سب سے اہم خام شے بن گیا یہاں تک کہ پہلی بڑی جنگ کے زمانے میں دنیا کے جہازوں کا ۹۰ فیصد حصہ فولاد سے بنایا جاتا تھا۔ لیکن یہ نئی صنعت ایسی تھی جس میں برطانیہ کو کوئی خاص سہولت نہ تھی۔ ریاستہائے متحدہ میں لوہے اور کوئلے کی بہت سی کانیں تھیں اور گلکرسٹ اور تامس کے طریقے نے لورین کی ان زرخیز کانوں کا استعمال ممکن بنا دیا تھا جو ۱۸۷۰ء کی جنگ کے بعد سے جرمنی کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جزائر برطانیہ کے مقابلے میں جرمنی کی فولادی پیداوار ڈیوڑھی اور ریاستہائے متحدہ کی پیداوار دگنی تھی۔

اس صدی کے آخری حصے میں اندرونی نقل و حمل کی حد تک دوسری تبدیلیاں اور ترقیاں بھی ہوئیں۔ ہو سکتا ہے کہ بائیسکل کی ایجاد بہت زیادہ تجارتی اہمیت کی نہ معلوم ہوتی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک اوسط درجے کے شہری کی روزمرہ زندگی پر دوسری ایجادوں کے مقابلے میں اس ایجاد کا بہت کافی اثر پڑا اور اس نے فن انجینیرنگ کے ایک شعبے کی ترقی کے لیے اچھی تربیت گاہ مہیا کی۔ نیو ماٹک ٹائر کی ایجاد نے سائیکل کو ہر دلعزیز بنا دیا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں سائیکلوں کی تیاری اور فروخت کی حیرت انگیز گرم بازاری رہی۔ صرف اسی ایک سال میں اس صنعت میں گیارہ ملین پونڈ سرمایہ لگایا گیا۔

۳۱۰

ایک طرف عوام کے سر پر سائیکلوں کا بھوت سوار تھا تو دوسری طرف چند دور اندیش لوگوں نے انھیں آگاہ کیا کہ سائیکلوں کا ایک حریف میدان میں آچکا ہے اور ممکن ہے کہ وہ سرمائے کے شغل کا مفید ذریعہ ثابت ہو، موٹر کار اب بھی تجربے کی منزل میں تھی اور فرانس سے باہر اس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس کے بڑے امکانات کو تاڑ لیا تھا۔ اس زمانے میں انگلستان میں اس کے رواج کی بہت کم گنجائش تھی، کیونکہ نومبر ۱۸۹۶ء میں جاکر وہ قانون منسوخ ہوا جس کی رو سے یہ لازم تھا کہ شاہراہوں پر ہر میکانی خود کار کل کے سامنے ایک شخص سرخ جھنڈی لیے ہوئے چلے تاکہ پیچھے آنے والے گاڑی بان اور پیادہ چلنے والے دونوں خطرے سے آگاہ ہو جائیں۔ لیکن موٹر چونکہ ہلکے اندرونی احتراقی پٹرول انجن سے چلتی تھی جس میں بھاپ تیار کرنے کے لیے کوئلہ اور بھٹی کے بجائے پٹرول کی ٹنکی اور برقی شرارے سے کام لیا جاتا تھا جو ہوا اور پٹرول کی دھار میں احتراق پیدا کرتا تھا۔ اس لیے موٹر، مرڈاک کی بھاپ کی گاڑی سے بہت مختلف تھی اور یہ امر لابدی تھا کہ وہ بہت جلد ہمارے شہروں کی سڑکوں سے گھوڑے کی سواریوں کو نکال باہر کرے۔ لیکن ۱۹۰۳ء میں بھی لندن کا اخبار ٹائمز اس نو وارد کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ چنانچہ ایک اداریے میں لکھا کہ "کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہین سم گاڑیوں[1] کی تعداد میں یا گھوڑے کی بس کی لانبی قطاروں میں کچھ بھی کمی ہوئی ہے؟" بخلاف اس کے آجکل ہین سم گاڑی کبھی کبھار ہی نظر آجاتی ہے اور گھوڑے کی بس تو عنقا ہو گئی۔

موٹر کار ہمارے معاشی نظام کا بہت ہی اہم اور ضروری جزو بن گئی ہے۔ وہ نہ صرف ہزاروں آدمیوں کو اپنے کام پر جلد پہنچنے کی سہولت

---

[1] دو نشستی گاڑیاں (Hansome Cabs) جن کے پچھلے حصے میں گاڑی بان بیٹھ کر چھت پر سے لگام لیے گاڑی ہانکتا تھا۔

مہیا کرتی ہے اور چھٹیاں منانے کے لیے توانائی یا وقت صرف کیے بغیر کہیں دور جانے کا سہارا بن گئی ہے بلکہ مسافروں اور سامان کی وسیع نقل و حمل کی خدمت بھی انجام دیتی ہے۔ تمام بڑے کارخانے اور خوردہ فروشی کی بڑی کوٹھیاں اپنے پاس موٹر لاریوں اور موٹروں کا بیڑا رکھتی ہیں۔ چنانچہ ذخیرہ گھران ہی کی مدد سے گاؤں اور ضلعوں میں لندن کا سامان باقاعدہ پہنچتا ہے جس سے گو مقامی دکان والوں کو بہت دکھ ہوتا ہے لیکن کاروبار سے الگ ہو جانے والے لوگ بھی شہر اور اس کی گڑبڑ اور گندگی سے دور جا کر گزر بسر کر سکتے اور شہر کے آرام وعیش کے سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ دور افتادہ گاؤں میں جہاں ریل نہیں ہے موٹریں اور سیر گاڑیاں (Chara-banc) شہریوں کو بھر بھر کر لاتی ہیں جس سے گاؤں والوں کو دکھ اور مقامی تاجروں کے پو بارہ ہوتے ہیں اور تھوڑے سے کرایے میں جنگلوں اور سمندر کے کناروں کی سیر کراتی ہیں۔ موٹر والی نقل و حمل کے ساتھ برقی ریل و رسائل کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ ٹرام، زمین دوز ریلیں اور مضافاتی برقی ٹرینیں آبادی کی نقل و حرکت میں سہولت پیدا کر رہی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف دیہی باشندے بے تکلف شہروں میں آنے جانے اور رہنے لگے ہیں بلکہ شہری بھی کاروباری مرکزوں سے ہٹ کر گاؤں میں اپنے مکان بنا رہے ہیں۔

گو کہ میکانی نقل و حمل کی ترقی کو وکٹوریہ کے عہد کی سب سے ممتاز صنعتی خصوصیت کہا جا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مہارت اور انتظام کے فروغ نے جس کی بدولت یہ ترقی ممکن ہوئی ملک کی دوسری صنعتوں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ایک بالکل نئی اور بہت ہی اہم صنعت وجود میں آئی۔ یوں تو مشینیں بنانے کا کام خاص صنعت کی حیثیت سے شروع ہونے سے پہلے ہی سے کپڑا بننے کی مشین اور

بھاپ انجن ایجاد، تیار اور استعمال ہو رہے تھے۔ چنانچہ کپڑے کے کارخانوں میں خاص قسم کی کتائی کی کلوں کا رواج ہو چلا تھا اور مقامی لوہار ابتدائی قسم کے انجن تیار کر رہے تھے۔ لیکن جب لیور پول اور مانچسٹر ریلوے کے لیے بہترین انجن انتخاب کرنے کی غرض سے مقابلہ مقرر ہوا تو چار انجینیری کی کمپنیوں نے ریلوں کے انجن پیش کیے۔ کانوں، کپڑے کے کارخانوں اور نقل و حمل میں میکانی قوت کے استعمال اور اس کی اصلاح اور ترقی کی ابتدائی کوششوں سے جدید انجینیری کی صنعت نے جنم لیا۔ پہلا ضروری کام یہ تھا کہ کلوں کے مختلف پرزے زیادہ صحت کے ساتھ تیار کیے جائیں۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس کام کو ہنری ماڈسلے اور اس کے پیرووں نے انجام دیا۔[۱] کچھ ہی مدت بعد مشینوں کی مدد سے مشین بنانے کا کام لیا جانے لگا۔ اس کے نتیجے بہت جلد ظاہر ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں بیسی مر نے کانسی کا سفوف بنانے کی مشین بنائی تو وہ اس کی ساخت اور ترکیب کو چھپانے کے لیے بہت فکرمند ہوا۔ چنانچہ اس نے الگ الگ فرموں سے مختلف پرزوں کی فرمائش کی اور مکمل ترکیب کے معائنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے کارخانے میں مختلف جگھوں سے پرزے آنے پر وہ اپنے بھروسے کے میکانک کی مدد سے مشین تیار کرتا اور کسی دقت کے بغیر مقررہ مقام پر اس کو نصب کر دیا جاتا تھا۔ جیمس واٹ اس صنعت کو اپنے اختیار میں لینے کے لیے اپنی آنکھیں نذر کرنے سے بھی شاید نہ ہچکچاتا۔ بیسی مر کے فولاد تیار کرنے کے طریقے اور دوسرے عملوں سے جو اس کے بعد ایجاد ہوئے، انجینیر کے لیے کام کے نئے نئے راستے کھل گئے۔ علم برق کی ترقی سے تجارت نے ایک نئے میدان میں قدم رکھا تو پٹرول کے انجن اور موٹر کاروں کی ہر دلعزیزی نے تجارت کو دوسری سمتوں میں

۳۱۲

۱۔ دیکھو صفحہ ۲۳۲۔

وسعت دی۔ اور ریلوں کے نظام اور جہاز سازی کے کارخانوں اور گودیوں نے مزدوروں کی مستقل کھپت کی صورت نکالی۔ اگر ان تمام دھندوں اور پیشوں کو اکٹھا کیا جائے جو دھات اور مشینوں کا کام کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں ان کی پیداوار کا حصہ انگلستان کی مجموعی برآمد کی قیمت میں ایک چوتھائی سے زیادہ تھا۔

انجینیروں نے تیزی سے ملک کی صنعتوں کی کایا پلٹ دی میکانی قوت سے جو کام لیے جاسکتے تھے غیر محدود پائے گئے۔ اور مشکل ہی سے کوئی ایسا پیشہ بچ سکا جس میں کلوں کی مدد سے کام انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کفش سازی، کاردگری، فرنیچر کی تیاری اور خیاطی جیسے دھندے اور پیشے جو ۱۸۵۰ء تک زیادہ تر دستکاری کی منزل میں تھے، ان پر بھی مشینوں کا دھاوا ہوا اور انھوں نے بڑے کارخانوں کی شکل اختیار کر لی۔ اور ان سب کا آخری سہارا اس قوت پر تھا جو کوئلے سے حاصل کی جاسکتی تھی۔ انگلستان کی اس وقت کی زندگی کا نقشہ کچھ اسی ڈھب کا تھا جو "الوتھن" (ایک ناول) میں اس کے ایک کردار پاشلؔ نے انگلستان سے منسوب کیا ہے، یعنی یہ کہ "انگریزوں کی فوجیں ابلتے ہوئے کڑھاؤ کے بخارات اور ان کے گھوڑے دہکتے ہوئے کوئلے ہیں۔ ہر جگہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور ہر طرف بھاپ کا زور اور سیٹیوں کا شور ہے"۔ کوئلے کی اس غیر محدود مانگ کی بدولت کوئلے کی صنعت نے بہت ترقی کی۔ انگلستان کی زرریز کوئلے کی کانوں کا علم صدیوں سے تھا۔ لیکن ان سے پورا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا گیا جب تک کہ بھاپ کی قوت کے استعمال نے دولت کی اس قسم میں نئی قدر نہیں پیدا کی۔ کوئلے کے کاروبار میں اس سے بھی زیادہ توسیع اور ترقی بعد میں ہوئی، جب کہ ان دخانی جہازوں کی خالی کوٹھریوں کو کوئلے سے بھرا جانے لگا جو دنیا کے تجارتی مال کو ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک پہنچاتے تھے۔ جس وقت یہ صورت حال رونما ہوئی انگلستان کی

برآمدی تجارت نے بہت کچھ اہمیت حاصل کرلی۔ چنانچہ خود اعداد وشمار اس کی گواہی دیتے ہیں۔ سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان انگریزی کوئلے کی پیداوار ۵۶ ملین ٹن سے بڑھ کر ۲۲۵ ملین ٹن اور برآمد ۴ ملین ٹن سے بڑھ کر ۸۵ ملین ٹن ہوگئی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا تناسب ہر قسم کی مجموعی برآمد سے پہلے ۲ فیصد تھا تو اب بڑھ کر ۱۲٫۶ فیصد ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تجارت خاص افادیت اور اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ وہ بیرونی ملکوں کو جانے والے جہازوں کو ایسے سامان سے لیس کرتی تھی جو انگلستان میں غلے، روئی، اون اور لکڑی کی کثیر درآمد کو متوازن کرتی تھی۔ یہ تمام صنعتیں "صنعتی انقلاب" سے زیادہ انیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور موجودہ زمانے میں بھی یہی سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ آجکل کی بڑی صنعتی گروہ بندیوں پر نظر ڈالی جائے تو صرف سوت کاتنے والے کارخانوں کے آجر ہی نہیں بلکہ کان کنوں، ریلوے کے مزدوروں، انجینیروں، جہاز سازی کے کارخانوں اور گودیوں میں کام کرنے والوں کی بھیڑ بھاڑ بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس صنعتی توسیع اور ترقی کی بدولت شمال کی جانب بڑے بڑے شہروں میں آبادی کی منتقلی کی رفتار تیز ہوگئی۔ نقل وحمل کا انتظام ترقی پانے تک مزدوروں کی بڑی تعداد کو کسی ایک مقام پر محدود طریقے سے رو کا جاسکتا تھا۔ ان کے کھانے پینے کے بندوبست اور ان کی محنت کی پیداوار کو بازاروں تک پہنچانے کے انتظام میں بڑی دشواریاں تھیں۔ سترھویں صدی میں لندن کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہوگئی تو حکومت کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب سنہ ۱۹۲۱ء میں انگلستان کے سولہ شہر ایسے تھے جن میں سے ہر ایک کی آبادی دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان ہی میں سے تین شہروں کی آبادی سات سات لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی اور لندن کی آبادی ۴۵ لاکھ تھی۔ انگلستان اور ویلز کی آبادی کا ۷۹ فیصد سے بھی زیادہ حصہ شہروں میں رہتا سہتا تھا۔ ان گنجان

آبادی کے علاقوں میں ایسے حالات پیدا ہوئے جس سے بڑے پیمانے پر
کارخانے قائم کرنے میں مدد ملی۔ بڑے پیمانے پر اور کثرت سے
سامان کی تیاری نہ صرف ان کارخانوں میں ہو رہی تھی جن کے اردگرد
آبادی اکھٹی ہو رہی تھی بلکہ ان دھندوں اور پیشوں میں بھی جو ان
کارخانوں کے اردگرد اکھٹی ہونے والی آبادی کی ضرورتوں کو پورا
کر رہی تھیں۔ اور شہروں میں بھی بڑے پیمانے پر کثرت سے مکانوں کی
تعمیر ہو رہی تھی۔ آبادی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کی فوری سمائی
کے لیے پہلے سے نقشہ بنائے بغیر جلدی میں بے سوچے سمجھے مکانوں کی
قطاریں کھڑی کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ
تنگ، تاریک اور گندہ محلے وجود میں آئے لیکن نقل و حمل کے انتظام
سے اس میں تغیر ہوا۔ چنانچہ جوں جوں مقامی ریلوے لائینیں، ٹریم
اور زمین دوز ریلیں شہروں کے مرکز سے نکل کر ملک میں چاروں طرف
پھیلنے لگیں ان کے ساتھ ساتھ خوش حال طبقہ مضافات کو بسانے لگا۔
اس کے علاوہ خود کارخانوں کو بستی کے مرکزوں سے ہٹا کر ایسے مقام پر
بنانے کی کوشش کی گئی جہاں زمین سستی اور مزدوروں کے مکانوں کے
اتنی قریب بھی ہو کہ وہ روزانہ اپنے کام پر آسانی سے آ جا سکیں۔
اس نقل و حمل میں بھاپ کے علاوہ دوسری قوت کے بڑھتے ہوئے
استعمال سے بھی کافی سہولت پیدا ہو گئی ہیں اور برقی قوت کسی
مرکزی مقام پر تیار کی جا سکتی ہے جہاں سے تھوڑے سے صرفے سے
نلیوں یا تاروں کے ذریعے سے ان کو دور افتادہ کارخانے تک پہنچایا
جا سکتا ہے۔ برقی قوت سے متعلق مختلف قوانین کو عمل میں لانے کے لیے
سنہ ۱۹۲۲ء میں محکمہ تجارت کی جگہ برقی کمیشن نے لے لی اور سنہ ۱۹۲۶ء میں
"قانون فراہمیٔ برق" کی منظوری نے ایک ایسی تجویز کو عملی جامہ پہنایا
جو برطانوی صنعتوں کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس قانون کی
رو سے ایک مجلس برق قائم کی گئی جس کو ملک کے ہر گوشے میں برق کے

استعمال کو بڑھانے اور پھیلانے اور اس کی رسد کو منظم کرنے کے بارے
میں وسیع اختیارات حاصل تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وسیع معاشی تنظیم نے ملک کی دولت
اور سماجی خوش حالی کی ترقی کی شاہراہیں کھول دیں لیکن بعد میں لوگوں
کے دلوں میں شبہے پیدا ہونے لگے اور وہ حیرت سے سوچتے تھے آیا
ان سب ترقیوں کے باوجود برطانوی عقلمندوں نے بقا اور حیات کے
مسئلوں کا کوئی آخری حل دریافت کر لیا یا نہیں۔ فرانسیسی اور پرشین
جنگ سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بڑی تجارتی گرم بازاری کا دور دورہ
رہا جس کی وجہ بڑی حد تک قیمتوں کی بیشی تھی جو آسٹریلیا اور کیلی فورنیا
سے سونا بڑی مقدار میں درآمد ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے
سنہ ۱۸۷۳ء تک یہ گرما گرمی بہت بڑھتی رہی۔ جس میں نہر سوئز کے کھل جانے
اور جرمنی اور امریکہ میں ریلیں بن جانے کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو گیا،
اس دور میں اختیار کی بے احتیاطی کے ساتھ توسیع زائد پیدائش اور غیر صحیح
تخمین کی معمولی علامتیں سب موجود تھیں۔ گرتی ہوئی قیمتوں کی پہلی علامت
ظاہر ہوتے ہی جو پہلی ضرب پڑی اسی سے اس پھیلاؤ کا بھانڈا پھوٹ
گیا۔ یہ صورت حال سنہ ۱۸۷۳ء میں ظاہر ہوئی جب کہ دنیا کے سونے کی
پیداوار کم ہو گئی اور جرمنی اور ریاستہائے متحدہ دونوں نے زر کے
اغراض کے لیے سونے کی بڑی مقدار کو جو گردش میں تھی محفوظ کرنا شروع
کیا، بیسی مر کے فولاد سازی کے سستے طریقے کی بدولت فولاد کی قیمت گرنے لگی
اور جہازی باربرداری کے کرائے میں اس لیے کمی ہونے لگی کہ پرانے جہازوں کے مقابلے میں
نئے جہازوں کی کارکردگی بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے ان کی تعداد تجارتی ضرورتوں سے
زیادہ ہو گئی تھی۔ یوں تو یہ بحرانی کیفیت تمام دنیا پر چھا گئی تھی لیکن
انگلستان اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ لوہے فولاد اور جہاز سازی کی
صنعتوں کو آئے دن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نت نئے طریقوں نے
پورے طور پر جدید تنظیم کو ضروری بنا دیا اور صنعتوں کو پھلنے پھولنے اور

۱۸۷۳ء

اس قابل بننے کے لیے کہ زیادہ کفایتی طریقوں کے استعمال سے پیداوار
میں جو اضافہ ہو اس کی نکاسی کر سکیں کافی وقت لگا۔

لیکن جب انگلستان نے یہ دیکھا کہ صرف وہی اکیلا ملک نہیں
جس کی صنعتیں ترقی کر رہی ہیں تو اسے بڑا رنج ہوا۔ انگلستان اپنے اثر کے صنعتی
حلقوں کو خصوصی دائرہ ہائے عمل سمجھ رہا تھا۔ لیکن اب دوسرے ملک
خاصکر جرمنی اور ریاستہائے متحدہ کی اس پر چڑھائی ہو رہی تھی۔ ہو سکتا
تھا کہ یہ ایک بے ہودہ حرکت ہو۔ لیکن یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس سے
نبٹنا ضروری تھا۔ یہ ممکن تھا کہ انگلستان کی صنعتی میدان میں فوقیت
ایک امر مسلم کی حیثیت نہ رکھتی ہو بہرحال امریکہ جو شروع میں یورپ کے
بازاروں میں انگلستان کا بڑا مدمقابل نہ تھا، اپنے لیے ایسے اشیا
بنانے لگا جن کو وہ پہلے انگلستان سے خریدا کرتا تھا۔ اور ۱۸۸۰ء سے
امریکی آبادی میں کافی اضافہ ہو جانے کے باوجود انگلستان سے امریکہ
بھیجی جانے والی اشیا کی قیمت یکساں رہنے لگی اور تھوڑی ہی مدت بعد
اس میں کمی شروع ہو گئی۔ ۱۹۰۰ء تک امریکی مصنوعات کی انگلستان میں
بھرمار ہونے لگی۔ بات یہ تھی کہ امریکہ میں لوہے اور فولاد کی صنعت بہت
بڑے پیمانے پر قائم ہو گئی اور برآمدی تجارت نے بھی کافی وسعت
حاصل کر لی۔ امریکی کھیتی باڑی کے آلات اور دوسری قسم کی کلیں کثرت
سے انگلستان آنے لگیں۔ امریکہ سے مشینوں کے بنے ہوئے جوتوں کی
بھرمار نے نارتھمپٹس کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ رہا جرمنی تو وہ انگلستان
سے بہت قریب تھا اور کامیابی کا راسخ ارادہ رکھتا تھا جس کی وجہ سے
اس کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ انگلستان کو یہ ماننے پر
مجبور ہونا پڑا کہ جرمنی کی آہنی اور فولادی صنعتیں اور ہتھیاروں کے
کارخانے انگلستان کے مقابلے میں کسی طرح کمتر نہیں اس کے کپڑے کے
کارخانوں کی ترقی بھی انگلستان کے لیے کوئی نیک فال نہ تھی۔ جرمنی کے
برقی آلات اور سامان اور مختلف قسم کی کیمیائی پیداوار نے بین قومی

۳۱۶

تجارت میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ سا بجن کی کاریگری کی شہرت شفیلڈ کی صنعت کے مقابلے میں کچھ کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جرمنی نے مختلف قسم کے سائنسی آلات اور اوزار عینک کے شیشے کھلونے، گھڑیاں، نادر چرمی مصنوعات اور کئی چھوٹی چھوٹی اشیا خصوصی مہارت کے ساتھ بنانے میں نمایاں ترقی کی۔ اس پیش قدمی سے انگریز سیاسی مدبرین بہت گھبرائے اور اپنے ملک کے فائدے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس پیش قدمی کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ انگریزی صنعتوں میں نئی توانائی پیدا ہوگئی جو نئے طریقے اختیار کرنے اور کارخانوں کے اتحاد اور انضمام کو ترقی دینے کی تحریک کا باعث بنی۔ چنانچہ اگلے باب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔ غرض جب کساد بازاری ختم ہوئی اور اعتماد بحال ہوگیا تو انگریز انجینیر نے خود کو اپنے کام پر جمے رہنے کے قابل پایا۔ موچیوں نے اپنے کام میں وہ بات پیدا کی کہ ان کا مال امریکی بازاروں میں بیچنے کے لائق ہوگیا۔ انگریزی جہاز سازی کی صنعت نے ترقی کے میدان میں قدم بڑھایا اور کوئلے کی برآمدی تجارت بھی برابر بڑھتی چلی گئی۔

لیکن ایک صنعت ایسی بھی تھی جس کی حالت کساد بازاری کی وجہ سے اتنی خراب ہوگئی کہ وہ پوری طرح کبھی نہیں ابھری۔ یہ صنعت زراعت تھی۔ انیسویں صدی کے پہلے چار دہوں میں زراعت پھلتی پھولتی رہی اور غلے کے قوانین کی تنسیخ سے اتنا نقصان نہیں ہوا جس کا بعض لوگوں کو اندیشہ تھا۔ آزاد تجارت نے کوئی بڑی مسابقت نہیں پیدا کی جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ زرعی پیداوار بھاری اور بوجھل ہوتی ہے اور اس کا زیادہ حصہ جلد گل سڑ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نرے باربرداری کے مصارف ہی موثر تامین کا کام کر رہے تھے۔ ملک کے اندرونی حصے میں نقل وحمل کے انتظام کی اصلاح، ترقی اور بڑے شہروں میں کثیر آبادی کا اکٹھا ہونا کسان کے لیے بڑی نعمت

۳۱۷

ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک طرف اس کی پیداوار کی نکاسی کا مستقل بازار
کھل گیا تو دوسری طرف وہاں تک پہنچنے کے ذریعے نپولین کی جنگوں کے بعد
زراعت کی حالت جیسی کچھ خراب ہوگئی تھی اس کے سدھارنے کے لیے
خون پسینہ ایک کرنا پڑا اور اس محنت کا اچھا پھل ملا۔ کئی ایک کسانوں
نے زراعت کے بہترین سائنسی طریقوں سے کام لیا اور اس میں شاہی
زرعی انجمن (رائل اگریکلچرل سوسائٹی) نے جو سنہ ۱۸۳۸ء میں قائم ہوئی ان کی
بڑی مدد کی۔ اس دوران میں سائنس سے بہتیرے کام لیے گئے۔ پانی کی
نکاسی کے لیے نالیوں کی ضرورت محسوس کی گئی تو مٹی کھود کر بنڈ بنانے
کے پرانے طریقے کی جگہ بند موریاں اور مٹی کے پائپ استعمال کیے
جانے لگے۔ جرمن کیمیا داں لای بگ کی مشہور کتاب سنہ ۱۸۴۰ء میں شائع
ہوئی اور اس کے تجربوں نے عمیق کاشت کے نئے امکانات پیدا کردیے۔
زمین کی کمزوری دور کرنے کے لیے کیمیائی کھاد استعمال کی جانے لگی اور
مویشیوں کی غذا کی مختلف قسموں کی قوت کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔
آخر میں انجینیروں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے
بھاپ کی قوت سے چلنے والی مشینوں کو کھیتی باڑی کے ہر شعبے میں
انسانی محنت کی جگہ استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے زمیندار اور کسان
دونوں کے لیے سنہری دور کا آغاز ہوا۔ ایک طرف لگان بڑھا تو دوسری طرف
پیداوار کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا اور نفع بڑھ گیا۔ سرمائے کی
افراط تھی، اس لیے منتشر کھیتوں کو یکجا کرکے وسعت دی گئی کھیت
کے مکانوں کو اصلاح اور ترقی دی گئی اور بھیڑوں اور مویشیوں کی
رکھوالی اور دیکھ بھال کے نت نئے طریقے اختیار کیے گئے۔

لیکن یہ خوشحالی دیر تک قائم نہیں رہی۔ زراعت پر ساتویں دہے
کی کساد بازاری کا اثر پڑا۔ سنہ ۱۸۷۵ء تا سنہ ۱۸۷۹ء کی لگاتار تین خراب
فصلوں کی وجہ سے اس کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ لیکن
سنہ ۱۸۷۹ء میں جو موسم کے اعتبار سے اس صدی کا بدترین سال تھا

زراعت کی حالت انتہائی نازک ہوگئی۔ ایک سو سال پہلے کسان عام طور پر کہا کرتے تھے کہ خراب موسموں میں ان میں نفع زیادہ ہوتا تھا کیونکہ قیمتیں بڑھ جاتی تھیں اور پیداوار کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بہت ہی کم غلہ درآمد کیا جاتا تھا۔ یہ بات آزاد تجارت کے دور میں بھی ایک حد تک صادق آتی تھی کیونکہ انگلستان میں فصل کی خرابی کے معنی عام طور پر یورپ کے بڑے حصے میں بھی فصلوں کی خرابی کے ہوتے تھے جس کی وجہ سے انگلستان کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے پیداوار کا حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ لیکن آج کل کے دخانی جہاز نے دوسرے براعظموں کو جن کی آب وہوا مختلف اور کھیتی باڑی کے لائق زمین غیر محدود ہے انگریز کسان کے مقابل لاکھڑا کر دیا۔ اگر انگلستان میں فصل خراب ہو تو پیداوار کی کمی زرخیز امریکی فصلوں سے پوری کی جا سکتی اور قیمت بھی کم رہتی ایسی صورت میں انگریز کسان کے پاس نہ تو اتنی پیداوار ہوتی جسے وہ بیچ سکتا اور جو تھوڑی بہت ہوتی بھی تو اسے سستا بیچنا پڑتا۔ یہ معلوم کر کے اسے سکھ نہیں ہوتا تھا کہ سال کا ہر مہینہ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں فصل کی کٹائی کا زمانہ ہوا کرتا تھا اور ان سب فصلوں کی پیداوار اسی کے بازار میں بھیجی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ صرف غلہ ہی ایک شے نہیں تھی جو درآمد کی جاتی تھی۔ بلکہ پنیر بڑی مقدار میں امریکہ سے آتا تھا، تیز رفتار جہاز ڈنمارک سے مکھن اور انڈے لاتے تھے اور نیوزی لینڈ اور ارجن ٹائن سے سوکھا گوشت خاص طور سے بنائے ہوئے جہازوں میں لایا جاتا تھا۔

زرعی صنعت ایک زمانے تک مایوسی سے دوچار رہی اور کھیتی باڑی کا معیار گھٹ گیا۔ بڑھے ہوئے لگان کا بوجھ ناقابل برداشت بن گیا۔ بدررو، کھاد اور مویشیوں کے چارے کی تیاری کے کام میں مزدوروں اور سرمایہ کی کھپت پہلے سے کم ہوگئی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور لگان میں کمی کے ساتھ ساتھ کلیسائی محصولوں اور دوسرے ابواب کے

۳۱۸

بوجھ میں بھی کسی حد تک کمی ہوتی گئی، زراعت سنبھلنے اور ان نقوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنتی گئی جو اس کو دبا رہی تھیں۔ کھیتی باڑی کے طریقوں کو کسی حد تک بدل دیا گیا۔ بڑے بڑے کھیتوں کو چھوٹے کھیتوں میں تقسیم کرنے کا میلان ظاہر ہوا۔ چنانچہ ۵۰ سے لے کر ۱۵۰ ایکڑ کے درمیانی کھیت کو زیادہ پسند کیا جانے لگا۔ چونکہ ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ جملہ غلے کی پیداوار کی قیمتیں گھٹ گئی تھیں اور ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے تک ان کی بحالی کی کوئی علامت نہیں پائی گئی اس لیے ظاہر ہے کہ اس زمین کا رقبہ بتدریج کم ہوتا گیا جس پر غلے کی کاشت ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں انگلستان کی کھیتی باڑی کا رقبہ ۷½ ملین ایکڑ تھا لیکن سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ گھٹ کر ۵½ ملین ایکڑ رہ گیا۔ اس کے مقابل مستقل چراگاہوں کے رقبے میں کافی اضافہ ہوا اور میووں کی کاشت کا رقبہ بھی نمایاں طور پر بڑھ گیا۔ ان اعداد کو پیش کرنے سے یہ مقصد ہے کہ بہترین زمینوں کے سوا دوسری زمینوں پر غلے کی کاشت کرنا غیر مفید اور جوکھم کا دھندا سمجھا جانے لگا۔ لیکن ملک میں پلی ہوئی گائے اور بکری کے گوشت، تازہ دودھ، مکھن، دہی، پنیر، مرغ اور دوسرے پرندوں اور میووں کی بازار میں اچھی قیمت مل سکتی تھی، بات یہ تھی کہ پیشوں اور دھندوں میں تنوع اور خصوصیت بہت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے کسان کو انتظام میں بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے کام کرنا ضروری تھا۔ ۳۱۹

اس تغیر کی مایوسانہ خصوصیت یہ تھی کہ کام پر لگے ہوئے مزدوروں کی تعداد گھٹی اور دیہات سے آبادی شہروں میں منتقل ہونے لگی۔ حکومت اس منتقلی کو روکنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے مزدوروں اور غریب کسانوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے خیال سے مقامی عہدہ داروں کی مدد سے ان کے لیے زمینیں مہیا کرنے کی کوشش کی اور اسی طرح دوسرے خوشحال لوگوں کے لیے بھی کسانوں کی حیثیت سے رہنے سہنے کی رغبت دلانے کے طور پر چھوٹے کھیت مہیا کیے۔ یہ خطے

ایک ایکڑ سے بھی کم ہوتے تھے جن پر مزدور اپنے کام کے ساتھ ساتھ لیکن فرصت کے گھنٹوں میں کھیتی باڑی کر سکتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس طریقے پر اس کو زمین کا مالک ہونے کا کچھ احساس ہوگا، اس علاقے میں اس کی ایک حیثیت قائم ہو جائے گی اور زمین کے اس ٹکڑے پر وہ جو کچھ سبزی اور ترکاری اُگا سکے گا اس سے زائد اجرت کے طور پر اس کو آمدنی ہو جائے گی۔ زمین کی ملک اس کو اپنے آجر اور مقامی دکان دار کا محتاج نہ رکھے گی۔ چھوٹے کھیت کا رقبہ ۱۵ یا ۲۰ ایکڑ ہوتا تھا جو ایسے آدمی کے ہاتھ بیچا یا کرائے پر دیا جاتا تھا جو اپنے بال بچوں کے ساتھ ان پر اپنا پورا وقت کام میں صرف کر سکتے تھے۔ کسی کھیت کا اتنا بڑا ہونا ضروری تھا جو کسان اور اسکے خاندان کے لیے روزی کمانے کے واسطے کافی ہو لیکن اتنا بڑا بھی نہ ہو کہ اس کا انتظام کسان بے مزدور لگائے نہ کر سکے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے "چھوٹے کھیتوں اور اراضی کے خطوں کے قانون[1]" کی رو سے پہلی مرتبہ مقامی عہدہ داروں کو زمین خریدنے کے کافی اختیارات حاصل ہوئے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۳۰،۰۰۰ بڑے خطے اور ۱۵ ہزار چھوٹے کھیت مہیا کیے گئے۔ بڑے خطے اکثر کے لیے بڑی نعمت ثابت ہوئے۔ لیکن یہ بہت زیادہ شہری مزدوروں کے حصے میں آئے۔ اگرچہ زمین موزوں ہونے کی صورت میں چھوٹے کھیتوں کو نمایاں کامیابی ہوئی، پھر بھی ان کا رواج اتنی تیزی سے یا اتنا آگے نہیں بڑھا کہ زراعت کی عام حالت پر کافی اثر پڑتا گو خوشحالی کے لوٹ آنے کی علامتیں بہت زیادہ اطمینانی نہیں تھیں، پھر بھی سنہ ۱۹۱۲ء میں زرعی مسائل کے مصنفوں کی تحریریں امید سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی امیدیں ٹھیک تھیں یا نہیں اس کا علم ہی نہیں ہو سکا کیونکہ

۴۲۰

۱؎ - Small Holdings & Allotments Act

اسی درمیان میں جنگ چھڑ گئی۔ آبدوزوں کی ناکہ بندی کے زمانے میں غذا کی جو سخت ضرورت ہوئی اس کی وجہ سے کسان خوب خوشحال ہو گئے۔ لیکن صلح کے کچھ زمانہ بعد زراعت میں پھر کساد بازاری شروع ہو گئی۔ اس کساد بازاری کو دور کرنے کی غرض سے سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۲۸ء میں "زرعی قرضے کے قوانین" منظور کیے گئے جن کی رو سے کسانوں کو قرضے دیے جا سکتے تھے اور سنہ ۱۹۲۸ء میں امدادی محصول کی ایک اسکیم" امدادی محصول کے تعین وتقسیم کے قانون" میں شریک کی گئی۔
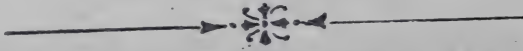
باب ۲۰

حکومت کی دوڑ دھوپ اور انفرادیت کا خاتمہ

ارسطو کا قول ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی مملکت سے کوئی تعلق نہ رکھے تو وہ یا انسانی جتھے سے اونچا ہے یا نیچا۔ گویا وہ ذات باہر ہے۔ دور وسطیٰ میں یہ بات اور زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ ہر آدمی کا تعلق کسی نہ کسی جتھے یا رضا کار انجمن سے ہو۔ اس زمانے میں مملکت بہت ہی کم بھروسے کے قابل تھی۔ کیونکہ وہ نہ تو کسی کی زندگی کے طور طریق میں دخل دے سکتی تھی اور نہ کسی کو پناہ۔ لیکن اگر کوئی فرد کسی جتھے کا رکن بن جاتا تو یہ جتھا اس کے حقوق اور ان قوانین کا سنگم ہوتا تھا جو اس کی روزانہ زندگی پر اثر ڈالتے تھے۔ دستکار اپنے جتھے میں، زرعی غلام اپنے جاگیری موضع میں، تاجر اپنی کمپنی میں اور راہب اپنی خانقاہ میں، غرض ہر ایک اپنے اپنے چھوٹے سے دائرے میں رہتا سہتا تھا اور یہی اس کی سماجی اور سیاسی دنیا تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرا اس نظام کا

شیرازہ بکھرتا گیا، جتھا بندی ٹوٹی اور فرد اور مملکت ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔ ہر شہری یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی غرضوں کے پورا کرنے میں آزاد اور صرف ملک کے اس قانون کے تابع ہے جو سب شہریوں پر یکساں عائد ہوتا تھا۔ اگر وہ جائداد والا ہوتا اور اس کو معاشی آزادی اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے تو وہ قانون اور وزیروں کو اپنے مخدوم کے بجائے اپنے خادم سمجھتا۔ اگر قانون اس کی نگرانی اور بچاؤ کی کوشش کرتا تو وہ اس طرح کی ناجائز مداخلت کے خلاف شور مچاتا اور عدم مداخلت کے اصول پر اپنے پورے بھروسے کا اظہار کرتا۔ بدقسمتی سے سلطنت کے مشیروں کو اس اصول کو مان لینے اور عملی جامہ پہنانے میں زیادہ مدت نہ لگی ہوگی کہ سماج کی ہیئت میں پھر تبدیلی ہونے لگی۔ نئے گروہ قائم ہوئے۔ ایک طرف سیاسی ماہر انسانوں کے باہمی تعلق کی حد تک انفرادی آزادی کی عزت وحرمت کی نصیحت کررہے تھے تو دوسری طرف مختلف گروہوں کے باہمی تعلق کی بنیاد پر معاشی سماج کی نئے سرے سے تنظیم ہورہی تھی کارخانہ دار کو محسوس ہوا کہ اسے اپنے مزدوروں سے فرداً فرداً تعلق قائم کرنے میں تو بہت ہی کم دلچسپی تھی لیکن ان کے اجتماعی تعلق سے بہت دلچسپی تھی۔ مزدوروں کو یہ معلوم ہوا کہ جس وقت وہ آجر سے معاملہ طے کرنے کی کوشش کرتے تو انھیں ایسے آدمی سے معاملہ کرنا پڑتا جو خود بھی کسی جماعت کا رکن ہوتا اور اس جماعت کی حکمت عملی پر پوری طرح چلتا تھا۔ سماج کی یہی تبدیلی انیسویں صدی میں حکومت کی ارادی دخل دہی سے کہیں زیادہ انفرادیت کے زوال کا باعث بنی۔

سب سے زیادہ مشہور صنعتی گروہ "مزدور سبھا" ہے اور وہ عہدوسطیٰ کے "دستکاروں کے جتھے" سے بہت مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ "جتھا" ایک ایسا نظام تھا جو پیشے کے استادوں کا بنایا ہوا اور انہی کی نگرانی میں تھا۔ اور یہی جماعت سرکاری اجازت یافتہ تھی جسے اس پیشے کا انتظام

سپرد تھا۔ لیکن مزدور سبھا صرف مزدوروں پر مشتمل ہوتی اور صرف اسی وجہ سے قائم ہوئی ہے کہ مزدوروں کو اس پیشے کی حکومت اور نگرانی میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا جس میں وہ کام کرتے تھے اور جس پر ان کی روزی کمانے کا انحصار تھا۔ ایسا اثر اور رسوخ جو تنظیم کا نتیجہ ہو قانون کے دیے ہوئے حقوق کا بہترین امکانی بدل تھا۔ ۳۲۲
مزدور سبھاؤں کے مقابلے میں آجر سبھائیں مزدوروں سے معاملہ کرنے کے لیے بنائی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی آبادی دو مخالف گروہوں میں بٹ گئی۔ جتھے عام طور سے مقامی ہوا کرتے تھے۔ لیکن نئی سبھاؤں نے "قومی" بننے کی کوشش کی جس میں ان کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ شروع میں مزدور سبھا کی قوتوں کو حملہ کرنے والی فوج سمجھ کر اسے کچلنے کے لیے قانون کی پوری طاقت لگا دی گئی۔ اور بے دلی سے ان کو مان لینے کے بعد بھی اس عام خیال کے تحت انھیں بدگمانی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ دو مخالف جماعتوں کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں گی۔ لیکن یہ عام خیال غلط ثابت ہوا۔ چنانچہ آجکل مزدور سبھائیں بڑی آزادی سے آجر سبھاؤں کے ساتھ معاملہ طے کرتی ہیں سنہ ۱۹۲۶ء میں مزدور سبھاؤں کی کانگریس کی عمومی مجلس نے اپنے مطالبوں کو منوانے کی غرض سے عام ہڑتال کا اعلان کیا جس سے پورا ملک خطرے میں گھر گیا۔ گو یہ ہو سکتا ہے کہ بعض معاملوں میں مزدور اور آجر سبھاؤں کی غرضیں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کی موجودگی صنعت پر دیرپا اور اچھا اثر ڈال رہی ہے۔

سنہ ۱۸۲۵ء کے قانون نے مزدور سبھاؤں کے قیام کا قانونی اختیار دیا تھا۔ لیکن یہ زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہ تھا۔ آجروں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اجتماعی تنظیم دشوار تھی۔ اگر کوئی مزدور

دوسرے مزدور پر حملہ کرتا ہوا پایا اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ
ڈالتا ہوا پایا جاتا تو اس کو تین مہینے قید کی سزا دی جا سکتی تھی۔ پھر بھی
مزدور سبھائیں پھلتی پھولتی رہیں اور آئندہ کامیابیوں کے بارے میں
ان کے دل امیدوں کی امنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۸۱۵ء کی
صلح کے بعد جو برا زمانہ آیا اس میں غریب طبقے کو بڑی تکلیفوں اور
مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے ان کے دل میں مالدار
طبقے کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اور سارے معاشری
نظام کو جو ایسی چیزوں کو جائز رکھتا تھا برا ٹھیرا کے اس کے خلاف
شور مچایا جانے لگا۔ جرنی مین ٹیلرز نے لکھا کہ "کیا سماج کے کاہل
اور ناکارہ طبقے یعنی امیروں کو یہ معلوم ہے کہ ان کی اصلیت کیا ہے؟
زندگی کی ضرورتوں، راحت اور عیش کے جس سامان سے وہ ناشکری
کے ساتھ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے لیے کیا وہ انھی لوگوں کے احسان مند
نہیں جن کے خلاف انھوں نے ایکا کر رکھا ہے؟" یوں تو عام طور سے
طبقہ واری جنگ کا جوش پیدا ہو گیا تھا لیکن مزدور سبھاؤں میں لڑنے
کی قوت آ گئی۔ چنانچہ ایک اشتراکی رابرٹ اوون کو بھی یہ یقین تھا کہ
اس کے مقصدوں کی تکمیل کا ایک امکانی ذریعہ مزدور سبھائیں ہی ہو سکتی
تھیں۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مزدوروں کے طبقے میں ایکا پیدا کر کے
بھائی چارہ قائم کرے اور امیروں کے طبقے سے لڑنے کے بجائے
باہمی ملاپ کے اصول پر ایک نئی جمہوریت بنائے جس میں زندگی کا
مقصد سماج کی خدمت ہو نہ کہ ذاتی منفعت۔ اس سے پہلے درزیوں،
مکان بنانے والے مزدوروں اور سوت کاتنے والوں نے اپنے اپنے
دھندوں کے لیے قومی سبھائیں بنانے کی کوشش کی تا کہ اس طرح
سارے مزدوروں کے طبقے کی ایک بڑی اور ملی جلی سبھا بنانے کے لیے
راستہ تیار ہو جائے۔ اس تحریک کو اوون نے اپنے ہاتھ میں لیا اور
فروری سنہ ۱۸۳۴ء میں ایک قومی مزدور مہا سبھا[1] بنائی۔ صرف چھ مہینے تک

[1] Grand National Consolidated Trades Union

٣٢٣

یہ مہا سبھا رہی۔ ظاہر ہے کہ ایسی ان گنت مقامی سبھاؤں کے وفاق کی ناکامی یقینی تھی جو برساتی پودوں کی طرح نکل پڑی تھیں، خود بے مایہ اور کوئی تجربہ کار رہنما نہ رکھتی تھیں۔ اوون نے ان مقامی کوششوں کی پرواہی نہیں کی جو آجروں سے اچھی اجرت اور اچھی شرطیں کرنے کے لیے کی جارہی تھیں۔ سماجی نظام میں کامل اور انقلابی تبدیلی کی جانب اس کی پوری توجہ رہی۔ اس کے دلیرانہ خیالات نے مزدور سبھا کے نظام کے لیے حیرت انگیز جوش و خروش پیدا کیا۔ لیکن جب ان خیالات کے عملی شکل اختیار کرنے کی امید دھندلی ہوتی گئی تو یہ جوش و خروش بھی ہانڈی کے اُبال کی طرح اور گنتی کی کچھ بے ربط مقامی کوششوں کے بعد "قومی مزدور مہا سبھا" کا خاتمہ ہو گیا۔

لیکن مزدور سبھاؤں کا نظام بالکل مردہ نہیں تو ادھ موا ضرور ہو گیا۔ گو قومی مزدور مہا سبھا ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی کچھ شاخوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کام اعتدالی طریقے پر جاری رکھا۔ معاشی نظام کو مان لینا ضروری تھا۔ سبھا کا کام یہ تھا کہ اپنے ارکان کے لیے پُرامن گفت و شنید کے ذریعے سے وہ تمام موافق حالات اور شرطیں حاصل کی جائیں جن کی یہ نظام اجازت دیتا تھا۔ مزدور سبھائیں آجروں سے "اچھا سمجھوتا کرنا" اور مزدوروں کو نقصان سے بچانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ دوسروں پر نقصان عائد کریں۔ طبقہ واری جنگ کی للکار ختم ہو چکی تھی اور اشتراکی "ہزار سالہ دور" کا تصور دھندلا پڑ چکا تھا۔ انھیں آنے والی نئی بادشاہت کی اتنی فکر نہ تھی جتنی کہ روزانہ کی روٹی کی! اس ڈھب پر تیس سال تک جان توڑ کام کرنے سے جو تجربہ حاصل ہوا اس نے مزدور سبھاؤں کے قائدوں کو مطمئن کر دیا کہ چاہے ان کے مقصد کتنے ہی اعتدالی کیوں نہ ہوں ان میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے آجر قانون میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔ اس زمانے کی طرح جب کہ

۴۴۳

فرانسس پلیس اتحاد کے قوانین کی منسوخی کی کوشش کر رہا تھا اب بھی انیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں مزدوروں کی تحریک کی خاص کوششوں کی نوعیت سیاسی تھی۔ لندن کے پانچ آدمیوں کی ایک مجلس اس مہم کو چلانے والی تھی جس کو جنٹا (Junta) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان آدمیوں میں سے چار ان طاقت ور سبھاؤں کے نمائندے تھے جن کا مستقر لندن تھا اور پانچواں آدمی جارج اجر مزدوروں کی ایک اشتراکی جماعت کا قائد تھا۔ اس مجلس کو اپنے کام میں نہ صرف اس لیے دشواری پیش آئی کہ عوام مزدور سبھاؤں کو باغی جماعت اور ان کے عہدہ داروں کو "کرائے کے شورشی" سمجھتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ اس مجلس کے حامی یہ نہ سمجھ سکے کہ پارلیمنٹ کے کسی گمنام قانون میں ترمیم ان کو اپنے آجروں سے اچھی اجرت دلانے میں کس طرح مدد دے سکتی تھی۔

خوش قسمتی سے عوام کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ کسی نے بارود کے ڈبے سے شیفیلڈ کے ایک مزدور کا گھر اڑا دیا۔ اس بیجا حرکت کی خبر سے غم اور غصے کی لہر سی دوڑ گئی اور فوری تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ عام خیال بالکل واجبی تھا کہ کسی مزدور سبھا نے یہ جرم کیا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ایک سال بعد ۱۸۶۷ء میں ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا اور مزدور سبھا کی ساری تحریک کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ فریڈرک ہیریسن جو کمیشن میں مزدور سبھاؤں کا نمائندہ تھا اس کی پرزور اور مخلصانہ کوششوں کی بدولت مزدور سبھاؤں نے محسوس کیا کہ ان کے خلاف اشتہار بازی نے ان کو مدد پہنچائی۔ گواہوں کے بیان نے سبھاؤں پر بغاوت اور سازش کے الزام کو بے بنیاد ثابت کر دیا اور وہ جو کچھ کر رہی تھیں اس کا مقصد مجموعی حیثیت سے پیشے کے حالات کو مستحکم کرنا تھا۔ "جنٹا" یعنی پانچ ارکان کی مجلس نے اس نئی حاصل کی ہوئی عزت سے بہترین امکانی طریقے پر کام لیا اور

۳۲۵

۱۸۷۶ء تک ایسے قوانین منظور کرانے میں کامیابی حاصل کی جن کی بدولت پرانے قوانین کی اعتراض کے قابل خصوصیتیں دور ہو گئیں۔

ایک نئے قانون کا تعلق معاہدے کی خلاف ورزی سے تھا۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی آجر اپنے کسی مزدور سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑتا تو اس کو جرمانہ دینا پڑتا لیکن مزدور آجر کی خدمت بجالانے کے بارے میں معاہدے کی خلاف ورزی کرتا تو اسے قید بھگتنی پڑتی تھی۔ نئے قانون کی رو سے خلاف ورزی کی صورت میں دونوں کے لیے ایک سے جرمانے کی سزا مقرر کی گئی۔ ایک اور قانون نے مزدور سبھاؤں کو عدالت میں چارہ جوئی کا حق دیا۔ گو اس سے پہلے مزدور سبھائیں غیر قانونی نہیں تھیں مگر قانون ان کے وجود کو نہیں مانتا تھا۔ اسی لیے وہ قانون کی حمایت سے محروم سمجھی جاتی تھیں۔ جس کا نتیجہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ۱۸۶۷ء میں ہوا کہ اگر کسی سبھا کی رقم اس کا خزانچی کھا جاتا تو سبھا کی دادرسی نہ ہوتی تھی۔ تیسرا قانون جو صنعتی جھگڑوں میں فوجداری جرموں سے تعلق رکھتا تھا اس نے یہ اہم اصول قرار دیا کہ مزدوروں کی جماعت سے کوئی فعل سرزد ہونے کی صورت میں اس وقت تک جرم نہیں قرار پا سکتا جب تک کہ وہ کسی فرد سے سرزد ہونے کی صورت میں جرم نہ ہو۔ لیکن ایک صورت ایسی تھی جس میں مزدور کو معمولی شہری کے مقابلے میں کم آزادی حاصل تھی۔ چنانچہ مزدور کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ کارخانے کی عمارت یا اپنے ہم پیشہ لوگوں کے مکانوں کے آس پاس اس غرض سے چکر لگائے کہ ان کو کسی سبھا میں شریک کرنے ہڑتال میں حصہ لینے کی ترغیب دے یا ان پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کی پہرہ بندی کو، خواہ کتنی ہی پرامن کیوں نہ ہو، بے جا دخل دہی یا رکاوٹ کی ایک شکل سمجھا جاتا تھا جو ۱۸۲۵ء کے قانون کی رو سے غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔

قوانین کی اصلاح نے اپنی آخری شکل ابھی اختیار نہیں کی تھی کہ

انیسویں صدی کے ساتویں دہے کی عام تجارتی کساد بازاری کی مزدور سبھاؤں پر ضرب پڑی۔ بیکاری اور اجرت کی کمی نے مزدور سبھاؤں کے خزانے کو بہت جلد خالی کرادیا اور جب ارکان نے اس خرابی کے روکنے میں اپنے نظام کو ناکام پایا تو ساری تنظیم کے بارے میں ان کی عقیدت ڈانواں ڈول ہوگئی۔ لیکن جونہی تجارت نئے سرے سے پھلنے پھولنے لگی تو یہ دیکھا گیا کہ نہ صرف پرانی سبھائیں کافی مضبوط بنیاد پر قائم اور آڑے وقت کے مقابلے کے لیے تیس ہوگئیں بلکہ مزدوروں کے غیر منظم طبقے میں بھی اپنے بچاؤ کے لیے لڑنے بھڑنے کا جوش پیدا ہوگیا۔ غیر ماہر مزدوروں اور گودیوں اور دوسری جگہ کام کرنے والے ہنگامی مزدوروں نے ماہر مزدوروں اور ہنر جاننے والے کاریگروں کی پھلتی پھولتی سبھاؤں کو ان کی تنگ دلی خود غرضی اور بزدلانہ بے حسی پر برا بھلا کہا اور مزدوروں کے پورے طبقے کے لیے جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ ایسا کرنے میں ان کا فائدہ ہی فائدہ تھا اور نقصان کچھ بھی نہ تھا۔ ایک بار ایسا معلوم ہوا کہ ۱۸۳۴ء کا انقلابی زمانہ پلٹ آیا تھا۔ پامال طبقہ جابر آجروں کے خلاف شور مچانے لگا اور تمام مزدوروں کو ان کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف متحد ہو جانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۹ء میں گودیوں کے مزدوروں نے بڑے پیمانے پر ہڑتال کردی۔ اس کو چلانے کے لیے جو وقتی انتظام کیا گیا تھا اس میں نیا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ان سبھاؤں کی پونجی کم اور ان میں جھگڑالوپن زیادہ تھا۔ وہ ایک ایسا فوجی دستہ معلوم ہوتی تھیں جس نے فتح کرنے کی ٹھان لی ہو۔

اسی زمانے میں ایک اور جماعت نئے اصول پر سماج کی کایا پلٹ اور پوری اصلاح کی تجویزیں بڑی محنت سے مرتب کر رہی تھی جیسا کہ اس سے پہلے اوون نے کیا تھا۔ یوں تو انھیں عام طور سے "اشتراکی" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں مختلف مکتب خیال کے لوگ

تسائل تھے۔ چنانچہ چند تو کارل مارکس کے مسلک کا پرچار کر رہے تھے
اور طبقہ واری جنگ کو ضروری بتلا رہے تھے بعض مثلاً ولیم ماریکس
اس زمانے کی زندگی کے بھونڈے پن اور اس کی مادیت پرستی سے
نفرت ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ فیبین گروہ عوام کو اشتراکی
اصول کی تدریجی طریقے پر تعلیم دینے کی حمایت کر رہا تھا۔ اشتراکی تصور
میں (جس کو ابھی تک شکل ہی اسے حکمت عملی کہا جا سکتا تھا) ایسی قوت
پائی گئی جس سے نہ صرف پرانی بے حس مزدور سبھاؤں کو جو آجروں
سے آہستہ آہستہ کچھ رعایتیں حاصل کرنے کی دھن میں تھیں بلکہ نئی
جوشیلی سبھاؤں کو بھی جو صنعتی آزادی کے لیے ہڑتال کا وار کرنے پر
تلی ہوئی تھیں ایک ہی "مزدور تحریک" کی شکل میں متحد کیا جا سکتا تھا۔
غرض سماج کو کمال کے درجے تک پہنچانے کے خاص مقصد پر سب کی
نظریں یکساں جمی ہوئی تھیں۔ البتہ کچھ اس مقصد کو دوسروں سے زیادہ
جلدی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے اور یہ بات نہایت اہم
تھی کہ اشتراکی جو اس پالیسی کے بانی تھے بڑی حد تک باضابطہ قانونی
طریقوں سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور
سبھاؤں کی تاریخ کے اس آخری دور میں، انیسویں صدی کے تیسرے
اور ساتویں دہے کی خصوصیتیں ایک جگہ ہوگئی تھیں اور "گرانڈ نیشنل"
(قومی مزدور مہاسبھا) کے بنیادی اصول اور جوش عمل اور "جنتا" (مشاورتی
مجلس) کے سیاسی مقصدوں اور طریقۂ کار میں تال میل پیدا ہوگیا تھا۔
ایک طرف "جنتا" کا نظام العمل چند قانونی اصلاحوں تک محدود تھا
تو دوسری طرف عمالی جماعت (جو اس میل جول کی پیداوار تھی) کی
پالیسی حکومت کے تمام شعبوں کو گھیرے اور مانے ہوئے سیاسی اصولوں
کی نظر ثانی کا مطالبہ کر رہی تھی۔

۴۲۷

مزدور سبھاؤں کا زور، صنعت اور سیاسیات دونوں میں بڑھ جانے
سے مزدور سبھاؤں کو اور دو مرتبہ قانون سے لڑنا پڑا۔ جب سبھاؤں کی

پونجی کافی بڑھ گئی تو بعض آجروں کو اس پونجی سے اپنے اس گھاٹے کی تلافی کی سوجھی جو ہڑتالوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ فنی اعتبار سے اس میں شبہہ تھا کہ قانون اس دعوے کو مان لے گا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک آزمائشی صورت پیش آئی جب کہ ٹاف ویل ریلوے کے مزدوروں نے ہڑتال کردی جس کے دوران میں بعض سبھائی عہدہ دار ناجائز ناکہ بندی کے مجرم ثابت ہوئے۔ چنانچہ ریلوے کمپنی نے مزدور سبھا کے خلاف دعویٰ کرکے مقدمہ جیت لیا اور ہرجانے کے طور پر ۲۳ ہزار پونڈ وصول کیے۔ اس طرح مزدور سبھاؤں کے قانونی حقوق اور ذمہ داریوں کا سارا مسئلہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کئی سال کی بحث اور تکرار کے بعد قانون کی نظرثانی اور ترمیم کرکے سنہ ۱۹۰۶ء کے صنعتی جھگڑوں کے قانون کی شکل دی گئی۔ یہ نیا قانون مزدور سبھاؤں کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس میں واضح کردیا گیا تھا کہ کوئی مزدور سبھا صرف اس بنیاد پر ہرجانے کی ادائی کی ذمہ دار نہ ہوگی کہ ہڑتال میں آجروں کو نقصان پہنچانے کی سازش کا امکان تھا۔ قانون کی متعلقہ دفعہ بہت عام لفظوں میں مرتب کی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا اطلاق دونوں طبقوں پر ہوتا تھا چاہے وہ آجر ہوں یا مزدور۔ سچ پوچھو تو اس میں یہ مان لیا گیا تھا کہ صنعتی جھگڑے ہمارے مسابقتی معاشی نظام کی خصوصیت ہیں جس میں ہر ایک اپنے حریف کو اکثر کافی نقصان پہنچانے کے لیے توڑ جوڑ کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس قانون نے اس جرم پر بحث کی جو ٹاف ویل کے مقدمے کا باعث تھا اور ناکہ بندی کو اس شرط پر جائز قرار دیا کہ وہ پُر امن ہو۔ یہی نہیں بلکہ قانون نے یہ بھی صراحت کردی کہ مزدور سبھا کے خلاف کسی ایسے فعل کی بنا پر ہرجانے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا جس کے مرتکب اس کے کارکن ہوں۔ اس قانونی دفعہ کی رو سے مزدور سبھاؤں کو خاص حق کے طور پر ایک غیر ذمہ دارانہ حیثیت حاصل ہوگئی جس کی بنا پر اس قانون پر ناانصافی کا الزام

۳۲۸

لگایا گیا۔ دوسری طرف اس کو بھی بے انصافی کہا جا سکتا ہے کہ کسی بڑی
قومی سبھا کی پونجی کو جس کے ارکان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہو
کسی مقامی شاخ کے عہدہ دار کے رحم اور کرم پر چھوڑ دیا جائے جسکے
بے احتیاطی سے کام کرنے کا امکان ہو۔ ۱۹۲۷ء سے "صنعتی جھگڑوں
اور مزدور سبھاؤں" کے قانون نے سبھاؤں کی حیثیت کی خاص کر
ہڑتالوں اور سیاسی دوڑ دھوپ کے تعلق سے مزید وضاحت کر دی۔
۱۹۰۸ء میں دوسری کھینچا تانی شروع ہوئی جب کہ ریلوے
کے ایک کارکن آسبورن نے اپنی سبھا کو پارلیمنٹ کے انتخاب کے سلسلے
میں ایک عمالی امیدوار کی حمایت میں سبھا کا پیسہ خرچ کرنے سے
روکنے کے لیے عدالت میں رجوع ہو کر مقدمہ جیت لیا۔ اس فیصلے
سے عمالی جماعت نے منہ کی کھائی اور مزدور سبھاؤں کی سیاسی سرگرمیاں
ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اس کے بعد پھر ایک لانبی بحث چھڑی جو صرف ۱۹۱۳ء
کے مزدور سبھاؤں کے قانون کے منظور ہونے پر ختم ہوئی۔ اس
قانون کی رو سے مزدور سبھا کو مجاز کیا گیا کہ اگر اس کے ارکان کی
اکثریت چاہے تو خصوصی سیاسی غرضوں کے لیے ایک رقم اس شرط سے
خاص کر سکتی تھی کہ اس رقم میں چندہ دینے سے انکار کرنے کی صورت
میں کوئی رکن اپنی رکنیت سے محروم نہ کیا جائے گا۔ یہ ضمنی شرط ثابت
۳۲۹
کرتی ہے کہ مزدور سبھاؤں کی نظر میں سیاسی کارروائی کتنی اہمیت
رکھتی تھی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی صنعتی حیثیت میں
کس حد تک تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس جھگڑے میں مزدور سبھاؤں نے
اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کسی رکن کو اپنی سبھا کی سیاسی
پالیسی سے اتفاق نہ ہونے کی صورت میں اس سے الگ ہو جانے کا
حق حاصل تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں تھا کیونکہ اکثر صنعتوں میں تنظیم اتنی
ترقی کر چکی تھی اور سرکار نے اس کو اس حد تک مان لیا تھا کہ اگر
کسی مزدور کا تعلق کسی سبھا سے نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہوتی تھی

اور وہ غالباً کام پانے کے بھی قابل نہ ہوتا تھا۔ ایسا مزدور جو کسی سبھا کا رکن نہ ہو صنعتی دنیا میں قانون کے دھتکارے ہوئے سے کچھ ہی بہتر حیثیت رکھتا تھا۔ مزدور سبھائیں قومی معاشی نظام کا اتنا اہم جزو بن گئی تھیں کہ انھیں من مانی اور غیر ذمہ دارانہ کارروائی کرنے کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی تھی۔

مزدور سبھاؤں کو اپنے ابتدائی دور سے ترقی یافتہ حالت تک پہنچنے کے پُر آشوب زمانے میں ایسے کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا جن کا اثر ان کی ساخت اور ترکیب پر اب تک باقی ہے۔ اکثر مزدور سبھاؤں نے "میت سبھاؤں" (Friendly Societies) کے بھیس میں جنم لیا جن کی نوعیت ایک ایسے کلب کی سی تھی جو اپنے ارکان کی مالی مدد چندے کے اکٹھا کیے ہوئے سرمایے سے کرتی تھیں۔ مزدور سبھاؤں نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا اور یہ سبھائیں چندہ وصول کرکے بوڑھوں، بیماروں اور بیروزگاروں کی مالی مدد کرتی تھیں۔ انیسویں صدی کے تیسرے دہے میں برساتی مینڈکوں کی طرح پھیلنے والی مزدور سبھائیں اپنے پیشروؤں کے نقش قدم پر نہ چل سکیں۔ ان کے ارکان نہ تو چندہ دینے کی گنجائش نکالتے تھے اور نہ ایک انقلابی جماعت ہونے کی حیثیت سے ایک سماجی کلب کا طریقہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ٹوٹ جانے کے بعد کے وقفے میں اچھی اجرت پانے والے ماہر مزدوروں نے نئے سرے سے اپنی سبھائیں بنائیں اور سرمایہ فراہم کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ء میں ایک طاقت ور سبھا یعنی انجینیروں کی ملی جلی سبھا[1] قائم ہوئی جو امدادی کلب کی پوری خصوصیتیں رکھتی تھی اور نوعیت کے اعتبار سے ایک نمایاں اور خاص حیثیت کی مالک تھی۔ اس نت نئے نمونے کی پیروی بڑے پیمانے پر کی گئی۔ لیکن وہ زیادہ مالدار طبقوں تک ہی رہی

[1] Amalgamated Society of Engineers.

اور اس کی طاقت کا سبب اس کی کمزوری کا بھی سبب بن گیا۔ اس کے سرمایے نے ارکان پر اس کا اثر بڑھا دیا۔ کیونکہ ارکان اپنی سبھا سے اس وقت تک الگ نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ انھیں کچھ نہ کچھ مالی فائدہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ ساتھ ہی چونکہ سرمایے کی سلامتی کو جوکھم میں ڈالنے میں تامل تھا اس لیے سبھا صنعتی جھگڑوں میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ ان نئی وضع کی سبھاؤں کو دوسری خوش نصیب سبھائیں نفرت اور حسد کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ۱۸۷۲ء میں جوزف آرچ نے زرعی مزدوروں کو منظم کرنے کی دلیرانہ کوشش کی تو اس نے ان ہی سبھاؤں کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا اور امداد حاصل کی۔ ۱۸۸۹ء میں ٹام مین اور بن ٹلٹ نے گودیوں کی ہڑتال کی قیادت کی تو ان سبھاؤں کو حقارت سے دیکھا اور یہ الزام لگایا کہ وہ خالص حرفتی کلب تھیں، جو اپنے ذاتی نفع کی خاطر مزدور طبقے سے غداری کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے جو مخالفت پیدا کی اس کا اثر کچھ دنوں رہا۔ وہ سب سبھائیں جن کے ارکان چندے دے سکتے تھے معمول کے مطابق سرمایے کا انتظام کرتی رہیں اور بیماروں اور بیروزگاروں کی مالی امداد کی جاتی رہی۔

ابتدائی سبھائیں ایسے لوگوں کا جتھا تھیں جو ایک ہی پیشے اور ایک ہی ضلع میں کام کرتے تھے اور جب انھوں نے ترقی کر کے موجودہ زمانے کی بڑی قومی سبھاؤں کی شکل اختیار کر لی تو اس کی وجہ سے تنظیم کے کئی پیچیدہ مسئلے پیدا ہو گئے۔ ترقی کا فطری طریقہ یہ تھا کہ مقامی سبھا کا دائرہ ضلع سے باہر کے رقبے پر پھیلتا جائے جس میں اس پیشے کے وہ سب ارکان شامل ہو جائیں جن کی وہ نمائندگی کرتی تھی، یہاں تک کہ اس کی تنظیم کل قوم پر حاوی ہو جائے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ایک ایسی قومی حرفتی سبھا بن جاتی تھی جس میں ایک ہی پیشے کے سب لوگ شلاً انگلستان کے تمام ٹوپی بنانے والے یا لوہار ہوتے تھے۔ جوں جوں سبھا ترقی کرتی جاتی تھی وہ بہت آسانی سے ایسے لوگوں کو بھی شامل کر سکتی تھی

جو ان دوسرے پیشوں اور حرفوں میں کام کرتے تھے جو ابتدائی سبھا سے گہرا تعلق رکھتے تھے لیکن پوری طرح وابستہ نہ تھے۔ اس کی مثال کے طور پر انجینیروں کی مشترکہ قومی سبھا کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان حرفتی سبھاؤں میں ناگزیر طور سے یہ خواہش پیدا ہوتی گئی کہ ان دوسرے پیشوں کی سبھاؤں سے اتحاد کر کے جو ایک ہی مقررہ صنعت یا آجروں کے ایک ہی جتھے کے تحت کام کر رہے ہوں اپنی حیثیت کو طاقت ور بنائیں۔ چنانچہ حالیہ سالوں میں یہی رجحان بہت نمایاں رہا ہے۔ لیکن اس کے راستے میں کئی رکاوٹیں پیش آئیں۔ جب غیر ماہر مزدوروں نے آٹھویں دہے کے آخری حصے میں اپنی تنظیم شروع کی تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے یے ماہر مزدوروں کی کسی موجودہ حرفتی سبھا میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے بڑی بڑی بے میل سبھائیں بنائیں جن میں ایسے لوگ شامل تھے جو مختلف قسم کے پیشوں اور دھندوں میں کام کرتے تھے اور کسی خاص صنعت میں کام کرنے والے سب مزدوروں کو ایک بڑی سبھا میں اکٹھا کرنے سے پہلے ان دھندوں کو کئی حلقوں میں بانٹنا ضروری تھا۔ دستکاروں کی سبھاؤں پر بھی یہی بات صادق آسکتی تھی جن کا کام بہت بڑے صنعتی میدان پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح اہلکاروں کی سبھا کے ارکان کا تعلق کسی ایک صنعت سے نہیں تھا۔ اس لیے صنعتی سبھاؤں یا ایسی سبھاؤں کا تصور جس میں ایک ہی صنعت میں کام کرنے والے سب مزدور شامل ہوں صرف جزوی طور سے ہی عملی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایسی صورتیں پائی جاتی تھیں کہ ایک ہی کارخانے کے مختلف شعبوں میں کام والے مزدور مختلف کارخانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے خلاف ایک ہی سبھا کے ارکان ایسے کاروبار میں کام کرتے تھے جس کی مختلف شاخوں میں کوئی بات ملی جلی نہ تھی۔ اس بارے میں بڑے پیمانے پر کامیابی کی سب کی قریبی شکل ریلوں اور کارخانوں میں پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں برطانیہ عظمیٰ کے کان کنوں کا وفاق ۳۶ ہزار

۳۳۱

مزدوروں کی رکنیت سے شروع ہوا اور مقامی اور ذیلی گروہوں کو تیزی سے جذب کرتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۲۲ء میں اس کے ارکان کی تعداد بڑھ کر ۹ لاکھ ہوگئی اور وہ نہ صرف ایک مشترک فائنڈ کی نگرانی میں تھا بلکہ اس کی پالیسی بھی ملی جلی تھی۔ ریلوں کے مزدوروں کی تنظیم اس سے کم مکمل تھی کیونکہ ریلوے مزدوروں کی قومی سبھائیں جو ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی تھیں ریلوں کے محرر اور انجن چلانے والے شامل نہیں تھے۔

لیکن ان مختلف سبھاؤں کے درمیان ربط قائم کیے بغیر جو کوئی راست صنعتی تعلق نہیں رکھتی تھیں یہ سارا "انضمام" مزدوروں کی تحریک" پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے چھٹے دہے میں اس ضرورت کا کئی شہروں میں مقامی طور سے احساس کر کے مجالس مزدوران[1] کے قیام سے اسے پورا کیا گیا۔ ان سب سبھاؤں کے نمائندوں نے جن کی شاخیں شہروں میں تھیں مجلس قائم کرنے کے لیے جلسہ کیا تاکہ مزدوروں کے مسئلوں اور غرضوں پر غور کیا جائے۔ مجالس مزدوران کے اختیارات محدود تھے، لیکن مزدور سبھاؤں کی شاخوں کے کاروبار میں اپنے وسیع تجربے سے مدد دے سکتے اور مقامی حکومتوں پر تھوڑا بہت اثر ڈال سکتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں مانچسٹر کے مزدوروں کی مجلس نے تمام مزدور سبھاؤں کے نام مراسلہ جاری کر کے ایک عام کانفرنس طلب کی جو سالانہ کانفرنسوں کے سلسلے کی پہلی تھی، تاکہ اس میں ان مسئلوں پر بحث کی جائے جو پارلیمنٹ میں قانون بنانے کے لیے پیش ہونے والے تھے۔ چنانچہ کانفرنس ہوئی اور طے پایا کہ اس کا دوسرا اجلاس برمنگھم میں کیا جائے لیکن اس اجلاس میں لندن کی مزدور سبھاؤں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ بعد میں ان کے اعتراض اور شبہے دور کر دیے گئے۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء کی لندن کانفرنس پہلی کانفرنس تھی جو اس تحریک کی پوری طرح نمائندہ تھی۔ اس تاریخ سے

۲۳۲

[1] Trades Councils.

بعد سے مزدور سبھا کانگریس ہر سال باقاعدہ اجلاس کر رہی ہے۔
گو مزدوروں کے ایسے نمائندہ جلسے میں ان سب معاملوں پر بحث کرنے کی کافی گنجائش تھی جو ہر کارخانے کے آجروں اور مزدوروں کے درمیان بات چیت کا مشترک موضوع تھے، پھر بھی شروع سے اس کانگریس کا اصل مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ پر قانون سازی کا کوئی منصوبہ بنانے کے لیے دباؤ ڈالا جائے۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس کے اپنے نمائندے دارالعوام میں ہوں۔ یوں تو سنہ ۱۸۶۹ء کے بعد سے ایسی انجمنیں قائم ہوگئی تھیں جن کا مقصد پارلیمنٹ میں مزدوروں کے چناؤ میں مدد دینا تھا۔ لیکن وہ کوئی نئی جماعت بنانا یا نئی پالیسی پر عمل کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ چاہے ان کے امیدوار ریڈیکل کی حیثیت ہی سے پارلیمنٹ میں بیٹھیں لیکن مزدوروں کی ترجمانی کے قابل ہوں اور اسطرح پارلیمنٹ کی صرف خاص طبقوں کی سرپرستی کی پالیسی کو بے اثر بنائیں۔ اشتراکیت نے ایک نئی سیاسی پالیسی پیش کی جس سے پرانی جماعتوں کو اختلاف تھا۔ اور سنہ ۱۸۹۳ء میں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی (آزاد مزدور جماعت) اس لیے قائم ہوئی کہ وہ ایسے امیدوار کھڑے کرے جو دوسری جماعتوں سے آزاد ہوں اور اشتراکی منصوبے کے موافق کام کریں۔ لیکن سنہ ۱۸۹۹ء تک اس منصوبے کی حمایت کے لیے مزدور سبھا کانگریس کو آمادہ نہ کیا جا سکا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں مزدور سبھا کانگریس، آزاد مزدور جماعت اور اشتراکی جماعتوں کی قوت کو ایک جگہ کرنے کے لیے مزدوروں کی ایک نمائندہ کمیٹی بنائی گئی جس نے اس سال کے موسم خزاں کے عام انتخابوں میں اپنے پندرہ امیدوار کھڑے کیے۔ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء میں اس کمیٹی کے نامزد امیدواروں میں سے ۲۹ ارکان کے چناؤ سے جو کامیابی ہوئی اس کی خوشی میں اس انتخابی تنظیم نے خود کو "لیبر پارٹی" (مزدور جماعت) کے نام سے نئے سرے سے منظم کیا اور سنہ ۱۹۲۲ء کے انتخابوں میں ۱۴۲ نشستیں جیت کر مزدور جماعت پہلی مرتبہ دارالعوام کی سرکاری مخالف

۳۳۳

جماعت بن گئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں مزدور جماعت نے دس مہینے تک وزارتی عہدے سنبھالے۔

انیسویں صدی کی ایک اور مقبول عام پیداوار امداد باہمی کی انجمن ہے۔ باہمی امداد اس اصول پر مبنی ہے کہ اگر کوئی کام اچھی طرح کرانا مقصود ہو تو اسے اپنی ذات سے انجام دیا جائے۔ عام طور سے تو یہ اصول بالکل غلط ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں اس پر بے خوف عمل کیا جا سکتا ہے۔ جب کچھ لوگ مساوی شرطوں پر کوئی جماعت بنائیں اور کوئی کام جس کو انھوں نے اب تک معاوضہ ادا کر کے دوسروں سے کرائیں یا اپنے طور پر کرنے کا سمجھوتا کریں تو امداد باہمی کی انجمن قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ خیال کرتے ہیں کہ نفع جو پہلے دوسروں کو مل رہا تھا وہ پانے لگیں گے اور کام بھی اچھی طرح انجام پائے گا۔ اس تحریک کا بانی رویرٹ رون یہ چاہتا تھا کہ معاشی زندگی کے سارے نظام پر اس اصول کا اطلاق ہو۔ اس نے "مثالی جماعت" کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں اجرت اور نفع دونوں نہ تھے۔ تمام لوگ اپنی قابلیت کے موافق کام میں ہاتھ بٹائیں گے اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے پیداوار میں سے حصہ پائیں گے۔ اس کے پیرو ایسے وسیع خیال کے نہیں تھے۔ امداد باہمی کی انجمن میں جو خردہ فروشی کے ذخیرے مہیا کرنے کے لیے قائم ہوتی ہے حصہ داری ان ذخیروں کے مالک' خریدار اور منتظم ہوتے ہیں۔ اس طرح دکان دار کو جو نفع ملتا وہ خود لیتے ہیں۔ لیکن اس میں اجرت پر ایسے لوگوں سے کام لیا جاتا ہے جو اس کی رکنیت سے خارج ہوتے ہیں۔ کاروبار چلانے کا یہ طریقہ عام طور پر بہت کامیاب رہا ہے۔ باہمی امداد کے طریقے پر نہ صرف اشیا کی تیاری بلکہ تقسیم میں بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ کارخانے کے مالک ہوتے ہیں وہی اس کا انتظام بھی چلاتے ہیں اور اس طرح سرمایہ دار اور ناظم کی جیب میں جانے سے نفع کو بچا لیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اپنا مال عوام کے ہاتھ راست بیچتے اور امکانی

۳۳۴

طور پر زیادہ سے زیادہ نفع کماتے ہیں۔ باہمی امداد کے طریقے پر مال تیار کرنے کا طریقہ انگلستان میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ چاہے اشیا کی تیاری میں وہ کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں، پھر بھی مزدوروں نے کوٹھی کے کاروبار اور بکری کے انتظام کے اتنے کم تجربے سے کام شروع کیا کہ اس سے کاروبار کی پوری نگرانی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان سے اور دوسری بھی لغزشیں ہوئیں۔ مثلاً کبھی انھوں نے قرضہ لینے پر خود کو مجبور پایا اور اس طرح ان کوٹھی والوں کے پھندے میں پھنس گئے جو انھیں رقم قرض دیتے تھے۔ کبھی خود کو کاروبار کا مالک پاکر انھیں اپنے طور پر کام چھوڑنے اور دوسروں سے اجرت پر ہی کام لینے کی ترغیب ہوتی تھی۔ اس طرح وہ باہمی امداد کے بنیادی اصول ہی سے ہٹ جاتے تھے۔

صارفوں کی امداد باہمی کی انجمن کی کامیابی کا آغاز ۱۸۴۴ء میں ایک ذخیرہ گھر "روشڈیل پاونیرز" کے قیام سے ہوا۔ نفع یا نقصان کے بغیر مال بیچنا بہت ہی مشکل ہے۔ اگر کوئی ذخیرہ گھر اسی قیمت پر مال بیچے جس پر تھوک فروش سے اس نے خریدا تھا تو اپنا کاروبار چلانے کے لیے وہ کس طرح روپیہ فراہم کرے گا اور اس مال کا نقصان بھرنے کے لیے جن کی بکری نہ ہو سکے کون سی گنجائش نکالے گا۔ اگر وہ یہ حساب لگانے کی کوشش کرے کہ کاروباری خرچ کے کتنے حصے کا بار ہر شے پر ڈالا جائے تو اس کے آمد و خرچ میں کبھی توازن ہی نہیں پیدا ہوگا۔ دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو گھاٹا آئے یا نفع ملے جس کو تقسیم کرنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ روشڈیل ذخیرہ گھر اشیا کو رائج قیمتوں پر نقد بیچتا، انتظام کے مصارف ادا کرتا اور اس کے بعد جو کچھ بچتا اس کو ارکان میں ترتیب وار ان کی خریداریوں کی مناسبت سے تقسیم کرتا تھا۔ اس طرح حسابی پیچیدگیوں کے بغیر نفع مل جاتا تھا اور ذخیرہ گھر مستحکم بنیاد پر کاروبار چلاتا رہا۔ باہمی امداد کے ذخیرہ گھروں نے نہ صرف اپنے ارکان کو خردہ فروشوں کا نفع منتقل کرکے فائدہ پہنچایا بلکہ مزدوروں کے لیے جن میں مرد عورت

۳۴۵

دونوں تھے، کاروبار کے انتظام میں کچھ نہ کچھ تجربہ حاصل کرنے کا موقع نکالا۔ اپنی اشیاء کی نوعیت اور عمدگی کا بلند معیار قائم کیا گھر گرہستی کرنے والی بیویوں کو ترغیب دی کہ وہ کسی پاس کی دکان میں ادھار کھاتا کھولنے کی بجائے اپنی مالی گنجائش کے اندر ذخیرہ گھر سے نقد خریداری کریں اور ارکان کو جو رقمیں ادا کی جاتی تھیں ان کے ایک حصے کو روک کر اور ہر سہ ماہی پر اسے ان میں تقسیم کرکے ازخود پس انداز کرنے کا طریقہ نکالا۔ جب ذخیرہ گھروں کی تعداد بڑھ گئی تو انھوں نے آپس میں مل کر وفاق قائم کر لیا اور اپنی ساری اکائیوں کے لیے تھوک طریقے پر سامان خریدنے لگے۔ جہاں تک کہ شمالی ضلعوں کا تعلق تھا ۱۸۶۳ء میں پوری طرح کام ہو گیا۔ لیکن پورے انگلستان کے لیے باہمی امداد کی تھوک انجمن اس کے دس سال بعد قائم ہو سکی۔ شروع میں اس وفاق نے اپنے کاروبار کو اشیا کی تھوک خریدی اور باہمی امداد کے ذخیرہ گھروں میں ان کی تقسیم تک محدود رکھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ اشیا بھی تیار کرنے لگا۔ اس نے باہمی امداد کے اصول پر کارخانے نہیں کھولے کیونکہ ان میں نجی کارخانے کی طرح مزدوروں سے اجرت پر کام لیا جاتا تھا۔ ان کارخانوں کی حیثیت ایک وسیع کاروبار میں صرف شعبوں کی سی تھی جن کے مالک اور منتظم صارف تھے اور جو اشیا تیار اور تقسیم کرتے تھے۔

اگر ہم صنعت کے آجروں میں گروہ بندی کی تلاش کریں تو ہمیں فوراً ایسی سبھاؤں کے پتے مل جائیں گے جو مزدور سبھاؤں کے مقابلے میں قائم تھیں۔ چنانچہ ان کی تاریخ ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ آدم اسمتھ کا کہنا تھا کہ "ہر پیشے کے استادوں میں ہمیشہ اور ہر جگہ اصلی شرح سے اوپر اجرت نہ بڑھانے کے بارے میں خاموش دائمی اور ایک سا یکتا قائم تھا۔" چنانچہ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں ایسے خاموش راضی نامے منتقل سبھاؤں کی شکل اختیار کر رہے تھے اور مزدور سبھاؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ ترقی کرتے جا رہے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں

سوت کاتنے والوں کے پیشے کے استادوں نے اپنی ایک سبھا بنائی جس کی دوسرے ضلعوں میں بھی پیروی کی گئی۔ رفتہ رفتہ ان مقامی جتھوں نے آپس کے رشک اور حسد پر قابو پا لیا اور سب مل کر بڑی بڑی اکائیوں میں ضم ہوتے گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء تک سوتی صنعت میں استادوں کی چار بڑی انجمنیں قائم ہو گئیں جو تمام پیشے پر حاوی تھیں۔ ایسا ہی تدریجی عمل سب بڑی صنعتوں میں عام طور پر جاری رہا اور آخری نتیجہ جس کی طرف وہ لے جاتا ہے اس وقت دیکھا جا سکتا ہے جب کہ کان کنوں کے وفاق (Mining Federation) اور کان کنوں کی انجمن (Mining Association) نے آپس کی بات چیت سے ان سب معاملوں کا تصفیہ کر لیا جو برطانیہ کی ساری کان کنی کی صنعت پر اثر ڈالتے تھے۔ لیکن ان جتھوں کی موجودگی کا سرسری ذکر کرنا گویا مسئلے پر محض سطحی نظر ڈالنے کے برابر ہے۔ ان جتھوں کو قائم کرنے والے لوگوں کی نگرانی میں جو کاروباری اکائیاں ہیں وہ خود ملے جلے سرمایے کی بڑی انجمنیں ہیں اور ان اکائیوں میں سے اکثر میں گہری تجارتی جماعت بندی موجود ہے جو ان آجر سبھاؤں سے پوری یا قریب قریب مطابقت رکھتی ہے جن کا ذکر ہم کرتے آئے ہیں۔

جب ہم اس زمانے کے خصوصی کاروبار کا دھیان کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں "فلاں فلاں کمپنی محدود" کا تصور قائم ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۰۵ء میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں معمولی کاروبار کی شکل فنی حیثیت سے ساجھے یا شراکت کی تھی نہ کہ کمپنی کی۔ کیونکہ "ساؤتھ سی ببل" کے پر آشوب زمانے کے بعد سے ملے جلے سرمایے کی کمپنیاں صرف پارلیمنٹ کے قانون یا بادشاہ کے منشور کی رو سے قائم ہو سکتی تھیں۔ اور "محدود" (Limited) کی چھوٹی مگر اہم علامت جس کے معنی "محدود ذمہ داری" تھے، ۱۸۵۵ء تک استعمال نہیں ہوئی۔ اگر ذمہ داری غیر محدود ہو تو ہر شریک تمام قرضوں کی حد تک ذمہ دار ہوتا تھا جن کی ادائی کے لیے اس کی ساری جائداد بیچی جا سکتی تھی۔ محدود کمپنی میں

سرمایہ لگانے والا صرف اپنے حصے کی قیمت کی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اس کا نقصان صرف اس کے لگائے ہوئے سرمایہ تک محدود رہ سکتا ہے۔ بڑھتے ہوئے کاروبار سے شراکت کا کوئی تال میل نہیں ہے کیونکہ اس میں حصے جاری کرکے جن کو صرافے میں خریدا اور بیچا جا سکے سرمایہ نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور اگر شراکت' ساجھے والوں میں اضافہ کرکے اپنے سرمایے کو بڑھا بھی لے تو انتظام میں بہت پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ سب ساجھے والوں کو برابر کا اختیار ہوتا ہے۔

۳۴۷ سنہ ۱۸۴۴ء اور ۱۸۵۵ء میں دو قانون منظور کیے گئے جن سے کاروباری اکائیوں کی ترقی کے راستے سے ان رکاوٹوں کو دور کیا گیا۔ پہلے قانون نے اس کا مجاز گردانا کہ رجسٹری کے سیدھے سادے عمل سے کمپنی قائم کی جائے اور یہ بھی لازم کیا گیا کہ اس کا دستور چند شرطوں کا پابند ہو۔ دوسرے قانون نے کسی کمپنی کو بھی جو اس کی درخواست کرے محدود ذمہ داری کا حق اس شرط پر دیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ "محدود" (Ltd) شریک کرے۔ اس طرح محدود ذمہ داری کے ساتھ مشترک سرمایہ کمپنی بڑے کاروبار کے انتظام کی عام شکل بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی دفعہ اب کسی معمولی آدمی کی بس انداز کی ہوئی رقم جو شراکت کے جوکھوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا اسی آسانی سے حاصل کی جا سکتی تھی جیسا کہ کارخانے کی مشین کے لیے ایندھن۔ ہر ایک کو سرمایہ لگانے کا معقول اور محفوظ ذریعہ فراہم کیا گیا جن میں وہ اپنے روپئے پیسے کا پھیلاؤ جانتا اور اپنے تمسکوں کو اپنی مرضی سے صرافے میں بیچ سکتا تھا۔ ملے جلے سرمایے کی انجمن بہت محفوظ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے انفرادی ارکان کی قسمتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چونکہ ناظموں کے ذریعے سے اس کا انتظام ہوتا ہے جن کا چناؤ خود حصہ دار کرتے ہیں اس لیے وہ اپنے حصہ داروں کی تعداد اور سرمایے کی مقدار اپنے نظم اور نسق کو الجھائے بغیر بڑھا سکتی ہے اور قانون کے مطابق منظم ہونے کی وجہ سے

قانون کی حفاظت میں ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ برے وقت قانونی چارہ جوئی
کر سکتی ہے۔ اس طرح بڑے کاروبار کے مالی انتظام نے آخر کار تمثیلی
شکل اختیار کر لی۔

اس کے ساتھ کاروباری اکائی نے جو ترقی کی وہ ہمیشہ ایک ہی
ڈھنگ پر جاری نہیں رہی۔ توسیع کا مقصد یہ تھا کہ پیدائش میں زیادہ
کفایت اور زیادہ کارکردگی حاصل کی جائے اور آدم اسمتھ نے بہت
پہلے ہی یہ بتلا دیا تھا کہ ان مقصدوں کے حاصل کرنے کا سب سے
بڑا ذریعہ تقسیم عمل ہے۔ گو صنعتی ترقی کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ دستکار
ایک ہی قسم کے کام کو خاص طور سے انجام دیں۔ لیکن اس سے یہ لازمی
نتیجہ نہیں نکلتا کہ مختلف کام مختلف انتظام کے تحت یا مختلف کارخانوں
میں انجام دیے جاتے تھے۔ جوں ہی سوتی صنعتوں میں کلوں کا رواج
عام ہوا سوت کاتنے اور بننے کی صنعتیں نہ صرف مختلف کارخانوں
بلکہ ضلعوں میں بھی پھیل گئیں۔ چنانچہ سوت کاتنے کی صنعت کا مرکز
جنوبی لنکاشائر اور کپڑا بننے کا صنعتی مرکز شمالی لنکاشائر بن گیا۔
اس کے خلاف اونی صنعت کے کاتنے اور بننے کا کام عام طور پر ایک ہی
فرم کی نگرانی اور ایک ہی کارخانے میں انجام پاتا تھا لیکن ہر فرم ایک خاص قسم کے
کپڑے کی تیاری کے لیے خاص کر دی گئی تھی۔ جب ترقی و توسیع کا عظیم دور
شروع ہوا تو فرم کے لیے اپنے کاروبار کو بڑھانے کا آسان طریقہ
یہ تھا کہ ملک کے چپے چپے میں اپنی شاخیں پھیلا کے اپنے حریفوں کو
میدان سے ہٹا دے اور کارخانے میں کوئی نیا شعبہ کھولے بغیر اپنی
مقررہ تجارت پر زیادہ سے زیادہ قابو پاتی چلی جائے۔ اس طریقے کو
عام طور سے "افقی" توسیع سے موسوم کیا جاتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر
کسی بڑی کمپنی کے ہاتھوں میں اجارہ داری آجاتی ہے۔ چنانچہ سوتی
صنعت کے ایک شعبے یعنی سلائی کے دھاگے کی صنعت میں ایسا ہی
ہوا۔ جے اینڈ پی کوٹس کمپنی جو ۱۸۲۶ء میں قائم ہوئی تھی ۱۸۹۶ء تک

اتنی مالدار ہو گئی کہ اپنے بڑے رقیبوں کا کاروبار خریدنے اور تجارت کو اپنے قابو میں لینے کے قابل بن گئی۔ کچھ زمانہ بعد اس نے دوسرے برطانوی کارخانے سے جو اس کے بعد سب سے بڑا تھا اور اسی طرح کے ایک اور امریکی کارخانے سے سمجھوتا کر لیا اور اس طرح دنیا کی ساری تجارت ایک ہی نگرانی اور انتظام کے تحت آگئی۔ افقی اتحاد بنکوں میں اس حد تک قائم ہو گیا کہ انگلستان کی قریب قریب تمام بنک کاری پانچ بڑی کمپنیوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اسی طرح صحافتی دنیا میں اتحاد اور انضمامی نتیجے کے طور پر چند لوگوں کو رائے عامہ کو قابو میں رکھنے کی جو بڑی اور خطرناک قوت حاصل ہوئی وہ بہت مشہور ہے۔ اس قسم کے اتحاد کا آخری مقصد یہ ہوتا ہے کہ حریفوں کی بڑی سے بڑی تعداد کا خاتمہ کیا جائے اور جو کچھ بچے رہیں ان سے اپنے موافق شرطیں طے کی جائیں۔

بعض صورتوں میں کاروباری وسعت اور ترقی نے ایک جداگانہ شکل اختیار کی۔ مثلاً کارخانوں نے اپنے اصل کاروبار میں نئے شعبے اس لیے کھولے کہ ان کاموں کو پورا کیا جائے جو اس کے اصل اور خصوصی کاروبار سے پہلے اور بعد کی منزل میں طے پاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی شے کو پورا اور بکری کے قابل بنانے کے لیے ایک کے بعد ایک جتنی منزلیں طے کرنی پڑتی تھیں وہ سب ایک ہی نگرانی کے تحت آگئیں۔ اس کو "عمودی" توسیع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس قسم کے کاروبار کی بڑے پیمانے پر ترقی حالیہ زمانے کی خصوصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نئے شعبے عام طور سے نئے کارخانے نہیں ہوتے تھے بلکہ موجودہ کارخانے ہی میں انھیں ضم کر لیا جاتا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثالیں لوہے اور فولاد کی تجارت میں ملتی ہیں جس میں ایسی کمپنیاں موجود ہیں جو کوئلے اور لوہے کی کانوں کی مالک ہیں، لوہے کا سامان تیار کرنے اور فولاد بنانے کے لیے کوئلہ استعمال کرتی ہیں، فولاد سے

۳۳۹

جہاز بنائیں، جہازوں کے انجن تیار کریں اور دوسرے ملکوں کے بازاروں میں اپنا کوئلہ اور دوسری پیداوار پہنچانے کے لیے جہاز چلانے کا انتظام کرتی ہیں۔ اس قسم کے کاروبار کے مختلف شعبوں میں مختلف کام خصوصی ماہروں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں اور ان مختلف اکائیوں کا انتظام انفرادی طور پر اتنا آزاد ہوتا ہے کہ وہ جداگانہ کارخانے معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ سب پالیسی کے منظم اقتدار کے تحت ایک ہی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔

مذکورۂ بالا بڑی متحدہ کمپنیاں کسی بڑی کاروباری جتھابندی (Ring or Trust) کے قائم کیے بغیر بھی ایک دوسرے سے کاروباری تعلق پیدا کر لیتی ہیں چنانچہ ممکن ہے کہ کوئلے کی کمپنی اپنا روپیہ لوہے اور فولاد کے کارخانے یا جہاز سازی اور تیل کے کاروبار میں لگائے اور اس طرح اپنے روپے پیسے کو وسیع میدان پر پھیلا کر اپنا سارا سرمایہ ایک ہی کاروبار میں لگا دینے کے خطرے سے اپنے آپ کو بچائے۔ عام طور پر ایک کمپنی دوسری کمپنی کے کافی حصے اور اس لحاظ سے رائے خرید لیتی ہے کہ اس کی پالیسی پر قابو پا سکے یا کوئی ایک ہی کمپنیوں میں لوگوں کا ایک ہی مقررہ گروہ ناظموں کے طور پر کام کرتا ہے جس کی وجہ سے ان سب کا آپس میں میل جول ہو جاتا ہے۔

لیکن ۱۹۱۸ء سے یہ میلان رونما ہوا کہ ایک ہی قسم کا کام کرنے والی تمام کمپنیاں ٹرسٹ کی شکل میں اتحاد کر کے ایسے کاروباری معاہدے کریں جو نہ صرف ان کے اور مزدوروں کے باہمی تعلقات پر حاوی ہوں بلکہ خود ان کی کاروباری پالیسی معین کریں۔ سمجھوتے کے ذریعے سے قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں اور پیداوار پر نگرانی رہتی ہے۔ کبھی تو تمام کمپنیاں اپنی پیداوار بیچنے کا انتظام ملی جلی ایجنسی کے ذریعے سے کرتی ہیں۔ جہاز رانی کی تجارت میں جتھے یا حلقے قائم کر لیے گئے ہیں جو نقل و حمل کے کرائے کی نگرانی کرتے ہیں اور اس وعدے کے ذریعے سے اپنے

۴۶۰

اجارے کا بچاؤ کرتے ہیں کہ کسی کمپنی کو جو اس جتھے کے جہاز کے سوا کوئی دوسرا جہاز استعمال نہ کرے۔ ۱ فیصد رقم واپس کردی جائے گی یہ معاہدے کبھی کبھی ملک کی حدوں کے باہر کے علاقوں پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے قومی ٹرسٹ دنیا کے بازاروں کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً برٹش امپیریل ٹوباکو کمپنی اور امریکن ٹوباکو ٹرسٹ کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے یہ قرار پایا کہ ہر ایک دوسرے کے اجارے کی اس کے گھریلو بازار میں عزت کرے گا اور سمجھوتے کے ذریعے سے انھوں نے ایک ملی جلی نئی کمپنی باقی دنیا میں کاروبار چلانے کے لیے بنالی۔ اس تحریک کو اس وجہ سے بھی قوت حاصل ہوئی کہ جرمنی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی صنعتیں تیزی سے ترقی کر رہی تھیں اور "ٹرسٹ" کے طریق پر انگلستان کے مقابلے میں بہت پہلے سے اور زیادہ تکمیلی طور سے کام کر رہی تھیں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے تنظیم ضروری تھی۔ جنگ عظیم نے اس تحریک کی مزید ہمت افزائی کی جس کے نتیجے کے طور پر ملک کی قریب قریب سب بڑی صنعتوں میں اس وقت کسی نہ کسی شکل میں اتحاد اور سمجھوتا پایا جاتا ہے۔ عام اثر کو ظاہر کرنے کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں سنہ ۱۸۲۰ء میں حکومت کے دخل نہ دینے کی پالیسی سے آزاد پیش قدمی ممکن ہوئی وہاں سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ آیا آزاد پیش قدمی کو بحال کرنے کے لیے حکومت کو دخل دینا چاہیے۔

انیسویں صدی کے نصف اول حصے میں بھی ایسی مثالیں موجود تھیں جن میں حکومت نے معاہدے اور پیش قدمی کی آزادی کو برقرار رکھنے کی غرض سے دخل دینے پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ مزدور سبھاؤں کے خلاف تجارتی اتحاد کے قوانین کو حق بجانب ثابت کرنے والی ایک دلیل یہ تھی کہ ان قوانین نے مزدوروں کی آزادی اور آجر اور مزدور کے باہمی معاہدے کی آزادی کو چھیننے سے مزدوروں کو روک دیا

ریلوں کی تاریخ ایک اور مثال مہیا کرتی ہے۔ حکومت کو اجارے سے یا
اس کے مثل کسی چیز سے ایسی بدگمانی ہوگئی تھی کہ جب اسے یہ معلوم
ہوا کہ ریلوے کمپنیاں اپنی لائنوں پر نجی ٹرینیں چلانے کی عوام کو اجازت
نہیں دیتیں تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ چوتھے دہے کے حالات نے
حکومت کی پریشانیوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ اسی زمانے میں مختلف لائنوں
کو ایک ریلوے نظام کے تحت لانے اور راست سفر اور اشیا کی
راست نقل اور حمل کی سہولت بہم پہنچانے کی پہلی حقیقی کوشش کی گئی۔
چنانچہ سنہ ۱۸۴۲ء میں ریلوں کا ایک "حساب گھر" قائم کیا گیا تاکہ راست
آمد و رفت کی صورت میں جو ادا کیے جائیں ان میں ہر کمپنی کا حصہ
معین ہو سکے۔ اور سنہ ۱۸۴۴ء سے سنہ ۱۸۴۷ء تک چھوٹی کمپنیوں کو ضم کرنے
کے بارے میں کئی تجویزوں کو عملی جامہ پہنایا گیا جو بڑی حد تک جارج ہڈسن
کے مشورے سے ہوا جسے اس کی جوشیلی اور بیباک کوششوں کی بدولت
"ریلوں کا بادشاہ" کہا جانے لگا۔

حکومت نے پہلے ہی سے ریلوں پر کچھ نہ کچھ نگرانی رکھی تھی۔
چنانچہ ہر کمپنی کے لیے لازم تھا کہ کام شروع کرنے سے پہلے پارلیمنٹ
سے قانون منظور کرائے تاکہ اس کی رو سے زمین خریدنے، دریاؤں
پر پل بنانے، سڑکوں کو پار کرنے، تمسک جاری کرنے اور دوسرے
کام کرنے کے بارے میں ضروری اختیار حاصل ہوں۔ لائنیں کھلنے
سے پہلے سرکاری ناظر ان کو دیکھ بھال کر عوام کے لیے کسی جوکھم
نہ ہونے کا اطمینان کر لیا کرتے تھے۔ اس قسم کی نگرانی کو دوسرے
شعبوں تک وسیع کرنا آسان تھا۔ شروع میں حکومت نے صرف یہ
کوشش کی کہ اتحاد اور انضمام کی حوصلہ شکنی سے مختلف ریلوے
کمپنیوں اور ریلوے اور نہر کی کمپنیوں کے درمیان مقابلہ جاری رہے
مگر جب وہ سیلاب کو نہ روک سکی تو دوسری کارروائی یہ کی گئی کہ
قانون بنا کر ان عام سہولتوں کا یقین دلایا جو مقابلے سے حاصل

ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۴ء کے ایک قانون کی رو سے کمپنیوں کو مجبور
کیا گیا کہ وہ روزانہ "فی میل ایک پنس" کی شرح سے ایک سستی ٹرین
چلائیں جو ہر اسٹیشن پر ٹھیرے اور جس کی رفتار کا اوسط ۱۲ میل فی گھنٹہ
ہو۔ بعد میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے ریلوں اور نہروں
کے ناظموں کی ایک ایسی مجلس بنائی گئی کہ وہ عوام کے مفاد کی نگرانی
کرے اور خاصکر ریلوے کمپنیوں کو ایسی ترجیحی اور رعایتی شرحیں مقرر
کرنے سے روکے جو اپنے حریفوں کے مسافروں کو ان کی لائن سے
ہٹا کر اپنی لائن پر لانے کی ترغیب کے طور پر دیجائیں۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں
کرایے کی شرحوں کی ایک بڑی پوری فہرست تیار کر کے اس میں
ایک ایسی قانونی حد مقرر کر دی گئی جس سے کوئی کمپنی بڑھ نہیں سکتی تھی۔ ۴۴۳

حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں
ریلوں میں آپس کا مقابلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ شروع میں جو اتحاد قائم
ہوئے تھے ان کے نتیجے کے طور پر اب بھی کئی بڑی بڑی آزاد کمپنیاں
باقی تھیں جو لندن کو مرکز قرار دے کر اپنی اپنی لائینوں پر ریلیں چلاتی
تھیں جس کی وجہ سے اکثر مقاموں پر ان میں تصادم ہو جاتا تھا اور
آپس میں سخت تجارتی جنگ جاری رہتی تھی۔ صرف سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ
کہا جا سکتا تھا کہ ریلوے کمپنیوں میں مقابلے کا دور ختم ہوا۔ کیونکہ اس
سنہ سے پہلے تک تباہی لانے والی اس رقابت کو ختم کرانے کے لیے
بڑے پیمانے پر راضی نامے کیے جاتے رہے۔ جنگ عظیم کے زمانے
میں حکومت نے ریلوں کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کی بنا
پر اکثر لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اتنی دور تک قدم بڑھانے
کے بعد اس کو چاہیے کہ ریلوں کو پورے طور پر خرید لے اور ملکی ریلوں
کا ایک قومی نظام بنائے۔ لیکن دوسری مصلحتیں اس خیال پر غالب
آگئیں اور صلح کے بعد ہی سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ پھر بھی بڑی حد تک
اصلاح اور تنظیم عمل میں لائی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء کے قانون کی رو سے

برطانیہ عظمیٰ کی ریلیں چار بڑے حصوں میں تقسیم کی گئیں جن میں سے
ہر ایک کا کاروبار الگ تھا۔ کرایے کی نگرانی کے لیے ایک مرکزی
مجلس کرایہ بندی[1] اور مزدوروں کے جھگڑے چکانے کے لیے قومی اور
مرکزی اجرت کی مجلسیں[2] بنائی گئیں۔

جنگ کے زمانے کے سوا کسی اور دور میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ
حکومت نے ریلوں کی طرح کسی اور صنعت کی نگرانی اپنے ہاتھ میں
لی ہو۔ البتہ خاص صورتوں میں جہاں ملک والوں کا تحفظ خطرے میں
ہوتا تھا حکومت دخل دہی کا حق جتاتی اور اس کے موافق آزادی
سے عمل کرتی تھی۔ چنانچہ اس اصول کے لحاظ سے غیر خالص غذا
بیچنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی، شراب کی تجارت پر
بندشیں عائد کی گئیں، بے احتیاطی سے موٹر چلانے والوں کے لیے
سزائیں تجویز کی گئیں، اور مقامی عہدہ داروں کو مضر صحت مکانوں
کو ڈھا دینے کا اختیار دیدیا گیا۔ کارخانوں کے قوانین کا کل مجموعہ
ایک نقطۂ نظر سے اس اختیار کے استعمال کی ایک خاص مثال ہے۔
حکومت نے محض اس وجہ سے مداخلت کی کہ کارخانوں میں کام کے
لمبے گھنٹے اور کام کی شرطیں بعض مزدوروں کی صحت کے لیے نقصان دہ
تھیں۔ ان قوانین کی تاریخ بیان کی جا چکی ہے اور جیسا کہ یاد ہوگا
وہ اس اصول پر مبنی تھے کہ بالغ مردوں کو چھوڑ کر صرف عورتوں اور
بچوں کو تحفظ کا مستحق قرار دیا جائے۔ لیکن حقیقت میں چونکہ عورتیں اور
مرد مل جل کر کام کرتے تھے اس لیے مرد بھی ان قاعدوں اور ضابطوں
سے فائدہ اٹھاتے جو عورتوں کے لیے نافذ کیے جاتے تھے۔ ۱۸۶۴ء
کے بعد سے ایسے قوانین بنائے گئے جن سے نگرانی کو نئے کارخانوں سے

۳۴۳

لہ۔ Central Rates Tribunal.

لہ۔ National and Central Wages Boards

پرائیویٹ کارخانوں تک وسیع کیا گیا اور کئی ایک پُرخطر کاروبار اور دھندوں کو منظم کیا گیا۔ موخر الذکر صورتوں میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ مردوں کی بھی حفاظت کا اصول آخر کار مان لیا گیا۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں جب زمین کے زیرین طبقوں کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے پارلیمنٹ کے قانون کی رو سے آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کیا گیا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ حکومت نے بالغ مرد مزدوروں کے کام کے گھنٹوں کے راست تعین کی جراءت کی۔

مزدوروں کے معاوضے کے قوانین[1] کے ساتھ ایک نیا اہم اصول رو نما ہوا۔ ان قوانین میں پہلا قانون ۱۸۹۷ء میں منظور ہوا۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور کسی ضرر کا ہرجانہ اپنے آجر سے طلب کرنے کے قابل ہو گیا لیکن صرف اسی شرط سے کہ ضرر یا حادثہ کام کے دوران میں اور اس کام کی وجہ سے ہو نہ کہ خود مزدور کی دانستہ بے احتیاطی یا بدعنوانی سے۔ اب اسے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہی کہ یہ حادثہ یا ضرر اس کے آجر یا آجر کے کسی نوکر کی بے احتیاطی کا نتیجہ تھا۔ یہ قوانین "صنعتی بیماریوں" پر بھی حاوی تھے جن کا شکار ہونے کا مزدوروں کے لیے بعض صنعتوں میں خاص طور پر امکان تھا، مثلاً سیسے کا زہر چڑھ جانا اور جمرہ (Anthrax) کی بیماری لگ جانا۔ اگر معمار مچان سے نیچے گر پڑے یا بنک کے ملازم کو راستے میں کوئی حملہ کر کے گرا دے تو وہ ہرجانے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ قوانین کارخانہ جات نے جو کام شروع کیا تھا اس کو ان قوانین نے پورا کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ جب کوئی آجر مزدور سے کام لے تو اس کو اپنے مزدور کی خوشحالی کی پوری ذمہ داری اپنے سر لینی چاہیے۔ اس زمانے کے بعد سے جب کہ محنت کی خرید و فروخت، اشیا کی طرح ہوتی تھی اور آجر اپنے مزدوروں کی

۴۴۳

۱۔ Workmen's Compensation Acts.

قبول کی ہوئی اجرت ادا کر کے اپنے ذمے کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا تھا اب بہت ترقی ہو چکی تھی۔ اس فرض کو بھی دیانت داری سے ہر آجر سے انجام دلانے کے لیے قوانین بنانے کی ضرورت پڑتی تھی بعض دھندوں میں اجرت نقد نہیں بلکہ اشیا کی شکل میں یا کسی ایسی دکان کے نام لکھی ہوئی اعتباری تحریر کی شکل میں ادا کی جاتی تھی جس کا مالک خود آجر ہوتا تھا۔ اشیا کی حقیقی قیمت کے بارے میں ناراضی کی کافی گنجائش ہوتی تھی اور مزدوروں کو ہمیشہ دھوکا دیا جاتا تھا۔ اگر حقیقت میں انھیں ان کی اجرت کے برابر اشیا وصول بھی ہو جائیں تو بھی نقد کی ضرورت انھیں اپنا مال نقصان سے بیچ ڈالنے پر مجبور کرتی تھی جنس کی شکل میں اجرت دینے کا طریقہ قوانین اجرت بہ شکل جنس[1] بابتہ سنہ ۱۸۳۱ء، سنہ ۱۸۸۷ء، سنہ ۱۸۹۶ء کی رو سے ممنوع قرار پایا۔ بدقسمتی سے قانون کو بہت پیچیدہ بنانا پڑا کیونکہ جنس کی شکل میں اجرت ادا کرنے کی بعض صورتیں نہ صرف نقصان سے خالی بلکہ حقیقت میں مزدوروں کے لیے فائدہ مند تھیں۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو کوئلہ زرعی مزدوروں کو ترکاریاں، دستکاروں کو آلات اور مزدوروں کے اکثر دوسرے طبقوں کو بلا کرایہ جھونپڑے اجرت کے طور پر دیے جاتے تھے جو ان کے لیے بڑی نعمت تھے۔ لیکن ان سب میں خاصکر آخری طریق کے بیجا طور پر استعمال کیے جانے کا امکان تھا۔ کیونکہ اپنے جھونپڑے کی درستی کا مطالبہ کرتے یا اگر اس کا زمیندار اس کا آجر بھی ہو تو لگان طے کرنے میں مزدور کی حیثیت بہت ہی کمزور ہوتی تھی۔

یہاں تک ہم نے صرف ان صورتوں کو بیان کیا جن میں حکومت، شہری کو جسمانی ضرر یا بہ شکل جنس اجرت ادا ہونے کی صورت میں

[1] Truck Acts

ارادی دھوکے سے بچانے کے لیے دخل دیتی تھی۔ اب یہ بتانا ہے کہ آیا حکومت، صنعت اور عوام یا صنعت اور مزدوروں کے عام باہمی تعلقات میں بھی جہاں ضرر یا فریب کا کوئی سوال نہ ہو دخل دیتی ہے یا نہیں۔ کیا حکومت اس بارے میں عوام کی حفاظت کرتی ہے کہ ان سے زائد قیمت نہ لی جائے؟ کیا وہ مزدوروں کی حفاظت کرتی ہے کہ انھیں کم اجرت نہ ملے؟ کیا وہ آجر کو مزدوروں کے بیجا مطالبوں سے محفوظ رکھتی ہے؟ اگر اس کا خطرہ ہو کہ عوام سے زیادہ قیمت وصول کی جائے ان کی خدمت خراب کی جائے تو حکومت سخت سے سخت کارروائی یہ کر سکتی ہے کہ صنعت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو خود چلائے۔ چنانچہ ریلوں اور کانوں کے بارے میں یہ صورت حال رونما ہوئی۔ اس کو صرف ڈاک خانے اور کسی حد تک محکمۂ برقی کے بارے میں اختیار کیا گیا (دیکھو صفحہ ۴۱۴)۔ لیکن بلدی حکام عوام کو بجلی، گیس، پانی، ٹریم، حمام اور دوسری خدمتیں مہیا کر کے خانگی کاروبار کے دائرے میں دخل دیا کرتے اور دے سکتے تھے۔ اگر حکومت کسی کارخانے کو پورے طور پر اپنے ہاتھ میں نہ لے تب بھی ان لوگوں پر شرطیں لگا سکتی تھی جو اس کی نگرانی کرتے تھے۔ لیکن انگلستان میں حکومت کی پالیسی کبھی ایسی نہیں رہی سوائے جنگ کے زمانے کے جب کہ کامل نگرانی کے نظام پر عمل کیا گیا۔ قیمتوں اور پیداوار پر قابو رکھنے کے لیے جو بڑے ٹرسٹ قائم کیے جاتے ہیں ان کی روک تھام کے لیے کوئی قانون نہیں ہے اور اس نفع پر بھی کوئی روک نہیں ہے جو اس قسم کے ٹرسٹ عوام سے حاصل کر کے اپنے حصہ داروں میں مقسوم کے طور پر بانٹتے ہیں[۱]۔ یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ ابھی اتنی مسابقت باقی ہے

۳۴۵

---

[۱] ۱۹۱۹ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے، قیمتوں، پیدائش کے مصارف اور ٹرسٹوں کے کاروبار کی تحقیقات کرنے اور نفع اندوزی کو روکنے

جو بڑی خرابیوں کو روکنے کے لیے کافی ہے۔

آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات کو منظم کرنے میں حکومت کا جو حصہ ہے اس کو جانچنے کے لیے کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا ضروری ہے۔ مزدوروں کے جھگڑے تجارت کو نقصان پہنچانے اور عوام کے لیے دقتیں پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر حکومت اس کو اپنا فرض سمجھتی ہے کہ آجر اور مزدور کے باہمی اختلاف کو روکنے کے لیے اپنی انتہائی قوت سے کام لے تاکہ دونوں میں کھلم کھلا لڑائی نہ ہو۔ سنہ ۱۸ء میں صنعتی کارخانوں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے حکومت نے مزدور سبھاؤں کو کچلنے کی پالیسی اختیار کی۔ ایک سو سال بعد صورت حالی پوری طرح بدل گئی تھی۔ ایسی صنعتوں کو جن میں از خود کوئی تنظیم نہ تھی ان کے لیے بچوں کی طرح کسی نگرانکار کی رکھوالی ضروری سمجھی گئی اور ان صنعتوں سے جن میں تنظیم نے پوری ترقی کر لی تھی بالغوں کی طرح برتاؤ کیا گیا۔ یعنی دلیلوں، ترغیب اور مشورے سے کام لیا گیا اور کوئی جبر نہیں کیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک پرزور ہلچل نے ان پیشوں کی جانب عوام کی توجہ پھیر دی جن میں عورتیں نیم بیگار کے اصول پر گھروں میں سخت محنت کے بعد کام کی مقدار کے لحاظ سے اجرت پاتی تھیں یہاں تک کہ کبھی انھیں صرف ۵ شلنگ فی ہفتہ کمانے کا موقع ملتا تھا۔ ان ادنیٰ شرحوں کا باعث یہ تھا کہ استادان پیشہ کے درمیان مسابقت جاری تھی جو اپنے مزدوروں ہی کی طرح غیر منظم تھے۔ اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے سنہ ۱۹۰۹ء اور سنہ ۱۹۱۸ء میں "قوانین مجالس پیشہ"[1] منظور کیے گئے جن کی رو سے وزیر عمال کسی ایسی

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کے لیے محکمۂ تجارت کو اختیارات دیے گئے۔ چونکہ اس قانون کا عملی طور پر انتظام دشوار تھا، اس لیے سنہ ۱۹۲۱ء میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔

[1] Trade Boards Acts

۳۴۶

صنعت میں جہاں تنظیم ناقص ہو اور یا اجرت خلاف معمول ادنیٰ ہو ایک مجلس پیشہ قائم کر سکتا تھا۔ یہ مجلس چند آجروں اور مزدوروں پر مشتمل ہوتی اور کم از کم ایک آزاد رکن کا تقرر وزیر عمال کر سکتا تھا۔ مجلس کا کام یہ تھا کہ پورے پیشے کے لیے اجرت کی کم سے کم شرحوں کا تعین کرے جو متعلقہ وزیر کی منظوری کے بعد قانونی طور سے لازم گردانی جاتی تھیں۔ ابتدا میں اس تجویز کو چار پیشوں میں نافذ کیا گیا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء تک ۶۳ مجلسیں قائم ہو گئیں جو بیس لاکھ سے زائد مزدوروں سے متعلق تھیں۔

تنظیم کی معیاری صورت نہ صرف یہ تھی کہ آجروں اور مزدوروں کی انجمنیں ہوں بلکہ دونوں جماعتوں کو اپنی رایوں کے اختلاف پر بحث کرنے کی غرض سے یکجا کرنے کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو۔ کئی اہم صنعتوں میں مستقل مشترک مجلسیں اس غرض سے قائم کی گئی تھیں۔ لیکن بہت سی صنعتوں میں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سنہ ۱۹۱۷ء میں "وھٹلے کمیٹی"[1] نے جو اپنے صدر کے نام سے موسوم ہوئی ایک ایسی اسکیم بنائی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہر صنعت میں ایک "قومی مشترک صنعتی مجلس" بنائی جائے جس کے تحت ضلعوں کی مجلسیں کام کریں اور انفرادی کارخانوں میں کارخانے کی کمیٹیاں ہوں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ آجروں اور مزدوروں کے باقاعدہ نظام کے ذریعے سے مجلسوں کے ارکان کا چناؤ ہو۔ قومی مجلسوں میں اجرت کے وہ سب مسئلے اور کام کی وہ سب شرطیں زیر بحث آسکتی تھیں جن سے ہڑتالوں کا اندیشہ ہو اور پُر امن تصفیے کے حصول کے بہترین امکانی موقعے بہم پہنچائے جاتے تھے۔ مقامی مجلسوں کو بہت کم اقتدار حاصل تھا کیونکہ سب اہم معاملوں کا تصفیہ قومی بنیاد پر عمل میں آسکتا تھا۔ لیکن کارخانوں میں لڑائی جھگڑے کو روکنے کے لیے وہ بہت کارآمد تھیں۔ چنانچہ ساری اسکیم کا یہی اصل مقصد تھا کہ آجروں اور مزدوروں کے

۳۴۷

[1] Whitley Committee

باہمی تعلق کو مستقل طور سے اصلاح اور ترقی دی جا سکے۔ وھٹلے مجلسیں، پیشوں کی مجلسوں سے اس لحاظ سے مختلف تھیں کہ اول الذکر کی ترکیب پوری طرح رضاکارانہ تھی اور ان میں بیرونی حاکموں کے مقرر کردہ ارکان شامل نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پیشوں کی مجلسیں صرف میعادی طور پر اجرت مقرر کرنے کے لیے اجلاس کرتی تھیں اور وھٹلے مجلسیں ہر وقت منعقد ہو سکتی تھیں اور ان کا سوچ بچار صنعتی حالات کے کل میدان پر حاوی ہوتا تھا۔ موخر الذکر اسکیم کو کس حد تک پسند کیا گیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تہتر صنعتوں نے مشترک مجلسیں قائم کر لیں۔ لیکن ان اسکیموں میں سے کسی کا بھی زراعت پر اطلاق آسان نہ تھا۔ جنگ کے زمانے میں اس اسکیم کو حکومت کی نگرانی میں لے لیا گیا اور اجرت کی کم سے کم شرح معین کرنے کے لیے اجرت کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء میں انھیں پیشگی اطلاع کے بغیر اچانک توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۴ء میں "زراعتی اجرت کی نگرانی کا قانون" منظور ہوا جس کی رو سے ایک مجلس زراعتی اجرت اور ہر ضلع کے لیے ایک زراعتی اجرت کمیٹی بنائی گئی جس میں آجروں اور مزدوروں کی نمائندگی مساوی رکھی گئی تھی)۔

وھٹلے مجلسیں، مزدوروں کے مسئلوں کو حل کرنے کے معمولی انتظام کا جزو ہیں۔ اگر یہ معمولی انتظام ناکام ثابت ہو تو کیا کیا جائیگا؟ بعض ملکوں میں ایسی حالتوں کے لیے "جبری مصالحت" اور "ثالثی" کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ "مصالحت" کے معنی نزاع کو کسی ایسی جماعت کے حوالے کرنا ہیں جس کے فیصلے کو منظور یا رد کرنے کا آزادانہ اختیار فریقین کو حاصل ہو۔ "ثالثی" کے معنی کسی نزاع کو ایسی جماعت یا فرد کے حوالے کرنا ہیں جس کے فیصلے کو فریقین نے آخری تصفیہ ماننے پر رضامندی ظاہر کی ہو۔ اگر ان طریقوں کو قانونی طور پر لازم ٹھیرایا جائے تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ معمولی طریقہ ناکام ہونے کی صورت میں

تمام جھگڑوں کا مصالحت یا ثالثی کے لیے پیش ہونا ضروری ہے،
جس وقت معاملہ مصالحتی مجلس کے زیر غور ہو، مزدوروں کے لیے ہڑتال
کرنا غیر قانونی ہے، اور فرد یا جماعت ثالث کا فیصلہ قانون کے ذریعے
سے نافذ کیا جائے گا۔ گو کہ انگلستان کی اکثر صنعتوں نے مصالحت یا ثالثی
کی تجویزوں کو باہمی سمجھوتے سے اختیار کر لیا ہے، پھر بھی حکومت نے
ان کو کبھی جبری طریق پر نافذ نہیں کیا۔ صنعتی عدالتوں کے قانون
بابتہ سنہ ۱۹۱۹ء کی رو سے جو سنہ ۱۸۹۶ء کے اسی قسم کے قانون کی ترمیم یافتہ
شکل تھی، ایک مستقل صنعتی عدالت قائم کی گئی جس سے وزیر عمال ہمیشہ
مشورے کر سکتا ہے اور جس میں جھگڑنے والے فریق اگر مناسب سمجھیں
تو اپنا مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ وزیر ان حالتوں کی تحقیق بھی کر سکتا ہے
جو صنعت میں پائی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر جھگڑا ہوا۔ اس قانون
کے تحت کوئی فیصلہ آجروں اور مزدوروں کے باہمی سمجھوتے سے زیادہ
پابندی نہیں لگاتا اور اس میں ہڑتال کے حق پر کوئی روک نہیں ہے۔
حکومت اس بات کے لیے ہر وقت تیار ہے کہ جھگڑالو جماعتوں کے لیے
کوئی ایسا انتظام کرے جسے وہ مصالحت یا ثالثی کے لیے پسند کریں اور
ان میں اتحاد پیدا کرنے اور پر امن بات چیت کی ہمت افزائی کی ہر امکانی
کوشش کرتی ہے۔ حکومت کا یہ بھی مقصد ہوتا ہے کہ ان کے آپس کے
اختلاف کا کوئی مناسب حل نکالے۔ پھر بھی فریقین کو آزادی حاصل
رہتی ہے۔ ان پر کوئی جبر یا ظلم نہیں کیا جاتا۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں جب قانون مفلسی منظور ہوا تو یہ بھی ایک ایسا قانون
تھا جو سماجی خدمت کر رہا تھا۔ اس کی رو سے ہر قسم کی تکلیف کو دور

۱۔ انیسویں صدی میں مجموعۂ قوانین میں ایسے قانون موجود تھے جن کی رو
سے ایک طرح کی جبری ثالثی کا انتظام تھا۔ لیکن ان کو کبھی استعمال نہیں کیا گیا اور
وہ سنہ ۱۸۹۶ء میں منسوخ کر دیے گئے۔

کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس قانون میں غریبوں کے بچوں کی مدد بوڑھوں اور بیماروں کے سہارے، پاگلوں کی نگہداشت اور بیروزگاروں کی رقمی امداد کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان سب معاملوں کے جملہ اخراجات مقامی امدادی محاصل سے جن کو (Local rates) کہا جاتا تھا پورے کیے جاتے تھے۔ اس زمانے کے بعد سے حکومت ہمیشہ زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں اپنے سرلیتی اور خدمات عامہ کا انتظام کرتی رہی ہے جن کے اخراجات ایک حد تک سرکاری محصولوں سے ادا کیے جاتے ہیں۔ حکومت کی ان کوششوں میں اس حد تک ترقی ہوئی ہے کہ ۱۹۰۹ء میں قانون مفلسی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے والے کمیشن کے ایک طبقے نے یہ سفارش کی کہ اس قانون کو منسوخ کر کے عوام پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں موزوں سرکاری محکموں میں بانٹ دی جائیں۔ یہاں ان اصلاحوں کا ذکر نہایت ہی اختصار سے ممکن ہے۔ چنانچہ پہلی دفعہ ۱۸۳۳ء میں تعلیم کے لیے بیس ہزار پونڈ کی سرکاری رقم منظور کی گئی لیکن ۱۸۷۰ء کے قانون تعلیم کی منظوری تک حکومت نے اپنے ملک کے بچوں کی تعلیم کے لیے کوئی سنجیدہ کارآمد کوشش ہی نہیں کی۔ ۱۹۱۸ء تک سب کے لیے مفت ابتدائی تعلیم کا ایک قومی نظام رائج ہو گیا اور مدرسوں کے لیے طبی امداد اور بعض صورتوں میں غریب بچوں کے لیے مفت کھانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں قومی محصولوں میں سے بڑھاپے کے وظیفوں کی منظوری ان سب مردوں اور عورتوں کے لیے دی گئی جو ستر سال سے زیادہ ہوں اور جن کی آمدنی ایک مقررہ رقم سے کم ہو۔ ۱۹۱۱ء میں قومی بیمہ کا قانون منظور ہوا جس کی رو سے بیماری اور بیروزگاری دونوں کے بیمے کا انتظام کیا گیا۔ ان دونوں مسئلوں نے قانون مفلسی کے وسیلوں پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔ جب معمولی مزدور بیمار پڑ جاتا تھا تو وہ عارضی طور پر محتاج بن جاتا تھا۔ لیکن اس کو نادار شمار کرنا درست نہ تھا۔

بیروزگاروں کے متعلق بھی یہی بات صادق آتی تھی۔ ایسا نظام جس کا مقصد صرف محتاج خاتون میں امداد دینا ہو ان بیروزگاروں کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا جن کی تعداد سال کے بارہ مہینے صنعت اور تجارت کی تبدیلیوں کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

بیمہ کے قانون کے دونوں شعبوں میں ہر بیمہ شدہ آدمی کی جانب سے ہفتہ وار تین چندے ادا ہوتے تھے۔ یعنی ایک خود بیمہ شدہ آدمی، دوسرے آجر اور تیسرے حکومت کی طرف سے۔ اسطرح جو فنڈ قائم ہوتا تھا اس سے ان لوگوں کو امداد دی جاتی تھی جو بیمار پڑ جائے یا بیکار ہو جاتے تھے۔ اس گہری ذمہ داری سے انیسویں صدی کے سیاسی نظریے کے تین اہم میلانوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے گو کہ اس سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا صرف قیاسی ہو گا۔ حکومت کا اس میں شریک ہونا اس اشتراکی نظریے کے موافق ہے کہ حکومت کو ہر شہری کی خوشحالی کا راست ذمہ دار ہونا چاہیے۔ آجر کا چندہ لارڈ شیفٹس بری جیسے لوگوں کے قدامت پسندانہ نظریے کو ظاہر کرتا ہے کہ آجر کا تعلق اس کے مزدوروں سے ایسا ہی ہے جیسا کہ زمیندار کا دیہاتیوں سے جو ماں باپ کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مزدور کا چندہ ریڈیکل (انتہا پسندانہ) نقطۂ نظر کے موافق ہے ہر فرد کی ایسی ہمت افزائی کرنی چاہیے جو وہ خود ہی اپنی گتھیاں سلجھائے اور اپنی تمام ضرورتوں کو خود ہی پورا کرے۔

قانون کی اس دفعہ کی رو سے جن میں بیروزگاری کے بیمے کی بحث کی گئی ہے بیروزگاروں کو چندوں کے تناسب سے امداد دی جاسکتی تھی اور کسی ایک سال میں ایسی امداد دینے کی میعاد چند ہی ہفتوں تک محدود رکھی گئی تھی۔ اس اسکیم کو پہلے صرف چند چنے ہوئے پیشوں کی حد تک نافذ کیا گیا لیکن سنہ ۱۹۱۶ء میں اور پھر ۱۹۲۰ء میں اس کو وسیع کیا گیا یہاں تک کہ وہ جملہ دستی کام کرنے والے، ادنیٰ اجرت پانے والے اور

۳۵۰

ہاتھ کا کام نہ کرنے والے مزدوروں پر بھی حاوی ہو گئی جس کے اہم مستثنیات صرف خانگی ملازم اور زرعی مزدور تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جو شدید تجارتی کساد بازاری شروع ہوئی اس میں قاعدے نرم کر دیے گئے اور سابق چندوں کی مقدار کے لحاظ سے بغیر امداد دی گئی۔ لیکن یہ غیر موعودہ امداد نظری طور پر ایک پیشگی ادائی تھی جو کام کی صواب دید پر اس امید پر دی جاتی تھی کہ آئندہ جب تجارت میں نئے سرے سے ترقی ہوگی تو پھر چندے وصول کیے جائیں گے۔ اس طرح گو ایک سال کے اندر بیروزگاروں کی امداد پر پچاس ملین پاؤنڈ صرف کر دیے گئے۔ پھر بھی اس رقم کی صرف ایک چوتھائی کا بوجھ محصول ادا کرنے والوں کو اٹھانا پڑا۔ صحت اور بیروزگاری کے بیمے کی اسکیموں میں کئی موقعوں پر ترمیم یا توسیع کی گئی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کے وظیفوں کا قانون منظور ہوا۔

ایک سو سال پہلے حکومت کو جنگ، عدل گستری اور قومی قرضے کے سود کے سوا باقی چیزوں پر بہت کم رقم خرچ کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی حسابات کو متوازن کرنے میں بہت سخت دشواری پیش آیا کرتی تھی۔ محصولوں کا بڑا حصہ درآمدی محصول اور چنگی کے نقصان دہ دقیانوسی طریق پر وصول ہوتا تھا۔ بعد میں دو بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ پیل اور گلیڈسٹون نے کروڑگیری کے کئی محصولوں کو منسوخ کیا اور صرف الکحلی مشروبات، تمباکو، چاء اور شکر وغیرہ جیسی چیزوں کے محصولوں کو برقرار رکھا جن سے تامینی دور کے تمام محصولوں سے بہت زیادہ آمدنی وصول ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ پیل نے آمدنی کے محصول (انکم ٹیکس[1]) کو پھر سے جاری کیا جو گلیڈسٹون کی اس دائمی خواہش کے باوجود کہ اس کو منسوخ

[1] فرانس سے جنگ کے زمانے میں پٹ نے انکم ٹیکس لگایا تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۱۵ء میں جب صلح کا معاہدہ طے ہوا تو یہ محصول اٹھا لیا گیا۔

کر دیا جائے۔ اب تک ہم پر عائد ہے اور ہمارے مالی نظام کا پشت پناہ ہے۔ اس راست محصول آمدنی کے علاوہ ایک اور راست محصول سرمایہ اس وقت لگایا گیا جب کہ ۱۸۹۴ء میں سر ولیم ہارکورٹ نے فوتی محصول جاری کیا۔ جس کے تحت حکومت ایسی تمام جائدادوں پر محصول لگاتی تھی جو متوفی کے مرنے پر ایک مالک سے دوسرے مالک کے ہاتھ میں منتقل ہوتی تھیں۔ یہ محصول بہت ہی مفید آمدنی کا ذریعہ ہے۔

حالیہ زمانے میں محصول لگانے میں رہنمائی کے لیے یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ ہر فرد کو اپنی حقیقی قابلیت اور استطاعت کے موافق محصول ادا کرنا چاہیے۔ گو کہ ابتدائی انکم ٹیکس سے بہت ہی مفلس اور نادار طبقہ مستثنیٰ تھا، لیکن باقی تمام طبقوں پر وہ مقررہ شرح سے لگایا جاتا تھا۔ اگر ہر ایک کو اپنی آمدنی کے ہر پاؤنڈ پر ایک شلنگ ادا کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ تنخواہ پانے والے ایک محرر کے مقابلے میں ایک لکھ پتی زیادہ محصول ادا کرے گا۔ پھر بھی یہ بات زیادہ منصفانہ ہوتی کہ وہ اعلیٰ تر شرح سے محصول ادا کرے۔ اگر ۱۵۰ پونڈ سالانہ پانے والے کی آمدنی سے آدھا حصہ یا فی پونڈ ۱۰ شلنگ لے لیے جائیں تو وہ مفلس ہو جائے گا۔ اگر ۱۵ ہزار پونڈ سالانہ پانے والے کی آمدنی سے آدھی رقم لے لی جائے تو بھی وہ مالدار ہی رہے گا۔ اس امر کے مدنظر انکم ٹیکس اور فوتی محصول دونوں کی حد تک یہ اصول اختیار کیا گیا کہ چھوٹی آمدنیوں کے مقابلے میں بڑی آمدنیوں پر اعلیٰ تر شرح سے محصول لگایا جائے۔ لیکن دوسرے ۲۵۳ امور کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ اگر کسی کو زمین اور مشاغل اصل سے آمدنی وصول ہو رہی ہو تو یہ سلسلہ شاید اس کی موت تک جاری رہے بلا لحاظ اس کے کہ وہ بیمار پڑے یا کام کے ناقابل ہو جائے۔ اگر آمدنی روزمرہ کے کام دھندے سے حاصل ہو رہی ہو تو اس کے کچھ حصے کو آڑے وقت اور بڑھاپے کے لیے اٹھا رکھنا پڑتا ہے۔ اس بات کو دھیان میں رکھ کر یہ تجویز کی گئی کہ دوسری قسم کی آمدنی پر جو "کمائی آمدنی" کے

نام سے موسوم کی گئی اتنا بھاری محصول ہونا چاہیے جتنا کہ بے کمائی آمدنی پر۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں دونوں میں یہ فرق منظور کر لیا گیا۔ یہ بھی مان لیا گیا کہ ایک بال بچے والا اتنا محصول ادا نہیں کر سکتا جتنا کہ اتنی ہی آمدنی پانے والا مجرد آدمی۔ اس لحاظ سے محصول ادا کرنے والے کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی قابل محصول آمدنی سے اتنا حصہ ان لوگوں کے لیے نہا کرے جو اس کی زیر پرورش ہوں۔

اس طرح محصول کا بار زیادہ منصفانہ طور پر تقسیم ہو گیا اور سرکاری خزانہ ان بڑھتے ہوئے مطالبوں کو ادا کرنے کے قابل بن گیا جو سرکاری محصولوں پر سماجی خدمتوں کے قیام اور انتظام نیز قومی قرضے کے سود کے سلسلے میں عائد ہوتے تھے اور جن کی مقدار سنہ ۱۸۸۰ء میں ۸۰ ملین پونڈ اور سنہ ۱۹۲۱ء میں بڑھ کر ۸۰۰ ملین پونڈ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود قرضے میں اضافہ ہوتا رہا۔ کیونکہ وہ ایک شے جسے مملکت سبھی اٹھا نہیں سکتی جنگ تھی۔
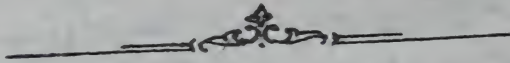
باب ۲۱

حالیہ دنیا میں انگلستان کا مرتبہ

کوئی مورخ جو سچائی پر نظر رکھتا ہے اس بات کی کوشش نہیں کرے گا کہ کسی ملک کی سرحدوں سے باہر کی وسیع تر دنیا کے علاقوں پر نظر دوڑائے بغیر اس ملک کی سرگزشت بیان کرے۔ کیونکہ کوئی ملک نہ تو بن باسی کی طرح الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ دوسرے ملکوں سے اپنا رشتہ ناتا توڑ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ سیاسی مدبر اپنی قومی آزادی کا نخوت و گھمنڈ سے ذکر کریں اور شیخی سے یہ کہیں کہ ان کی مادر وطن اپنی ذہانت اور قوت سے اپنی قسمت آپ بنائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ زور شور سے بہنے والے دریا کی ان موجوں کے خلاف ان کی کشمکش بہت سی کمزور ثابت ہوتی ہے جو دوسرے انسانوں کی طرح انھیں بھی مستقبل کی جانب بہائے لے جاتی ہیں۔ انگلستان صدیوں تک سمندروں کے راستے جہاز رانی کرتا رہا اور یورپ سے اس کی تجارت تھوڑی مقدار میں اگرچہ استقلال سے جاری تھی۔ اور اب اس کے جہازوں سے ایسے بندرگاہوں تک اس کی رسائی ہو گئی جہاں دنیا کی تمام قوموں کی

ایک دوسرے سے مٹھ بھیڑ رہتی اور میل جول ہوتا تھا۔ جہاں تک تاریخی یادداشتوں سے پتا چلتا ہے، اب تک دور دیس کے رہنے والوں کے ملنے کا مقام یا تو جنگ کا میدان ہوتا تھا یا تجارتی منڈی۔ لیکن پچھلے ایک سو سال سے تمام ملکوں کا بڑے کاروبار میں ایک دوسرے سے ساجھا ہو گیا ہے جو ان کی خوشحالی کے لیے اتنا اہم ہے کہ اگر یہ ساجھا اچانک ختم ہو جائے تو ممکن ہے کہ کچھ ملک تباہ ہو جائیں اور کچھ پچھلے دور کے افلاس میں پھر ڈوب جائیں۔

یہ عالمی کاروبار انیسویں صدی کے عظیم قومی کاروبار کی طرح تقسیم عمل کے اصول پر مبنی ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ نہ صرف انفرادی دستکار خصوصی مہارت رکھتے تھے بلکہ کارخانے اور ضلعے بھی خاص خاص شعبوں میں ماہر تھے۔ شہر چند اشیا کی تیاری پر اپنی پوری توجہ صرف کر کے اور اپنے حریفوں کا گلا گھونٹ کر ملک کے اندر اپنی حیثیت اتنی طاقتور بنا لیتے تھے کہ ان کے تجارتی شعبے میں داخل ہونے والی تمام نئی اکائیاں ان کے اثر کے دائرے میں سمٹ آتی تھیں۔ بڑے بڑے صنعتی کارخانے چند اہم مرکزوں میں اکھٹے ہو گئے۔ لیڈز نے اونی کپڑوں کی تیاری کے لیے شہرت حاصل کر لی۔ بریڈ فورڈ بٹی ہوئی اون، مانچسٹر سوتی کپڑوں، نیو کیسل اور کلائیڈ جہاز سازی، شفیلڈ کاردگری، ناٹنگھم فیتہ سازی اور نارتھمپٹن جوتوں کی صنعت کی بنا پر مشہور ہوا۔ یہ سب کچھ علاقہ واری تقسیم عمل کا نتیجہ تھا لیکن اس کا یہیں پر رک جانا ضروری نہیں۔ مختلف ملکوں کے درمیان بھی اسی طرح تقسیم عمل ممکن ہے۔ ۱۸۴۶ء میں غلے کے قوانین کی تنسیخ اس بات کی علامت تھی کہ برطانیہ مستقبل میں اپنی ساری غذا خود ہی تیار نہیں کرے گا۔ بلکہ ایسی صنعتوں میں اپنی توجہ صرف کرے گا جن میں اس کو خاص مہارت حاصل ہے اور اپنے مصنوعات کا مبادلہ دنیا کے بازاروں میں اشیائے خورد و نوش یا دوسرے مطلوبہ اشیا سے کرے گا۔ انگلستان کے کوئلے، سوتی کپڑے، جہاز سازی اور انجینیری کی بڑی صنعتوں کا وجود صرف

انگریز باشندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کی احتیاج کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی انگلستان نے اپنے سر لی۔ گویا انگلستان ان کی خدمت اس سے کہیں بہتر طریقے پر انجام دیتا ہے جس کو وہ خود اپنے طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے معاوضے میں انگلستان یہ توقع رکھتا ہے کہ دوسرے ملک بھی اپنی ضرورتوں سے زیادہ اشیائے خورونوش، اون اور روئی تیار کریں گے اور اس کی برآمد کردہ اشیا کے مبادلے میں اس کو دیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم عمل کی بنیاد محنت کی پیداوار کا مبادلہ ہے اور جب یہ تقسیم عمل مختلف ضلعوں یا ملکوں کے درمیان ہو تو ان کے درمیان مبادلے کے معنیٰ ایک اعلیٰ درجے کے ترقی یافتہ تجارتی نظام کے ہوں گے۔

تقسیم عمل کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ افراد اور جماعتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں باہمی تعاون اور اتحاد عمل ہو۔ دوسرے لفظوں میں جوں جوں تقسیم عمل ترقی کرتی جائے گی ایک دوسرے پر لوگوں کا انحصار بڑھتا جائے گا۔ غاروں میں زندگی بسر کرنے والا انسان جو شکار کے ذریعے سے اپنی غذا حاصل کرتا اور اپنے ہتھیار اور چرمی لباس خود ہی تیار کرتا تھا کسی کا بھی محتاج نہیں تھا۔ وسطی دور کے گاؤں میں بڑھئی، نانبائی یا موچی اور جلاہے کے بغیر کوئی اپنا کام ہی نہیں چلا سکتا تھا۔ لیکن گاؤں مجموعی حیثیت سے خود مکتفی طور پر زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے پڑوسیوں پر تکیہ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ جب مختلف شہروں، قصبوں اور ضلعوں میں تقسیم عمل رونما ہوئی تو یہ سب علاقے جن میں گاؤں بھی تھے ایک دوسرے کے محتاج بن گئے۔ شفیلڈ کاریگری میں اس وقت تک اپنی پوری توجہ صرف نہیں کر سکتا جب تک کہ نارتھمپٹن اس کے لیے جوتے اور لیڈز اور بریڈفورڈ اس کے لیے کپڑے تیار نہ کریں۔ اس طرح ایک بہت ہی پیچیدہ نظام وجود میں آیا جس میں ہر شہر اور قصبے کو اپنا خاص کام کرنا پڑتا تھا اور ساری قوم ایک معاشی اکائی کے رشتے میں گندھ گئی۔ آجکل اس عمل کا

دائرہ تمام دنیا میں پھیل گیا ہے، قوموں کی زندگی کا مدار ان کی باہمی تجارت پر ہے، دنیا کی حیثیت ایک بازار کی ہوگئی ہے اور اسی بازار کے کاروبار پر نوع انسانی کی خوشحالی منحصر ہے۔ جب ملکہ ایلزبتھ کے میران عدل اجرت کا تعین کرتے اور بندرگاہوں کے عہدہ دار اٹھارھویں صدی کے غلے کے قوانین کو نافذ کرتے تو گیہوں کی اس قیمت کو معیار مانا جاتا تھا جو ان کے ملک یا بندرگاہ میں رائج ہوتی تھی۔ لیکن آجکل گیہوں کی عالمی قیمت کی اطلاع ایک شہر سے دوسرے شہر کو تار کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے اور کینیڈا کے سارے گیہوں کی پیداوار کی خرید و فروخت بیک وقت لیورپول، ہیمبرگ اور شکاگو میں ہوتی ہے۔ اس نمایاں ترقی میں نقل و حمل کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ کیونکہ لیورپول میں امریکہ کی روئی کی خرید اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ بحر اطلانطک کو عبور کر کے لیجانے کا کوئی سستا اور تیز رفتار ذریعہ نہ ہو۔ لیکن برقی ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کی ایجاد اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ انیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ٹیلیگراف کا استعمال شروع ہوا جس کی وجہ سے ۱۸۵۱ء تک انگلستان کا فرانس سے ربط ہو گیا۔ ۱۸۶۶ء تک اطلانطک میں بحری تار کامیابی سے بچھا یا گیا اور آجکل تو ستونی لاسلکی اور بے تار کا ٹیلیفون بھی موجود ہے۔ چنانچہ دنیا کے ملکوں میں باہمی ربط یوں بھی قریبی اور گہرا ہو گیا ہے کہ خبریں اور نرخناموں کے متعلق اطلاعیں اور فرمائشیں آن کی آن میں نشر کی جاتی اور بھیجی جاتی ہیں۔

لیکن جن قوتوں نے یہ صورت حال پیدا کی وہی اس کے استحکام کو بھی دھمکی دینے لگیں۔ نقل و حمل، صنعتوں کی تحصیر اور آبادی کے ارتکاز کو ممکن بناتی ہے۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہی نقل و حمل ان چیزوں کو غیر ضروری بنا دیتی ہے۔ نقل و حمل، قوموں کو اس قابل بناتی ہے کہ ایک مشترکہ بازار میں اپنی پیداوار کے مبادلے پر زندگی بسر کریں۔ لیکن اسی بازار میں پیش قدمی کے ذریعے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا موقع بھی نقل و حمل ہی نکالتی ہے۔ ریلوں نے انگلستان کے شہروں کو بڑا بنانے میں بہت کچھ مدد دی، لیکن ٹریموں اور

موٹر کاروں نے شہر سے باہر لوگوں کے رہنے سہنے کو ممکن بنا دیا۔ صنعتیں کوئلے اور لوہے کی کانوں کے ارد گرد اکٹھی ہوتی گئیں۔ لیکن کوئلے اور لوہے کی ڈھلوائی اتنی ہی آسان ہے جتنی کہ صنعتوں کی پیداوار کی بار برداری اور برقی قوت تو نقل و حمل کی ضرورت ہی سے بے نیاز ہے۔ جب ہم صنعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے بعض کی بنیاد مصنوعی اور خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں کپاس نہیں ہوتی اور یہاں کے کارخانے بڑی حد تک دور دراز ملکوں کے لیے کپڑا تیار کرتے ہیں۔ سوت کات کر اور کپڑا تیار کر کے ہندوستان بھیجنے کے لیے مصری اور امریکی روئی لنکاشائر کیوں لائی جاتی ہے؟ ایک حد تک اتفاقی سبب سے یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ بات یہ ہے کہ سب سے پہلے انگریزوں ہی نے بڑے پیمانے پر سامان تیار کرنے کا گر معلوم کیا۔ انگلستان میں کوئلہ اور لوہا موجود تھا اور اس کی آب و ہوا بھی موافق تھی۔ لیکن موجودہ زمانے میں انگلستان نہ تو مہارت کا اجارہ دار رہا اور نہ کوئلے اور لوہے کا۔ اس کے بازار کے قریب یا خود امریکہ میں خام مال کی منڈی کے پاس کپڑے کا کوئی بڑا کارخانہ کھولنے سے ہندوستان کو کون روک سکتا ہے؟ سچ پوچھو تو انگلستان کی صنعت کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ بہت پرانی ہے اور کافی سرمائے سے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے جو نئے رقیبوں کا سر کچل سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور امر مانع نہیں ہو سکتا۔

اگر حریف مبارزت طلبی نہ بھی کریں تو قومی مہارت اور تخصیص کا یہ نظام انگلستان کا دوسری قوموں اور دنیا کے دوسرے علاقوں کے حالات پر انحصار بہت ضروری بنا دیتا ہے۔ اگر خام کپاس کی رسد میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو، اگر انگلستان کے گاہک اس سے سامان نہ خریدنا چاہیں یا خریدنے کے قابل نہ ہوں تو اسے تباہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ جب امریکی خانہ جنگی کے باعث کپاس کی رسد رک گئی تو لنکاشائر میں فاقے ہونے لگے۔ جس وقت جنگ عظیم کے باعث کساد بازاری ہوئی اور انگلستان کو اپنے سامان کی کھپت کے لیے کوئی بازار نہ مل سکا تو بیس لاکھ بیروزگار آدمی بڑے بڑے شہروں کی گلی کوچوں میں

۳۵۶

بھیک مانگتے مارے مارے پڑے پھر رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف جنگ یا اچانک آفتوں کے اثر اور نتیجوں ہی کا ڈر انگلستان کو لگا ہوا نہیں ہے۔ برطانیہ نے اپنے لیے یہ راستہ اختیار کیا کہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کر کے خود زندگی بسر کرے اور وہ صرف اسی وقت تک خوشحال رہ سکتا ہے جب تک کہ اس کی خدمات کی ضرورت ہو اور وہ پسند کی جائیں اور دوسروں کے مقابلے میں بہتر طریق پر انجام دی جائیں۔ پچھلی صدی کے وسط میں صنعتی میدان میں انگلستان کی قیادت مسلم تھی اور اسے مسابقت کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنی دو کروڑ آبادی کی پرورش اپنی زمین کی پیداوار سے نہیں بلکہ دنیا کی پیداوار سے کر سکتا تھا جو دنیا کے بازاروں سے اس کی بے نظیر مصنوعات کے بدلے خریدی جاتی تھی۔ لیکن دوسرے ملکوں یعنی جرمنی اور اسکے بعد ریاستہائے متحدہ نے بھی اسی نہج پر ترقی شروع کی اور میکانی نقل و حمل نے فاصلے کا وہ سد راہ توڑ دیا جو امریکہ کو یورپ کے بازاروں سے دور رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصے میں انگلستان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے اپنی معاشی زندگی کے وسیلوں کی حفاظت کے لیے جنگ کرنی پڑے گی۔

اس کتاب کے مصنف نے اپنے آخری باب ۱۸۹۸ء میں اس صورت حال کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ یہ زمانہ تاجین کے حامیوں کے اپنی سرگرم مہم شروع کرنے سے کچھ پہلے کا اور اس جنگ سے کئی سال پہلے کا تھا جس سے وہ ڈر رہا تھا اور جس نے آخر یورپ کے سارے جسم کو گھائل کر دیا۔ چنانچہ انگلستان کی عظیم صنعتی ترقی کی اہم خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے ذیل کے خیالات کا اظہار کیا تھا:۔

"یہ سب رجحانات ایک عرصے سے لگاتار کام کر رہے ہیں اور آئندہ ان میں تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ لیکن دوسری حکمت عملی جو بعد میں اختیار کی گئی اس کے دائمی قیام کے متعلق شبہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آزاد تجارت کے عام اصول پر عمل کرنے کے بارے میں بھی کبھی کبھی تامل کیا جاتا ہے۔ غلے کے قوانین اور تجارتی طریق کی جانب لوٹنے کا تصور کرنا یقینی طور پر بے معنی ہے۔ لیکن یہ

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ قوم مجموعی حیثیت سے بیرونی پیش قدمی کے خطرے سے تیس سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ متاثر نہیں ہے اور قومی صنعتوں کے احیاء کے بارے میں کارروائی کرنے کے لیے زیادہ آمادہ ہے۔ نشان مال تجارت کا قانون، بیرونی شکر کی مالی امداد کے خلاف ہیجان، انگریز تاجروں کے مقابلے میں غیر ملکی تاجروں کے لیے رعایتی شرحیں مقرر کرنیوالے مالکان جہاز کے خلاف شکایتیں، بیرونی صنعتیں کبھی غیر جانب دار بازاروں میں اور کبھی خود انگلستان کے بازاروں میں ملکی صنعتوں پر کس طرح غلبہ حاصل کر رہی تھیں ان کو ثابت کرنے کے لیے کثرت سے اعداد و شمار کی اشاعت، ان سب اور دوسری باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگلستان کی صنعتی اور تجارتی سیادت کے دوام اور استحکام کے متعلق کچھ بے اطمینانی محسوس کی جا رہی تھی اور بعض صورتوں میں کم از کم عدم مداخلت کے مقابلے میں دوسرے طریقے زیادہ مناسب ہو سکتے تھے۔ جہاں تک یہ احساس زیادہ دوڑ دھوپ اور پیدائش کے جدید طریقوں اور اصلاح اور ترقی سے استفادے کی کوشش اور دوسروں پر سبقت لے جانے میں زیادہ پختہ ارادے کا محرک ہو اس حد تک وہ آزاد تجارت کے منافی نہیں ہوتا۔ چنانچہ آزاد تجارت کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی اغراض کی حفاظت کرے اور اس طرح اجتماعی اغراض کی تقویت کا باعث ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے تعیش سے جس قومی اور انفرادی بے پروائی کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس سے بچنے کے لیے مذکورۂ بالا طریقوں پر احتیاط کی جانی ضروری ہے۔"

"یہ عام تجربے کی بات ہے کہ بڑی کاروباری کوٹھیاں بے دھڑک کاروبار ہی کی بدولت بڑی بن جاتی ہیں اور احتیاط سے کام کر کے اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھتی ہیں۔ لیکن اگر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، یہ احتیاط بودے پن اور کاہلی کی شکل اختیار کرے تو ان کوٹھیوں کی جگہ نئی اور جوشیلی کوٹھیاں لے لیتی ہیں۔ یہ بات دنیا کے بڑے سے بڑے صنعتی ملک پر بھی صادق آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ملک اپنے رقیبوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے،

۳۵۸

نئی حالتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کیے بغیر ایک ہی وضع کی اشیا لگاتار بناتا رہے اور اپنے خرید و فروخت کے طریقوں کو بدلنے کی طرف دھیان ہی نہ دے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بہت دیر میں اس وقت جاگے گا جبکہ اس کے رقیب جو تھوڑے سے نفع پر قناعت کر کے اپنے پیر جمانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے سمجھ سے کام لے کر اور زمانے کا ساتھ دے کر اس سے آگے بڑھ چکے ہونگے۔ یہ ممکن ہے کہ انگریزی صنعت اور تجارت اس خطرے سے پوری طرح باخبر نہ ہو اور اس طرح کبھی بے اطمینانی کا اظہار اور ہیجان مفید ثابت ہو۔ لیکن اس بارے میں کوئی شبہہ ہی نہیں ہے کہ اکثروں کے دل میں قوم کو چوکنا اور چوکس رکھنے کے علاوہ ایک اور بڑا مقصد بھی ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قومی صنعت اور تجارت کو ترقی دینے کے لیے قانون سازی اور سرکاری قواعد کی تدوین کے نت نئے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے لوگوں کی جماعت اپنا اثر اور اقتدار کہاں تک بڑھا رہی ہے؟ یا یہ جماعت صرف ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کسی زمانے میں تامین کے حامی رہے ہیں؟ اگر اس جماعت کی عددی قوت بڑھ رہی ہے تو وہ کس حد تک اپنی تدبیروں میں کامیاب ہوگی اور ان تدبیروں کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ سب مستقبل کے سوال ہیں"۔

اس کے بعد ملکی معاملوں میں حکومت کی پالیسی کی سرگزشت کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے مصنف اپنی بحث کا سلسلہ یوں جاری رکھتا ہے کہ :۔ ۳۵۹

"تجارتی معاملوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے کے لیے ایک اور اعتبار سے بھی حکومت پر زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انگریزوں کی پرانی نوآبادی پالیسی سے جس پر تجارتی نظام کے تحت عمل ہوتا رہا امریکی نوآبادیاں کس طرح انگلستان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ان نوآبادیوں کی حد تک جو واقعات ظہور میں آئے ان کی اور نظیریں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے واقعات سے ہسپانیہ کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کے خلاف امریکی نوآبادیوں نے بغاوت کی اور آزاد ہوگئیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جلد یا دیر سے جملہ

نو آبادیوں کا انجام ایسا ہی ہوگا۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا اُسی وقت صحیح ہو سکتا ہے
جب کہ نو آبادیوں سے برتاؤ کا طریقہ یکساں ہو۔ انگلستان نے اپنی پرانی پالیسی
کو نظر انداز کر کے ایک نئی پالیسی اختیار کر لی ہے جس سے نو آبادیوں کی وفاداری
کے مستحکم ہونے کی زیادہ امید ہے۔ انگریزی نو آبادیوں کو اب صرف تجارتی
مقبوضات یا حرفتی رقیب نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے بڑے حصے کو اپنے آپ پر حکومت
کرنے کی اتنی آزادی دی گئی ہے کہ وہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر بھی خود مختار
رہیں نفع نقصان کا خیال ترک کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ قومیت کے تصور کو
دی گئی ہے۔ یہ نئی پالیسی اب تک کامیاب ثابت ہوئی ہے اور قرینے سے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ بھی ہمیشہ کامیاب رہے گی۔ لیکن قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ شہنشاہی وفاق، تجارتی تعلقات یا فاصلوں میں کمی سے جیسے جہازرانی اور نقل و
حمل کی اصلاح اور ترقی نے ممکن بنا دیا ہے باہمی ارتباط اور اتحاد زیادہ قریبی
ہو جائے گا یا اس کے برعکس ماحول اور آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے آپس میں چھوٹے
چھوٹے اختلاف پیدا ہو کر اتنے بڑھ جائیں گے کہ ہر نو آبادی ایک خود مختار حکومت
کی خواہش کرے گی۔ اس زمانے میں اتحاد کے قرینے علٰحدگی کے قرینوں سے زیادہ
قوی معلوم ہو رہے ہیں علٰحدگی کے قرینے گو کم ہیں، لیکن آئندہ ان کے قوی ہونے
کا امکان ہے۔ اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ۳۶۰
دیکھنا ہے کہ اگر کوئی بڑی بحری جنگ ہو تو ہماری نو آبادیوں پر کیا گزرے گی۔"
"اس میں شک نہیں کہ مانچسٹر اسکول کی اس یقین آفرینی کے باوجود کہ
آئندہ جنگیں کم ہوں گی اور تجارت اور امن و امان کا دور دورہ رہے گا، واقعات
کی رفتار نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ یقین آفرینی غلط تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کا
ابتدائی زمانہ بہت پر آشوب گزرا اور اس کا وسطی حصہ پر امن رہا۔ لیکن
آخری دور میں سخت کشمکش ہوئی۔ اس وقت تک جھگڑوں نے جنگوں کی شکل اختیار
نہیں کی ہے۔ لیکن امن و امان سے رہنے کا میلان گھٹتا جا رہا ہے۔ جن لوگوں
نے اپنی تلواروں کو کوٹ پیٹ کر ہل کے پھل اور اپنے نیزوں سے درانتی اور قینچی بنائی
تھی انھیں یہ محسوس ہوا کہ ان چیزوں کو پھر اپنی اصلی حالت میں لانا پڑے گا۔ پھر یہی

اب بھی بھیڑیوں کو اپنا تکلیف دہ ہمسایہ پاتی ہیں۔ قوی اور مسلح آدمی کو بھی اپنے مال کی پر امن حفاظت کا یقین نہیں۔ اس سیاسی بے چینی اور بے اطمینانی کا سبب جس سے بار بار وحشت پیدا ہوتی ہے، نو آبادی اغراض کا تصادم ہے۔ اٹھارھویں صدی کے تجربے سے ہم کو یہ سبق ملنا چاہیے کہ نو آبادی حسد جنگ کا کتنا موثر سبب بن سکتا ہے۔ لیکن حال میں یورپ نے نو آبادی کی توسیع خواہش کا پھر شدت سے مظاہرہ کیا ہے۔"

"اگرچہ جارج سوم کے دور حکومت کے بعد سے نو آبادیوں اور خاص کر سفید نو آبادیوں سے برتاؤ کے طریق میں خاصی تبدیلی ہوگئی ہے، پھر بھی نو آبادیوں کی لازمی طور پر ان ہی پرانے اسباب کی بنا پر قدر کی جاتی ہے۔ وہ نہ صرف غذائی پیداوار اور خام پیداوار مہیا کرتی ہیں جن سے ان ملکوں کی روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں جو اپنا وقت اور اپنی محنت مصنوعات کی تیاری میں صرف کرتی ہیں بلکہ ان ملکوں کی زائد آبادی کو بسانے کی صورت بھی نکالتی ہیں۔ اس لحاظ سے نو آبادیاں دوسرے کسی ملک کے مقابلے میں انگلستان کے حق میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ سیاسی مدبروں نے بڑھتی ہوئی بے چینی کیساتھ جب اپنی قوم کو دوسرے ملکوں کا دست نگر دیکھا جو پہلے ہی سے اس کے حریف تھے اور کسی وقت اس کے دشمن بھی بن سکتے تھے تو انھوں نے مدد حاصل کرنے کے لیے سلطنت برطانیہ کی جانب توجہ کی۔ یہ خیال بیہودہ تھا کہ برطانیہ کو معاشی حیثیت سے خود مکتفی بنا کر دوسرے ملکوں سے بے نیاز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر پوری سلطنت کو ایک اکائی قرار دیا جاتا تو اس صورت میں یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اتنے وسیع علاقے میں کہیں نہ کہیں سے انگلستان کی آبادی کی تمام حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے تجارت روک دی جائے بلکہ نو آبادیوں کے مادی وسیلوں کو ترقی دی جائے اور سلطنت کی تجارت کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ سلطنت کے تمام حصے بحران اور آفت کے زمانے میں محفوظ رہیں۔ اس طرح نو آبادیوں کے معاملے سے پھر نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ امریکی نو آبادیوں کے ہاتھ سے نکل جانے سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ پرانے ملکوں کے فائدے کی خاطر نئے ملکوں کی

۳۶۱

لوٹ کھسوٹ کی پالیسی ٹھیک نہ تھی۔ چنانچہ عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ نوآبادیوں کو قبضے میں رکھنا بے سود تھا۔ ان سے کوئی فائدہ نہ ہونے کی صورت میں ان پر روپیہ صرف کرنا فضول معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہمیشہ سے کچھ لوگ یہ کوشش کرتے رہے کہ بیچ میل اور مختلف وضع کے زرعی علاقوں کو ملا کر آزاد حکومتوں کا ایک وفاق بنا دیا جائے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ خود مختاری دیدینے سے ایک طرف مادر وطن کے سر سے بڑا بھاری بوجھ اتر جاتا ہے اور دوسری طرف پوری علٰحدگی کا کوئی رجحان بھی نہیں پیدا ہوتا تو برطانیہ میں عوام نے سلطنت کے مسئلے پر پھر سے غور شروع کیا اور ان طاقتور نوخیز نوآبادیوں پر فخر کرنے لگے جو اپنی مادر وطن سے بے انتہا وفادار معلوم ہوتی تھیں۔ جذباتی، معاشی اور فوجی سببوں کی بنا پر ان کے درمیان اتحاد کے رشتے کو مضبوط کرنا مناسب تھا۔ چنانچہ شاہی کانفرنسوں میں، جن میں سے پہلی ۱۸۸۷ء میں منعقد ہوئی، اس پالیسی کی بابت ایک نمایاں قدم آگے بڑھایا گیا۔ ۱۹۲۶ء کی کانفرنس میں ایک خصوصی کمیٹی نے وسیع سلطنت برطانیہ کے مختلف حصوں کے باہمی تعلقات کے مسئلے پر بڑی بحث کی اور اس کمیٹی کی تحقیقات، جسے کانفرنس نے متفقہ طور سے منظور کر لیا، برطانوی سلطنت کے جدید تصور اور دستور کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ نے یہ واضح کر دیا کہ "برطانیہ عظمٰی اور اس کی خود مختار نوآبادیاں، سلطنت برطانیہ میں آزاد قوموں کی حیثیت رکھتی ہیں، سب کا درجہ برابر ہے اور اپنے اندرونی یا بیرونی معاملوں میں کسی اعتبار سے بھی ایک دوسرے کی تابع نہیں ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ تاج برطانیہ سے وابستگی کے ایک رشتے میں منسلک اور برطانوی دولت عامہ کے ارکان کی حیثیت سے آزادانہ طور پر متحد ہیں۔" ان لفظوں سے صرف یہی نہیں واضح ہوتا کہ آجکل کی برطانوی سلطنت کیا ہے بلکہ یہ بھی صاف طور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عظیم تر برطانیہ کی طاقت کس چیز میں پنہاں ہے۔

معاشی اتحاد کا حصول بحد دشوار تھا، خاصکر اس صورت میں جب کہ اس سے محصول کی تمام بندشیں توڑ دی جائیں اور سلطنت برطانیہ کی سرحدوں پر کروڑگیری کی ناکہ بندی کی جائے۔ دوسرے نوخیز ملکوں کی طرح نوآبادیاں بھی شدومد سے

۳۶۲

تامین کی حامی تھیں۔ اس کے برخلاف انگلستان آزاد تجارت کی پالیسی کا پابند
تھا۔ نوآبادیوں کی حکومتیں مادری ملک کو کچھ ترجیح دینے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن
برطانوی مال کی خاطر اپنے محصولوں کو منسوخ کرنے کے لیے آمادہ نہ تھیں کیونکہ وہ جانتی
تھیں کہ برطانیہ میں تامینی محصولوں کا وجود ہی نہیں تھا جن کو منسوخ کرکے وہ انھیں
کوئی مساوی رعایت دیتیں۔ ۱۸۹۵ء میں جب جوزف چیمبرلین نوآبادیوں کے
وزیر مقرر ہوئے تو انھوں نے اس عہدے میں، جو اب تک غیر اہم تھا، جان ڈال دی۔
انگلستان کی نوآبادیوں کی صنعتوں کو ترقی دینے اور سلطنت کے مختلف حصوں
کے درمیان اتحاد اور دوستی کا رشتہ اور مضبوط کرنے میں انھوں نے اپنی انتہائی
قوت صرف کی۔ لیکن آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ محصول کے طریق میں تبدیلی ضروری
تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے تامین کے متعلق اپنی مہم شروع کی جس سے شاہی
ترجیح بھی وابستہ تھی۔ ان کی تحریک یہ تھی کہ خوراک کی اشیا کی درآمد پر کم اور جملہ مصنوعات
کی درآمد پر زیادہ محصول لگایا جائے اور نوآبادیوں کو ترجیح دی جائے۔ انھیں
توقع تھی کہ اس کے جواب میں نوآبادیاں بھی کچھ رعایتیں ملحوظ رکھیں گی۔ گو یہ
پیش قدمی بہت دلیری سے کی گئی تھی، مگر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے
رفقائے کار نے اس تحریک کی تائید نہیں کی اور ۱۹۰۶ء میں لبرل فری ٹریڈرس
(آزاد تجارت کے حامی) تمام ملک پر چھا گئے۔ یہ مباحثہ بھی سرد پڑ گیا یہاں تک کہ
۱۹۲۳ء کے عام انتخاب کے موقع پر جب کہ غذا کو محصول سے مستثنیٰ رکھتے ہوئے
تامین اور شاہی ترجیح کی تجویزیں دوبارہ پیش کی گئیں وہ پھر ایک اہم سیاسی
مسئلہ بن گیا۔ گو تامین کو حکومت کی مقررہ پالیسی کی حیثیت سے کبھی اختیار
نہیں کیا گیا۔ پھر بھی جنگ کے بعد والے دور میں بعض تامینی تجویزیں منظور کی گئیں۔
مثلاً ایک تو قانون تحفظ صنائع بابتہ ۱۹۲۲ء بعض ایسی کلیدی صنعتوں کی تامین کرتا
تھا جو نہایت اہم مانی جاتی تھیں اور جن کو اسی قسم کی پیداوار دوسرے ملکوں سے
ارزاں حاصل ہونے کی صورت میں بھی چلانا مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ اور دوسرا
قانون نشان تجارت بابتہ ۱۹۲۶ء جو حکومت کے متعلقہ محکمے کو اس کا اختیار دیتا
ہے کہ بعض درآمدی اشیا پر ان کے اصلی ملک کے نشان کو لازمی قرار دے۔ سیح

۳۶۳

پوچھو تو یہ دونوں نابین کی ایک چھپی ہوئی شکل ہیں۔ شاہی ترجیح کو بھی ایک ترمیم شدہ صورت میں رائج کیا گیا۔ چنانچہ بعض قابل محصول درآمدی اشیا مثلاً تنباکو اور قہوہ اگر سلطنت کی حدوں میں پیدا کی جائیں تو ترجیحی محصول کے تابع ہیں لیکن مسٹر بالڈون کی وزارت کے دوسرے دور میں (۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۹ء) حکومت نے دوسرے ذریعوں سے بھی سلطنت کی تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کی اور ایک سلطنتی مجلس فروخت (امپائر مارکیٹنگ بورڈ) تابع اور خودمختار نوآبادیوں کے محکموں کے ایک شعبے کی حیثیت سے قائم کی گئی۔ اس مجلس نے شاہی تشہیری ایجنسی کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے!

موجودہ دنیا میں صنعتی اور تجارتی قوم ہونے کے اعتبار سے برطانیہ عظمیٰ کی حیثیت کیا ہونی چاہیے؟ مختلف سیاسی جماعتیں اس سوال کا جواب قطعی لیکن ایک دوسرے سے بہت مختلف دیتی ہیں۔ تاہم جب ان سب جوابوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ یعنی اشتراکی نے غیر شعوری طور پر قدامت پسندی کے عنصر کو قبول کر لیا ہے اور قدامت پسند نے غیر محسوس طریقے پر اشتراکیوں کے نصب العین یعنی منظم تعاون کی تائید کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معاملہ کسی ایک سیاسی جماعت کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ اس کے قطع نظر بھی اگر اس سوال کا کوئی جواب دیا جائے تو لازمی طور سے وہ قیاسی ہوگا۔ کیونکہ اس سوال پر کہ "کیا ہونا چاہیے؟" بہت زیادہ وقت ضائع کیا جا چکا ہے اور اس کے برخلاف یہ سمجھنے کے لیے کہ "کیا صورت حال ہے" بہت ہی کم وقت دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ہم یہ معلوم کرنے کی غرض سے برطانیہ عظمیٰ کی صنعتی تاریخ کا مطالعہ کرتے آئے ہیں کہ موجودہ دنیا میں انگلستان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ انگلستان نے صنعتی میدان میں کس طرح پیش قدمی اور ترقی کی۔ انگلستان کے معاشی نظام کے ارتقا کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس طرح ہماری بحث اور تحقیق دراصل اس سوال کا امکانی طور سے اطمینانی جواب ہے کہ "صورت حال کیا ہے"۔ اس لحاظ سے دو برطانیہ عظمیٰ ہیں۔ ایک تو

۳۲۴

سلطنت کے اندر کا برطانیہ اور دوسرا بقیہ دنیا سے تعلق رکھنے والا برطانیہ وہ سب لوگ جو جماعتی سیاسیات کی حدوں سے آگے بھی نظر دوڑانے کی بصیرت رکھتے ہیں ان دونوں طرح کے برطانیہ کو ایک ہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمت
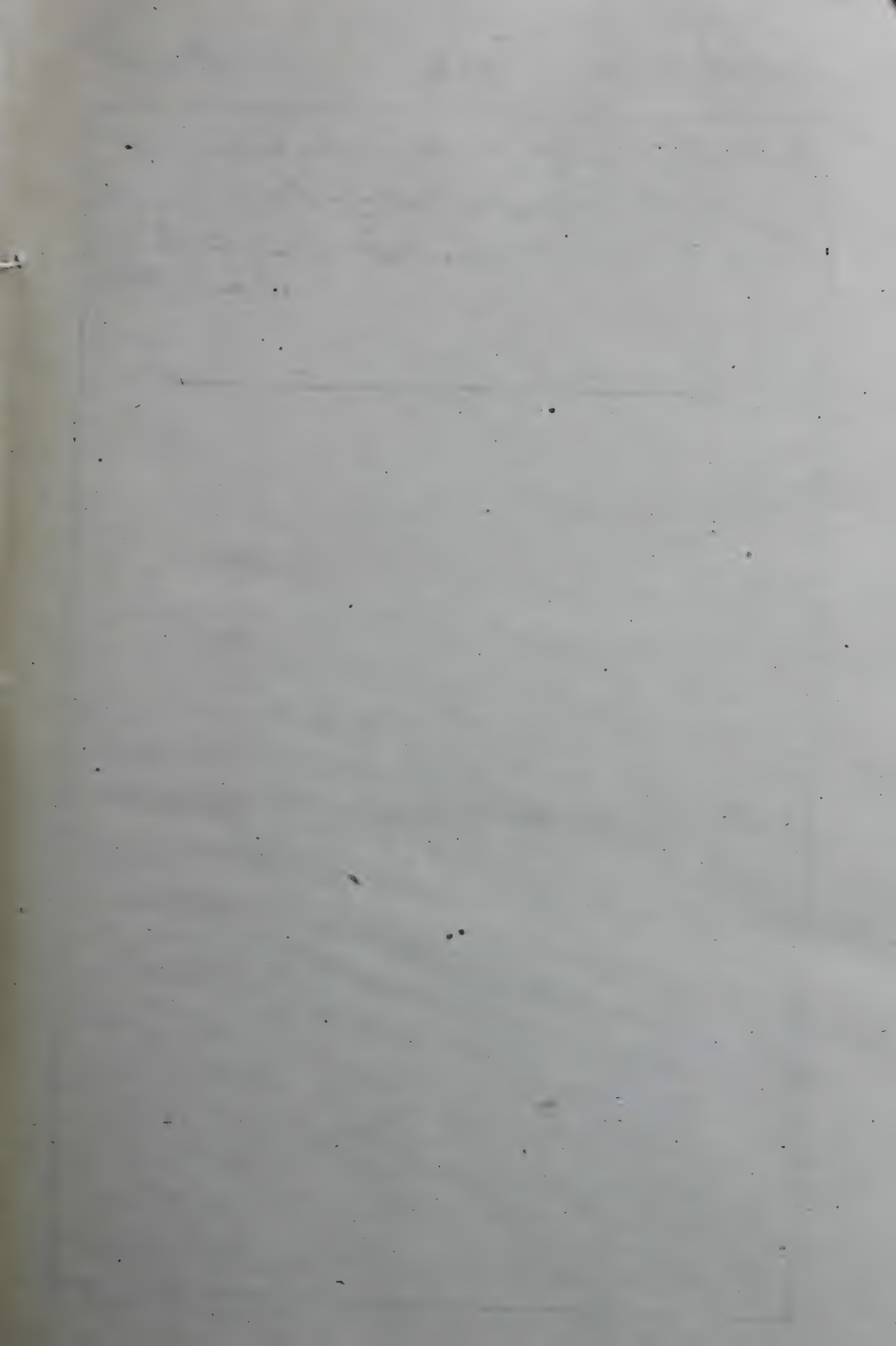
صحت نامہ

صنعتی تاریخ انگلستان
کے
ممتاز دور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
متن ۲	۲	کہ ابادی النظر	کہ بادی النظر
۱۶	۱۱	محھولوں	محصولوں
۱۷	۱۱	Tributure	Tributum
۲۰	۱۰	ٹے،سی،اٹس	ٹیسی ٹس
۲۱	۱۳	ڈونڈے	ڈومسڈے
۳۳	۵	ہر دیہاتی کر کچھ	ہر دیہاتی کو زمین کے کچھ
۵۴	۲۴	دومین،	دوسرے
۵۵	۹	دومین،	دوسرے
۶۸	۲۲	باقی گیئے تھے	باقی رہ گیئے تھے
۷۰	۲۱	جتھے	جتھے کا
۸۱	۸	ایکیجبر	اکسچکر
۹۰	۱۷	تاحد	×
۹۱	۲۰	المصرام	الصرام
۱۲۵	۱۵	جھنجھٹ	جھنجھٹ
۱۴۹	۲۴	ڈھونے	ڈھونڈنے
۲۰۰	۸	صفت	صنعت
۲۱۴	۴	حوصولہ	حوصلہ
۲۱۴	۲۲	نہ لیاں	نمایاں
۲۲۲	۴	جینیر	جینیز
۲۲۴	۲۰	فاؤلینڈ	فاؤنڈلینڈ
۲۳۱	۲۰	محخفظو	محفوظ
۲۳۸	۱۱	صنعت کا گھونٹ	صنعت کا گلا گھونٹ
۲۴۱	۳	کریڈسٹین	کریڈٹین
۲۴۱	۱۴	شکنی تھی	شکنی کی تھی
۲۸۳	۱	صوالا	مسمار
۲۹۷	۲۰	سلکس	سکس
۳۱۱	۱۰	شروح	شروع
۳۳۵	۱۷	وہ اصل	دراصل
۳۷۷	۲۰	Arganzine	Organzine
۴۰۶	۱	چرخاب	ٹرمین۔تربان
۴۱۱	۱۰	Chara-banc	Char-a-banc
۴۱۲	فٹ نوٹ	۲۳۲	۳۰۷
۴۳۹	۱۴	انڈیپنڈنڈنٹ	انڈیپنڈنٹ
۴۴۲	۲۳	یکا	ایکا
۴۴۳	۸	mining federation	miners federation
۴۵۴	۸	ان کی	یا ان کی
۴۶۸	۲۵	علی	گلی
۴۷۵	۲۱	ضائع	صنائع